ماہنامہ

الفرقان
لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ اور عہد ہے

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے بھیجے ہوئے

حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے، اسی سانچے میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں اور وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا

عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فاطر السماوات والأرض أنت وليي في الدنيا والآخرة

توفني مسلما وألحقني بالصالحين

ادارۂ الفرقان

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (بلکہ ہندستان) ۶
" " (بلکہ پاکستان) ۶
ششماہی ۳

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی آٹھ آنے (۸)

ممالک غیر سے
۱۰ شلنگ سالانہ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ چندہ ۱۵

جلد (۲۹) | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۱ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۶۱ء | شمارہ (۱)

اگر دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو ـ تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۱ جولائی تک ضرور پہونچ جانی چاہیئے۔

اطلاع دیتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ
دفتر الفرقان
کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اولیں

اسلامی جنتری کا ایک اور ورق الٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی الفرقان نے اُنتیسویں[29] سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ خدا توفیق دے کہ یہ قدم جادۂ حق پر رہے، اور الفرقان کا یہ نیا سال اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں کی زندگی میں اچھے اضافوں کا ذریعہ بنے۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو بستی سے یو۔ پی کی جس دینی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا تھا، ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ریاست کے ایک بڑے حصہ میں پھیلنے کے بعد اس تحریک کی ایک ریاستی کانفرنس ۴ اور ۵ جون کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کو بجا طور پر تحریک کا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے، گرمی کی غیر معمولی شدت کے باوجود ریاست کے ۴۰ اضلاع سے چھ سو کے قریب نمائندے شریک ہوئے۔ اس تعداد سے بھی زیادہ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ نمائندگی بڑی وقیع اور جاندار تھی، اضلاع کا بہت ہی باصلاحیت، نمایاں اور کارکن طبقہ ان نمائندوں میں شریک تھا جس سے معلوم ہوا کہ تحریک نے مسلمانوں کے بہت جاندار عنصر کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ اور اس لحاظ سے تحریک گویا بہت ہی مختصر مدت میں اپنی بنیادیں کافی مضبوط کر چکی ہے۔

دراصل سرکاری نصاب تعلیم کے خطرات کا صحیح شعور اور آزاد دینی مکاتب کے قیام کا صاف واضح اور ممکن العمل نقشہ اس تحریک کا وہ امتیاز ہے جس نے مسلمانوں کے باشعور طبقے کو گہری فکر اور پوری امید کے ساتھ اس تحریک کی طرف مائل کر دیا ہے۔ اس تحریک سے پہلے سرکاری نصاب تعلیم کے دینی خطرات کا ادراک صرف افراد تک محدود تھا اور مسلمان بچوں کی عمومی دینی تعلیم کے نظام کا کوئی واضح اور ممکن العمل نقشہ سرے سے سامنے ہی نہ تھا، لیکن اس تحریک نے ایک طرف

ایک ایک بچے کی دینی تعلیم کے نظام کا ایک واضح اور قابلِ عمل نقشہ پیش کیا اور دوسری طرف ان دور رس خطرات کا شعور عام کیا جو موجودہ سرکاری نصابِ تعلیم میں مسلمان نسلوں کے دین و ایمان کے لیے مضمر ہیں۔ یہی چیز تھی جس نے ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں ایک عام بیداری مسلمانوں کے باعمل طبقوں میں پیدا کر دی۔ اس کانفرنس میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے جنرل سکریٹری نے ڈیڑھ سال کے کام کی جو رپورٹ پیش کی اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"آج ایک قلیل عرصہ کے بعد جب دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے زیر اہتمام اور انجمن تعلیمات دین ضلع لکھنؤ کی دعوت پر یہ پہلی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس ہو رہی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ منزل کے حصول اور طریقِ کار کی کامیابی پر عامۃ المسلمین میں یقین و اعتماد پیدا ہو چکا ہے۔ ۳۴ اضلاع میں کونسل کی شاخیں بن چکی ہیں، اور دینی مکاتب کے اجراء میں ہر ضلع دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کے اندر کسی تعمیری کام کے پھیلنے سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو چکے تھے وہ پورے عزم و یقین کے ساتھ میدان میں آ گئے ہیں، اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات کی ہوا بھی اس کام میں کسی کو نہیں لگ رہی ہے ایک عام خطرے کے پیشِ نظر اختلافات اور باہمی تصادم و تضاد کو "غرقِ دریا" کر دیا گیا ہے۔"

کام کی تیز رفتاری اور مسلمانوں کی عام دلچسپی کا اندازہ مکاتب کے قیام و الحاق کے اس تفصیلی نقشے سے ہوتا ہے جو رپورٹ کے آخر میں منسلک کیا گیا ہے، جن نئے مکاتب کا قیام عمل میں آیا یا پرانے مکاتب کی تنظیم کی گئی اُن کی مجموعی تعداد ۱۵۰۰ سے اوپر ہے، "یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے" اور پورے وثوق کے ساتھ امید دلاتی ہے کہ انشاء اللہ اب یہ کارواں اپنی اس منزل ہی پر جا کر دم لے گا جس کی طرف سکریٹری کی اس رپورٹ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

"لوگ عادتاً خود بخود گاؤں گاؤں اور محلے محلے آزاد دینی مکاتب کھولنے لگیں گے نہ کسی انجمن کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی مبلغ کی، بالکل اسی طرح جیسے لوگ مساجد اور عیدگاہیں بناتے ہیں اور عربی مدرسے کھولتے ہیں۔"

یہ سطریں لکھنؤ کانفرنس کی کامیابیوں کے مسرت انگیز تذکرہ کے مقصد سے لکھنی شروع

کی تھیں مگر ابھی یہ نامکمل ہی تھیں کہ کانفرنس اور دینی تعلیمی تحریک کے سب متعلقین کے لیے ایک دلدوز اور بالکل ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔ چنانچہ تین دن کے بعد ان سطروں کو بہت ہی بجھے ہوئے دل کے ساتھ جبراً تکمیل تک پہونچانے کی نوبت اس دلخراش تذکرہ کے ساتھ آرہی ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے جنرل سکریٹری چودھری نفیس احمد صاحب ایڈوکیٹ جن کی دو ماہ کی شبانہ روز مساعی کو کانفرنس کی کامیابی میں بہت بڑا دخل تھا چھ دن کی مختصر علالت کے بعد ۲۷ اور ۲۸ جون کی درمیانی شب میں سفر آخرت اختیار کرکے ہم سے جدا ہوگئے۔ اس کانفرنس کے سلسلہ میں ذمہ داران دینی تعلیمی کونسل اور انجمن تعلیمات دین لکھنؤ کے ارکان پر مرحوم کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کے جوہر کھلے تھے ان سے دینی تعلیمی تحریک کے سلسلہ میں بڑی توقعات پیدا ہوگئی تھیں۔ افسوس کہ اس ہیرے کو نظر لگ گئی اور وہ ہمارے ہاتھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ مرحوم سے ادارۂ الفرقان کا ذاتی تعلق بھی بہت گہرا اور پرانا تھا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ مرحوم کی عمر صرف ۴۷ سال تھی۔ پسماندگان میں والدہ بزرگوار، بہن اور بھائیوں کے علاوہ پانچ بچے اور ایک بیوہ ہیں۔ ناظرین الفرقان سے التجا ہے کہ وہ مرحوم اور ان کے پسماندگان کو اپنی خصوصی دعاؤں سے یاد فرمائیں۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

اذان ـــــــ (۲)

(۴۴) عن ابی محذورۃ قال القی علیّ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم التاذین ھو بنفسہ فقال قل اللہ اکبر
اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اشھد ان لا الٰہ
الا اللہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ اشھد ان محمداً
رسول اللہ اشھد ان محمداً رسول اللہ ثم
تعود فتقول اشھد ان لا الٰہ الا اللہ اشھد ان
لا الٰہ الا اللہ اشھد ان محمداً رسول اللہ اشھد
ان محمداً رسول اللہ حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ
حی علی الفلاح حی علی الفلاح اللہ اکبر اللہ اکبر
لا الٰہ الا اللہ ـــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اذان پڑھنا مجھے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس سکھایا مجھ سے فرمایا کہو۔

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
اشہد ان محمداً رسول اللہ اشہد ان محمداً رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا پھر دوبارہ

یہی کہو ۔ اشہدان لا الہ الا اللہ اشہدان لا الہ الا اللہ ، اشہدان محمداً رسول اللہ اشہدان محمداً رسول اللہ ، حی علی الصلوٰۃ حیّ علی الصلوٰۃ حیّ علی الفلاح حیّ علی الفلاح ، اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ ۔

_______ صحیح مسلم

(۳۵) عَنْ اَبِی مَحْذُوْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَّمَہُ الْاَذَانَ تِسْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً وَالْاِقَامَۃَ سَبْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً ۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجۃ)

(ترجمہ) حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اذان سکھائی انیس[۱۹] کلمے اور اقامت سترہ[۱۷] کلمے ۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مسند دارمی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حضرت ابومحذورہ کی اوپر والی روایت میں اذان کے پورے انیس[۱۹] کلمے ہیں کیونکہ شہادت کے چاروں کلمے اس میں مکرر آئے ہیں اور اقامت میں سترہ کلمے اس طرح ہوں گے کہ شہادت کے کلمے مکرر نہ ہونے کی وجہ سے چار کلمے کم ہو جائیں گے اور " قد قامت الصلوٰۃ ، قد قامت الصلوٰۃ " دو کلموں کا اضافہ ہو جائے گا ۔ اس کمی اور بیشی کے بعد ان کی تعداد پوری سترہ ہو جائے گی ۔

ابو محذورہ کو اذان سکھانے کا یہ واقعہ شوال ۸ھ کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے ـــــ اس واقعہ کی تفصیل جو مختلف روایات کے جمع کرنے سے معلوم ہوتی ہے دلچسپ بھی ہے اور ایمان افروز بھی ۔ اس لیے اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ سے فارغ ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ حنین کی طرف تشریف لے گئے ، جبکہ آپ کے ساتھ ایک خاصی بڑی تعداد مکہ کے ان طلقا کی بھی ہو گئی تھی جن کو آپ نے فتح مکہ کے دن ہی معافی دے کر آزاد کیا تھا تو یہ ابو محذورہ بھی

جو اس وقت ایک شوخ نوجوان تھے اور مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے اپنے ہی جیسے نو اور یا دس ساتھیوں کے ساتھ حنین کی طرف چل دیئے ــــــ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ ہی میں حضور سے ہماری ملاقات ہوئی ــــــ نماز کا وقت آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن نے اذان دی۔ ہم سب اس اذان سے (بلکہ اذان والے دین ہی سے) منکر و متنفر تھے۔ اس لیے ہم سب ساتھی مذاق اور تمسخر کے طور پر اذان کی نقل کرنے لگے۔ اور میں نے بالکل موذن ہی کی طرح خوب بلند آواز سے نقل کرنی شروع کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز پہونچ گئی تو آپ نے ہم سب کو بلوا بھیجا ہم لاکر آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ آپ نے فرمایا بتاؤ تم میں وہ کون ہے جس کی آواز بلند تھی۔ (ابو محذورہ کہتے ہیں کہ) میرے سب ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کر دیا، اور بات سچی بھی تھی، آپ نے اور سب کو تو چھوڑ دینے کا حکم دے دیا اور مجھے روک لیا اور فرمایا کھڑے ہو اور پھر اذان کہو (ابو محذورہ کا بیان ہے کہ) اس وقت میرا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ نے جس اذان کے دینے کا حکم دیا تھا اس سے زیادہ مکروہ اور مبغوض میرے لیے کوئی چیز بھی نہ تھی یعنی میرا دل (معاذ اللہ) آپ کی نفرت اور بغض سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن میں مجبور اور بے بس تھا اس لیے ناچار حکم کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خود اذان بتانی شروع کی اور فرمایا کہو "اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر" (آخر تک بالکل اسی طرح جس طرح اوپر والی حدیث میں گزر چکی ہے ــــــ آگے ابو محذورہ بیان کرتے ہیں) جب میں اذان ختم کر چکا تو آپ نے مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی جس میں کچھ چاندی تھی، اور میرے سر کے اگلے حصہ پر آپ نے اپنا دست مبارک رکھا اور پھر آپ نے اپنا دست مبارک میرے چہرہ پر اور پھر میرے سامنے کے حصہ پر یعنی سینہ پر اور پھر قلب و جگر پر اور پھر نیچے ناف کی جگہ تک پھرا پھر مجھے یوں دعا دی۔

"بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ وَبَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ" (اللہ تعالیٰ تیرے اندر برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے) یہ دعا آپ نے مجھے تین دفعہ دی، (حضور کی اس دعا اور دست مبارک کی برکت سے میرے دل سے کفر اور نفرت کی وہ لعنت دور ہو گئی

یوں کہو — اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ، اشہد ان محمداً رسول اللہ اشہد ان محمداً رسول اللہ، حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح حی علی الفلاح، اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ۔ — صحیح مسلم

(۳۵) عَنْ اَبِیْ مَحْذُوْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَّمَہُ الْاَذَانَ تِسْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً وَالْاِقَامَۃَ سَبْعَ عَشْرَۃَ کَلِمَۃً —

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجہ)

(ترجمہ) حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اذان سکھائی انیس[19] کلمے۔ اور اقامت سترہ[17] کلمے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مسند دارمی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حضرت ابومحذورہ کی اوپر والی روایت میں اذان کے پورے انیس[19] کلمے ہیں کیونکہ شہادت کے چاروں کلمے اس میں مکرر آئے ہیں اور اقامت میں سترہ کلمے اس طرح ہوں گے کہ شہادت کے کلمے مکرر نہ ہونے کی وجہ سے چار کلمے کم ہوجائیں گے، اور "قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ" دو کلموں کا اضافہ ہوجائے گا۔ اس کمی اور بیشی کے بعد ان کی تعداد پوری سترہ ہوجائے گی۔

ابو محذورہ کو اذان سکھانے کا یہ واقعہ شوال ۸ھ کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے — اس واقعہ کی تفصیل جو مختلف روایات کے جمع کرنے سے معلوم ہوتی ہے دلچسپ بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔ اس لیے اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ سے فارغ ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ حنین کی طرف تشریف لے گئے جبکہ آپ کے ساتھ ایک خاصی بڑی تعداد مکہ کے ان طلقاء کی بھی ہوگئی تھی جن کو آپ نے فتح مکہ کے دن ہی معافی دے کر آزاد کیا تھا تو یہ ابو محذورہ بھی

جو اس وقت ایک شوخ نوجوان تھے اور مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے اپنے ہی جیسے نو اور یاروں کے ساتھ حنین کی طرف چل دیئے ـــــ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ ہی میں حضور سے ہماری ملاقات ہوئی ـــــ نماز کا وقت آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن نے اذان دی۔ ہم سب اس اذان (بلکہ اذان والے دین ہی سے) منکر و متنفر تھے۔ اس لیے ہم سب ساتھی مذاق اور تمسخر کے طور پر اذان کی نقل کرنے لگے۔ اور میں نے بالکل موذن ہی کی طرح خوب بلند آواز سے نقل کرنی شروع کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز پہونچ گئی تو آپ نے ہم سب کو بلوا بھیجا، ہم لا کر آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ آپ نے فرمایا تم لوگوں میں وہ کون ہے جس کی آواز بلند تھی۔ (ابو محذورہ کہتے ہیں کہ) میرے سب ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ اور بات بھی یہی تھی، آپ نے اور سب کو تو چھوڑ دینے کا حکم دے دیا اور مجھے روک لیا اور فرمایا کھڑے ہو اور پھر اذان کہو (ابو محذورہ کا بیان ہے کہ) اس وقت میرا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ نے جس اذان کے دینے کا حکم دیا تھا اس سے زیادہ مکروہ اور مبغوض میرے لیے کوئی چیز بھی نہ تھی یعنی میرا دل (معاذ اللہ) آپ کی نفرت اور بغض سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن میں مجبور اور بے بس تھا اس لیے ناچار حکم کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خود اذان بتانی شروع کی اور فرمایا کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر" (آخر تک بالکل اسی طرح جس طرح اوپر والی حدیث میں گزر چکی ہے ـــــ آگے ابو محذورہ بیان کرتے ہیں) جب میں اذان ختم کر چکا تو آپ نے مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی جس میں کچھ چاندی تھی، اور میرے سر کے اگلے حصہ پر آپ نے اپنا دست مبارک رکھا اور پھر آپ نے اپنا دست مبارک میرے چہرہ پر اور پھر میرے سامنے کے حصہ پر یعنی سینہ پر اور پھر قلب و جگر پر اور پھر نیچے ناف کی جگہ تک پھرا، پھر مجھے یوں دعا دی۔

"بَارَكَ اللّٰهُ فِيكَ وَبَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ" (اللہ تعالیٰ تیرے اندر برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے) یہ دعا آپ نے مجھے تین دفعہ دی۔ (حضور کی اس دعا اور دست مبارک کی برکت سے میرے دل سے کفر اور نفرت کی وہ لعنت دور ہو گئی

اور ایمان اور محبت کی دولت مجھے نصیب ہو گئی) اور میں نے عرض کیا کہ مجھے مکہ معظمہ میں مسجد حرام کا موذن بنا دیجئے! آپ نے فرمایا کہ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں اب مسجد حرام میں تم اذان دیا کرو!۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شہادت کے کلمے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ مکرر یعنی بجائے دو دو دفعہ کے چار چار دفعہ کیوں کہلوائے، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں اس وقت تک ایمان آیا نہیں تھا۔ انھوں نے صرف حکم سے مجبور ہو کر اپنے اس وقت تک کے عقیدے کے بالکل خلاف اذان دینی شروع کر دی تھی۔ اور اذان کے کلمات میں سب سے زیادہ ناگوار ان کو اس وقت شہادت کے یہی دو کلمے تھے (یعنی "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ") جب ایک دفعہ وہ کہہ چکے تو حضور نے فرمایا ان کلموں کو پھر دوبارہ کہو اور خوب لمبی آواز سے کہو۔ اس عاجز کا خیال ہو کہ آپ کی زبان سے یہ کلمے کہلوائے تھے اور خود اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے کہ وہ ان کلموں کو اپنے اس بندے کے دل میں اتار دے، الغرض یہ بات بالکل قرین قیاس ہو کہ اس وقت کی ان کی خاص حالت کی وجہ سے آپ نے شہادت کے یہ کلمے مکرر کہلوائے ہوں۔ ورنہ کسی صحیح روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مستقل موذن حضرت بلال کو یہ حکم دیا ہو اور وہ اذان میں شہادت کے یہ کلمے اس طرح چار چار دفعہ کہتے ہوں، اسی طرح عبد اللہ بن زید کے خواب کی صحیح روایات میں بھی شہادت کے یہ کلمے دو ہی دو دفعہ وارد ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ابو محذورہ مکہ معظمہ میں ہمیشہ اسی طرح اذان دیتے رہے یعنی ان کلموں کو مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق چار چار دفعہ کہتے رہے جس کو اصطلاح میں (ترجیع) کہتے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضور نے جس طرح ان سے اذان کہلوائی تھی اور جس کی برکت سے ان کو دین کی دولت ملی تھی وہ ایک عاشق کی طرح چاہتے تھے کہ ہو بہو وہی اذان ہمیشہ دیا کریں ورنہ وہ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ حضور کے موذن بلال کس طرح اذان دیتے ہیں ...... اسی واقعہ کی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو محذورہ کے سر کے اگلے حصے (ناصیہ) پر جہاں دست مبارک

رکھا تھا وہ دہاں کے اپنے بالوں کو کبھی کٹواتے نہیں تھے، اس عاجز کا خیال ہو کہ جیسی یہ ان کی ایک عاشقانہ ادا تھی اسی طرح ان کی ایک ادا یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ ترجیع کے ساتھ اذان کہتے تھے، اور بلاشبہ حضور کو اس کا علم تھا لیکن حضور نے منع نہیں فرمایا اس لیے اس کے بھی جواز میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں! اور حقیقت وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ اذان واقامت کے کلمات کا یہ اختلاف بس مختلف قراءتوں کا سا اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

اذان واقامت میں دین کے بنیادی اصولوں کی تعلیم ودعوت:۔

اذان و اقامت کے سلسلہ میں یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ناظرین کے لیے انشاء اللہ مفید اور موجب بصیرت ہوگا کہ اگرچہ یہ دونوں چیزیں بظاہر وقتِ نماز کے اعلان کا ایک وسیلہ اور نماز کا بلاوا ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایسے جامع کلمات الہام فرمائے ہیں جو دین کی روح بلکہ دین کے پورے بنیادی اصولوں کی تعلیم و دعوت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا مسئلہ ہو اس بارہ میں اسلام کا جو نظریہ ہو اس کے اعلان کے لیے اللہ اکبر اللہ اکبر سے بہتر اور اتنے جاندار الفاظ تلاش نہیں کیے جا سکتے، اس کے بعد نمبر آتا ہے عقیدۂ توحید کا، بلکہ صفات کا مسئلہ اسی سے صاف اور مکمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جیسا جاندار اور موثر کوئی دوسرا مختصر کلمہ منتخب نہیں کیا جا سکتا، ——— پھر اس حقیقت کے واضح اور معلوم ہو جانے کے بعد کہ بس اللہ ہی ہمارا الٰہ و معبود ہے، یہ سوال فوراً سامنے آجاتا ہے کہ اس اللہ تک پہونچنے کا راستہ یعنی اس سے بندگی کا صحیح رابطہ قائم کرنے کا طریقہ کہاں سے معلوم ہو سکے گا؟ اس کے جواب کے لیے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے بہتر کوئی کلمہ نہیں سوچا جا سکتا، اس کے بعد "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" کے ذریعہ اس صلوٰۃ کی دعوت دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی اور اس سے رابطہ قائم کرنے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہے اور اللہ کی طرف چلنے والے کا سب سے پہلا قدم بھی ہے۔ اس کے بعد "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کے ذریعہ اس حقیقت کا اعلان

کیا جاتا ہے کہ یہی راستہ فلاح یعنی نجات و کامیابی کی منزل تک پہونچانے والا ہے۔ اور جو لوگ اس راستہ کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چلیں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ گویا اس میں عقیدۂ آخرت کا اعلان ہے اور ایسے الفاظ کے ذریعہ اعلان ہے کہ ان سے صرف عقیدہ ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کا سب سے اہم اور قابل فکر مسئلہ بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ پھر یہ اعلان اور پکار ہے کہ انتہائی عظمت و کبریائی والا بس اللہ ہی ہے اور وہی بلا شرکت غیرے الٰہ برحق ہے۔ اس لیے بس اسی کی رضا کو اپنا مطلوب و مقصود بناؤ۔

بار بار غور کیجیے کہ اذان و اقامت کے ان چند کلمات میں دین کے بنیادی اصولوں کا کس قدر جامع اعلان ہے اور کتنی جاندار اور مؤثر دعوت ہے۔ گویا ہماری ہر مسجد سے روزانہ پانچ وقت دین کی یہ تبلیغ دعوت نشر کی جاتی ہے۔

ہم مسلمان اگر اتنا ہی کرلیں کہ اپنے ہر بچے کو اذان یاد کرا دیں اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا مطلب سمجھا دیں خصوصاً اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا مطلب، زمانہ اور ماحول کی ضرورت کے مطابق سمجھا دیں تو انشاء اللہ وہ کبھی کسی غیر اسلامی دعوت کا شکار نہ ہو سکے گا۔

صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ

۴ر اور ۵ر جون ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی جانب سے جو پہلی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا تذکرہ نگاہ اوّلیں میں آیا ہے، آئندہ صفحات میں اس کا خطبۂ استقبالیہ، صدر کانفرنس کا خطبہ اور کانفرنس کی افتتاحی اور اختتامی تقریریں درج کی جا رہی ہیں۔

دینی تعلیمی تحریک ہم ہندوستانی مسلمانوں کے خاص حالات میں وقت کی سب سے اہم تحریک ہے، اس تحریک کی کامیابی پر ہماری آئندہ نسلوں کے دین و ایمان کی بقاء کا انحصار ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اسکے مقصد اور پروگرام سے پوری واقفیت حاصل کریں، اور اس واقفیت کو عام کریں، اسی ضرورت کے احساس کے ماتحت کانفرنس کی یہ اہم تقریریں اور خطبات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

افتتاحی تقریر

(دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی پہلی ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی کارروائی کا آغاز ۴ر جون ۸۲ء کو صبح ۹ بجے اضلاع کے نمائندوں کی نشست سے ہوا۔ اس نشست میں صدر کانفرنس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے ایک مختصر افتتاحی خطاب فرمایا جو درج ذیل ہے۔)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وازواجه وذرياته وسلم تسليماً كثيراً كثيراً۔

بزرگانِ محترم و نمائندگان!

میں اس وقت جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں گا اس کی نوعیت عام وعظ و تقریر کی نہیں، بلکہ میں یہ سمجھ کر عرض کروں گا کہ ہم ایک سفر کے رہرو اور ہمسفر ہیں اور ایک منزل کو سر کرنے کا مقصد ہمارے سامنے ہے، ہر رفیق کے کچھ تجربے ہوتے ہیں جو دوسرے رفقار کے کام آسکتے ہیں اور کچھ مشورے ہوتے ہیں جو وہ دوسروں کو پیش کر سکتا ہے۔

میں کچھ تجربے اور مشورے ہی اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس وقت کے خطاب میں خطابت و بیان کے عناصر کم سے کم، اور تجربے اور سوچی سمجھی باتیں زیادہ سے زیادہ ہوں، ہم ایک اعلان کے اوپر لبیک کہہ کر کھڑے ہوئے ہیں جس ارادہ سے ہم نے یہ سفر شروع کیا ہے اس کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھنا اور اس کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہے۔

بغیر کسی تکلف اور تفنن کی آمیزش کے میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارا اور آپ کا ساتھ خالص دینی رفاقت کا ساتھ ہے۔ ہم ایسے مسافر نہیں ہیں جو اتفاق سے ایک جگہ جمع ہوگئے ہوں، جن کی منزلیں مختلف یا اغراض و مقاصد جُدا جُدا ہوں۔ جو وقت کاٹنے یا سفر کو خوشگوار بنانے کے لئے باتوں میں لگ گئے ہوں۔ ہم نے ایک منزل کا انتخاب کیا ہے اور ایک مشترک ذہنی کیفیت کے ساتھ، موسم کی شدت کے باوجود یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے لئے ایک سایہ کا انتخاب کیا ہے اور طے کیا ہے کہ خواہ کچھ بھی حالات ہوں، ہم ایک مقدس مقصد کے لئے یہاں جمع رہیں گے، ہمارا آپ کا ساتھ اخلاص کا ساتھ ہے، مخلصانہ ولولے اور ارادے کے ساتھ خود کو اللہ کے دین کی خدمت کے لئے پیش کرنے کا ساتھ ہے۔

نیت میرے رفیقو اور دوستو! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر عمل کی روح وہ خاص ذہنی کیفیت اور وہ نیت ہے جس کی بنا پر عمل شروع کیا جائے۔ دنیا میں ہر کام کی قوت محرکہ اور قوت منظمہ یہی ذہنی کیفیت ہے۔ چھوٹی بڑی جتنی تحریکیں اٹھیں وہ دراصل اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ تھیں جو ان کے محرکین نے اپنے اندر پیدا کی۔ اگر ہم وہ ذہنی کیفیت کھو دیں گے جو ہمارے اس کام اور ہماری اس جد وجہد میں ہونی چاہیئے تو ہم بڑے خسارے میں رہیں گے، حدیث شریف میں ارشاد ہے:۔

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء ما نوی فمن
کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ
ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا
فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

یہ صحیحین کی حدیث ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر بیٹھ کر اس کو بیان فرمایا ہو جس کا مطلب ہو کہ

اعمال کے اجر کا دار و مدار نیت پر ہے، ہر آدمی کو اپنی نیت کے مطابق بدلہ ملتا ہو جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی نیت سے ہوگی اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف شمار ہوگی، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے عقد کرنے کی نیت سے ہوگی، اس کی ہجرت انھیں مقاصد کے لئے شمار ہوگی۔

ہمیں اور آپ کو اپنے دلوں کو ٹٹولنا اور اپنا جائزہ لینا چاہیئے کہ ہمارا اس کام میں کیا حال ہے۔ نیت کے معاملہ میں دو خطرے ہوتے ہیں۔ ایک بدنیتی۔ اس کا مجھے بحمد اللہ اندیشہ نہیں ہے، نہ آپکے بارے میں نہ اپنے بارے میں، اس لئے کہ اس کی قباحت کو ہم سب سمجھتے ہیں، ہم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا۔ جو اس کام کے ساتھ بری نیت رکھتا ہو کسی نامناسب مقصد سے اس میں شامل ہو گیا ہو، لیکن دوسرا خطرہ ہے بے نیتی کا۔ یہ انسان کے لئے بڑی سخت گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کام کی عظمت اس کے تقدس اور اصل اہمیت کو سوچا ہی نہیں، اور غور ہی نہ کیا ہو کہ ہماری کیا نیت اس کام میں ہونی چاہیئے، نیت کے سلسلہ میں جو چیز ہمارے ذہنوں میں بیدار رہنی چاہیئے وہ یہ اس کام کے مقصد اور اسکی عظمت کا احساس ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سے جو دینی وراثت ہم کو ملی ہے، ہمارے اس کام کا مقصد اس عظیم وراثت کو خود محفوظ رکھنا اور اپنی آئندہ نسلوں تک اس کو منتقل کرتے رہنا ہے، لکھنا پڑھنا لکھا دینے اور اپنی آئندہ نسلوں کو علم سے آراستہ کر دینے کا نہیں ہے، علم کی جناب میں ادنی گستاخی کئے بغیر اور اگر یہ گستاخی ہی ہو تو میں اس کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا، کہ مطلق علم کی کوئی بڑی اہمیت میری نظر میں نہیں ہے، اردو زبان کے بقا کو میں ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی ضرورت سمجھتا ہوں اور اسکے لئے کام کرنے والوں کی ہر ممکن امداد اپنا فرض سمجھتا ہوں لیکن اس زبان کو بھی سکھا دینا میرے نزدیک اتنا اہم نہیں ہے کہ اس تحریک سے میری دلچسپی اسکی وجہ سے ہو، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ قرآن شریف تک محض پڑھا دینا بھی اس کا منتہا نہیں ہے۔ علم اور تعلیم سے ہماری دلچسپی کی اور اس کو اس درجہ اہمیت دینے کی اصل وجہ یہ ہے کہ کچھ خاص احوال و ظروف اور زمانہ کی خاص رفتار نے افکار و نظریات

اور تہذیبوں کی معرکہ آرائی اور فتح و شکست کا فیصلہ کن میدان تعلیم کو بنا دیا ہے، اب اس میدان میں جو تہذیب جیتے گی وہ جیتے گی اور جو ہارے گی وہ ہارے گی۔ اسلامی تہذیب اور جاہلی تہذیب کی جو جنگ حضرت آدم کے زمانہ سے جاری ہے اور جس میں اسلامی تہذیب . . . . کے غلبہ سے ہمیں دلچسپی ہے، یہ جنگ بھی اب علم و تعلیم کے میدان میں منتقل ہو گئی ہے۔ پس دراصل مسئلہ محض تعلیم کا نہیں بلکہ ابراہیمی اور محمدی تہذیب کی تعلیم کا ہے، اسلامی نسل کا اسلام اور اسلامی تہذیب پر باقی رہنا آج اس بات پر منحصر ہو گیا ہے کہ تعلیم کے میدان میں اسلامی، ابراہیمی اور محمدی تہذیب کا گہرا نقش اس کے دلوں پر قائم کر دیا جائے۔ اسی کے لئے یہ تحریک ہے، اور یہی تحریک کی روح ہے۔ اس کو اپنے دلوں میں بٹھائیے۔ اور اس مقدس مقصد سے پورے اخلاص کے ساتھ بار بار اپنے دلوں کا جائزہ لیتے رہیے۔ آپ پر اپنے نفس کے اور باہر کے نرغے اور حملے ہوں گے بڑے نازک مرحلے آپکے اخلاص کو پیش آئیں گے ان سے ہوشیار رہیے اور اس مقدس تحریک کو کسی جاہ و عزت اور لالچ کی نذر نہ کیجیے۔ عوام کو جو اعتماد اس کام پر ہو گیا ہے اسے کسی دوسرے مقصد کا آلۂ کار نہ بنائیے۔

سیرت دوسری بات مجھے آپ سے یہ کہنی ہے کہ ہماری سیرت کو بھی اس مقدس تحریک سے مناسبت ہونی ضروری ہے، کہا تو ہمیشہ یہ گیا ہے کہ اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال کہنے والے کی بات دیکھو اس کی ذات نہ دیکھو۔ لیکن لوگ بات کے ساتھ ہمیشہ کہنے والے کو بھی دیکھتے ہیں۔ قول اور اس کی زندگی میں مناسبت تلاش کرتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ کو بھی یہ بات پسند نہیں ہے کہ ہماری دعوت اور ہماری سیرت میں کوئی مناسبت نہ ہو پس اس تحریک کے کارکنوں اور داعیوں میں دینی فرائض کی ادائیگی اور سنتوں کا اہتمام بھی ہونا ضروری ہے۔ اسی سے تحریک میں طاقت آئے گی اور اس پر اللہ کی مدد حاصل ہو گی۔

ایک مشورہ ہر تحریک کا ایک مزاج اور اس کا ایک فکر و فلسفہ ہوتا ہے۔ اس کے سمجھے بغیر تحریک کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے رفیقوں کو اس پر بھی

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

خطبۂ استقبالیہ

(از ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی)

استقبالیہ خطبوں میں عام طور پر پُر مغز باتوں کا رواج نہیں ہے۔ کانفرنس کے موضوع سے متعلق ہلکی پھلکی مختصر گفتگو، اور کچھ میزبانی و مہمانداری کی باتیں، بس یہ ہوتا ہے خطبۂ استقبالیہ۔ صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ کا خطبہ استقبالیہ اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ اس میں بعض متعلقہ مسائل پر بڑی فکرانگیز گفتگو کی گئی تھی، اسکی بنا پر اسکے شروع اور آخر کے رسمی اجزا چھوڑ کر بقیہ حصہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

دینی تعلیم اور حب الوطنی

یہ بارہا کہا جا چکا ہے کہ ہندوستانی مسلمان پہلے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے اور اسکے بعد ہندوستانی، اور دینی تعلیم ان کو شدت پسند مسلمان زیادہ بناتی ہے اور ہندوستانی کم، اس لئے دینی تعلیم پانے کے بعد مسلمانوں کی آئندہ نسل غیر قومی رجحانات کی حامل ہوگی۔ میں کہوں گا کہ اس سے بڑھ کر لغو، اور شرارت پروپگنڈہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹکنیک ان لوگوں نے اختیار کی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں یا ان لوگوں نے جو وطن دوستی، عصبیت، وفاداری اور خوشامد میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مطلق نہیں جانتے کہ وطن دوستی کے بارہ میں اسلام کی کیا تعلیمات ہیں، جو الزامات وہ مسلمانوں پر لگانا چاہتے ہیں۔ ان کو ہندوستان کی تاریخ بارہا رد کر چکی ہے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں مسلمان علماء نے بحیثیت ایک طبقہ کے کتنا نمایاں حصہ لیا تھا۔ آج جو لوگ حب الوطنی کے

اجارہ دار بنتے ہیں ان کے آبا واجداد اُس وقت انگریزوں سے ملازمتیں اور دوسری مراعات حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی مولانا عظیم اللہ، مولانا حسین احمد، مولانا عطاء اللہ بخاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد، یہ چند نام ان ہزاروں علماء میں سے سنائے گئے ہیں جو سچے مسلمان تھے اور گہرا مذہبی علم رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں تھے۔ کوئی شخص بھی ان حضرات کے مذہبی علم، اسلام پر ان کے عقیدہ اور وطن سے ان کی محبت کا انکار نہیں کر سکتا ہے، اگر اسلام کی تعلیمات مسلمانوں میں وطن دشمنی کے جذبات پیدا کرتی ہیں تو پھر علماء کے اس پورے گروہ کو جن کے چند نام آپ حضرات کے سامنے پیش کئے گئے، وقت کا سب سے بڑا وطن دشمن ہونا چاہیے تھا۔

جہانتک وطن دوستی کا سوال ہے ہندوستان کے شہریوں کے درمیان مذہب یا علاقہ کی بنا پر فرق کرنا ایک مضحکہ انگیز بات ہے۔ خدا کی اطاعت حبِّ وطن سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ وطن کی محبت خدا کی تعظیم کی منافی نہیں ہے۔ دینی تعلیم کے باعث ایک مسلمان اپنا وطنی ولولہ کھو نہیں بیٹھتا ہے۔ اسکے برعکس وہ مادر وطن کا زیادہ پُرخلوص خادم بن جاتا ہے مذہبیت اور وطنیت دو مختلف ذہنی انداز ہیں، ان کے اقدار مختلف ہیں اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ عیسائی خواہ وہ یورپ میں ہوں یا امریکہ، ایشیا اور آسٹریلیا میں یا کہیں اور اولاً عیسائی ہی رہیں گے۔ ہندو، ہندوستان، لنکا، انڈونیشیا یا جہاں کہیں بھی ہوں سب سے پہلے ہندو ہی ہوں گے۔ مذہب نسلی یا جغرافیائی حدوں میں بند نہیں ہے، آپ کسی سکھ سے دریافت کیجئے، وہ یہی کہے گا کہ اسے اس کا خدا اور اس کے گرو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ ایک عیسائی حضرت عیسیٰ کو ہر چیز پر مقدم رکھے گا، ایک رومن کیتھولک پوپ کو اور ایک بدھ، گوتم بدھ کو —— پھر یہ الزام آخر مسلمانوں پر کیوں لگایا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح ہر شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان

یا عیسائی یا کسی اور مذہب کا پیرو ہو، گہری مذہبیت کے ساتھ سچا وطن دوست بھی ہو سکتا ہے۔
...... ہر اس ملک میں جہاں کے لوگ خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں صرف مذہب کے عقائد اور اصول ہی میں جو ہر حال میں قومیت سے بلند اور ماورا رہتے ہیں۔ حب الوطنی اور اچھی شہریت کی تعلیم دینا مبہم اور غیر متعین قومیت کا راگ الاپتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ قومی ریاست کا نظریہ ایک نیا نظریہ ہے جو اٹھارویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا۔ ایشیائی قوموں نے اپنے قومی دور کا افتتاح ترکی میں کمال اتاترک، مصر میں سعد زغلول، ہندوستان میں گاندھی جی اور چین میں سن یات سن کی قیادت میں اس صدی کے آغاز میں کیا۔ یہاں ریاست اور قومیت میں یکسانیت پیدا ہونے کافی وقت لگے گا۔

قومی ہم آہنگی اور مسلمان

یہ محسوس کیا جاتا ہے اور صحیح محسوس کیا جاتا ہے کہ ایک طرف ہندوؤں کی مختلف ذاتوں اور ان ذاتوں کی مختلف شاخوں اور دوسری طرف ہندوؤں اور اقلیتوں اور آخر میں مختلف ریاستوں، علاقوں اور لسانی خطوں میں ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے کی فوری اور شدید ضرورت ہے۔ ان طبقوں اور علاقوں کے متحد نہ ہونے کی صورت میں ملک کا شیرازہ بکھر جانے کا اس سے کہیں زیادہ خطرہ ہے جتنا کہ تنہا ہندو مسلم اختلاف کے باعث۔ میکرز دیک ہم کو ان سب لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہیے جو ہندوستانی معاشرہ میں ایکتا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل مسلم نوجوان اگر اسے صحیح دینی تعلیم و تربیت ملے، اس کام کے لئے بہت موزوں ثابت ہو گا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اسے ذات پات کے تعصبات، چھوت چھات اور علاقائی تنگ نظری وغیرہ سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔ لیکن حکومت ہند کے قومی ایکتا کمیشن (NATIONAL INTEGRATION COMMISSION) کو وسائل و ذرائع کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی آبادی مختلف معاشرتی گروہوں پر مشتمل ہے جو مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف رواج رکھتے ہیں اور مختلف مذاہب کی پیروی کرتے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے مخصوص تہذیبی ورثہ پر فخر ہے۔ یہ سارے مختلف گروہ بنیادی اکائیاں ہیں جو ملکر ہندوستانی قوم کی تشکیل کرتی ہیں۔ اگر ان کو جمہوری طرز پر پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے تو

ہندوستانی قوم خود بخود عملی شکل میں آجائے گی، لیکن اگر اس کا شائبہ بھی ہوا کہ جن سنگھی ذہنیت کے ماتحت ان کو کچل ڈالنے، بدل ڈالنے، یا ضم یا جذب کر لینے کے منصوبہ پر چلا جا رہا ہے تو ان گروہوں اور علاقوں کے درمیان فاصلہ اور بڑھ جائے گا۔ اہل ملک کی جذباتی ہم آہنگی مختلف معاشرتی گروہوں کی خواہش اور مرضی کے خلاف ہو کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ دنیا کے موجودہ حالات میں پولیس ایکشن کے ذریعہ بھی اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مکمل تہذیبی خود اختیاری صحت مند ہندوستانی قومیت کی تشکیل اور ترقی کے لئے اولین شرط ہے جس میں تمام حصہ لینے والے عناصر کی خصوصیات واضح اور نمایاں ہوں۔

دوسرے ممالک میں بھی اقلیتیں پائی جاتی ہیں۔ مصر میں قبطی، عراق میں کُرد، شرقِ اردن میں عیسائی بستے ہیں اور وہ سب بہت باعزت اور پُرامن زندگی بسر کر رہے ہیں ــــ پروٹسٹنٹ، رومن کیتھولک، کویکرس (QUAKERS) اور آزاد خیال (PRESBYTARIANS) اور (METHODISTS) سب برطانیہ میں مل جل کر زندگی گذارتے ہیں اور اپنے اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہیں نسلی طور سے اہل برطانیہ، انگلینڈ، آئرلینڈ اور ویلس کے باشندوں پر مشتمل ہیں۔ فرانسیسی، جرمن اور اطالوی جو ایک دوسرے سے اپنی زبان، روایات تاریخ وغیرہ میں بہت مختلف ہیں، سوئٹزرلینڈ کے باشندے بن گئے ہیں۔ امریکن قوم یورپ کے تمام لسانی، نسلی اور تاریخی عناصر پر مشتمل ہے۔ نیگرو اور وہاں کے اصل قدیم باشندے اس کے علاوہ ہیں۔ یہی معاملہ اور دوسرے ممالک میں بھی نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی دستور میں "قوم" کا لفظ کہیں نہیں ملتا۔ اس کے بجائے "شہری" کا لفظ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔

ان تمام مختلف عناصر کو متحد کرنے کے لئے جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں تو قومی ایکتا کمیشن کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ایسے طریقے اختیار کرے جو طریقے سمپورنانند گورنمنٹ نے یو۔پی میں استعمال کئے تھے۔ وہ درسی کتابیں جو اس دورِ حکومت میں تیار کی گئیں، اس درجہ ناقص تھیں کہ حکومت کو ان کا جائزہ لینے کے لئے پالیوال کمیٹی مقرر کرنا پڑی۔ سمپورنانند گورنمنٹ نے غالباً یہ اشارہ فرانس کی اس پالیسی سے حاصل کیا تھا

جو اس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد (ALSACE-LORRAINE) کے لوگوں کو جذباتی طور پر اپنانے کے لئے اختیار کی تھی۔ چنانچہ اس صوبہ کے بچوں کے اسکولوں تک میں اس نے اپنے سپاہیوں کے نمونہ پر بنے ہوئے کھلونے، قومی جھنڈے اور تمغے وغیرہ بڑی تعداد میں بھیجے تھے، بعد میں نازیوں اور فاشستوں نے بھی اسی قسم کے طریقوں سے پورا فائدہ اٹھایا، ڈکٹیٹری طرز حکومت والے ممالک اپنے یہاں کے مختلف تہذیبی عناصر کو ذہنی غسل (BRAIN WASHING) دیگر ادوار ان کو اپنے عقیدہ کے سانچہ میں ڈھالکر (INDOCTRINATION) پہلے ان کی انفرادیت ختم کرتے ہیں پھر ان کو نگل جاتے ہیں۔ یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "باقی تمام اقدار کو چھوڑ کر محض قومی اقدار پر خصوصیت کے ساتھ حد سے بڑھا ہوا اصرار اپنی قوم کے بارہ میں ایک غرور آمیز اور بے تکان بڑائی اور اہمیت کا احساس پیدا کر دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دوسروں کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اسی جارحانہ اور توسیع پسند قومی جذبہ کی وجہ سے مختلف گروہ اور طبقے، اور خاص طور پر اقلیتیں خود اس مقصد یعنی قومی ہم آہنگی کی طرف سے مشکوک ہونے لگتے ہیں، جسے انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر شخص چاہتا ہے۔ اخبار "پانیر" (THE PIONEER) لکھنؤ نے اپنی ۱۴ مئی سنہ ۶۱ء کی اشاعت میں صحیح لکھا ہے کہ:۔

"سرکاری زبان کی آڑ لے کر ہر صوبہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اقلیتوں کو روزگار اور پیشوں سے بالکل بے دخل کر کے رکھدے اور اس کے تعلیمی اور ثقافتی ورثہ کا خاتمہ اس طرح کر دے کہ نہ کوئی رونے والا ہو نہ ماتم کرنے والا۔ کیڑے مکوڑے بھی جب حد سے زیادہ پریشان کئے جاتے ہیں تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

دنیا کی تمام حکومتوں نے اقلیتوں کے حقوق تسلیم کئے ہیں۔ مجلس اقوام متحدہ (U.N.O.) نے بھی ہمارے حقوق کی حفاظت کا یقین دلایا ہے۔ پھر بھی یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ ہندوستان میں جب بھی کسی اقلیت نے اکثریت کے برتاؤ سے غیر مطمئن ہو کر اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھائی ہے تو اس کو غدار، بتایا گیا ہے، اس کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اسے

شدید ناانصافی اور بدظنی کا ہدف بنایا گیا ہے۔ اس طرح قومی ایکتا کمیشن کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے اکثریت اور خاص طور پر اس کے ذہین، تعلیم یافتہ اور اونچی ذات والے طبقہ کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا کرے، ہم نے ابھی کچھ ایسے ملکوں کے نام لئے تھے جہاں نسلی، لسانی اور مذہبی اعتبار سے مختلف فرقے آباد ہیں اور جہاں اکثریت نے اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور اس بات کا یقین دلانے کی خاطر کہ ان کو کسی بات کا اندیشہ نہ ہونا چاہئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ان ممالک کو نمونہ بنا کر یہاں بھی مفید نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ان ملکوں کی اقلیتوں سے مادر وطن سے وفاداری کا ثبوت کبھی نہیں طلب کیا جاتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں طریقہ ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں یہ کہہ کر آپکے خیالات کی ترجمانی کروں گا کہ قومی ہم آہنگی ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے مگر تنہا مسلمانوں کو اس کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہئے۔ جذب کرنے اور ضم کرنے کی تمام کوششوں کی کڑی نگرانی کرنے کی ضرورت ہے۔

(بقیہ افتتاحی تقریر صـــ ۱۶)

توجہ کی ضرورت ہے، مجھے بعض جگہ اس کا احساس ہوا کہ کام میں لوگ شریک ہیں لیکن اس تحریک کو سمجھنے کے لیے جو ایک اہم کتاب ہے "دینی تعلیمی تحریک" اس کو ان لوگوں نے بالکل نہیں دیکھا ہے، میں بغیر کسی تکلف کے عرض کرتا ہوں کہ ہر ضلع کے نمائندوں کو اس کتاب کو خود پڑھنا اور دوسروں کو پڑھوانا ضروری ہے، یہ کتاب اس لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمارے قلم سے نکلی ہے بلکہ اس تحریک کے مزاج اور فکر کو سمجھانے میں بڑی حد تک مفید ہے۔

آخری چیز یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تحریک کو ہم اسلام کے احیاء اور ہندستان کے خاص حالات میں اسلامی شعور کی بیداری کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس چیز سے تحریک کا گو براہِ راست تعلق نہ سہی لیکن بالواسطہ گہرا تعلق ہے۔ اور اس کے پروگراموں کے ذریعہ کانفرنسوں اور جلسوں کے سبب عوام میں ایک بیداری اور احساسِ شعور پیدا ہوتا ہے، اس کی قدر کرنے اور اہمیت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اس کانفرنس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں۔ آمین۔

خطبۂ صدارت

(از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی ــــــــــ

حضرات :۔

وقت کے اہم ترین مسئلے نے ہم کو آپ کو پچھلے کام کا جائزہ لینے اور آئندہ کے لئے نقشۂ کار مرتب کرنے کے لئے دوبارہ جمع کر دیا ہے۔ وقت کی نزاکت اور کام کی وسعت کا تقاضا ہے کہ رسوم و روایات کی پابندی کے بغیر ہمارا سارا وقت اصل موضوع پر صرف ہو اور مغز کی بات بغیر کسی تمہید و تکلف کے شروع کر دی جائے۔

صاحبو! کسی سیدھی سی بات اور کسی مسلّم حقیقت کو نقصان پہونچانے کا دانشمندانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو علمی مسئلہ اور پیچیدہ فلسفہ بنا دیا جائے۔ مسلمانوں کا اپنے بچّوں کے لئے ایسی تعلیم کا انتظام کرنا جو ان کے اندر اسلامی شعور، اسلام کے اُصول و عقائد پر یقین، اور اسلامی سیرت اور صفات سے متصف ہونے کی آمادگی اور صلاحیت پیدا کرے، کیوں ضروری ہے؟ نیز ایسا نظامِ تعلیم کیوں ان کے حق میں سم قاتل ہے جو ان کے بنیادی عقائد سے متصادم اور دوسرے متوازی عقائد کا داعی و مبلغ ہو، جو ان کا رشتہ اسلام کی عالم گیر تہذیب اور دنیا کے بین الاقوامی ابراہیمی کنبے سے قطع کرتا ہو؟ اور اگر ایسا نظامِ تعلیم کسی ایسے ملک میں جہاں انھوں نے رہنے کا فیصلہ کیا ہے کسی منصوبے کے ماتحت یا محض نادانستگی اور غفلت میں رائج ہو تو یہ صورت حال

کیوں ان کے لئے شدید ترین تشویش اور بے چینی کا باعث اور ان کی موت وزندگی کا مسئلہ بن جاتا ہے؟

یہ ایک نہایت واضح اور بدیہی مسئلہ ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی بڑی ذہانت اور کسی وسیع علم اور مطالعہ کی ضرورت نہیں اس کے لئے محض اس رشتے اور تعلق کا جان لینا کافی ہو جو مسلمان اور اسلام کے درمیان ہے۔

حضرات!

جس طرح ہماری اس دنیا میں بعض انسانی گروہ نسل ونسب یا ملک وطن کے اتحاد، زبان وتہذیب کے اشتراک، یا مشترک دشمنی اور مشترک اغراض وخطرات یا سیاسی شعور وغیرہ کی بنیادوں پر وجود میں آتے ہیں اور وسعت وتنظیم کے بعد قوموں کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، اسی طرح کچھ انسانی گروہ اور مجموعے ہوتے ہیں جن کا دارومدار کسی عقیدے اور کچھ مابعدالطبیعی (غیبی) حقائق کے تسلیم وقبول پر ہوتا ہے، یہ عقیدہ اور یہ مسلمات اس پورے گروہ کی عمارت کا سنگ بنیاد ہوتے ہیں وہ اس کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روح انسانی جسم میں رکھتی ہے، اس روح کا اخراج اس کے قتل کے مرادف اور اس کو نقصان پہونچانا اس کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے خواہ دانستہ ہو، خواہ نادانستہ۔

مسلمانوں کا تعلق دراصل انسانی گروہوں اور مجموعوں کی اسی دوسری قسم سے ہے اس ملت کا وجود محض ایک عقیدہ اور چند دینی حقائق کی بنیاد پر عمل میں آیا ہے جو اس کے ایمان ویقین کے مطابق اپنے اپنے وقت میں خدا کے پیغمبر لے کر آئے اور اس تکمیل وتفصیل کے ساتھ خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ اس امت کا اس عقیدے سے تعلق ایسا واضح اور مستحکم ہے، اور اس کا وجود اس حقیقت سے ایسا مربوط و دائمی ہے کہ اللہ ورسول نے اسی عقیدہ کی تصدیق اور تعمیل کو اس کا قومی لقب اور اجتماعی نام قرار دیا اور اس کے سچے پیرووں نے اسی نام سے اپنے کو پکارا اور کسی نسل یا ملک یا شخصیت سے انتساب پر اپنی اجتماعی زندگی اور شہرت کی بنیاد نہیں رکھی اور اس کو اپنے نام کا جزو نہیں بنایا دنیا میں ایک بڑی مذہبی قوم یہود یا بنی اسرائیل یا اسرائیل (ISRAEL) کہلائی، جو ایک

واجب التعظیم شخصیت یہودا یا اسرائیل (یعقوب) کی طرف نسبت ہے، دوسری ایک عظیم الشان مذہبی قوم کی شہرت عیسائی، مسیحی، کرسچین (CHRISTIAN) یا نصاریٰ کے ناموں سے ہے۔ عیسائی، مسیحی اور کرسچین تینوں ایک برگزیدہ پیغمبرانہ شخصیت (حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف نسبت ہے، نصرانی یا نصاریٰ اس شہر ناصرہ (NAZARETH) کی طرف نسبت ہے جس کو حضرت مسیح علیہ السلام کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، خود ہمارے ملک کے قدیم باشندوں نے مذہبی طور پر ہندو کہلانا پسند کیا اور دنیا میں اسی نام سے شہرت پائی جو ایک ملک کی طرف نسبت ہے۔

اس کے برخلاف مسلمان کا مستند نام "مسلم" اور اس ملت کا نام "امت مسلمہ" ہے جس کے معنی خدا کے فرماں بردار یا اسلام کے پیرو کے ہیں۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج ۱۰۶)	اس نے تمھارے لئے وہی دین تجویز کیا جو تمھارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اسی خدا نے اگلی کتابوں میں پہلے سے تمھارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی۔

مسلمانوں کو اپنے پیغمبر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات گرامی سے جو شیفتگی اور جو عقیدت اور محبت ہے وہ دنیا میں ضرب المثل اور مذاہب و اقوام کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اسی طرح گہوارۂ اسلام عرب کی سرزمین اور اس کے دو محبوب شہروں مکہ اور مدینہ سے جو روحانی اور ذہنی وابستگی ہے وہ کبھی محتاج تشریح نہیں، لیکن اپنے تعارف اور امتیاز کے لئے انھوں نے ان محبوب مرکزوں میں سے کسی کی طرف نسبت کو اپنے نام کا جزو اور اپنا قومی لقب نہیں بنایا اور ہر دور میں صرف "مسلم" کہلائے۔

اس حقیقت سے آپ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مسلمان فرد یا جماعت کی زندگی میں اسلامی عقیدے، اس پر مضبوطی اور اس کے ساتھ وفاداری کو کیا مقام حاصل ہے، اور اس کا اس کی روح، اس کے ذہن و دماغ کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے، مسلمان کا ہر زمانہ اور ہر مقام پر اس عقیدے کے ساتھ وابستہ رہنا اور اپنی زندگی میں اس کا اظہار کرنا کس قدر

ضروری ہے، اس بات کا نتیجہ ہے کہ اسلام کو بحیثیت نظام اور مسلمانوں کو بحیثیت جماعت اپنا عقیدہ اور اپنے مسلّمات اتنے عزیز اور ان کی نظر میں ان کی بقا اور ان کی سالمیت (INTEGRETY) اتنی اہم اور ناگزیر ہے کہ وہ اس پر اپنے عظیم ترین مصالح اور اپنے عزیز ترین افراد کو قربان کر سکتے ہیں، جس طرح اسلام اپنی عالمگیر دعوت اور اپنے بین الاقوامی تعلقات میں نہایت فیاض اور وسیع القلب ہے وہ اپنے عقائد اور حدود کی حفاظت میں نہایت خوددار اور غیور واقع ہوا ہے، بنیادی عقائد کے بارے میں وہ کسی عزیز سے عزیز فرد کے لئے اور کسی نازک سے نازک نفسیاتی آزمائش میں بھی کسی رعایت، لوچ یا خود فریبی کے لئے تیار نہیں، خاص طور پر توحید کا عقیدہ اس کے دینی نظام میں ایسی اہمیت اور نزاکت رکھتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی اس پر بال آنا گوارہ نہیں کر سکتا۔

انسان کے لئے سب سے بڑی آزمائش کا موقع وہ ہے جب اس کے نفس کے ساتھ یا اس کی اولاد، یا اس کے عزیز ترین افراد کے ساتھ اظہار تعلق کے ضمن میں کوئی گمراہی یا غلطی شامل ہو، بڑے سے بڑے قانونی اور اصولی انسانوں نے ایسی غلطی کو معاف کر دیا ہے جس کے ساتھ نفس کی خاموش سفارش یا کسی عزیز کا معصوم و محبوب چہرہ ہو، پھر جب اس عزیز کی مفارقت کے تازہ داغ نے اسکی محبوبیت و دلآویزی میں ہزار چند اضافہ کر دیا ہو تو پھر تو محبت اور غم میں ڈوبی ہوئی فضا پکار پکار کر کہتی ہے کہ

جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

لیکن توحید کا مسئلہ ایسا نازک اور اسلام کا مزاج اس کے بارے میں ایسا غیور واقع ہوا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم کی وفات کے عین موقع پر سورج گرہن ہوا اور صحابۂ کرام کی زبانوں پر بے اختیار یہ آنے لگا کہ آج سورج بھی فرزند رسولؐ کے سوگ میں سیاہ پوش ہو گیا ہے، تو نبوت کی پُرجلال آواز بلند ہوئی۔

ان الشمس والقمر آیتان من	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں
آیات اللہ لا یخسفان لموت	سے دو نشانیاں ہیں ان کے گرہن کا
احد ولا لحیاتہ فاذا رایتم	تعلق کسی کے مرنے جینے سے کچھ نہیں،

ذالك فاذكر والله. جب ایسا موقع پیش آئے تو اللہ کو
(صحیحین) یاد کرو۔

دوسرا نازک موقع وہ ہوتا ہے جب آدمی کی تعریف اور اس کے ساتھ اظہار عقیدت کیا جائے، اس موقع پر بھی بڑی سے بڑی عقلِ اصول پرست چشم پوشی اور خاموشی کا فتویٰ دیتی ہے لیکن جب ایک صحابی نے جو ایک عیسائی ملک سے تازہ تازہ واپس آئے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اپنے پیشواؤں کے سامنے اظہار عقیدت میں سجدہ کرتے دیکھا تھا آپ کے لئے سجدہ کی اجازت طلب کی تو آپ نے سختی سے منع فرمایا، اسی طرح جب ایک موقع پر ایک شخص نے آپ کی تعریف میں حدود سے ایسا تجاوز کیا کہ عقیدۂ توحید پر زد پڑنے لگی تو آپ نے فوراً اس کا منہ بند کر دیا اور فرمایا جعلتني لله ندًّا (تم نے مجھے خدا کا ہمسر ہی بنا دیا؟) سیرت و احادیث میں اس کی اتنی مثالیں ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس نوعیت کا تعلق ہے دوسروں کو اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے ان کے ایمان کے لئے یہ شرط ہے کہ آپ کی ذات گرامی اپنی جان، اپنے والدین، اپنی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہو، یہ مسلمان کا ایسا دینی مزاج ہے جو زندگی کے اختلافات اور عمل کے تفاوت کے ساتھ ہمیشہ اور ہر جگہ قائم رہتا ہے، ان کا احساس آپ کی عزت و ناموس کے بارے میں اتنا نازک اور تیز واقع ہوا ہے کہ اس کا اندازہ بھی غیر متعلق لوگوں کے لئے مشکل ہے، محبت اور تعلق کا یہ وہ مقام ہے کہ جوش و سرمستی میں بڑے بڑے اہل خرد عالی مرتبہ لوگوں نے کہا ہے

نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوئے تو شد بے ادبی

توحید کی بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط پر توازن اور پامردی کے ساتھ گزرتے ہوئے اور فرقِ مراتب کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے امت نے اپنے نبی کے ساتھ جس تعلق کا اظہار کیا ہے اسکی مثال ملنی مشکل ہے، اس امت کا شیرازہ اور گلدستہ بھی محبت و عقیدت کے اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے، اللہ کے پاک نام کے بعد جو نام

دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہے وہ یہی نام ہے اور کہنے والے نے بجا اور غلط نہیں کہا کہ

صبا یہ جا کے تو کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

حضرات!

یہ چند مثالیں میں نے قصداً و ارادۃً اس لئے پیش کی ہیں کہ آپ حضرات کے ذہن میں اور ہمارے غیر مسلم بھائیوں کے علم میں یہ بات پورے طور پر آجائے کہ توحید و رسالت جیسے بنیادی عقائد مسلمان کی زندگی اور اسکی نگاہ میں کیا حیثیت و اہمیت رکھتے ہیں، اسکا مزاج ان عقائد و مسلمات اور اسلام کی روح کے بارے میں کتنا غیور کتنا ذکی الحس (SENSITIVE) اور کتنا بیدار واقع ہوا ہے، وہ اپنے دن رات کے ساتھیوں اور محبت کا دم بھرنے والوں کے ساتھ بھی ان کے بارے میں کسی بے اصولی کسی مداہنت پر تیار نہیں اور اس کے لئے کسی زمانے اور کسی مقام پر بھی کسی مشرکانہ عقیدے یا مشرکانہ فعل یا مشرکانہ رسم کی گنجائش نہیں، ان کا خدا اور رسولؐ کے ساتھ کسی نوعیت کا تعلق ہے؟

پھر یہ بھی واضح ہو گیا کہ مسلمان کا تصور اسلام کے بغیر ممکن نہیں اور اسلام کسی ذات برادری اور کسی قومیت یا وطنیت کا نام نہیں، جس میں انسان کے ارادے اور اختیار کو کچھ دخل نہیں ہوتا، وہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ، ایک پسندیدہ مسلک زندگی اور ایک قبول کیا ہوا عقیدہ ہے جس کے لئے شعور، ارادہ صحیح علم اور کوشش کی ضرورت ہے۔

ایک ایسی ملت جس کا ظہور اور جس کا وجود تمام تر ایک خاص عقیدے اور مسلک زندگی کا رہین منت ہے . . . .

. . . . ایک ایسی تعلیم کے بغیر اس کے وجود و بقا کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اصول و عقائد سے واقفیت پیدا کر سکے، اپنے فرائض کو ادا کرنے کے قابل بنے جو اس دین کے قبول کرنے کی بنا پر اس پر عائد ہوتے ہیں اور ان اعتقادی گمراہیوں اور ان عملی غلطیوں سے محفوظ رہ سکے جن کا (صحیح علم نہ ہونے کی صورت میں) خطرہ ہے، اسلام نے علم کو

جو اہمیت جو عظمت اور جو تقدس بخشا ہے وہ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ

بے علم نتواں خدا را شناخت

اسی لئے قرآن اور تاریخ اسلام میں جاہلیت (غیر اسلام) کی اصطلاح پائی جاتی ہے جس سے جہل کا خطرناک اور مہلک ہونا اور اسلام کے منافی ہونا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے پڑھوں اور ناواقفوں کو علم دین حاصل کرنے اور پڑھے لکھوں اور واقفوں کو پڑھانے اور سکھانے کا پابند کیا اور دونوں طبقوں کو اپنا اپنا فرض نہ ادا کرنے پر وعید فرمائی اور اس دنیا میں وبال اور آخرت میں عذاب سے ڈرایا، اسی بنا پر مسلمانوں کو ایسے ماحول میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی جہاں اس ضروری علم اور واقفیت کے حصول کے ذرائع مفقود اور اسکے مطابق زندگی گزارنے کی راہ مسدود ہو، یہی ہجرت کے حکم ... ... کی غرض وغایت اور اسکی روح ہے اسی بنا پر ضروری قرار دیا گیا کہ ہر قریہ اور ہر شہر میں سے کچھ لوگ کسی دینی علمی ماحول میں جاکر دین کی سمجھ حاصل کریں تاکہ وہ اپنے اہل وطن کی دینی تعلیم اور واقفیت کا انتظام کریں، ان کو آخرت کے خطرات سے ڈرائیں اور ناواقفیت اور جہالت کے اثرات سے بچائیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا	اور مومنوں کو نہ چاہیئے کہ سب کے سب
كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ	نکل کھڑے ہوں، یہ کیوں نہ ہو کہ ہر
فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ	گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا
لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ	ہوا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل
وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا	کریں اور اپنی قوم کو ڈراتے
رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ	رہیں جب ان کے پاس
يَحْذَرُونَ ۱۲۲ (البراءۃ)	واپس آجائیں عجب کیا کہ وہ محتاط رہیں۔

اسی بنا پر خلافت راشدہ میں (حسب تعلیم و تربیت کے ذرائع مہیا ہوئے) ہر مسلمان کی ضروری دینی واقفیت اور تعلیم کا انتظام کیا گیا اور امراء وعمال حکومت کو گشتی فرمان

جاری ہوئے کہ اسلام کے قلمرو میں کوئی مسلمان بنیادی دینی تعلیم سے محروم اور ان ضروری دینی معلومات سے بے بہرہ نہ رہے جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہیں یہ ایک طرح کی جبری دینی تعلیم تھی جس کا دائرہ نابالغوں تک محدود نہ تھا، بلکہ بالغین بھی اس کے پابند تھے اس شخص کی تادیب وتنبیہ کی جاتی تھی جو بقدر ضرورت بھی دینی معلومات نہ رکھتا ہو اور اتنا قرآن مجید بھی اسکو یاد نہ ہو جس سے وہ نماز ادا کرسکے اس کو ایک خاص مدت کے لئے مہلت دی جاتی تھی کہ وہ اپنی اس کمی کو پورا کرلے، پھر اس کا امتحان لیا جاتا تھا، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد میں آپ کو اسکی نمایاں مثالیں ملیں گی، یہ سب اس شعور و یقین پر مبنی تھا کہ بنیادی اسلامی تعلیم کے بغیر اسلام اور مسلمان کا وجود ممکن نہیں، اگر مسلمان بننا اور مسلمان رہنا ہے تو اسلام کے عقیدے سے ضروری حد تک واقفیت اور اس کے ارکان فرائض ادا کرنے کی قابلیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

حضرات!

کسی ملک کے مسلمانوں کا خواہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں اولین اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے بالغین کی دینی واقفیت اور بچوں کی دینی تعلیم کا کیا بندوبست کیا ہے؟ میں اپنے محدود مطالعہ اور دینی واقفیت کی بنا پر یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ یہ مسئلہ ان کے تمام قومی مسائل سے مقدم اور اہم ہے یہ ان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے یہ ابدی نجات یا ابدی ہلاکت کا سوال ہے اور ان کو عقل و ہوش کی پہلی فرصت میں طے کرنا پڑے گا کہ وہ ان دونوں میں سے کس راہ کا انتخاب کرتے ہیں؟ اگر وہ ابدی نجات کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو یہ ضروری دینی علم کے بغیر عملاً ممکن نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت (خواہ اجمالی ہو) بنیادی اسلامی عقیدے کا علم، توحید سے وابستگی اور شرک سے دوری پیدا ہو، اگر ان کے نزدیک نجات و ہلاکت اور ہدایت و ضلالت کے مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں اصل مسئلہ معاشی یا سیاسی ہے اور اصل فکر و اہتمام کی چیز بچے کی وہ تعلیم ہے جو اس کو اپنی معاشی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کا اہل بنا سکے خواہ اس کا عقیدہ، اسکی سیرت کچھ ہو اور خواہ دوسرے عالم میں اس کا کچھ انجام ہو تو پھر

ان سے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں اس لئے کہ ایمان کی جس بنیاد پر یہ ساری گفتگو ہے وہ یہاں سرے سے مفقود ہے۔

حضرات!

ایک ایسے ملک میں بھی جہاں کوئی متوازی اور جارحانہ نظام تعلیم موجود نہ ہو، جہاں بچوں کی سادہ تختی پر اسلامی تعلیم کے نقوش ثبت کرنے کی پوری سہولت اور گنجائش ہو یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام اور اپنی آئندہ نسلوں کے اسلام پر قائم رکھنے کا اطمینان حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں اور ان کو ایک دن کی تاخیر اور ایک لمحے کے التوا کے بغیر وہ تمام تدبیریں اور وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو اس مقصد کے حصول کے لئے مفید اور ضروری ہوں۔

لیکن اس ملک میں ان کی ذمہ داری دوہری اور نہایت شدید ہو جاتی ہے جہاں لازمی طور پر کوئی ایسا نظام تعلیم ونصاب تعلیم جاری ہو جو اسلام کے بالمقابل عقائد کی تعلیم دیتا ہو اور جس کے مضامین اور مندرجات توحید و رسالت کے بنیادی اسلامی عقائد کے منافی اور وہ شرک و ثنویت کے علانیہ داعی اور مبلغ ہوں، جہاں مسلمان بچے بھی کسی دوسری مذہبی قوم کی دیومالا (MYTHOLOGY) پڑھنے پر مجبور ہوں جس کا یقین کرنے سے کوئی مسلمان تاویل وتکلف کے ساتھ بھی مسلمان نہیں رہ سکتا، جہاں مسلمانوں کی اس محبوب شخصیت کا جس کی محبت وتعظیم مسلمانوں کا ایمان ہے تذکرہ و تعارف ایسے نازیبا اور خلاف واقعہ انداز میں کیا جائے جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی روحانی اذیت اور ایمانی خطرہ ہے، جہاں مسلمانوں کی تاریخی شخصیتوں کو ایسے حقیر و داغدار طریقے پر پیش کیا جائے کہ مسلمان بچوں میں ان کی حقارت اور اپنے ماضی سے نفرت پیدا ہو، جہاں مسلمانوں کو جو اس ملک کے برابر کے شہری اور ہندوستانی جمہوریہ کا ایک ضروری عنصر ہیں ان الفاظ سے یاد کیا جائے جو پردیسیوں، نیچ ذات اور ملچھ اقوام کے لئے بولے جاتے ہیں[1]۔ ایسے حالات میں مسلمانوں پر

---

[1] یہ سب سرکاری نصاب تعلیم کے مضامین سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ "دینی تعلیمی تحریک" (باقی صفحہ ۳۲ پر)

دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک اس نا مناسب صورت حال کی اصلاح و تبدیلی کی کوشش دوسرے جب تک وہ قائم ہے اس کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان، اور خواہ وہ قائم رہے یا دور ہو جائے دونوں حالتوں میں مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم کا مستقل بندوبست۔

حضرات!

ایک حساس و غیور مسلمان کی حیثیت سے اس سخت قابل اعتراض نصاب تعلیم کے لئے کسی تاویل اور معذرت پر ضمیر اور زبان آمادہ نہیں، اور ایک آزاد نا مذہبی جمہوریہ جس نے آبادی کے تمام عناصر کو اس ملک کا برابر کا شہری تسلیم کیا ہے اور باعزت اور آزاد زندگی گذارنے اور پھلنے پھولنے کے تمام وسائل و مواقع یکساں طریقہ پر عطا کئے ہیں ایسے جارحانہ (AGGRESSIVE) نصاب کے ایک دن باقی رکھنے کا جواز نہیں، اس ملک کے ساتھ سب سے بڑی وفاداری اور خیر خواہی یہ ہے کہ جلد سے جلد ہندوستان کی جمہوری روح اور نا مذہبی ریاست اور آئین کے خلاف اس تضاد کو رفع کیا جائے اور ہندوستان کی جمہوریت کے چہرے کے اس بدنما داغ کو دھو دیا جائے اور اس کے لئے وہ تمام مؤثر و مناسب ذرائع اختیار کئے جائیں جو ہماری دسترس میں ہیں اور جن کی نہ صرف قانون نے اجازت دی ہے بلکہ ہندوستان کی جمہوری روح اور اس کے ساتھ وفاداری کا عہد ہم سے اس کا مطالبہ کرتا ہے اور ہمیں اس کا پابند بناتا ہے۔

اس سب کے ساتھ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اس میں ہماری اس کوتاہی کو بھی دخل ہے کہ ہم نے برادران وطن اور محکمۂ تعلیم کے ذمہ داروں پر ابھی تک واضح نہیں کیا ہے کہ مسلمان و اسلام کا رشتہ کس نوعیت اور کس درجہ کا ہے؟ ہمارے ہم وطن اور نصاب کے واضعین و مرتبین اپنے ذاتی و مذہبی تجربوں کی بنا پر اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسلمان کے احساسات

(بقیہ حاشیہ صلا) کا مضمون فرزندان توحید کو شرک کی تعلیم از مولوی عتیق الرحمٰن، نیز مضامین مولوی فدا حسین صاحب "آزادی کی بہاریں" نیز ملاحظہ ہو وہ یادداشت جو دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے وفد نے گورنمنٹ یوپی کی مقرر کردہ اصلاح نصاب کمیٹی کے صدر پالیوال جی کی خدمت میں پیش کی۔

دینی عقائد کے بارے میں کتنے نازک واقع ہوئے ہیں، توحید کا عقیدہ اور رسولؐ کی شخصیت سے تعلق ان کے لئے کیا بنیادی اہمیت رکھتا ہے؟ اور اس سے محروم ہونے یا اس کو خطرہ میں ڈالنے کے بعد ان کا وجود کسی بھی ملک میں ان کے لئے کتنا ناخوشگوار اور دشوار ہو جاتا ہے؟ وہ ایسی حالت میں ایسے شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں گے کہ اس ملک کے تعمیری کاموں میں خوش دلی اور گرمجوشی سے حصہ نہ لے سکیں گے، یقیناً ہمارے ملک ہندوستان کا دستور آبادی کے کسی عنصر اور ملک کے کسی فرقے کو اسکی ان خصوصیات اور آزادیوں سے محروم نہیں کرتا جو اس کو اپنی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز ہیں ـــ

. . . . یہ بات سب کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے کہ کسی فرقے کو بھوکا، پیاسا یا دست وپا بریدہ حالت میں رکھنا، اس کو شہری حقوق دینے اور ملک کا باشندہ تسلیم کرنے کے ہرگز مرادف نہیں، کوئی آئینی حکومت اور کوئی آزاد جمہوریہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی، ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیئے (اور ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کے مستند نمائندوں کے متفقہ بیان پر ارباب حکومت کو باور کرنا چاہیئے) کہ مسلمانوں کے لئے اپنی آئندہ نسلوں کو مذہبی اور تہذیبی ارتداد کے خطرے میں مبتلا کرکے اور ان کے بنیادی عقائد کو متزلزل، اور غیر اسلامی عقائد ان پر مسلط کرکے زندہ رہنا اس صورت حال سے قطعاً مختلف نہیں جس کا میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے، بلکہ ایک گنہگار مسلمان کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی حیثیت سے مفلوج و مسخ شدہ زندگی گذارنا اور اپنی آئندہ نسل کی اسلامیت سے محروم رہنا، بھوکے پیاسے رہنے سے زیادہ سنگین واقعہ ہے، یہ ایمان کا ابتدائی تقاضا اور اسلامیت کا اجماعی فتویٰ ہے جس میں میں نے کسی مبالغہ یا شاعری سے کام نہیں لیا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہ صورت حال واضح اور مسلمانوں کا یہ احساس ثابت ہو جائے تو اسکی اصلاح میں کچھ دیر نہیں لگے گی، اور اگر ایسا نہیں ہے (اور میں اسکو فرض کرنے کے لئے بھی تیار نہیں) تو ہندوستان کو اپنے اس مقام اور احترام سے دستبردار ہونا پڑے گا جو اس کو دنیا کی جمہوری حکومتوں اور بین الاقوامی صف میں حاصل ہے۔

حضرات!

ہم نے اس ملک میں اپنی ملی خصوصیات، اپنے پورے دینی عقائد اور اسلامی تہذیب کے ساتھ رہنے کا عزم کیا ہے، یہ ملی خصوصیات، یہ دینی عقائد، اور یہ اسلامی تہذیب آب و گل اور گوشت و پوست کے تمام رشتوں اور علاقوں سے زیادہ عزیز ہے، یہ ایمان کا طبعی تقاضا، اور بنیادی مطالبہ ہے، اسکے بغیر ہم ایمان کے وصف اور خدا کی مدد کے مستحق نہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَ
أَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ
وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا
وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ
إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا
حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ۔

(التوبۃ - ع ۳)

اے پیغمبر! مسلمانوں کو سمجھا دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں، اور تمھارے کنبے دار، اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے مندھے پڑجانے کا تم کو اندیشہ ہے اور مکانات جن میں رہنے کا تمھارا جی چاہتا ہے، اگر یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول، اور اللہ کے رستے میں انتہائی جد و جہد کرنے سے تم کو زیادہ عزیز ہوں تو ذرا صبر کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمھارے سامنے لاموجود کرے اور اللہ ان لوگوں کو جو اس کے حکم سے سرتابی کریں ہدایت نہیں دیا کرتا۔

ہم اپنے عقیدے اور دین کی رو سے اس فیصلے کے لئے مجبور تھے اور ہم کو بہرحال یہ فیصلہ کرنا تھا۔ اور ہر قیمت پر اس فیصلے پر قائم رہنا ہے لیکن خوش قسمتی سے اس ملک کا دستور بھی اسکی اجازت دیتاہے، وہ ہندوستان کو مختلف فرقوں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کا ملک تسلیم کرتا ہے اور نہ صرف ان کی بقا، بلکہ ان کے نشو و نما و ارتقاء کی ضمانت کرتاہے،

اگر اس ملک میں صرف ایک عقیدہ اور تہذیب یا صرف اکثریت کے عقیدے، فلسفے اور تہذیب کی گنجائش ہے تو فرقوں (COMMUNITIES) اور اقلیتوں (MINORITIES) کے سیاسی و دستوری اصطلاحات کے کیا معنی ہیں؟ جس طرح کسی بیرونی طاقت یا قوم کی بالادستی اور استعماریت (IMPERIALISM) کو موجودہ جمہوری دور جائز نہیں قرار دیتا، اور اگر وہ کسی ملک میں موجود ہے تو اسکے خلاف جنگ جائز اور مقدس ہو اسی طرح کسی ملک کے اندر کسی فرقے، کسی زبان، کسی تہذیب کو کسی دوسرے فرقے کسی زبان اور تہذیب پر حکومت کرنے یا اس کو مٹا دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، یہ اعتقادی تہذیبی، لسانی سامراج، سامراج کی بدترین قسم ہے، ہندوستان کا غیر مذہبی دستور، ہندوستان کی جمہوری روح، ہندوستان کی جنگ آزادی کی عظمت وسعت، ہندوستان کا صلح پسند مزاج، ہندوستان کا حساس و بیدار ضمیر کسی کوتاہ اندیشی، کسی مجرمانہ سازش کسی فرقے وارانہ عصبیت اور کسی تہذیبی ولسانی سامراج کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کرسکتا، اور بالآخر عقل کی جذبات پر، علم وحقیقت کی اوہام وتخیلات پر، بے غرضی و خیرخواہی کی موقع پرستی اور خود غرضی پر جمہوریت وحریت کی غلامانہ ذہنیت پر فتح ہوکر رہے گی۔

حضرات!

ہم نے جب اس ملک میں اپنی ملی خصوصیات، دینی عقائد اور اسلامی تہذیب کے ساتھ رہنے اور ترقی کرنے کا عزم اور عہد کیا ہے تو ہم نے لازماً اس کی تمام ذمہ داریوں کو بھی قبول کیا ہے، ہمیں ایک ایسے ملک میں جہاں ہم اقلیت میں ہوں اور جہاں کی پچھلی تاریخ کا مطلع غبار آلود ہو عقیدۃً و عملاً مسلمان بن کر رہنے کی نظیر قائم کرنی، اور دوسرے ملکوں کے لئے اعتماد و حوصلہ کی شمع روشن کرنی ہے، ہمیں اپنے جرأت و اعتماد، صلاحیت و قوت کار اور ذہانت واجتہاد

کا ایک نمونہ قائم کرنا ہے، دنیا کے وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اپنے دینی مستقبل کی تشکیل کے کارِ عظیم سے دوچار ہیں، ہماری رہنمائی کے منتظر ہیں، اس لئے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی اسلامی اقلیت ہیں جو کسی ملک میں پائی جاتی ہے، اور ہم نے ماضی میں بارہا عالمِ اسلام کی رہنمائی کی ہے، ہمیں نہ صرف اپنی آیندہ نسلوں کی اسلامیت کا غیر مشکوک اطمینان حاصل کرنا ہے، نہ صرف اپنے دینی مستقبل کی تابناکی کا یقین پیدا کرنا ہے، بلکہ اپنی ذہانت اپنے عبقریت (GENIOUS) اپنی صحیح اور غیر متزلزل حب الوطنی اپنی بے پایاں شرافت اپنی صلاحیت کار، کا غیر فانی نقش قائم کرنا ہے، ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ جو خدا نے ہم کو بخشی ہیں اور اسلام نے ان کی پرورش کی ہے، ہمیں جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے، اور اُس کو چار چاند لگانا ہے، ہمیں دُنیا پر یہ ثابت کرکے کہ ہم اس ملک میں اپنی ملّی خصوصیات اپنے عقائد اور اپنی اسلامی تہذیب کے ساتھ ترقی کرسکتے ہیں دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کرنا اور اس کے جمہوری و لا مذہبی ہونے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنا ہے، نیز یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام میں زمان و مکان کے تغیرات سے عہدہ برآ ہونے، وقت کی مشکلات کو حل کرنے، دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کو یکساں فیض پہونچانے اور بلا تفریق مذہب و ملت انسان کی خدمت کرنے کی کتنی عظیم طاقت و صلاحیت ہے۔

حضرات !!

یہ کانفرنس سفر کا اختتام نہیں، سفر کا آغاز ہے، بے شک ہم نے اپنے سفر کی ایک منزل طے کی ہے ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخوں میں جب ہم بستی میں جمع ہوئے تھے اس وقت تک خدا کی توفیق سے ہم نے کچھ کام کیا، صوبے کے نصف سے زائد اضلاع میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں اور کونسل کا پیغام پہنچانے کے لئے جلسے اور کنونشن ہوئے سرکاری نصاب کی خامیوں اور کوتاہیوں کا چرچا ملک میں عام ہو گیا اور حکومت نے بھی اس کا اعتراف کیا اور اسکی اصلاح کا ارادہ ظاہر کیا، جدید مکاتب کی ایک بڑی تعداد کا قیام اور قدیم مکاتب کی ایک بڑی تعداد کی تنظیم ہوئی، لیکن دراصل ابھی کام کا آغاز ہی ہوا ہے ابھی کام کا پورا میدان پڑا ہوا ہے، کتنے مسائل ہیں جو حکومت اور محکمہ تعلیم کے دائرے میں طے کرنے ہیں ابھی ہمارے پیغام نے قومی نعرے اور مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار نہیں کی، ہمارا کام اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہو گا جب تک مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کو ان کی غذا و دوا سے زیادہ اہم نہ سمجھیں گے اور دینی مکاتب و مدارس کو اسی سنجیدگی اور اسی ذوق و شوق سے قائم نہ کریں گے جس سنجیدگی اور ذوق و شوق سے وہ مساجد کی تعمیر کرتے ہیں (اس لئے کہ ان مساجد کی آبادی ان مکاتب کے بغیر ممکن نہیں) جب تک ہم اس راہ کے مصارف کو اپنا اہم ترین اور مقدس ترین فرض نہ سمجھیں گے اور اس میں صداقت، ذوق اور عشاقی جذبے کے ساتھ حصہ نہ لیں گے، جب تک ہم اس راہ کی کوشش کو عبادت کا درجہ نہ دیں گے۔

ہمارے لئے جو چیز اس کوشش کا محرک ہوئی ہے وہ اس کی دینی حیثیت اور اسلامی اہمیت ہے۔ ضرورت ہے کہ یہی روح ہم سب میں پیدا ہو، یہی روح ہے جس نے تاریخ میں خارق عادت اور محیر العقول کام انجام دیئے ہیں اور یہی روح آج تمام رکاوٹوں اور سارے اختلافات پر غالب آسکتی ہے۔

حضرات !

ریاستوں کے مذہبی فرقہ وارانہ نصاب کی اصلاح اور اس کو حقیقی معنی میں لا مذہبی

(سکولر) بنانے کی آئینی کوشش، ایسے آزاد اسلامی مکاتب کا قیام جن میں حکومت کے مطلوبہ معیار اور مقرر کردہ مضامین (CURRICULUM) کے مطابق پانچویں درجہ تک معیاری تعلیم کا انتظام اور اردو دینیات اور قرآن پڑھانے کا بندوبست ہو، ہمارے جو بچے سرکاری اسکول میں تعلیم پاتے ہیں ان کے لئے ایسے صباحی اور شبینہ مدارس کا قیام جہاں وہ ضروری دینی معلومات اور اردو دینیات سے ضروری واقفیت حاصل کرسکیں، ان سب مدارس کے لئے مناسب معلمین و اساتذہ کی تربیت، اوپر کے درجوں اور عام مسلمان طالب علموں کے مطالعہ کے لئے دینی واقفیت کا، اردو اور ہندی نصاب تیار کرنا اور توسیعی و معلوماتی خطبات کا انتظام کرنا کونسل کے مقاصد و پروگرام میں شامل ہے ہماری نظر میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی اسلامیت کی بقا اور ان میں اس آزاد اور مختلف المذاہب جمہوریہ کے اندر اپنا صحیح پارٹ ادا کرنے اور اس کا تعمیری عنصر بننے کے لئے یہ سب انتظامات ضروری ہیں، اس کے لئے ایک عظیم اور منظم مہم کی ضرورت ہے، اس کے لئے جذبۂ عمل، ذہانت، جرأت خلوص، اور ایثار کی ضرورت ہے، اس کے لئے قومی فیصلے اور عزم کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس کانفرنس سے کام کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا، آپ کونسل اور اس عظیم اجتماع کا پیغام گھر گھر پہونچائیں گے اور پوری قوم میں ایک نئی روح، ایک نیا یقین اور ایک نیا ولولۂ عمل پیدا کردیں گے، اور مدارس و مکاتب کا ایک جال سارے ملک میں پھیلا دیں گے۔

حضرات!

قوموں کے سیاسی و تعلیمی تغیرات، قوموں کے اجتماعی و باہمی تعلقات انسانی گروہوں کی افسردگی و زندہ دلی، زمانہ کے تیور، واقعات کے اشارے، مشکلات کے پہاڑ اور وقت کے دھارے ان میں سے کوئی چیز بھی تقدیر الٰہی اور مشیت خداوندی کی طرح آخری اور مبرم اور لاعلاج و غیر تغیر پذیر نہیں۔ نصرت الٰہی اور اہل ایمان کے صدق و اخلاص اور اہل یقین کے عزم و فیصلہ نے بار ہا ان میں تغیر و انقلاب پیدا کر دیا ہے، اور تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا ہے، زندہ قوموں کی کوئی چیز آخری اور ابدی نہیں، آپ

ایک زندہ اور صاحب عزم قوم کی طرح ہندوستان میں اپنا مقام بنانے، اپنی راہ نکالنے اور ہندوستان کو ایسا آزاد جمہوریہ بنانے کی کوشش کیجئے جو اس کے اعلان اور دستور کے مطابق اور آپ کے حالات اور ضروریات کے مناسب ہو، اپنے اس تعلیمی مسئلے کو اپنے ایمان و یقین، اپنے عزم و فیصلہ، جوش عمل اور ولولہ کار سے حل کرنا ہے۔ اگر آپ نے اس کی شرطیں پوری کر دیں تو ہر مشکل آسان اور ہر عقدہ حل ہے۔

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں انکی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

دینی تعلیمی کونسل اترپردیش لکھنؤ کی اپیل

لکھنؤ کانفرنس کے موقع پر دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کی جو نشستیں ہوئیں اُنمیں کونسل کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ کونسل کے پاس نہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی ہے نہ اُسکے فنڈ میں کچھ موجود ہے۔ ایسی صورت میں کونسل اپنے منصوبوں کے مطابق کس طرح کام جاری رکھ سکتی ہے، جبکہ اس کو ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اور ۱۵ ہزار روپے سالانہ کی لازمی ضرورت ہے۔

کونسل کے نزدیک ضروری ہے کہ اُسکے پاس کم سے کم پچاس ہزار روپے کا فنڈ موجود ہو تاکہ پیش نظر منصوبوں کو پوری یکسوئی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد کی جا سکے۔ اس مقصد کیلئے کونسل نے وفود کے دوروں کی بھی تجویز منظور کی ہے۔ لیکن کونسل کا یہ نشانہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ اہل خیر و اہل درد خود ہی دست اعانت دراز فرمائیں۔ جملہ ترسیل زر اس پتہ پر ہونی چاہئے۔

جناب سید اصغر حسین صاحب ایڈوکیٹ (خازن دینی تعلیمی کونسل اترپردیش) بیسرو روڈ لکھنؤ۔

(مولانا) سید ابوالحسن علی (ندوی) صدر دینی تعلیمی کونسل اترپردیش لکھنؤ

ایک عزم، ایک فیصلہ

اختتامی تقریر

(از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(یہ تقریر مولانا ہی کے الفاظ میں قلمبند کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مولانا کی نظر ثانی کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ مسنونہ کے بعد

حضرات!—— آج کانفرنس کی آخری نشست ہے، آپ حضرات اپنے مقامات پر جائیں گے، میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں سے ایک پیغام لے کر جائیں اور ایک فیصلہ کر کے انھیں، ہمارے آپ کے مستقبل کا انحصار اسی فیصلے پر ہے۔ اس فیصلے کے دو جز ہیں، ایک جز یہ ہے کہ یہ ہندوستان ہمارا ملک اور وطن ہے، اس کو اپنا ملک و وطن سمجھ کر ہمیں یہاں رہنا ہے، اس ملک پر ہمارا وہی حق ہے جو یہاں کے کسی بڑے سے بڑے اور قدیم سے قدیم شہری کا ہو سکتا ہو ہندوستان کا کوئی متنفس اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا حق اس ملک پر ہمارے حق سے زیادہ ہے، صدر جمہوریہ سے

لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار ہندوستانی کا اس سرزمین پر جو حق ہو سکتا ہے، وہی ہمارا حق ہے، اس طرح سے ہم کو یہ ملک عزیز ہو، ہم اس کے اور اس کے جمہوری دستور کے محافظ ہیں، اس دستور کی آبرو کے محافظ ہیں، ہم اس دستور و آئین کے خلاف کوئی بےعنوانی کوئی بے اصولی کوئی سازش برداشت نہیں کرسکتے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ملک اور اس آئین کی حفاظت کریں، اس سرزمین کے چپے چپے پر ہماری تعمیری صلاحیتوں کے نقش اور ہماری لازوال یادگاریں ہیں، ہم نے اس ملک کو وہ عطا کیا ہے جو اس ملک میں بسنے والی قوموں میں سے کسی قوم نے اس کو نہیں عطا کیا۔ ہم نے اس ملک کو ازسرنو بنایا اور سنوارا اور اس ملک کو تمدن و تہذیب آراستگی و شائستگی میں کہیں سے کہیں پہونچا دیا اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ ہماری آمد سے پہلے یہ ملک کیا تھا اور ہماری آمد کے بعد اس ملک کا کیا نقشہ ہو گیا تو بابر کی تزک کا مطالعہ کیجئے جس نے اس وقت کے ہندوستان کی تصویر کھینچی ہے، اس لحاظ سے یہ پورا ملک ہمارا وطن ہے، ہمارا نشیمن ہے، ہمارا چمن ہے، اور ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ع

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصل بہار پر

اس بارے میں ہماری وطنیت اور ہمارے شہری حقوق کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا، آپ کا ذہن اس بارے میں بالکل واضح اور صاف ہونا چاہیئے اور تردد و تذبذب کے ہر شائبے سے پاک، ہم ہندوستانی ہیں ہم کو اسی ہندوستان میں رہنا ہے اور اس کی تعمیر و ترقی میں حصّہ لینا ہو، اگر پورے ملک میں کوئی ایک انسان بھی یہاں کے دستور و آئین کی حفاظت کرنے والا اس کی عزت قائم رکھنے والا اور اس کی

طرف سے لڑنے والا نہ ہوگا تو ہم یہ فرض انجام دیں گے، اور اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے، ہم کسی بے آئینی و بے عنوانی اور کسی زبردستی کو برداشت نہیں کریں گے، یہ ہمارا ایک سوچا سمجھا فیصلہ ہو اور اس مجلس میں ہم کو دوبارہ اس فیصلے کی تجدید کرنی چاہیے۔

ہمارے فیصلے کا دوسرا اہم جز یہ ہو کہ ہمیں اس ملک میں اپنی پوری ملی خصوصیات اپنی اسلامی تہذیب اسلامی شعائر اسلامی اخلاق اور اپنی پوری اسلامی شخصیت کے ساتھ رہنا ہو، ہم اس کے کسی گوشے سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور اس سے محروم ہو کر زندگی گذارنا نہ ہمارے لئے جائز ہے نہ پر لطف نہ خوشگوار، اگر ہم کو یہ حق و آزادی حاصل نہیں کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں تک اپنا عقیدہ اور اپنا تہذیبی ورثہ منتقل کرسکیں، ہم ان کو اپنے اصول و عقائد کے مطابق تعلیم دے سکیں ہم ان کی اسلامیت اور ایمان کے مناظر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرسکیں، تو یہ زندگی نہ مسلمان کی ہے نہ کسی شریف و باعزت انسان کی، جانور کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس کو راتب ملتا رہے، اس پر کوئی حملہ نہ کرے اس کی نسل بڑھتی اور پھلتی رہے، کتے کو جب خوراک ملتی رہتی ہے، اس کے بچوں پر کوئی حملہ نہیں کرتا تو وہ مطمئن رہتا ہو اس کے نزدیک یہ مکمل زندگی و آزادی ہے، لیکن انسان کے لئے اتنا کافی نہیں، اس کی فطری خواہش اور حق ہے کہ وہ اپنا عقیدہ اپنی عزیز خصوصیتیں اپنے جانشینوں اور اپنی اولاد تک منتقل کرے۔ اگر آپ کے لئے اتنا کافی ہے کہ آپ کو اس ملک میں راشن ملتا رہے، آپ ننگے بھوکے نہ رہیں آپ کی جان و مال محفوظ ہو آپ کو اپنی نسل بڑھانے کے مواقع حاصل ہوں آپ کی اولاد کے لئے کچھ اسامیاں موجود یا مخصوص ہوں تو یہ زندگی اشرف المخلوقات کی زندگی نہیں بلکہ ارذل المخلوقات کی زندگی ہو۔

یہ زندگی انسان اور مسلمان کی زندگی نہیں، بہائم اور چوپایوں کی زندگی ہے، بیلوں گدھوں اور کتوں کی زندگی ہے، فیصلہ کیجئے کہ اس ملک میں کتوں کی طرح زندگی نہیں گزارنی ہے کہ ہم کو کھانے پینے کی، نوکری حاصل کرنے کی، بچوں کی جسمانی پرورش کی آزادی حاصل ہو، لیکن اپنی مرضی کے مطابق اپنے عقیدے اور ایمان کے مطابق انکی ذہنی و روحانی علمی و اخلاقی تربیت اور ان کو اپنے رنگ میں رنگنے اور مسلمان بنانے کی آزادی و مواقع حاصل نہوں، ہم اس زندگی سے بیزار ہیں اور اس محدود آزادی کو ہرگز آزادی نہیں سمجھتے۔

حضرات! اس ملک میں پسماندہ اقوام بھی رہتی ہیں جن کو اس ملک کے فاتحین نے ہزاروں برس پہلے غلام بنایا تھا اور ان کو ایک ذلیل شہری کی حیثیت سے زندگی گذارنے پر مجبور کردیا تھا آج وہ نیچ ذات کی قومیں اور اچھوت سمجھی جاتی ہیں، ان مظلوم قوموں سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے زندگی نما موت کو موت نما زندگی پر ترجیح دی، انھوں نے ذلت کی زندگی کو عزت کی موت پر ترجیح دی، قوموں سے غلطی ایک بار ہوتی ہے باربار نہیں ہوتی، لیکن ایک بار کی غلطی کا خمیازہ ہزاروں سال بھگتنا پڑتا ہے، ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے، ہم ہندوستان میں عزت کی زندگی گذارنے کا عہد کرتے ہیں، ہم یہاں نہ کتوں کی زندگی گذاریں گے نہ پسماندہ اقوام کی، ہم اس ملک میں غلام بن کر نہیں رہیں گے، ہم اس ملک میں برابر کے شریک ہیں، اس ملک کے معمار اور محسن ہیں، اس ملک کی عزت اور اس کے دستور و آئین کے محافظ ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس فطری اور آئینی حق سے محروم نہیں کرسکتی، غلامی و سامراج کا زمانہ ختم ہوگیا، آج نہ قوموں کا سامراج برداشت کیا جاتا ہے نہ زبانوں اور تہذیبوں کا، آج ساری دنیا ایک گھر بن گئی ہے، آج کسی ملک کی بے آئینی چھپی ڈھکی نہیں رہ سکتی، دنیا کا ضمیر بیدار ہوچکا ہے، افریقہ کے کسی حصے میں سیاہ فام انسانوں پر یا امریکہ میں نیگروز پر ظلم ہوتا ہے تو ساری

دنیا چیخ اٹھتی ہے، اگر ہمارے ساتھ کوئی بےانصافی یا بےآئینی ہوئی تو سب سے پہلے ہم اس ملک کے ضمیر سے اپیل کریں گے، اور انصاف حاصل کرنے کے لئے وہ تمام آئینی ذرائع اختیار کریں گے جو اس ملک میں ممکن ہیں، پھر ہم دنیا کی رائے عامّہ سے اپیل کریں گے، ہم لاوارث نہیں ہیں ہمارا کنبہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، ہم کو اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے تمام جائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں، یہ ٹھیک ہے کہ ہم بہت نازک حالات سے گذر رہے ہیں، ہمارے لئے بڑی مشکلات ہیں، لیکن ہم ایک زندہ قوم ہیں، ہمارے اندر وہ تمام صلاحیتیں پوشیدہ ہیں جنھوں نے انسانیت اور اس ملک کو فیض پہونچایا تھا۔ ہم اب بھی ذہنی و اخلاقی حیثیت سے کوئی دیوالیہ قوم نہیں ہیں، ع

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

حضرات! انسان کی قدیم کمزوری ہے کہ وہ تذبذب و توہم کا مریض ہوتا ہے، مشکلات کو باہر دیکھتا ہے، مشکلات و مصائب باہر نہیں بلکہ آپ کے اندر ہیں بیرونی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں، صرف آپکے اندر ان کا وجود ہے آپ توہم کے مریض ہیں۔ تعلیم کے مسئلے میں کوئی پیچیدگی نہیں، کچھ بھی مشکل نہیں، صرف آپ خوفزدہ ہیں، خوفزدہ انسان اپنے سایہ سے ڈر جاتا ہے۔ آپ تذبذب کو دُور کردیں۔ ہندوستان میں ایک باعزّت شہری کی طرح زندگی گذارنے کا فیصلہ کریں، اس کا عزم کریں کہ ہم کو اس ملک میں رہنا ہے اور اپنی پوری ملّی خصوصیات کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ کو بہرحال اس کا فیصلہ کرنا چاہئیے تھا لیکن خوش قسمتی سے اس ملک کا دستور نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ ضمانت کرتا ہے۔ آیئے اس مبارک وقت میں کہ رات آخر ہو رہی ہے اور خدا کی رحمتوں کے نزول کا وقت ہے سچے دل سے عزم اور عہد کریں کہ ہم کو اس ملک میں اپنی اسلامیت کے ساتھ رہنا ہے اور اپنی آئندہ نسلوں کی اسلامیت کا اطمینان حاصل کرنا ہے اور پھر اس راہ میں اگر آزمائشیں پیش آئیں تو انکو گوارا کرنا ہے،

لیکن اس صراط مستقیم سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا ہو، قرآن مجید میں مسلمانوں کے دو ہی گروہوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہو اور انھیں کا محبت و عظمت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو، ایک وہ گروہ جس نے اپنے عہد کو پورا کر دیا اور خدا سے جو نذر کی تھی وہ وفا کی، اور دوسرا وہ جو اپنے عہد پر قائم ہو اور اس سے انحراف قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ـ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا، (اہل ایمان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے وہ سچا کردیا جو انھوں نے اپنے اللہ سے عہد کیا تھا ان میں بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنی منت پوری کردی، اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں. اور انھوں نے (اپنے موقف میں) کوئی تبدیلی نہیں کی.)

اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے عزت کی زندگی گذارنے کے لئے اگر کوئی جائز جدوجہد کی جائے، اس کے لئے اگر اپنی خواہشات اور عزیز چیزوں کو قربان کیا جائے اسکی اگر کوئی قیمت ادا کرنی پڑے تو یہ تمام تر نفع ہی کا سودا ہو. اور ایک باعزت اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ـ ع

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

آئیے پھر آخر میں اس بات کا عہد کریں کہ ہم کو اس ملک میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جو ہمارے دین و ایمان کا جز ہیں اور جن کے بغیر زندگی کا لطف نہیں انسان دوست خیرخواہِ وطن، پُرامن اور تعمیر پسند شہری کی طرح رہنا ہو اور اس حق کو حاصل کرنے کے لئے وہ پوری جدوجہد کرنی ہو جو وقت کا تقاضا اور ایک آزاد شہری کا حق ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قسط (۲)

ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے چند خطوط

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

برادر عزیز از جان سلّمکم[1]۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں۔ اچھی پھوپھی[2] کے خط سے معلوم ہوا کہ تم اُن کے یہاں نہیں ہو۔ تمہیں مناسب ہو رہا ہو۔ مگر کھانے کا انتظام اپنا ہو (یہ مقصود نہیں کہ اچھی پھوپھی کے یہاں بھی اپنا انتظام ہو) مولانا[3] سے روپیہ لیتے رہو اور کھانے کے مصارف ادا کرتے رہو۔ جتنے دن ضرورت مجبور ہو اور جب آنے لگو تو خانپور[4] اور تھانہ بھون ہوتے ہوئے آؤ۔ تھانہ بھون میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مقیم ہیں ان کے یہاں ٹھہر سکتے ہو۔ حضرت سے اگر ملاقات نہ ہو تو میرا نام بتا دینا میں انھیں خط بھی لکھ دوں گا۔ جانے سے پیشتر مولانا اشرف علی صاحب کو خط کے ساتھ جوابی لفافہ بھیج دو اور اس میں اپنا مختصر تعارف اس طرح کرا دو کہ فلاں کا بیٹا ہوں، یہ تعلیم حاصل کی ہے، اور فلاں سے بیعت کی ہے، اور مقصد آمد محض شرف ملاقات و زیارت ہے۔ اور اتنے دن تقریباً قیام رہے گا۔ جب

---

[1] یہ خط لاہور لکھا گیا تھا سنہ غالباً ۳۱-۳۲ء ہے۔ مکتوب الیہ اس وقت مولانا احمد علی صاحب کے مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتا تھا۔ [2] پھوپھی صاحبہ مرحومہ اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحب۔ [3] مولانا سید طلحہ صاحب۔

[4] خانپور کے قریب دین پور ایک بستی ہے، وہاں مولانا احمد علی صاحب مدظلہ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحبؒ تشریف رکھتے تھے میری پہلی بیعت حضرت ہی سے تھی۔

مولانا کا جواب آجائے تو اپنے ساتھ یہ جواب لیتے جانا اور پہونچنے پر جواب دکھلا دینا۔

اگر وہاں رہنا مفید معلوم ہو تو کچھ دن ٹھیر جانا۔ گھر کی ضرورتوں کے خیال سے آنے میں جلدی نہ کرنا۔ غالباً جتنے دن وہاں رہو کچھ فائدہ ہی پہونچتے رہیں۔ لایشقی جلیسہم

مولوی مسعود علی صاحب[1] کے جانے کے بعد میں نے پھر طلبہ میں کسی قسم کی تحریک محسوس نہیں کی گویا وہ کبھی آئے ہی نہ تھے۔ اب پھر آنے والے ہیں۔

عطیہ[2] گویا مئو میں ہیں۔ اپنی خوشی سے گئے ہیں بطور مہمان کے مقیم ہیں۔ ان کے میزبان کہتے تھے کہ جب تک رہنا چاہیں گے رہیں گے۔

محمود و محمد ثانی[3] کی تعلیم کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہے میرے خیال میں لکھنؤ میں رہنا چاہیے اور دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیے محمد عربی سے فائدہ پہونچے گا، محمود اردو حساب اور دینیات پڑھ سکتے ہیں۔ درجہ ابتدائی میں۔

اشتہارات[4] آنے پر تقسیم کرا دیے جائیں گے۔

عبدالعلی - ۱۷ اپریل

برادر عزیز سلمکم اللہ تعالیٰ[5]	السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

تمہارے متعدد خطوط پہونچے مگر جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی اس سے تمہیں بہت تشویش ہوئی ہوگی، ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ایک بار خدیجہ کو

---

[1] مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے کچھ روز مسجد کی تعمیر کے زمانہ میں دارالعلوم میں قیام فرمایا تھا اس سے طلبہ میں خاصی تحریک اور دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

[2] ایک عرب نوجوان مدینۂ طیبہ کے رہنے والے اس وقت دارالعلوم میں مقیم تھے۔

[3] ہمارے دو بچے [3] ہمارے استاذ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی کے چھوٹے بھائی جو اس وقت دارالعلوم میں مدرس تھے [4] یاد نہیں کس قسم کے اشتہارات مراد ہیں [5] یہ خط اس وقت لکھا گیا جب مکتوب لیہ دارالعلوم دیوبند میں مقیم تھا، اور مولانا مدنی کے درس حدیث میں شرکت کرتا تھا۔

بجائے یا تھا اور ایک بار اسہال کی شکایت ہوئی تھی۔ اب بحمداللہ کوئی شکایت نہیں ہے۔
اس سے بہت خوشی ہوئی کہ تمہاری صحت اچھی ہے اور بھوک اور ہضم کی قوت بڑھ گئی ہے۔

جن کپڑوں کی ضرورت تم محسوس کرتے ہو بھیج دیے جائیں گے۔ جلد مطلع کرو جب سے باورچی خانے میں کھانا کھانے لگے ہو اس وقت سے ناشتہ کا کیا انتظام ہے۔ اگر کوئی انتظام نہ ہو تو بازار سے پکا ہوا دودھ اور بسکٹ لے کر کھالیا کرو۔

غالباً قیام مولانا[۵] ہی کے یہاں ہوگا۔ اس سے بھی مطلع کرو۔

مولانا انور شاہ صاحب میں یا گئے اگر ہوں تو ان سے بھی استفادہ کا موقع ملتا ہے یا نہیں؟

اپنے چوبیس گھنٹے کے پروگرام سے مطلع کرو اور لکھو کہ جمعرات و جمعہ کو سبق ہوتا ہے یا نہیں اور ان ایام کے علاوہ بھی کسی مسئلہ پر گفتگو کا موقع ملتا ہے یا نہیں۔ یہ بھی لکھو کہ حضرت مولانا کی خدمت میں رہنے کا کتنا موقع ملتا ہے۔

جہاں رہتے ہو وہاں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں اور وہ کس قسم کے لوگ ہیں۔

جب تم وہاں گئے تھے اس وقت سے اب تک اپنے میں کوئی تغیر محسوس کرتے ہو یا نہیں، جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا مفصل جواب لکھنا اور میرے خط کو سامنے رکھ کر لکھنا تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے۔

حضرت مولانا کی خدمت میں سلام عرض کر دینا۔

عبدالعلی

لکھنؤ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء

جناب خالہ صاحبہ دام مجدہا[۵۲]

سلام مسنون کے بعد گذارش ہے کہ ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں۔ امید ہے کہ

---

[۵۱] مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ [۵۲] یہ خط والدہ صاحبہ مدظلہا کے نام ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت سے واپس آکر لکھنؤ میں تبلیغی کام شروع کیا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ لوگ بھی بخیر و عافیت ہوں گی۔

علی سلمہٗ بدستور تبلیغ دین کا کام کر رہے ہیں۔ اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی کام نہیں اس لیے کہ انبیاء اسی کام کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ میری تمنا تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے۔ مگر معاش کی مجبوریاں مانع ہیں۔

تعلیم کا کام بھی انھیں کرنا پڑتا ہے اس لیے انھیں بہت محنت کرنا پڑتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور ان کی صحت اور قوت میں برکت عطا فرمائے۔ اور اپنے دین کی خدمت عرصۂ دراز تک لیتا رہے۔

زراعت و باغبانی کا جو کچھ کام میں کر رہا ہوں اس کی غرض یہ تھی کہ ہم دونوں مل کر اعلاء کلمۃ اللہ میں اپنا وقت صرف کر سکیں اور نہ انھیں ملازمت کی حاجت رہے اور نہ مجھے مطب کی پابندی رہے۔ تعلیم دین بھی ثواب کا کام ہے مگر ملازمت کی پابندی سے مقصد میں خلل ہوتا ہے۔ ملازمت نہ ہوتی تب بھی وہ انشاء اللہ قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے اور تبلیغ کا کام بھی کرتے اور میں بھی کرتا۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اپنی رضامندی کی راہ پر چلاتا رہے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر قائم رکھے اور اپنے دین کی خدمت لے اور ہمارے ذریعے سے گمراہوں کو سیدھی راہ دکھلائے اور اس طرح رزق عطا فرمائے کہ سوا اللہ کے کسی کی حاجت نہ رہے۔

جس طرح علی سلمہٗ کام کر رہے ہیں اس سے میرا دل بالکل مطمئن ہے عرصے جس بات کی تمنا تھی وہ حاصل ہو رہی ہے۔ دل کو قرار ہو گیا اور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں، مگر شوق اس کا طالب ہے کہ اور ترقی ہو اور جس طرح سید صاحبؒ سے اسلام کو ترقی ہوئی ویسے ہی علی سلمہ کی کوششوں سے ترقی ہو اور مجھے بھی کام میں شرکت کا موقع ملے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمنا پوری فرمائے اور ہم لوگوں کی صحت و قوت میں ایسی برکت عطا فرمائے کہ یہ کام

جو بھائی صاحبؒ کے خاص ذوق اور دلچسپی کی چیز تھی اور مدت سے ان کی آرزو تھی کہ میں اس کام میں مشغول ہوں اس وقت میں دارالعلوم میں تدریس کا کام بھی کرتا تھا۔ ۵؎ بھائی صاحبؒ وطن میں کچھ باغ لگا رہے تھے تاکہ معاش سے فارغ ہو سکیں۔

پورا ہو۔

رضوی و محمود سلمہا سے دعا فرما دیجئے۔

عبدالعلی ۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء

برادر عزیز از جان سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تمھارے خطوط سے خیریت معلوم ہوتی رہی دل کو بڑا اطمینان رہا۔ وہاں کے حالات سے کافی بڑی خوشی رہی ۔ آخری خط سے حضرت سید صاحبؒ کے جہاد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا دل کی عجیب کیفیت رہی ۔ سید صاحب کے تذکرے سے قلب میں جو رقت اور نور پیدا ہوتا ہے وہ تو تھا ہی اسی کے ساتھ اس زمانہ کے اندوہناک واقعات اور مسلمانوں کی بدبختی نے دل کو ایسا پژمردہ کر دیا کہ اب تک اثر باقی ہے ، فتح خاںؒ کے اعقاب کا حال سن کر بے اختیار دل چاہا کہ میں بھی وہاں ہوتا ، جی چاہتا ہے کہ انھیں کوئی ہدیہ بھیجا طول مسافت اگر اس سے مانع ہے تو کم از کم جی چاہتا ہے کہ میرا سلام پہونچ جائے ۔

خادی خاںؒ نے جو کیا اس سے ہم لوگوں کا دل ٹکڑے ہوتا ہے ۔ مگر اُن کے اعقاب اگر نادم ہوں اور سید صاحب کی راہ پر ہوں تو ہم ان سے بھی وہی برتاؤ کریں گے جو سید صاحبؒ نے اُن کے بزرگوں کے ساتھ کیا ۔ شاید اللہ تعالیٰ انھیں یا ان کی اولاد کو دین کی کسی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں ۔ صوبۂ سرحد میں تمھارا سفر قریب ختم ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ اس سفر کو سید صاحبؒ کے مشن کا جزو بنائے اور اس مشن کی تکمیل میں اپنے ان ناچیز بندوں سے بھی کچھ خدمت لے ۔ ہمارے قدیم دشمنوں کی اولاد اگر اللہ کا کام کرنے پر آمادہ ہوں تو ہمارے سر اور آنکھوں پر۔ اللہ تعالیٰ ہمیں البغض فی اللہ والحب فی اللہ کی توفیق عطا فرمائیں ۔

ؔ۱ یہ خط اس وقت کا ہے جب کہ مکتوب الیہ صوبۂ سرحد کے دورہ اور پنجتار کے سفر سے (جو کئی سال تک حضرت سید احمد شہیدؒ کا مستقر رہا ہے) واپس لاہور آیا تھا اور بھائی صاحب کو پنجتار کا حال لکھ چکا تھا۔ ؔ۲ علاقۂ سمہ کا رئیس جس کے مرکز پنجتار میں سید صاحب کا عرصہ تک قیام رہا ۔ ؔ۳ ہنڈ کا رئیس جو سید صاحب کے مقابلہ میں مارا گیا ۔

مولانا الیاس صاحب کا حال آخر میں چودھری نعیم اللہ صاحب سے معلوم ہوا تھا وہ ہوتی کی تعطیل میں گئے تھے۔ کہتے تھے کہ دست کے دورے ہوتے ہیں، کمزوری زیادہ ہے، غذا میں میٹھا ہوتا ہے۔

میری طبیعت تمھارے سامنے سے خراب تھی، مختلف شکایتیں بدل بدل کر ہوتی تھیں، تین مسہل لینے کے بعد بہت کمی ہے۔ اب برائے نام شکایت باقی ہے۔

عبدالغفار صاحب نگرامی[1] علی گڑھ گئے تھے، مسلم یونیورسٹی کے دس پندرہ طلبہ مسودات کے لیے اور کام کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں پھر بلایا ہو۔ بارہ بنکی میں عمران خاں[2] اور مطلوب[3] صاحب بانسہ گئے تھے اچھا کام ہوا اور نیا دیڑ گئی، ہردوئی، گونڈہ اور ردولی میں بھی کام در پیش ہو۔ یہاں بفضلہ تعالیٰ خیریت ہے۔

عبدالعلی ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء

برادر عزیز از جان سلمکم اللہ ووفقکم لما یحب ویرضیٰ[4]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کراچی سے اور پھر کامران کے قریب سے تمھارے خطوط ملے، دوسرا خط تم نے ہوائی ڈاک سے بھیجا تھا مگر تیرہ روز میں پہنچا، معلوم نہیں کیا سبب ہوا بڑی فکر تھی کہ لاہور اور کراچی کے درمیان خالہ جان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ گرمی کی تکلیف تو ہوئی مگر الحمدللہ کہ طبیعت اچھی رہی، پھر سمندر کا سفر اور برسات کا زمانہ اس کی فکر رہی، خط سے معلوم ہوا کہ سات روز طبیعت خراب رہی اس کا اندیشہ ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ ان

---

[1] مولانا عبدالغفار نگرامی ندوی [2] مولانا محمد عمران خاں ندوی، مہتمم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم اور مکتوب الیہ کے رفیق [3] مولانا مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم [4] حضرت سید عبدالرزاق شیخ الانظام الدین کا وطن ضلع بارہ بنکی میں ایک گاؤں [5] یہ خط ۱۹۴۶ء میں پہلے حج کے موقع پر جب مکتوب الیہ والدہ ماجدہ اور اہل خانہ کے ساتھ عزیزی مولوی سید محمد ثانی سلمہ کی معیت میں حجاز اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں کے تبلیغی کام میں حصہ اور خاص طور پر عربوں میں دینی دعوت کے لیے زمین تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خط مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد ہی ملا۔

تکلیفوں کو کفارۂ سیئات اور رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ امید ہو کہ یہ تکلیفیں بیکار نہ جائیں گی اور وہاں کے کام کے لیے طبیعت کو زیادہ نیاز کردیں گی۔ جیکہ ادرستی اور ضعف کی وجہ سے ان ایام میں کام کا موقع نہ ملا تو انشاء اللہ اجر میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ جس کام کی نیت تھی اور ان عوارض سے وہ نہ ہو سکا اس کا پورا اجر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ملنے کی پوری توقع ہے بلکہ نیۃ المرء خیر من عملہ، اچھے رہتے اور کام کرتے تو جتنا اجر ملتا اس سے زیادہ کی توقع رکھنا چاہیے۔

جس سفر پر تم لوگ گئے ہو اگر اتنا لمبا سفر کسی دوسرے مقصد سے ہوتا تو ہم لوگ ہر وقت پریشان رہتے۔ مگر اس مقصد کی برکت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بڑی خوشی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو اپنے دربار میں حاضری کی عزت بخشی۔ ہم لوگ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پورے اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قبول فرمائیں۔ اگر دل میں کھٹک رہتی ہے تو یہ کہ افسوس کہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہ جا سکا۔ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ یہ سعادت نصیب فرمائے اور میں بھی ہمراہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب تم لوگ مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی حاضری اور روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہوگے۔ یہ خیال کرکے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور بے اختیار دل کھنچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے دلوں کو اپنی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور اتباع سے منور فرمائے۔

حج و زیارت کے سوا دوسرا کام جو اہمیت میں کم نہیں ہے شروع ہو چکا ہوگا۔ جہاں سے اس کام کی ابتدا ہوئی تھی اور پھر تمام عالم منور ہوا تھا وہیں اللہ تعالیٰ نے اسی کام کے کرنے کا تمہیں موقع عنایت فرمایا ہے اور جس نے ابتدا کی تھی اسی[1] کے ظل عاطفت میں کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اس کا شکر بندہ کے بس سے باہر ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ وَالشُّکْرُ لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیم عاجز و ناتواں و ناکارہ بندوں سے بڑے سے بڑا کام لے سکتی ہے۔ کیا تعجب کہ اللہ تعالیٰ اس بیج کو تناور درخت کردے جس کی جڑ اس ارض پاک میں ہو اور شاخیں تمام عالم کو اپنے سایہ میں لے لیں۔ ممکن ہے کہ جو بیج

---

[1] اور ہمارا تمہارا نفوس ما فداہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

تمھارے ہاتھوں لگ رہا ہے وہ کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار کا مصداق ثابت ہو۔ اپنے کام کو بیج اور ناکارہ سمجھتے ہوئے اس کے نتائج کو محض تائید الٰہی کی امید پر بڑے سے بڑا اور اہم سے اہم سمجھنا چاہیے اور اسی تخیل کے مطابق اجر کی امید رکھنا چاہیے۔ اور انا عند ظن عبدی بی کا خیال کرکے اس کے ملنے کا یقین رکھنا چاہیے، کام کرتے وقت حوصلہ بلند رکھنا چاہیے اور تمام عالم کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ ایک دفعہ تمام عالم یہاں کی شعاعوں سے منور ہو چکا ہے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پھر یہیں سے اُمت کی نشاۃ ثانیہ کا سامان کر دے اور تمھیں بھی اس کا ذریعہ بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم دورافتادہ دعا گویوں کو محض اپنے لطف و کرم سے تم لوگوں کے ساتھ شامل کر دے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توقع بیجا نہیں ہے، کسی عمل سے رضامندی بھی اجر کا سبب بنتی ہے۔ تمھیں اندازہ ہوگا کہ کتنا عظیم الشان کام ہے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہے پھر اس کے لیے کتنی جد و جہد درکار ہو گی۔ یہی کام ایسا ہے جس کے لیے آدمی مر مٹے، اللہ تعالیٰ تمھیں اور سب کام کرنے والوں کو جد و جہد کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، حق تو یہ ہے کہ کون حق ادا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دل و جان سے اپنے کام میں لگنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے قبول فرمائیں اور اس کا اجر اپنے کرم کے اندازہ سے عطا فرمائیں۔

رابع کو جو تم نے میرے خط میں لکھا تھا وہ میں ان شاء اللہ کل ان کو لکھ دوں گا آج کے خط میں لکھنا بھول گیا۔ امید ہے کہ خالہ جان، ہمشیرہ، محمد ثانی اور سب خیریت سے ہوں گے سب سے سلام اور دعا کہہ دینا۔ معین کی والدہ کا ہیضہ میں انتقال ہو گیا دعاء مغفرت کرنا اور خالہ جان سے بھی کہنا۔ خالہ جان اور ہمشیرہ سے کہنا کہ امید ہو کہ دعاؤں میں فراموش نہ کریں گی۔ تم سے تو اس کے کہنے کی ضرورت نہیں اور اُن سے بھی بغیر کہے ہوئے اسی کی امید ہو۔ ساتویں یا دسویں دن خط لکھ دیا کرنا امید ہو کہ مدینہ طیبہ سے ہوائی ڈاک پہونچ جایا کرے گی۔ سب تمھیں اور خالہ جان ہمشیرہ وغیرہ کو سلام کہہ رہے ہیں۔ فضل عظیم[1] اور دوسرے متعارف حضرات سلام قبول فرمائیں۔

عبدالعلی ۱۰ ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۶ھ

از لکھنؤ

---

[1] حاجی فضل عظیم مرادآبادی۔

تعارف و تبصرہ

خدائی وعدہ

مصنفہ ڈاکٹر طہٰ حسین، مترجمہ معراج محمد بارق
صفحات ۲۶۰، سائز خورد، قیمت ۳/۵۰

ناشر:- نور محمد اصح المطابع، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔

مکہ کی سرزمین پر اللہ کے آخری رسول نے جب کلمۂ حق بلند کیا اور اس سرزمین کی سعید روحیں اس ندائے حق کی طرف لپکنا شروع ہوئیں تو جاہلی نظام حیات کے پرستار جبر وستم کے سارے تیر و ترکش سنبھال کر ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ظلم وستم کی ان وحشیانہ مشقوں کا مزا جو تیرہ سال تک مکہ کی وادی میں ہوتی رہیں، یوں تو ان سبھی سعید روحوں نے چکھا لیکن ان میں جو سب سے بے سہارا اور کمزور تھے وہ تو گویا مستقل تختۂ مشق بنے رہے، مثلاً بلال رضؓ حبشی، صہیب رومیؓ، عمار بن یاسرؓ، خباب بن ارتؓ وغیرہ۔ مگر اللہ کے وعدے کے مطابق ایک دن نہ صرف ان کو اس مظلومیت سے نجات ملی بلکہ عزت و شرف کے تاج ان کے سروں پر رکھے گئے۔ ان بزرگوں کی زندگیوں کے یہ دونوں پہلو اس کتاب میں منظر کشی کے انداز میں دکھائے گئے ہیں ــــ گویا کہ اسلامی تاریخ کو ان نہایت اثر انگیز اوراق کو ناول کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اور منظر کشی کے اسلوب سے واقعات میں جو ایک خاص تاثر پیدا ہو جاتا ہے اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ان واقعات میں وہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ــــ ترجمہ بہت ہی کامیاب اور مترجم کی سلاست و لیاقت کا آئینہ دار ہے ــــ کسی جگہ بھی ترجمہ پن کا احساس نہیں ہوتا۔

خلافت کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کے متعلق ڈاکٹر طہٰ حسین کے خیالات بہت گمراہ کن ہیں، جو موصوف کی کتاب الفتنة الکبریٰ حصہ اول اور اس کے ترجمے عثمان عروہ تاریخ کی روشنی میں سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ حضرت عمار بن یاسرؓ وغیرہ کے تذکرہ کے سلسلہ میں اس کتاب میں بھی ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کی جھلک آ گئی ہے۔ یہ کمی کتاب کی ایک قابلِ تنقید چیز ہے۔ ورنہ کتاب بہت اچھی اور قابلِ مطالعہ ہے۔

زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک مؤلفہ مولانا الحاج شیر محمد شاہ صاحب سندھی۔ ناشر:۔ مولانا غلام محمد یوسف نورگت۔ تبلیغ آفس ترکیسر۔ دایا کیم۔ ضلع سورت صفحات ۵۰۰ $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر قیمت ۱۰/۔

مناسک حج پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر غالباً یہ کتاب سب سے زیادہ جامع ہے یہ اس سلسلہ کی متعدد مستند کتابوں کا (با حوالہ) خلاصہ ہے۔ خود مؤلف کے علمی پایہ کے بارے میں حضرت مولانا بدر عالم مدظلہٗ جیسے معتمد عالم کے الفاظ یہ ہیں کہ مولانا شیر محمد صاحب کو میں حج کے مسائل کے بارے میں امام مانتا ہوں۔"

(ع۔س)

القاموس الجدید مؤلفہ مولوی وحید الزماں صاحب کیرانوی شائع کردہ دارالفکر دیوبند بہت چھوٹی تقطیع صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ۵۰/۷

ہندستان میں عربی کی ترویج و اشاعت کا کام اس حیثیت سے تو اچھا خاصا ہوا تھا کہ عربی کی کتابوں کی تعلیم مدارس عربیہ اور دوسرے مراکز علم میں ہوتی تھی اور اس سلسلہ میں عربی قواعد صرف و نحو اور علوم بلاغت و ادب کی طرف بھی یہاں کے علماء کی توجہ تھی لیکن ہندستان کے علماء نے اس بات کی فکر کم کی تھی کہ عربی زبان کے جو الفاظ ان کو علوم میں ان الفاظ کو وہ صحیح طور پر اپنی زبان و قلم سے بتکلف ادا کر یں اس گوشہ میں ہندستان کا یہ نقص گذشتہ دور میں تو ایک حد تک ہی سکتا تھا جب کہ عالم عربی اور عالم اسلامی سے ربط و تعلق کی گنجائشیں کم تھیں لیکن اب جب کہ ذرائع اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہاں کے افراد کو عرب افراد سے ملنے اور تبادلہ خیالات اور خط کتابت کرنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں اس کی بڑی ضرورت ہو گئی ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر جس لٹریچر اور کتابوں کی ضرورت ہے وہ ہندستان اور اردو میں تقریباً مفقود تھیں اب کچھ عرصہ سے بعض لوگوں کو توجہ ہوئی اور یہ کام شروع ہوا۔ اس ضرورت کی ایک کڑی اردو عربی لغات کی تیاری کا کام تھا جس کی الحمد للہ داغ بیل پڑ گئی ہے اس سلسلے کی ابتدا مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے کی اور

اس سلسلہ کی دوسری پیش کش وہ کتاب ہے جو اس وقت پیش نظر ہے اس میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے تمام عام اور کثیر الاستعمال الفاظ کے لیے مستعمل اور صحیح عربی الفاظ پیش کیے جائیں کتاب پر ایک ہلکی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ صاحب کتاب اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہیں، اور اس کامیابی پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب مختصر ہے اور رائج و مستعمل الفاظ پر مشتمل ہے اس میں زیادہ علمی اور ادق الفاظ نہیں دیئے گئے ہیں، اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے

کتاب میں کہیں کہیں کچھ تسامحات بھی ہیں، جو کتاب کی افادیت اور زیادہ تر کامیاب و مفید ہونے کی صورت میں قابل نظر انداز ہیں، لیکن مصنف کی توجہ کے لیے چند اشارے پیش کیے جاتے ہیں۔

صفحہ نمبر ا پر لفظ آب پاش کے آگے آب پاش کی صرف تصویر بنی ہوئی ہے حالانکہ اس کے لیے عربی لفظ ہونا چاہیئے۔ آبدیدہ کے لفظ کے آگے کئی عربی الفاظ دیے گئے ہیں جن میں حزین اور مغموم بھی ہیں حالانکہ یہ بالکل دوسرے معنی رکھتے ہیں۔

صفحہ ۲۶۲ پر راز فاش ہونا کے لیے اکتشف السر لکھا ہے حالانکہ اکتشف متعدی ہے۔

صفحہ ۴۰۵ پر قدم چومنا کے آگے لکھا ہے (۱) النجاح حلیفہ (۲) قبل اقدامہ اس میں پہلا ترجمہ صحیح نہیں ہے "کامیابی اس کے قدم چومتی ہے" کے جملے کو عربی میں ادا کرنے کے لیے النجاح حلیفہ بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس لیے کہ اس کا مفہوم ادا ہوتا ہے نہ کہ یہ اس کا ترجمہ ہوا اور پھر صرف قدم چومنے کے لیے تو یہ ترجمہ بالکل غیر صحیح ہے۔

بہرحال یہ چند مثالیں بطور مشورے کے پیش ہیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس طرح کے تسامحات دور کردیے جائیں گے اور امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن زیادہ کامیاب اور مفید ہوں گے۔

(م۔ ر۔ ا)

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

فی کاپی آٹھ آنہ (۸/)

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (ہندوستان) ۶/
سالانہ چندہ (پاکستان) ۷/

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ چندہ ۲۵/

جلد (۲۹) | بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۱ھ مطابق اگست ۱۹۶۱ء | شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ⭘ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی۔ براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۳ اگست تک دفتر میں ضرور آجانی چاہیئے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری:۔ خط و کتابت اور منی آرڈر پر اپنا نمبر خریداری لکھنا ہرگز نہ بھولئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۳۰ تاریخ کے اندر آنی چاہیئے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

مقامِ اشاعت دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

مسلم کنونشن، ایسے حضرات کی دعوت، ایسے حضرات کی قیادت اور رہنمائی میں منعقد ہوا تھا جن کی پوری زندگی پر فرقہ پرستی کا کوئی ادنیٰ داغ نہیں، جو متحدہ قومیت کے اس وقت بھی نقیب اور علمبردار تھے جب جداگانہ قومیتوں کا نعرہ ملک میں گونج رہا تھا، اور جو جداگانہ قومیتوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کو قبول کرنے سے اس وقت بھی انکاری رہے جب گاندھی جی بھی ہتھیار ڈال چکے تھے، یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے اتحادِ وطن کے نصب العین پر عزت و آبرو کا سرمایہ بھی لٹانے سے دریغ نہیں کیا ـــــ اور یہ وہ قربانی تھی جس میں ان نیشنلسٹ مسلمانوں کا کوئی دوسرا شریک و سہیم نہیں!

ایسے کنونشن کے بارے میں قدرتی طور پر یہ توقع تھی کہ کانگریس اور دوسری نیشنلسٹ جماعتیں اس کا احترام کریں گی، اس کے پلیٹ فارم سے کہی گئی باتوں کو وزن دیں گی اور مسلمانوں کے اس خاص اجتماع کو کوئی غلط معنیٰ پہنانے کی کوشش نہیں کریں گی۔

لیکن اس توقع کے بالکل برعکس صورت حال یہ ہوئی ہے کہ کانگریس کے وہ آل انڈیا لیڈر جن کے مکمل اظہار اطمینان کے بعد یہ کنونشن منعقد ہوا تھا، اپنی اس "غلطی" پر ملک کے سامنے معذرت پیش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ صوبوں کے کانگریسی لیڈر تو گویا کنونشن منعقد کرنے والوں پر پل پڑے ہیں کہ انھوں نے ملک کے مفاد سے غداری کی ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ پرستی پھیلائی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی طرح کے تبصرے دوسری نیشنلسٹ جماعتوں کی صفوں سے بھی سنائی دے رہے ہیں۔

اس ردعمل کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی حق تلفیوں اور مظلومیت کے جو مسائل اس کنونشن کے ذریعہ اٹھائے گئے تھے وہ گویا پس پشت جا پڑے بلکہ ملک کے اندر فرقہ وارانہ مسئلہ کی جو نوعیت مدھیہ پردیش کے ہولناک واقعات کی روشنی میں قرار پائی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہ بدل کر رہ گئی۔ مدھیہ پردیش کے سانحہ نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا تھا کہ فرقہ واریت کے نام سے ہندوستان میں اب اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ ہندو فرقہ پرستی کا مسئلہ ہے۔ لیکن کنونشن پر اس ردعمل کے بعد سے یکایک مسلم فرقہ پرستی کا زور و شور بھی اس ملک میں دریافت ہونے لگا، اسکے خطرات سے آگاہی بھی دی جانے لگی اور ذمہ داران امن و امان کو اس پر کڑی نگرانی رکھنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔

اس صورت حال نے ہندو فرقہ پرست جماعتوں کے لئے بہترین موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کی یلغار کر کے انھیں ایسا سراسیمہ اور بھونچکا کر دیں کہ وہ ان جماعتوں کے خلاف سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت اور ہمت کھو بیٹھیں۔ ہمارے خیال میں آنے والے الکشن تک یہ جماعتیں اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی۔ تاکہ مسلمان اپنے ووٹوں کو ان طاقتوں کے خلاف منظم کرنے کا موقع نہ پا سکیں جس کا کافی امکان مدھیہ پردیش کے حادثات کے نتیجہ میں پیدا ہو گیا تھا۔

اگر ان مسلم دشمن جماعتوں کی یہ چال کارگر ہو گئی تو بلاشبہ یہ ایک عظیم نقصان ہوگا۔ مسلمانوں کو اس چال سے ہوشیار رہنے اور وقت کے تقاضے کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ انھیں بالکل نڈر اور بے خوف ہو کر اس مسئلہ پر سوچنا چاہیے کہ اُن کے ووٹ کا استعمال کس طرح اِن جماعتوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں کو برسرِ اقتدار آنے سے کس طرح روکا جائے۔ مسلمانوں کو آنے والے الکشن کے سلسلہ میں اس نقطۂ نظر سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے، اور اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ اُن کے ووٹ فرقہ پرستوں کی شکست میں فیصلہ کن ثابت ہوں۔

مقالاتِ سِیَر
از ، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم ، اے
سیرت نبوی کے موضوع پر آٹھ مقالات کا قابل قدر مجموعہ ۔ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے پڑھنے کے لائق ـــــ کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ـــــ مجلد مع گرد پوش ۔ قیمت ۴/۵۰
طوفان سے ساحل تک
مشہور نومسلم یورپین فاضل (لیوپولڈ ویس) محمد اسد کی کتاب روڈ ٹو مکہ کا اردو ترجمہ جس میں مصنف نے اپنی سوانح حیات اور اپنے قبول اسلام کی نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز داستان بیان کی ہے قیمت ۵/
ہندوستانی مسلمان
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بالکل نئی کتاب
مسلمانوں نے ہندوستان کو کیا دیا ، اور کیا سے کیا بنا دیا ؟ ملک کی جنگ آزادی میں ان کا کیا حصہ رہا ؟ ہندوستانی مسلمانوں نے دین اور علم دین کی کیا بلند پایہ خدمات انجام دیں ؟ کیسی کیسی عظیم شخصیتیں ہر شعبے میں پیدا کیں ؟ اسی طرح کے عنوانات پر مولانا ندوی کی دس ہلکی پھلکی تقریریں اور مضامین ـــــ
اعلیٰ کاغذ ، عمدہ طباعت ، سوا دو سو صفحات ، مجلد اعلیٰ گرد پوش ، قیمت ۲/۵۰
دجالی فتنہ اور سورۂ کہف
مغربی تہذیب و تمدن دراصل دجالی فتنہ ہے ۔ قرآن پاک کی سورہ کہف اس فتنہ پر ایک کاری ضرب ہے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ رسی سے اس سورہ کے عجیب عجیب نکات و اشارات کھولے ہیں جس سے یہ سورت آج کے دجالی فتنہ میں اہل ایمان کے لئے مشعل راہ بنجاتی ہے ۔ تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے ـــــ قیمت ۱/۵۰
ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ
کتب خانہ الفرقان کی مفصل فہرست کتب مفت طلب فرمائیے ۔

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مسلسل)

اذان و اقامت سے متعلق بعض احکام

(۳۶) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ اِذَا اَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ وَاِذَا اَقَمْتَ فَاحْدُرْ وَاجْعَلْ بَيْنَ اَذَانِكَ وَاِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الْاٰكِلُ مِنْ اَكْلِهٖ وَالشَّارِبُ مِنْ شُرْبِهٖ وَالْمُعْتَصِرُ اِذَا دَخَلَ لِقَضَاءِ حَاجَتِهٖ وَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ۔

(رواہ الترمذی)

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مؤذن بلال سے فرمایا کہ جب تم اذان دو تو آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر دیا کرو۔ (یعنی ہر کلمہ پر سانس توڑو اور وقفہ کیا کرو) اور جب اقامت کہو تو رواں کہا کرو، اور اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فصل کیا کرو کہ جو شخص کھانے پینے میں مشغول ہے وہ فارغ ہو جائے اور جس کو استنجے کا تقاضا ہے وہ جا کر اپنی ضرورت سے فارغ ہو لے۔ اور کھڑے نہ ہوا کرو جب تک کہ مجھے دیکھ نہ لو۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث میں اذان اور اقامت سے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ تو

بالکل واضح ہیں کسی تشریح کی محتاج نہیں، البتہ آخری ہدایت "ولا تقوموا حتّٰی ترونی" (اور کھڑے نہ ہوا کرو جب تک کہ مجھے دیکھ نہ لو) وضاحت طلب ہے، غالباً کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حجرۂ شریفہ سے حضور کے مسجد میں تشریف لانے سے پہلے ہی یہ اندازہ کرکے کہ آپ نماز پڑھانے کے لیے عنقریب باہر تشریف لانے والے ہیں، لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے، اس کی آپ نے ممانعت فرمادی اور ارشاد فرمایا کہ میں جب تک مسجد میں آنہ جاؤں اور تم مجھے دیکھ نہ لو اس وقت تک کھڑے نہ ہوا کرو ـــــ اس ممانعت کی یہ وجہ تو ظاہر ہے کہ پہلے سے کھڑے ہوجانا بے وجہ کی تکلیف اٹھانا ہے، اور ہوسکتا ہے کہ کسی وجہ سے آپ کو تشریف لانے میں دیر ہوجائے لیکن اس کے علاوہ آپ کی تواضع پسند طبیعت کے لیے بھی یہ بات تکلیف اور گرانی کا باعث ہوتی ہوگی کہ اللہ کے بندے صف باندھ کر آپ کے انتظار میں کھڑے ہوں۔

(٣٧) عَنْ سَعْدٍ مُؤَذِّنِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَالًا اَنْ یَّجْعَلَ اِصْبَعَیْہِ فِیْ اُذُنَیْہِ وَقَالَ اِنَّہٗ اَرْفَعُ لِصَوْتِکَ ـــــــــ (رواہ ابن ماجۃ)

(ترجمہ) سعد قرظ جو (مسجد قبا) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے مؤذن تھے ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو حکم دیا کہ اذان دیتے وقت وہ اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں دے لیا کریں، آپ نے ان سے فرمایا کہ ایسا کرنے سے تمہاری آواز زیادہ بلند ہوجائے گی۔ (سنن ابن ماجہ)

(٣٨) عَنْ زِیَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِیِّ قَالَ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُؤَذِّنَ فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ فَاَذَّنْتُ فَاَرَادَ بِلَالٌ اَنْ یُّقِیْمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخَا صُدَاءٍ قَدْ اَذَّنَ وَمَنْ اَذَّنَ فَہُوَ یُقِیْمُ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

(ترجمہ) زیاد بن حارث صُدائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ فجر کی نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ تم اذان پڑھو، میں نے اذان پڑھی۔ اس کے بعد جب اقامت کہنے کا وقت آیا تو بلال نے ارادہ کیا کہ اقامت وہ کہیں تو حضور نے (میرے متعلق) فرمایا کہ اس صُدائی نے اذان پڑھی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو اذان پڑھے وہی اقامت کہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(۲۹) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِي الْعَاصِ قَالَ اِنَّ مِنْ آخِرِ مَا عَهِدَ اِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِ اتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَا يَاخُذُ عَلٰى اَذَانِهٖ اَجْرًا ——— رواه الترمذی

(ترجمہ) عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب طائف کا عامل بنا کر مجھے روانہ فرمایا تو اس وقت آپ نے) آخر میں جو تاکیدی ہدایتیں مجھے فرمائیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کوئی ایسا مؤذن مقرر کرلینا جو اذان پڑھنے کی مزدوری نہ لے (بس اللہ کے لیے اور آخرت کے ثواب کی نیت سے اذان پڑھا کرے)

(جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث کی روشنی میں اکثر ائمہ دین کا جن میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں مسلک یہ ہے کہ اذان پڑھنے کی تنخواہ اور اجرت لینا درست نہیں ہے دوسرے حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کو تقویٰ اور عزیمت پر بھی محمول کیا ہے۔ حنفیہ میں سے بعض متاخرین اہل فتویٰ نے زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کے تحت اس میں گنجائش سمجھی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اذان اور امامت جیسے دینی اعمال کی عظمت اور تقدس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ خالصاً لوجہ اللہ ہوں۔ اور تنخواہ کا معاملہ اگر ناگزیر ہی ہو تو دوسری متعلقہ خدمتوں اور پابندیوں کے عوض میں ہو اور معاملہ کے وقت یہ بات صاف کرلی جائے۔

(۳۰) عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ اَللّٰھُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّۃَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِیْنَ ـــــ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والشافعی

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام ضامن اور ذمہ دار ہے اور مؤذن امین ہے، اے اللہ اماموں کو ٹھیک چلنے کی توفیق دے اور مؤذنوں کی مغفرت فرما۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، مسند شافعی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ امام پر اپنی نماز کے علاوہ مقتدیوں کی نماز کی بھی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو اپنے امکان کی حد تک ظاہراً اور باطناً اچھی سے اچھی نماز پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور مؤذن پر لوگوں نے اذان کے بارہ میں اعتماد کیا ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی مصالح اور خواہشات کی رعایت کیے بغیر صحیح وقت پر اذان پڑھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں مؤذن اور امام دونوں کی ذمہ داری بتلائی اور دونوں کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

(۱۴) عَنْ مَالِکِ بْنِ الْحُوَیْرِثِ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ اَنَا وَابْنُ عَمٍّ لِّیْ فَقَالَ اِذَا سَافَرْتُمَا فَاَذِّنَا وَاَقِیْمَا وَلْیَؤُمَّکُمَا اَکْبَرُکُمَا ـــــ رواہ البخاری

(ترجمہ) مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے ایک چچا زاد بھائی بھی ساتھ تھے، تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سفر کرو تو نماز کے لیے اذان اور اقامت کہو اور جو تم میں بڑا ہو وہ امامت کرے اور نماز پڑھائے۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) صحیح بخاری ہی کی دوسری ایک روایت میں ہے کہ یہ مالک بن الحویرث اپنے قبیلہ کے بعض اور آدمیوں کے ساتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور دین سیکھنے اور حضور کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کی نیت سے قریباً بیس دن قیام کیا تھا

اپنی اس روایت میں انھوں نے حضور کے جس ارشاد کا ذکر کیا ہے وہ غالباً اُس وقت کا ہے جب وطن واپس جانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رخصت فرمایا تھا، اس میں آپ نے ان کو دو ہدایتیں فرمائیں ایک یہ کہ سفر میں بھی نماز کے لیے اذان و اقامت کا اہتمام کیا جائے اور دوسری یہ ہے کہ جو بڑا ہو وہ امامت کرے، چونکہ دین اور علم دین کے لحاظ سے یہ اور ان کے ساتھی بظاہر برابر تھے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں کوئی خاص فضیلت اور فوقیت حاصل نہیں تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم میں عمر کے لحاظ سے جو بڑا ہو وہ امامت کرے۔ اور ایسی صورت میں یہی اصول اور مسئلہ ہے۔

اذان اور مؤذنوں کی فضیلت :-

(۴۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَسْمَعُ مَدٰی صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا اِنْسٌ وَلَا شَیْءٌ اِلَّا شَہِدَ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔

رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہونچتی ہے وہاں تک جو جن اور جو انسان اور جو چیز بھی ان کی آواز سنتی ہے وہ قیامت کے دن ضرور اس کے حق میں شہادت دے گی۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو اپنی معرفت کا کچھ حصہ عطا فرمایا ہے (وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ)[1] اس لیے جب مؤذن اذان دیتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی توحید اور اس کے رسول کی رسالت اور اس کی

---

[1] یہ قرآن مجید کی آیت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز اور ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کرتی ہے لیکن ان کی یہ تسبیح اور حمد تم انسانوں کے فہم و ادراک سے باہر ہے۔

دعوت کا اعلان کرتا ہے تو جن و انس کے علاوہ دوسری مخلوقات بھی اس کو سنتی اور سمجھتی ہیں اور قیامت میں اس کی شہادت ادا کریں گی۔ بلاشبہ اذان اور مؤذنوں کی یہ بڑی قابلِ رشک فضیلت ہے۔ وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

(۴۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ الشَّيْطَانَ إِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ بِالصَّلٰوةِ ذَهَبَ حَتّٰى يَكُوْنَ مَكَانَ الرَّوْحَاءِ۔ ——— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ شیطان جب نماز کی پکار یعنی اذان سنتا ہے تو مقامِ روحاء کی برابر دور چلا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اللہ کی مخلوق میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو بعض دوسری چیزوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ مثلاً اندھیرے کے لیے آفتاب ناقابلِ برداشت ہے۔ آفتاب کے نکلتے ہی اندھیرا کافور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سردی کے لیے آگ ناقابلِ برداشت ہے، جہاں آگ روشن کر دی جائے وہاں سے سردی دفع ہو جاتی ہے۔ بس کچھ یہی حال شیطان کا اذان کی پکار سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جیسے ہی وہ اس کو سنتا ہے اتنی دور چلا جاتا ہے جتنی دور مدینہ سے مثلاً مقامِ روحاء ہے۔ (حضرت جابر سے اس حدیث کے روایت کرنے والے راوی طلحہ بن نافع کا بیان اسی حدیث کے ساتھ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ روحاء مدینہ سے ۳۶ میل دور ہے) حدیث کی روح یہ ہے کہ اذان جو توحید اور ایمان کی پکار ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کو نہایت محبوب ہے اور اس کے اچھے بندے اس کو سن کر مسجدوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، اسی طرح شیطان مردود کے لیے وہ گویا بم کا گولا ہے۔ جہاں اللہ کے منادی نے اذان شروع کی وہ اس سے ایسا بھاگتا ہے جیسے آفتاب سے اندھیرا کافور ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۴۴) عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُوْنَ أَطْوَلُ النَّاسِ أَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ ——— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ اذان کہنے والے قیامت کے دن دوسرے سب لوگوں کے مقابلہ میں دراز گردن (یعنی سربلند) ہونگے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے الفاظ "اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا" کا لفظی ترجمہ تو دراز گردن ہی ہے۔ لیکن شارحین نے اس کے کئی مطلب بیان کیے ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک اس سے مراد انکی سربلندی ہے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ امتیاز اسی طرح حاصل ہوگا جیسا کہ آگے آنے والی حدیث میں ان کا یہ امتیاز بھی بتایا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن مُشک کے ٹیلوں پر ہوں گے۔

(۴۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَۃٌ عَلٰی كُثْبَانِ الْمِسْكِ يَوْمَ الْقِيٰمَۃِ عَبْدٌ اَدّٰى حَقَّ اللّٰہِ وَحَقَّ مَوْلَاہُ وَرَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ بِهٖ رَاضُوْنَ وَرَجُلٌ يُنَادِيْ بِالصَّلَوٰتِ الْخَمْسِ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَۃٍ۔ ——— رواہ الترمذی

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تین (قسم کے) آدمی مشک کے ٹیلوں پر تشریف رکھیں گے۔ ایک وہ نیک غلام جس نے دنیا میں اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا بھی، دوسرا وہ آدمی جو کسی جماعت کا امام بنا اور لوگ (اس کی نیکی اور پاکیزہ سیرت کی وجہ سے) اس سے راضی اور خوش رہے۔ اور تیسرا وہ بندہ جو دن رات کی پانچوں نمازوں کے لیے روزانہ اذان دیا کرتا تھا۔ (جامع ترمذی)

(۴۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَذَّنَ سَبْعَ سِنِيْنَ مُحْتَسِبًا كُتِبَ لَہٗ بَرَاءَۃٌ مِّنَ النَّارِ

رواہ الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ

(ترجمہ) حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس بندہ نے سات سال تک اللہ کے واسطے اور ثواب کی نیت سے اذان دی اس کے لیے آتش دوزخ سے برات لکھ دی جاتی ہے۔ (یعنی اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ طے فرما دیا جاتا ہے کہ دوزخ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں اور اس کی آگ اور لپیٹ کو اس بندہ کو چھونے کی بھی اجازت نہیں) (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(۷۳) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ وَالْمُلَبِّيْنَ يَخْرُجُوْنَ مِنْ قُبُوْرِهِمْ يُؤَذِّنُ الْمُؤَذِّنُ وَيُلَبِّيْ الْمُلَبِّيْ ۔ ——— رواہ الطبرانی فی الاوسط

(ترجمہ) حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اذان کہنے والے اور تلبیہ پڑھنے والے اپنی قبروں سے اس حال میں نکلیں گے کہ اذان کہنے والے اذان پکارتے ہوں گے اور تلبیہ پڑھنے والے تلبیہ کی صدا بلند کرتے ہوں گے۔ (معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) اذان اور مؤذنوں کی جو غیر معمولی فضیلتیں ان حدیثوں میں بیان فرمائی گئی ہیں ان کا راز یہی ہے کہ اذان ایمان و اسلام کا شعار اور اپنے معنی اور ترتیب کے لحاظ سے دین کی نہایت بلیغ اور جامع دعوت و پکار ہے اور مؤذن اس کا داعی اور گویا اللہ تعالیٰ کا نقیب اور منادی ہے، افسوس آج ہم مسلمانوں نے اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اور اذان کہنا ایک حقیر پیشہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عظیم ترین اجتماعی گناہ کو معاف فرمائے اور توبہ و اصلاح کی ہم کو توفیق دے۔

اذان کا جواب اور اس کے بعد کی دعا۔

(۴۴) عَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ إِذَا

قَالَ الْمُؤَذِّنُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ فَقَالَ اَحَدُکُمُ اللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ ثُمَّ قَالَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ قَالَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ثُمَّ قَالَ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ثُمَّ قَالَ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ثُمَّ قَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ قَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ ثُمَّ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مِنْ قَلْبِہٖ دَخَلَ الْجَنَّۃَ ـــــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مؤذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر اور (اس کے جواب میں) تم میں سے کوئی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر مؤذن کہے اشہد ان لا الہ الا اللہ اور وہ جواب دینے والا بھی (اس کے جواب میں) کہے اشہد ان لا الہ الا اللہ، پھر مؤذن کہے اشہد ان محمداً رسول اللہ اور وہ جواب دینے والا بھی کہے اشہد ان محمداً رسول اللہ، پھر مؤذن کہے حی علی الصلوٰۃ تو جواب دینے والا کہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ پھر مؤذن کہے حی علی الفلاح، اور جواب دینے والا کہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ، پھر مؤذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر اور جواب دینے والا بھی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر، پھر مؤذن کہے لا الہ الا اللہ اور جواب دینے والا بھی کہے لا الہ الا اللہ اور یہ کہنا دل سے ہو تو وہ جنت میں جائے گا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) ناظرین کو جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے اذان کے دو پہلو ہیں یا کہنا چاہیے کہ اذان دو حیثیتوں کی حامل ہے۔ ایک یہ کہ وہ نماز باجماعت کا اعلان اور بلاوا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایمان کی دعوت، پکار اور دینِ حق کا منشور ہے۔ پہلی حیثیت سے اذان سننے والے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اذان کی آواز سنتے ہی نماز میں شرکت کے لیے تیار ہو جائے اور ایسے وقت مسجد میں پہنچ جائے کہ جماعت میں شریک ہو سکے۔[۱] اور دوسری

---

[۱] اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تاکیدی ارشادات ان شاء اللہ آگے "جماعت" کے بیان میں درج کیے جائیں گے۔

حیثیت سے ہر مسلمان کو حکم ہے کہ وہ اذان سنتے وقت اس ایمانی دعوت کے ہر جز اور ہر کلمے کی اور اس آسمانی منشور کی ہر دفعہ کی اپنے دل اور اپنی زبان سے تصدیق کرے اور اس طرح پوری اسلامی آبادی ہر اذان کے وقت اپنے ایمانی عہد و میثاق کی تجدید کیا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کا جواب دینے کی اور اس کے بعد کی دعائیں پھر کلمۂ شہادت پڑھنے کی اپنے ارشادات میں جو تعلیم و ترغیب دی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک اس کی خاص حکمت یہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم ——— اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اذان کا جواب جو بظاہر ایک معمولی سا عمل ہے اس پر داخلہ جنت کی بشارت کا کیا راز ہے؟

(۴۹) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یَسْمَعُ الْمُؤَذِّنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا غُفِرَلَہٗ ذَنْبُہٗ ـ

——— رواہ مسلم ———

(ترجمہ) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مؤذن کی اذان سننے کے وقت (یعنی جب وہ اذان پڑھ کر فارغ ہو جائے) کہے کہ میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور میں راضی و خوش ہوں اللہ کو رب مان کر اور حضرت محمد کو رسول مان کر اور اسلام کو دین حق مان کر، تو اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) نیک اعمال کی برکت سے گناہوں کی بخشش کے بارے میں کچھ ضروری وضاحت وضو کے فضائل و برکات کے بیان میں کی جا چکی ہے، وہ بیان بھی محفوظ رہنی چاہیے۔

(۵۰) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یَسْمَعُ النِّدَاءَ اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَةِ

التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَ نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ حَلَّتْ لَهٗ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ـــــــ رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی بندہ اذان سننے کے وقت اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرے "اے اللہ اس دعوتِ تامّہ کاملہ اور اس صلوٰۃ قائمہ دائمہ کے رب! (یعنی اے وہ اللہ جس کے لیے اور جس کے حکم سے یہ اذان اور یہ نماز ہے) (اپنے رسول پاک) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ اور فضیلہ کا خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرما اور ان کو اس مقامِ محمود پر سرفراز فرما جس کا تو نے ان کے لیے وعدہ فرمایا ہے" تو وہ بندہ قیامت کے دن میری شفاعت کا حقدار ہو گیا۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین چیزوں کی دعا کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو بندہ اذان سننے کے وقت اللہ تعالیٰ سے ان تین چیزوں کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کرنے کی دعا کرے گا وہ قیامت کے دن شفاعتِ محمدی کا خاص طور سے حقدار ہو گا ـــــ ایک وسیلہ ـــ دوسرے فضیلۃ ـــ تیسرے مقامِ محمود ـــ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس وسیلہ کی تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقبولیت و محبوبیت کا ایک خاص الخاص مقام و مرتبہ اور جنت کا ایک مخصوص و ممتاز درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی ایک ہی بندہ کو ملنے والا ہے، اور سمجھنا چاہیے کہ فضیلۃ بھی گویا اسی مقامِ اختصاص و امتیاز کا ایک عنوان ہے۔ اور اسی طرح مقامِ محمود وہ مقامِ عزت ہے جس پر فائز ہونے والا ہر ایک کی نگاہ میں محمود اور محترم ہو گا اور سب اس کے ثنا خواں اور شکر گزار ہوں گے ـــــ

اسی سلسلۂ "معارف الحدیث" کی پہلی جلد میں شفاعت کے بیان میں وہ حدیثیں ناظرین کی نظر سے گزر چکی ہوں گی جن میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن جو اللہ تعالیٰ کے جلال کے

ظہور کا خاص دن ہوگا اور سارے انسان اپنے اعمال اور احوال کے اختلاف کے باوجود اس
وقت دہشت زدہ اور پریشان ہوں گے۔ حتیٰ کہ حضرت نوح وابراہیم اور موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام
جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ کرسکیں گے تو اس وقت
سید الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی "انا لہا انا لہا" کہہ کر احکم الحاکمین کی بارگاہ جلال میں
سب سے پہلے سارے انسانوں کے لیے حساب اور فیصلہ کی استدعا اور شفاعت کریں گے اور اس کے
بعد گنہگاروں کی سفارش اور ان کے دوزخ سے نکالے جانے کی استدعا کا دروازہ بھی آپ ہی کے
اقدام سے کھلے گا، خود آپ کا ارشاد ہے "انا اول شافع واول مشفع" (سب سے پہلا
شافع میں ہوں گا اور بارگاہ خداوندی میں سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی)
نیز آپ کا ارشاد ہے "وانا حامل لواء الحمد یوم القیامۃ آدم فمن دونہ
ولا فخر" (قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور آدم اور ان کے علاوہ سارے
انبیاء ورسل اور ان کے متبعین میرے اسی جھنڈے لوا کے نیچے ہوں گے۔) بس یہی وہ
مقام محمود ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے "عسیٰ
ان یبعثک ربک مقاماً محموداً" (بنی اسرائیل ع ۹) (امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو
مقام محمود عطا فرمادے)۔ الغرض وہ خاص انتہائی بلند درجہ جس کو حدیث میں "وسیلہ
اور فضیلہ" کہا گیا ہے اور عزت وامتیاز اور محمودیت کا وہ مقام جس کو قرآن مجید میں
اور اس حدیث میں مقام محمود کہا گیا ہے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے والے ہیں اور
تقدیر الٰہی ازل ہی سے آپ کو نامزد کرچکی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم امتیوں
پر یہ نوازش ہے کہ زیر تشریح حدیث میں آپ نے ہم کو اس کی ترغیب دی کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ
سے دعا کریں کہ یہ درجے اور مقامات آپ کو عطا فرمائے جائیں، اور بتلایا کہ جو کوئی میرے لیے
یہ دعا کرے گا وہ قیامت کے دن میری شفاعت کا خاص طور سے مستحق ہوگا۔

(فائدہ) مندرجہ بالا تینوں حدیثوں پر عمل کرنے کا طریقہ اور ترتیب یہ ہے کہ مؤذن
کی اذان کے ساتھ ساتھ تو اس کے کلمات دہرائے جائیں [illegible] حدیث
میں مذکور ہوا اور اس کے بعد [illegible] حدیث کے مطابق کہا جائے "اشہد ان لا الہ

الا اللہ (آخر تک) اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کی جائے "اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ سے وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ن الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ تک۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں نقل کیا ہے کہ بیہقی کی روایت میں اس دعا کے آخر میں "اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" کا اضافہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ ان احکام کی روح کو سمجھ کر ان پر عمل کی حقیقی برکات حاصل کریں۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات

(از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[یہ مولانا کی تازہ ترین کتاب "ہندوستانی مسلمان" کا ایک باب ہے۔ کتاب ابھی ابھی پریس سے نکل کر آئی ہے ——————— ادارہ]

مسلمان مبلغ اور درویش

اس عظیم ملک میں مسلمان بھی تو ہر قسم کے دنیاوی مفاد اور مادی منفعت سے بے نیاز ہو کر خالص دینی جذبات کے تحت داخل ہوئے وہ یہاں اسلامی عدل و انصاف کا پیغام لے کر آئے، تاکہ تنگ و تاریک دنیا میں روشنی و کشادگی کے لئے ترستی ہوئی انسانیت، کو خدا کی وسیع زمین میں فطرت کے انمول خزانوں سے بہرہ ور ہونے کا طریقہ سکھلائیں اور غلامی و محکومی کی آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے بے بس انسانوں کو خالق کائنات کی بخشی ہوئی آزادی سے مستفید ہونے کا موقع دلائیں۔ اسلام کے بے لوث خادموں اور شاہان بوریہ نشین کی زندگیاں ان مخلص مبلغوں کی بہترین مثال ہے جن کے سایۂ عاطفت میں ہندوستانی معاشرہ کے ستائے ہوئے ہزاروں مظلوموں کو نہ صرف پناہ ملی بلکہ وہ انکے یہاں حقیقی باپ بیٹوں اور بھائی بہنوں کی طرح رہنے لگے، حضرت سید علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین اجمیری، اور سید علی صاحب ہمدانی کشمیری کا شمار انہیں بزرگوں میں ہوتا ہے۔

فاتح و بانیانِ حکومت

یہی مسلمان اس ملک میں فاتح سپہ سالاروں اور بانیِ حکومت سلاطین کی حیثیت سے آئے جیسے سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری اور قطب الدین ایبک دہلوی وغیرہ سلاطین کے ہاتھوں اس ملک میں ایسی عظیم الشان حکومت کی بنیاد پڑی جس نے صدیوں تک اس ملک کی خدمت کی اور اسے ترقی و خوشحالی کی بلندترین

منزل تک پہونچا دیا۔

ملک سے دائمی تعلق وجذبۂ خدمت

غرضکہ مسلمان جس حیثیت سے بھی اس ملک میں آئے انھوں نے اسے اپنا وطن سمجھا، ان کا عقیدہ تھا کہ زمین خدا کی ہے وہی جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث ونگہبان بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو خدا کی طرف سے اسکی زمین کا منتظم اور اس کی مخلوق کا خادم سمجھتے تھے اور اس پر عقیدہ رکھتے تھے کہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اس لیئے مسلمانوں نے ہمیشہ اس ملک کو اپنا وطن، اپنا گھر اور اپنی ابدی قیام گاہ سمجھا جس سے وہ کبھی اپنی نظریں پھیر نہ سکتے تھے چنانچہ اس ملک کی خدمت کے لیئے انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور خداداد قابلیت وذہانت صرف کردی، ان کا خیال تھا کہ وہ اس ملک کی دولت میں جو بھی اضافہ کریںگے وہ گویا خود انکی اپنی ثروت میں اضافہ ہوگا کیونکہ انکا مستقبل اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ اس تصور کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان جس نظر سے اس ملک کو دیکھتے تھے وہ انگریزوں اور دوسری استعمار پسند طاقتوں سے بالکل مختلف تھی، یورپ کی استعماری طاقتوں کا مقصد صرف یہاں کی دولت کھینچنا تھا، ان کے نزدیک دراصل اس ملک کی حیثیت ایک مستعار دودھاری گائے کی سی تھی جو ان کے پاس چند دن رہ کر واپس چلی جانے والی تھی، اس لیئے وہ اسکو اچھی طرح دوہ لینا چاہتے تھے، اس ملک کی ترقی وخوشحالی میں مسلمانوں نے جس دلچسپی سے کام لیا اس کا حقیقی راز یہی ہے۔

باہر کی متمدن دنیا سے ہندستان کی بے تعلقی

مسلمان جب ہندستان میں آئے تو یہاں قدیم علوم وفلسفہ موجود تھا، پھل، غلہ، میوہ اور خام اشیا بکثرت پیدا ہوتی تھیں، لیکن تہذیبی لحاظ سے وہ متمدن دنیا سے عرصہ دراز سے بالکل الگ تھلگ تھا، ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ اور دوسری طرف وسیع سمندر اُسے بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنے سے روکتے تھے۔ سب سے آخری تاجدار جو باہر کی متمدن دنیا سے یہاں آیا تھا وہ سکندر اعظم تھا، اسکے بعد سے مسلمانوں کے آنے تک باہر کی دنیا سے اس ملک کا

کوئی رشتہ نہ تھا۔ نہ تو باہر کے افکار و خیالات، علوم و تمدن اور نظم و نسق کے نئے طریقے یہاں تک پہونچ سکتے تھے اور نہ یہاں کے قدیم علوم باہر جا سکتے تھے۔

متمدن اور ترقی یافتہ دنیا سے ذریعۂ اتصال

ایسی حالت میں مسلمان جو اس وقت مشرق بلکہ پورے کرۂ ارض کی سب سے ترقی یافتہ قوم تھے اس ملک میں داخل ہوئے ان کے ساتھ ایک نیا، مبنی بر عقل و حکمت اور عملی دین تھا، پختہ علوم، ترقی یافتہ تمدن، شائستہ تہذیب، متعدد تہذیبوں کے قیمتی تجربات اور شاداب دماغوں اور دنیا کی بہت سی قوموں کے ذہین و ذکی انسانوں کے نتائج فکر تھے جس میں عربوں کا ذوق سلیم، ایرانیوں کی لطافت اور ترکوں کی سادگی تھی اسکے علاوہ بہت سی نادر چیزیں اور یکتائے روزگار تحفے تھے۔

توحید اور خدا پرستی کا اسلامی عطیہ

سب سے بیش قیمت اور نادر تحفہ جو مسلمان یہاں لائے وہ اسلام کا خالص اور بے میل عقیدۂ توحید تھا جس کے تحت عبد و معبود کے درمیان دعا و عبادت کے لئے کسی درمیانی ہستی کی ضرورت نہیں ہے، اس عقیدہ میں "تعدد الٰہ" خدا کے مظہر یا سایہ کے تصور اور "حلول و اتحاد" کے عقیدہ و نظریہ کی گنجائش نہیں، بلکہ خدائے واحد و بے نیاز کی الوہیت اور وحدانیت کا اعتراف و اقرار ہے جس کے نہ کوئی بیٹا ہے نہ باپ اور نہ خدائی میں کوئی اس کا شریک، کائنات کی خالقیت و پیدائش، دنیا کا نظم و نسق اور زمین و آسمان کا اقتدار اعلیٰ اسی کے ہاتھ میں ہے، اس عقیدۂ توحید کا اثر ہندستان کے ذہن پر جو صدیوں سے اس توحید خالص کے عقیدہ سے ناآشنا تھا قدرتی تھا۔ ہند و تہذیب اور ہندو مذہب پر اسلام کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور فاضل و مورخ ڈاکٹر کے، ایم، پانیکر لکھتے ہیں:-

> "اور یہ بات تو واضح ہے کہ اس عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا، ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا، اور اس زمانہ کے تمام ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام چاہے کچھ بھی رکھا ہو خدا پرستی ہی کی تعلیم دی، یعنی خدا ایک ہے وہی عبادت کے لائق

ہے اور اسی کے ذریعہ ہم کو نجات مل سکتی ہے[1]"

اسلامی اخوت و مساوات کا تحفہ

اجتماعی زندگی میں ہندستان کے لئے سب سے نئی اور قیمتی چیز "اسلامی اخوت و مساوات" کا تصور تھا، مسلمانوں کے یہاں نہ تو طبقاتی اونچ نیچ تھی، اور نہ اچھوت نام کی کوئی قوم تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی شخص جنم کا ناپاک یا جاہل نہیں ہوتا کہ جس کو حصول علم کا حق نہ ہو، کسی پیشے یا صنعت کے لئے کوئی ذات خاص نہیں تھی بلکہ ایک ساتھ رہتے تھے، کھاتے پیتے تھے اور امیر و غریب سب پہلو بہ پہلو حصول علم کی کوششیں کرتے تھے، ہر شخص کو حق تھا جو پیشہ چاہے اختیار کرے، انسانی مساوات کا یہ نظام ہندستانی ذہن اور ہندستانی سماج کے لئے ایک نیا تجربہ اور غور و فکر کی دعوت تھی، جس سے اس ملک کو بہت فائدہ پہونچا ـــــ اسی کے نتیجہ میں رائج الوقت طبقاتی نظام کی بندشیں بڑی حد تک ڈھیلی پڑگئیں اور ملک میں طبقاتی نظام کے خلاف ردعمل شروع ہوگیا، نیز معاشرتی اصلاح کے علمبرداروں کے لئے اس نے مہمیز کا کام کیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کردیا، اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے اس سے بہت متاثر ہوئے[2]"

عورت کے حقوق اور بعض رسوم کی اصلاح

دوسرا تحفہ جو مسلمان اس ملک کے لئے لائے وہ عورت کی عزت اور خاندان انسانی کے ایک باعزت فرد اور مرد کی رفیقۂ حیات

---

[1] A SURVEY OF INDIAN HISTORY ماخوذ از ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک مطبوعہ دار المصنفین صفحہ ۳۵

[2] تلاش ہند صفحہ ۵۲۶، ۵۲۵ (DISCOVERY OF INDIA)

کی حیثیت سے اسکے حقوق کا اعتراف تھا، ایک ایسے ملک میں جہاں شریف عورتیں شوہروں کی موت پر ستی ہوجاتی تھیں، کیونکہ سماج اور خود ان کی نظر میں شوہر کے بعد انھیں زندہ رہنے کا حق ہی نہ تھا، اسلام کے بخشے ہوئے صنف نازک کے حقوق کی جو اہمیت ہوسکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

ستی کی مہیب دلرزہ خیز رسم کی اصلاح میں بھی مسلمان سلاطین اور اہل حکومت نے ہندستان کے مذہبی عقائد ورسوم کے احترام اور رعایت کے ساتھ ممکن حصہ لیا، ہندستان کا مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے:-

"آج کل پہلے کی نسبت ستی کی تعداد کم ہوگئی ہے، کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں اس وحشیانہ رسم کو نیست ونابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں، اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہے، کیونکہ ان کی پالیسی (تدبیر مملکت) کا یہ جزء ہے کہ ہندوؤں کے معاملات میں دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے، بلکہ مذہبی رسم کے بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں، تاہم ستی کی رسم ورواج کو بعض اینچ پینچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہوسکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا، جب تک واقعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہوجاتا کہ وہ اپنے ارادے سے ہرگز باز نہ آئے گی۔

صوبہ دار بیوہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اگر اسکی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنے محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں، مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے" [1]

---

[1] وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر جلد دوم صفحہ

فن تاریخ مسلمانوں نے بہت سے جدید علوم کلی ہندستان میں منتقل کئے ان علوم میں تاریخ کا فن بہت اہم ہے، کیونکہ اس وقت تک اس فن میں یہ ملک بالکل تہی دست تھا، یہاں کوئی کتاب صحیح معنوں میں تاریخ کی کتاب کہلانے کی مستحق نہ تھی، بلکہ صرف مذہبی نوشتے رزمیہ قصائد اور مہابھارت و راماین کے نسخے ملتے تھے، مسلمانوں نے فن تاریخ میں مستقل کتب خانہ تیار کر دیا جس کا شمار تاریخ کے وسیع ترین کتب خانوں میں کیا جا سکتا ہے جو کسی ملک میں وجود میں آئے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الثقافة الاسلامیة فی الهند"[1] (ہندستان میں اسلامی کلچر) کے سرسری جائزہ سے فن تاریخ میں مسلمانان ہند کی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر گسٹاولی بان اپنی کتاب "تمدن ہند" میں لکھتا ہے:۔

> "قدیم ہند کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے، ان کی کتابوں میں مطلقاً تاریخی واقعات درج نہیں ہیں اور نہ ان کی عمارات اور یادگاروں سے اس کمی کی تلافی ہوتی ہے کیونکہ پرانی سے پرانی یادگار بمشکل تیسری صدی سے ماقبل کی ہو، علاوہ چند مذہبی کتابوں کے جن میں بعض تاریخی واقعات کہانیوں اور حکایات کے اندر دفن ہیں، قدیم ہند کے حالات کا معلوم کرنا اسی قدر مشکل ہے جیسا کہ اس خیالی جزیرہ اٹلانٹس کا جو بقول افلاطون انقلاب ارضی کی وجہ سے تباہ ہوگیا۔"

پھر یہ لکھنے کے بعد کہ وید اور راماین مہابھارت سے کسی قدر اس ملک کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، لکھتا ہے:۔

> "ہندستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا اور ہندستان کے پہلے مورخ مسلمان تھے۔"[2]

---

[1] حال ہی میں دمشق کی مشہور اکیڈمی "المجمع العلمی العربی" نے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔

[2] تمدن ہند کتاب سوم ہندستان کی تاریخ ص۱۳۶

ہندستان کو مسلمانوں سے عمومی طور پر وسعت خیال، ندرت فکر اور شعر و ادب کے نئے نئے اسالیب ملے، نیا زاویہ نگاہ اور نیا انداز فکر بغیر عقلی اور ادبی و فکری امتزاج کے ناممکن تھا۔ دوسرے تحائف اور اضافوں کے ساتھ جو مسلمانوں نے ہندستانی تہذیب میں کئے، مسلمانوں نے اس ملک کو ایک نہایت حسین اور وسیع زبان دی جو ہندستان کی مختلف قوموں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ اور علم و ادب کی زبان قرار پائی، میری مراد اُردو سے ہے، جس کی وسعت اور شیرینی محتاج تعارف نہیں ہے۔

نئے اسالیب

اس ملک کی تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور زندگی کے طور طریقوں پر مسلمانوں کی چھاپ دوسرے تمام گوشوں سے زیادہ گہری نظر آتی ہے، انھوں نے اس ملک کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا جو اس برصغیر کے پرانے ڈھانچوں سے بالکل مختلف تھا، بالکل اسی طرح جیسے موجودہ یورپ کی زندگی وہاں کے قرون وسطیٰ کی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔

تہذیب و تمدن میں انقلاب

مسلمانوں نے اس ملک کے تہذیبی سرمائے میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اسکی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم ہندستان کے اس دور کا جائزہ لیں، جب مسلمان یہاں نہیں آئے تھے اور جدید اسلامی ہند کی تعمیر نہیں ہوئی تھی، سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر (۸۸۸ - ۹۳۷) نے مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس ملک کی زندگی کا نقشہ بہت ہی واضح طور پر کھینچا ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اس سرزمین کو اپنے تعمیری ذوق اور ماہرانہ صلاحیتوں کی بدولت کہاں سے کہاں پہونچا دیا، واضح رہے کہ مغلوں کی آمد سے بہت پہلے ہندستان میں مسلمانوں نے تعمیر و ترقی کی جد و جہد شروع کر دی تھی، بابر اپنی توزک میں لکھتا ہے:۔

قدیم ہندستان کی تصویر بابر کے قلم سے

"ہندستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور نہیں خربوزہ نہیں، برف نہیں، آب سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع نہیں، مشعل نہیں شمع دان نہیں، شمع کے بجائے ڈیوٹ ہوتا ہے، یہ تین پائے کا ہوتا ہے، ایک پایہ میں چراغ دان کے منہ کے شکل کا ایک لوہا لکڑی میں وصل کر کے

لگا دیتے ہیں، ایک وحشی بتی دوسرے کر پائے میں لگی ہوتی ہے داہنے ہاتھ میں
کدو کی ایک تونبی ہوتی ہے جس کا سوراخ تنگ ہوتا ہے، اسی کی راہ سے تیل
کی پتلی سی دھار گرتی ہے، راجوں اور مہاراجوں کو رات کے وقت روشنی کا
کچھ کام پڑتا ہے تو نوکر یہی کثیف ڈیوٹ لے کر ان کے پاس کھڑے ہوتے ہیں"
باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں، عمارتوں میں نہ صفائی ہے نہ
موزونی، نہ ہوا، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں ایک لنگوٹی لگائے پھرتے
ہیں، عورتیں لنگی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں، اور
آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کی اس تصویر پر جو بابر کی توزک پیش کرتی ہے تبصرہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بابر کی لکھی ہوئی تاریخ سے ہمیں اس تہذیبی افلاس کا پتہ چلتا ہے جو شمالی ہند
پر چھایا ہوا تھا، اسکی وجہ کچھ تو وہ بربادی تھی جو تیمور کے حملہ کے باعث ظہور میں
آئی اور کچھ یہ بات تھی کہ بہت سے عالم، آرٹسٹ اور صناع شمالی ہند چھوڑ کر
جنوب کی طرف چلے گئے تھے، اس تنزل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندستانیوں
کی تخلیقی قوتوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔"

بابر کہتا ہے کہ اس ملک میں ہوشیار کاریگروں اور صناعوں کی کمی نہیں
ہے لیکن یہاں کے میکانکی اختراعات میں ذہانت اور ہوشیاری بالکل نہیں[۱]....

میوہ جات کی ترقی

سرسبزی و شادابی کے باوجود اس ملک میں میوہ جات اور پھل بہت کم
تعداد میں اور کم حیثیت میں ہوتے تھے اور جو کچھ پیدا ہوتے تھے وہ عموماً
خود رو تھے جن کی طرف اہل ملک خاطر خواہ توجہ نہ دیتے تھے، لیکن جب مغل جن کا ذوق
بہت بلند تھا اور جن کے وطن میں بکثرت پھل اور میوے پیدا ہوتے تھے، اس ملک میں

۱؎ تلاش ہند صفحہ ۵۲ جلد اوّل (DISCOVERY OF INDIA)

داخل ہوئے، تو انھوں نے پھلوں اور میوہ جات کو بڑی ترقی دی جن کی تفصیل "تزک بابری" اور "تزک جہانگیری" سے معلوم کی جاسکتی ہے، مغلوں نے ہندستانی پھلوں کی طرف خاص توجہ کی اور مختلف اقسام کے پھلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ قلم کرکے متعدد انوکھی اور لذیذ قسمیں دریافت کیں، آم ہندستان کا مشہور اور لذیذ ترین پھل ہے، مغلوں کے داخلہ سے قبل اس کی صرف ایک قسم یعنی تخمی ہوتی تھی، لیکن انھوں نے مختلف اقسام کے باہمی میل سے قلمی آم دریافت کیے، جو نہایت لذیذ اور خوش رنگ ہوتے ہیں، اس کے نتیجہ میں قلمی آم کی اتنی قسمیں پیدا ہونے لگیں جن کا شمار مشکل ہے۔

صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت کی ترقی

یہی حال کپڑے کی صنعت کا تھا، ہندستانیوں کا لباس عام طور سے گزی گاڑھا اور معمولی قسم کے موٹے سوت یا خام اون کا ہوتا تھا۔ سلطان محمود بن محمد شاہ گجراتی نے جو محمود بیگڑہ (م ۹۱۷ھ) کے نام سے مشہور تھا متعدد کارخانے قائم کیے تھے جن میں کپڑا بنائی، رنگائی چھپائی اور ڈیزائن تیار کرنے کا کام ہوتا تھا، سنگ تراشی، ہاتھی دانت، ریشمی کپڑے اور کاغذ سازی کے کارخانے بھی قائم کیے گئے، سلطان محمود گجراتی نے بڑا ستھرا تعمیری ذوق پایا تھا، اس نے ملک کے گوشہ گوشہ میں بے مثال صنعتی، زرعی اور تجارتی سرگرمی پیدا کردی تھی، ہندستان کے مایۂ ناز مورخ مولانا سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ "نزہۃ الخواطر" میں سلطان مذکور کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

"سلطان کے عظیم کارناموں میں ملک کی ترقی، مسجدوں، مدرسوں اور مسافرخانوں کی تعمیر، زرعی پیداوار میں اضافہ سے پھل دار درختوں اور باغات کی تعمیر شامل ہے، اس نے لوگوں کو ان کاموں کے لئے ابھارا اور آبپاشی کے لئے کنوئیں اور نہریں بنوائیں، اسی لئے کاریگر، معمار اور صنعت وحرفت کے ماہرین ایران وترکستان سے اس کے پاس کثیر تعداد میں آئے اور نئی صنعتیں یہاں جاری کیں، جس کے نتیجہ میں گجرات کنوؤں اور چشموں کی بدولت ایک سرسبز وشاداب چمنستان بن گیا جہاں لہلہاتی

کھیتیاں، گھنے باغات اور لذیذ میوے پیدا ہونے لگے، اسکے علاوہ گجرات ایک تجارتی منڈی بھی بن گیا، جہاں سے اعلیٰ قسم کے قیمتی کپڑے بیرون ہند بھیجے جاتے تھے، یہ سب کچھ سلطان محمود شاہ کی توجہ اور ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی کے لئے اسکی گہری دلچسپی کا نتیجہ تھا۔[1]

شیر شاہ اور اکبر کی اصلاحات اور قوانین آراضی

آراضی کے لگان اور جائداد کی پیمائش وغیرہ کے نظام میں مسلمان بادشاہوں نے خاص اصلاحات کیں، اور قوانین بنائے، مالیات خصوصاً سکوں کی تنظیم کے سلسلہ میں جو بیش قیمت اصلاحات اس دور میں ہوئیں اس سے قبل ہندستان ان سے قطعاً ناواقف تھا، قانون سازی اور دفتری تنظیم میں شیر شاہ سوری کو کمال حاصل تھا اسی کی پیروی بعد کو اکبر نے کی۔

رفاہ عامہ کے کام

جانوروں کی تربیت اور انکی نسلوں کی ترقی میں بھی مسلم حکومتوں کو کمال حاصل تھا جہانگیر کی "توزک" اور دوسری کتب تاریخ مثلاً آئین اکبری وغیرہ میں یہ چیز تفصیل سے ملے گی۔۔۔

اسپتالوں و محتاج خانوں کے قیام اور باغ عامہ تفریح گاہوں، بڑی بڑی نہروں اور وسیع تالابوں کی تعمیر مسلم حکومتوں کا کارنامہ ہے، مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے اپنی بے نظیر کتاب "جنۃ المشرق"[2] میں اسلامی عہد کے ہندستان کے شفاخانوں، رفاہ عام کے اداروں اور تعمیری منصوبوں کی طویل فہرست درج کی ہے۔

ہندستان کے مشرقی و مغربی حصوں کو ملانے والی طویل ترین سڑکیں بھی مسلمان بادشاہوں کی بنوائی ہوئی ہیں، ان میں سب سے مشہور سڑک شیر شاہ کی بنوائی ہوئی سڑک ہے جو (اس وقت کے مشرقی پاکستان کے آخری حدود) سنار گاؤں سے لے کر (مغربی پاکستان میں) سندھ کے مقام نیلاب تک جاتی ہے اس سڑک کی لمبائی تین ہزار میل یا چار ہزار آٹھ سو بتیس (۴۸۳۲) کیلومیٹر ہے، ہر تین کیلومیٹر یا دو میل پر ایک مسافر خانہ ہوتا تھا، جس میں ایک لنگر ہندوؤں کے لئے اور دوسرا مسلمانوں کے لئے ہوتا تھا، ساتھ ہی ایک مسجد بھی ہر دو میل پر بنائی گئی تھی، جس کے مؤذن، حافظ اور امام مقرر تھے، ہر مسافر خانہ میں پیغام رسانی اور ڈاک کے لئے تیز رفتار دو گھوڑے رہتے تھے جن کی مدد سے روزانہ نیلاب کی خبریں بنگال کی دور دراز سرحد تک پہونچائی جاتی تھیں، سڑک پر دو رویہ پھل دار درخت تھے جن کا پھل اور سایہ مسافروں کے لئے بیش بہا نعمت تھی۔

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد چہارم تذکرہ سلطان محمود بن محمد گجراتی ۵۸-۳۵۷ [2] یہ کتاب ابتک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی۔

رہنے سہنے کے طریقوں میں وسعت ونظافت

مزید برآں مسلمانوں نے ہندستان کو نظافت، پاکیزگی اور خورد ونوش کی اشیاء میں خوش ذوقی، اصول صحت کی پابندی، مکانوں کو ہوادار اور روشن بنانے کا طریقہ اور قسم قسم کے کھانے پینے کے برتنوں سے بھی آشنا کیا، اس سے قبل اہل ہند بڑی بڑی دعوتوں میں درخت کے پتوں پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے اور آج بھی کہیں کہیں اس کا دستور باقی ہے، لیکن مسلمانوں نے یہاں کے سماج، یہاں کے گھریلو زندگی اور گھروں کی آرائش وزیبائش میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ انھوں نے جدید فن تعمیر بھی ایجاد کیا جو سنجیدگی، لطافت، حسن اور تناسب میں ملک کے قدیم فن تعمیر سے ممتاز تھا۔ تاج محل فن تعمیر کے عجوبۂ روزگار نمونہ کی حیثیت سے اس عہد زریں کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔

تمدن وثقافت پر گہرے اثرات

پنڈت جواہر لال نہرو نے (DISCOVERY OF INDIA) میں ہندستانی سماج، ہندستانی فکر اور ہندستانی تمدن وثقافت پر مسلمانوں کے ناقابل فراموش گہرے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"ہندستان میں اسلام کی اور ان مختلف قوموں کی آمد نے جو اپنے ساتھ نئے خیالات اور زندگی کے مختلف طرز لے کر آئیں یہاں کے عقائد اور یہاں کی ہیئت اجتماعی کو متاثر کیا، بیرونی فتح خواہ کچھ بھی برائیاں لے کر آئے اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے، یہ عوام کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کر دیتی ہے اور انھیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی حصار سے باہر نکلیں وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں زیادہ بڑی اور بوقلموں ہے جیسی کہ وہ سمجھ رہے تھے بالکل اسی طرح افغان فتح نے ہندستان پر اثر ڈالا اور بہت سی تبدیلیاں وجود میں آگئیں، اس سے بھی زیادہ تبدیلیاں اس وقت ظہور میں آئیں جب مغل ہندستان میں آئے کیونکہ یہ افغانوں سے زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تھے، انھوں نے ہندستان میں خصوصیت کے ساتھ اس نفاست کو رائج کیا جو ایران کا حصہ تھی۔"

اس حقیقت کا اعتراف سابق صدر کانگرس اور جنگ آزادی کے ایک رہنما ڈاکٹر پٹابی سیتا رمیہ نے بھی کانگرس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ سے کیا۔

"مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے اور ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا، نیز وہ ملک کے دور دراز حصوں کو ایک دوسرے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے"[1]

طبی خدمات

مسلمانوں کی آمد اور ان کی حکومتوں کی وجہ سے ہندستان کو اس وقت کی متمدن و ترقی یافتہ دنیا میں جو مرکزیت حاصل ہو گئی تھی اس کی بدولت اس ملک کو جو علمی اور مادی فوائد حاصل ہوئے ان میں ایک وہ نظام علاج و معالجہ بھی ہے جو طب جدید کی ترقی اور وسعت کے دور سے پیشتر دنیا کا سب سے ترقی یافتہ، منظم اور مقبول طریق علاج تھا اور جس کو عام طور پر طب یونانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عراق و ایران و ترکستان اپنے دور عروج میں اس طب کا سب سے بڑا مرکز تھے، اور وہیں قرون وسطیٰ میں اسکے امام فن اور محقق پیدا ہوئے، ہندستان میں طاقتور اسلامی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد اور شاہان ہند کی علوم و فنون کی قدر دانی اور اولوالعزمی کی داستانیں سننے کے بعد اس فن کے کامل اور ماہر یکے بعد دیگرے اس ملک کا رخ کرتے رہے، یہ سلسلہ ساتویں صدی ہجری سے شروع ہو گیا اور تقریباً بارہویں صدی تک قائم رہا، ہندستان کے ان باکمال مہمانوں اور مجتہد الفن حکماء پھر ان کے کامل الفن تلامذہ اور حاذق طبیبوں کی قابلیت و حذاقت، انہماک اور جذبۂ خدمت کی بدولت یہ فن ہندستان میں اپنے پورے عروج پر پہونچ گیا، اور اسکے سامنے تمام قدیم طریق علاج ماند پڑ گئے، ہندستان کا کوئی شہر، قصبہ طبیبوں سے خالی نہیں رہا یہ طریق علاج ارزاں بھی تھا، سہل الحصول بھی تھا، ہندستان کے مزاج وطبیعت و آب وہوا کے مطابق بھی تھا اور اس وقت کی دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور وسیع طریق علاج تھا، اس لئے بہت جلد مقبول ہوا اور سرعت کے ساتھ پھیلا اور اس نے کثیر آبادی کے اس ملک کے باشندوں کی جن میں بڑی تعداد غرباء کی ہے گرانقدر

---

[1] خطبۂ صدارت انڈین نیشنل کانگرس اجلاس جے پور۔

مسلمان جہاں بھی گئے اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے، کچھ تو بذریعہ تلوار لیکن زیادہ تر انسانی فطرت کے دو نہایت ہی اہم احساسات کی تحریک سے، ہندوؤں نے دہانۂ گنگا کی قدیم اقوام کو کبھی اپنی برادری میں شامل نہیں کیا، مسلمانوں نے جملہ انسانی مراعات کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا، ان پُرجوش مبلغوں نے ہر جگہ یہ پیغام سنایا کہ ہر شخص کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھک جانا چاہیے، خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں، اور مٹی کے ذروں کی طرح سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ فتح کے بعد فتح کا نعرۂ جنگ ایک الہامی اور متبرک حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔"[1]

نورانی مشعل

ایک ہندستانی فاضل جناب این، سی، مہتا صاحب آئی، سی، ایس اپنے ایک انگریزی مضمون (ہندستانی تہذیب اور اسلام) میں اسلام کے فیوض احسانات کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

"اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے زمانۂ قدیم میں جبکہ پرانے تمدن انحطاط پذیر ہو رہے تھے، اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کر دیا، دیگر ممالک کی طرح ہندستان میں بھی سیاست سے زیادہ خیالات کی دنیا میں اسلام کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، آج کی اسلامی دنیا بھی ایک روحانی برادری ہے جس کو توحید اور مساوات کے مشترک عقیدے کا ایمانی رشتہ باہم منسلک کئے ہوئے ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں اسلام کی تاریخ صدیوں تک حکومت سے وابستہ رہی جس کی وجہ سے اسلام کی اصلی نوعیت پر پردہ پڑ گیا، اور اسکے فیوض نگاہوں سے مخفی ہو گئے۔"[2]

ان تاریخی حقائق کے پیش نظر صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم ملک کو جس قدر فائدہ پہونچایا وہ اس فائدہ سے بہت زیادہ ہے جو ہندستان نے انھیں پہونچایا، مسلمانوں کی آمد اس ملک کی تاریخ میں ایک نئے دور ترقی و خوشحالی کا آغاز تھا، جسے ہندستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

---

[1] ماخوذ از ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵

[2] ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ مضمون "ہندستانی تہذیب اور اسلام" از جناب این، سی، مہتا صاحب آئی، سی، ایس صفحہ ۳۱۶، ۳۱۷

آخری قسط

ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کے چند خطوط

(مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(۴)

برادر عزیز از جان سلمکم اللہ تعالیٰ[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ——— مسرت نامہ موصول ہوا اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہاں کی آب ہوا تمھارے مزاج کے موافق ہے۔ طب کی کتابوں میں نیل کے پانی کی تعریف دیکھی تھی اور یقین نہ آیا تھا اب یقین آیا۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ کی آب ہوا کو تمھارے مزاج کے موافق بنادے اور ہر جگہ ہر زمانے میں تندرست اور قوی رکھے اور اپنے دین کی خدمت کی توفیق اور قوت عطا فرمائے اور تمام مسلمانوں کو اس سے مستفید فرمائے جو حالات خط سے معلوم ہوئے اس سے بڑی خوشی ہوئی اسمعی یا مصر پڑھ کر خصوصاً بہت مسرت ہوئی جو کچھ میرے دل میں تھا وہی تمھارے دل میں تھا اس لئے زبان سے وہی نکلا، اثر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے وہی مقلب القلوب ہے، اللہ تعالیٰ تمام جدوجہد، ملاقاتوں، گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہونچائے اور ان مسلمانوں کو بھی یہی کرنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے، امیر عبد الکریم سے ملاقات کا حال معلوم ہونے سے خوشی ہوئی۔ اب وہ بھی بہت بوڑھے

---

[1] یہ خط اس وقت کا ہے جب مکتوب الیہ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں مقیم تھا۔

ہوں گے، امید ہے کہ شمالی افریقہ کے لئے ان کی جد و جہد جاری ہوگی، شمالی افریقہ اور
فلسطین کے تمام دنیا کے عرب اپنے دلوں میں بے چینی پاتے ہوں گے اور کچھ نہ کچھ کرتے
ہوں گے، ضرورت اسکی ہے کہ نیت کی تصحیح کی جائے تاکہ اللہ عز و جل کی نصرت کے مستحق ہو سکیں
اور اپنے جد و جہد میں ذکر اللہ کی کثرت کی جائے امید ہے کہ مناسب موقعوں پر یہ یاد دلاتے
رہو گے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان ممالک میں بھیج کر بڑا فضل فرمایا ہے اور ایک پرانی
تمنا پوری فرمائی ہے، اس کا شکر یہی ہے کہ کوئی ساعت اور کوئی لمحہ اسکے دین کی خدمت سے
خالی نہ رہے۔ الحمد للہ جہاں تک اندازہ ہو رہا ہے ایسا ہی ہو رہا ہے مگر کارکن کو ہر موقع پر اپنی
خدمت کو حقیر سمجھنا اور زیادہ سے زیادہ خدمت کا طالب رہنا چاہیئے الحمد للہ یہ بات بھی
محسوس کر رہا ہوں۔ مصر کا قیام بہت اہم معلوم ہو رہا ہے۔ جمال الدین افغانی نے عالم اسلام
کا سفر سیاسی مقاصد سے کیا تھا اور وہ اتنا زمانہ گذرنے پر بھی بے نتیجہ نہیں رہا تھا، تمھارا
سفر الحمد للہ دینی مقاصد سے ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ انقلاب انگیز ہوگا گو اس وقت تک
کا احساس نہ ہو۔ تم نے جسٹر بنوا لیا بہت ہی اچھا کیا گو اب گرمی آرہی ہے مگر ٹرکی میں اسکی
ضرورت ہوگی اگر سوڈان جانے کا موقع مل گیا تو بہت اچھا ہوگا۔ اسمعی یا مصری میں
جو تم نے افریقہ کے متعلق کہا ہے وہ بہت اہم ہے وہی بات دوسرے اسلوب سے سوڈان
میں بھی کہنے کی ہے۔ مصر میں جو رسائل چھپوائے ہیں ان کے لئے دو سو روپے بھجوا رہا ہوں
دوسرے روز دو دو پونڈ کا منی آرڈر کیا جاتا ہے اگر عبد الرشید صاحب یا معین اللہ صاحب
کے نام مولوی عبد الغفور صاحب کے نام سے منی آرڈر پہونچے تو وہ بھی اسی کے لئے سمجھا
جائے ان منی آرڈروں کے بعد پچاس روپیہ اپنی طرف سے بھیجوں گا وہ تمھارے
ذاتی صرف کے لئے ہوں گے اسی سلسلہ میں وہ بھی جائیں گے کوپن تو ہوتا نہیں اس لئے
اسی خط میں اطلاع کر دی۔

والد ماجد رحمۃ اللہ کی کتابوں کی طباعت کی امید سے بڑی خوشی ہوئی جنۃ المشرق
کے آخری حصہ کا مقابلہ نہیں ہوا تھا ذرا اسکو دیکھ کر دینا۔ امید ہے کہ بہت معمولی غلطیاں
ہوں گی میں نے بہت کوشش کی تھی کہ مقابلہ پورا ہو جائے مگر وقت کی تنگی سے نہ ہو سکا تھا۔

معارف العوارف کا تو بالکل مقابلہ نہیں ہوا اندیشہ ہے کہ اس میں غلطیاں زیادہ نہ ہوں
اگر غلطیاں کم ہوں تو یہ[1] کی کرامت سمجھوں گا۔ تلخیص الاخبار اور اسکی شرح منتہی الافکار
کا بھی تذکرہ کر رکھنا انشاء اللہ تعالیٰ اسکی طباعت کی بھی صورت پیدا ہونے کی آئندہ
امید ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب دو تین روز کے لئے آ گئے تھے ما ذا خسر العالم
اور جو رسائل ایک ایک انھیں دیدیا ہے۔ محمد نے عربی ترجمہ بحری ڈاک سے بھیج دیا کہ
مجھ سے پوچھتے تو میں ہوائی ڈاک سے بھجواتا۔ رابع سلمہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ما ذا خسر العالم
کے جو نسخے تم نے بحری ڈاک سے بھیجے تھے وہ اب تک نہ پہونچے اندیشہ ہے کہ ضائع ہو گئے
ہوں۔ ترجمہ الخواطر جلد اول، جلد ثانی کی فروخت کا انتظام مصر میں ہو جاتا تو بہت
اچھا ہوتا۔ اگر ضرورت ہو تو لکھو اول بھیجدوں اور جلد ثانی حیدرآباد سے منگوانے کی
فکر کروں۔ سیرت سید احمد شہید جو پاکستان گئی تھی وہ سب پہونچ گئیں محمد ثانی سے میں
کہہ رہا ہوں کہ مظفر شاہ صاحب کو قیمت کے لئے لکھیں۔ امید ہے کہ روپیہ آنے میں
اب دقت نہ ہوگی۔ مصر سے آج کل پرچے شاذ و نادر آتے ہیں بلکہ نہیں آتے ہیں غالباً
جو رہ ختم ہو گیا ہوگا اسلئے وہاں موجود ہو تم نے اخبار و رسائل دیکھے ہوں گے۔ اخوان المسلمین
نے بھی اخبارات جاری کئے ہوں گے۔ ندوہ کے لئے چند ہفتہ وار اخبار اور چند علمی رسائل
منتخب کر کے اطلاع دو تو روپیہ بھیجوں۔ اگر اخباروں کے دفتر میں روپیہ بھیجنا مناسب
ہو تو پتے لکھو۔ ایسے اخبارات یا مواصلات کا تبصرہ نہ ہوں جیسے المنار اور منبر الشرق ہوتے ہیں
بلکہ اخبار ہوں جن میں ہر ملک کی خصوصاً عالم اسلامی کی خبریں ہوں، سیاسی مقالات ہوں مگر
دین کے تحت میں ہوں۔ مصر کے مدارس کے لئے جغرافیہ کی جو کتابیں لکھی ہوں اُن میں
[illegible] کے حالات پر مشتمل ہو وہ بھی منگوانا ہے اور جغرافی
[illegible] ہے کہ اگر خود مختلف کتابیں دیکھ کر
انتخاب کر کے [illegible] نے اب مجھے مطلع کر دیا۔

---

[1] مولوی [illegible] مرحوم [illegible] نے اس کتاب کی نقل کی تھی۔

مصر کی فہرست کتب میں بعض سفرنامے بھی دیکھے ہیں عبدالرشید صاحب ایسے سفرناموں کو دیکھ لیں جو جدید ترین ہوں اور اسلامی ملکوں کے حالات پر مشتمل ہوں ان کے نام اور قیمت سے مطلع کریں۔ لغت کی کتاب المعتمد جو سرکاری مدارس میں رائج ہے وہ دیکھ لینا اور منجد اور المعتمد کا موازنہ قیمت کا لحاظ رکھتے ہوئے کرنا اگر تجربہ سے المعتمد بہتر ہو تو وہ منگوائی جائے۔ دارالعلوم کے نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے حجاز و مصر میں رہنے سہنے کے بعد دارالعلوم میں جس تعلیم و تربیت کی ضرورت تمھیں محسوس ہوتی ہو اسکے لحاظ سے رائے قائم کرو اور مصر کی کتابوں پر بھی اس لحاظ سے نظر ڈالو کہ دارالعلوم کے لئے کونسی کتابیں موزوں ہوں گی۔ فقہ کے لئے اگر جدید اسلوب پر کتابیں تیار ہوئی ہوں تو ان کو نظر میں رکھنا تاکہ شرح وقایہ اور کنز و ہدایہ کے بجائے وہ داخل کی جائیں۔ غرض یہ کہ تحصیل علم کو آسان کیا جائے اور معیار پست نہ ہونے پائے۔

مولوی معین اللہ صاحب اور مولوی عبدالرشید صاحب سلام مسنون قبول کریں۔

عبدالعلی

۱۷ مارچ ۱۹۵۱ء

برادر عزیز از جان سلمکم اللہ تعالیٰ[1]

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔۔۔۔۔ تمہارے حالات سے بڑی خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے آثار نظر آرہے ہیں اللہ تعالیٰ دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور اس مرکز سے تمام عالم کو منور فرمائے اس سے پہلے جو خطوط ارسال کئے ہیں وہ پہونچے ہوں گے امید ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے اور تمھیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان و کرم کے مطابق اجر عطا فرمائے بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے مثلاً ہندو

---

[1] یہ خط حجاز بھیجا گیا جب مکتوب الیہ مصر کا ارادہ کر رہا تھا۔

دلیسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار قبول حق سے بڑا مانع ہے۔ افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے۔ اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا تمدن مذہب سے ناآشنا ہے گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے۔ قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی اور تمھاری کوششوں کو اللہ عز وجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لئے کھول دیں۔ مصر افریقہ کا دروازہ ہے اگر اہل مصر کو اس ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور مغرب صحرائے اعظم اور صحرا کے جنوب کے اور مغرب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں مصر ہو کر گذریں تو ان کو دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قرب کی غیر مسلم آبادیوں میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نور اسلام سے منور ہو سکتا ہے۔ مصری سوڈان کا تعلق ایک طرف مصر سے ہے اور جنوب میں یوگنڈا، کینیا اور کانگو سے ہے سوڈان کے لوگ بہ نسبت مصر کے تمدن جدید سے دور اور اسلام سے زیادہ قریب ہیں مصر میں جو سوڈانی مقیم ہیں ان میں بھی کام ہونا چاہیئے۔ ازہر کے سوڈانی طلبہ کے ذریعہ تمام سوڈانیوں کو جمع کیا جاسکتا ہو اور ان لوگوں کا کام حاصل کیا جاسکتا ہے جو سوڈان کے ائمہ عامہ پر اثر رکھتے ہیں اور قاہرہ میں مقیم ہیں۔

تمھارے آخر کے خطوں سے تمھاری صحت کا حال معلوم ہونے سے اطمینان ہوا اللہ تعالیٰ صحت و قوت میں ترقی عطا فرمائے، اور تبلیغ میں پوری سعی اور جدوجہد کی توفیق اور قوت عطا فرمائے۔

مولانا حسین احمد صاحب کا والا نامہ موصول ہوا تھا موصوف کو کچھ حال مکہ معظمہ کا معلوم ہوا۔ حضرت نے تمھارے لئے یہ کلمات لکھے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت جلیلہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے۔ آمین"

عبد العلی ۲۸ دسمبر ۱۹۵۰ء

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کی ذمہ داری صرف انھیں کتابوں کے لئے ہوگی جن کے بارے
میں مصنف کا نام اور ضخامت وغیرہ لکھ کر، پہلے ہم سے منظوری حاصل
کرلی جائے ——————— ادارہ)

مقالاتِ سیرت از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے (پی، ایچ، ڈی) شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوۃ العلماء) لکھنؤ۔ کاغذ اور کتابت وطباعت معیاری صفحات ۲۸۰، مجلد قیمت ۴/۵۰

یہ کتاب سیرت نبوی پر ڈاکٹر آصف کے ان آٹھ مقالوں کا مجموعہ ہے، جن میں سے بیشتر الفرقان میں شائع ہو چکے ہیں اور بہت قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مقالوں کے عنوانات یہ ہیں:۔

"اسلام میں نبوت کا تصور، حیات طیبہ (ولادت تا ہجرت)، حیات طیبہ (ہجرت تا وفات) معجزے، خُلقِ عظیم، پیغمبر اسلام اور تلوار، کامیاب ترین پیغمبر، سرور کائنات"

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، جو تھوڑے ہی دن ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں عصری تقاضوں کے مطابق مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے کی غرض سے قائم ہوئی ہے، یہ کتاب اسکی پہلی پیش کش ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ بہت کامیاب اور قابل قدر پیش کش ہے۔ فاضل مصنف نے جدید تعلیم یافتہ دماغوں کو

سامنے رکھ کر یہ مقالات ترتیب دیئے ہیں، اُن کے یہ مقالات گواہ ہیں کہ ان کی تیاری کے لئے انھوں نے سیرت کے اُردو اور انگریزی کتب خانہ کو کھنگالا ہے اور اختصار کو پیش نظر رکھ کر وہ اپنے موضوعات پر اس وسیع کتب خانہ کا عطر کھینچ لائے ہیں۔ اپنے حاصل مطالعہ کو اُن کے پیش کرنے کا انداز بھی بڑا شگفتہ اور جاندار ہے۔ زبان میں سادگی کے ساتھ شگفتگی، عبارت میں بے تکلفی اور برجستگی، موضوع کی پابندی اور حشو و زوائد سے اجتناب یہ اُن کی تحریر کی بہت واضح خصوصیات ہیں، جنھوں نے اُن کے حاصل فکر و مطالعہ کو علمی اور ادبی حیثیت سے بہت اچھی شکل دیدی ہے۔

کتاب یوں تو پوری کی پوری ہی پڑھنے کے قابل اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے، مگر دو مقالے خصوصیت سے بہت خوب ہیں۔ ایک "اسلام میں نبوت کا تصور"، دوسرا "معجزے"۔۔۔۔۔۔ جدید ذہن کے اعتبار سے نبوت کے اسلامی تصور کی قدر و قیمت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا مگر آصف صاحب نے مقالے کے اختتام پر صرف اس خطبہ کا حوالہ دیکر جو وفات نبوی کے موقع پر ابوبکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا تھا، اور اسکی روح اور اسپرٹ کی طرف چند لفظوں میں اشارہ کر کے، سوچنے اور سمجھنے والوں کے لئے جو بات پیدا کردی ہے وہ شاید صفحے کے صفحے لکھنے سے بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس مقالہ میں ایک جگہ یہ الفاظ پائے جاتے ہیں "(اسی لئے پیغمبروں کو دوسری تدبیروں کے ساتھ معجزوں سے بھی کام لینا پڑتا تھا)" (ص۳۱) ہمارے خیال میں یہ الفاظ نظر ثانی کے قابل ہیں۔ اس سے معجزات "دنیا" کی تدبیر" ظاہر ہوتے ہیں، علاوہ ازیں یہ تصور کچھ اچھا نہیں کہ انبیاء ایمان آفرینی کے لئے "تدبیروں" سے کام لیتے تھے۔

مقالات کے بعد کتاب میں ۴ ضمیمے بھی دئے گئے ہیں، جن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خطبوں پر مشتمل ہے، دوسرا بعض حدیثوں پر، تیسرا آپکی بعض دعاؤں پر، دعاؤں میں عربی متن بھی ہے۔ باقی ضمیمے صرف اردو میں ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے شروع میں "تعارف و پیش لفظ" ہے، جسے مصنف اور کتاب کے لئے سند کہا جا سکتا ہے۔

ہم اس کتاب پر مصنف اور ناشر دونوں کو مبارک باد دیتے ہیں، امید ہے کہ تعلیمیا فتہ مسلمان اس دینی اور علمی تحفے کی قدر کر کے اپنی قدر شناسی کا بھی ثبوت دیں گے اور کارکنانِ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی حوصلہ افزائی کا ملّی فرض بھی انجام دیں گے۔۔۔۔ کتاب ظاہری طور پر بھی سادگی کے ساتھ بڑی نفاست اور بلند معیار کی حامل ہے۔

طوفان سے ساحل تک | از محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ترجمہ:۔ محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی لکھنؤ، صفحات ۲۰۷، مجلد قیمت -/۵ روپے

یہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کی دوسری پیش کش ہے۔ اور ظاہری ومعنوی معیار سے پہلی پیش کش کے ہم پلہ ہے۔۔۔۔ یورپین نومسلم فاضل محمد اسد، جو اسلام لانے سے قبل لیوپولڈ ویس کہلاتے تھے، ہندو پاکستان کے علمی حلقوں میں اپنے علمی اور دینی کاموں کی وجہ سے اچھی طرح معروف ہیں۔ وہ یہودیوں کے مذہبی طبقے کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ اور ایک طویل ذہنی کش مکش کے بعد اسلام کے آغوش میں جا پہنچے۔ صحافت (جرنلزم) کے پیشے میں انھیں دوبار عالم اسلام (مشرق وسطیٰ) کے سفر کا موقع ملا۔ عالم اسلام کے یہ جسمانی سفر ان کی روح کو اسلام کی طرف سرگرم سفر کرنے کا ذریعہ بنے۔ پہلی بار لیوپولڈ ویس کی روح عالم اسلام کی اسلامی روح سے قریب ہوئی اور دوسری ملاقات میں مکمل طور سے اسیر ہو گئی۔

لیوپولڈ ویس کی روح میں کوئی مذہبی بے چینی نہیں تھی، البتہ روح کا وہ اضطراب' افکار کا وہ انتشار، مستقبل کے اعتماد کا وہ فقدان، خوف کی ایک مبہم اور مبہم کیفیت' خودغرضی اور نفسی نفسی کا ایک سیلاب جو پہلی جنگ عظیم کے بعد پوری یورپین سوسائٹی پر چھا گیا تھا، لیوپولڈ ویس کی روح محسوس کرتی تھی کہ اسکے پس منظر میں ایک زبردست روحانی خلا ہے، جو قدیم مذہبیت اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، اور مغربی علم وفکر اس خلا کو پُر کرنے میں بالکل عاجز ہو رہا ہے، یہاں مسئلہ کے حقیقی حل کے بجائے جدید اقتصادی نظاموں کا راگ الاپا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ صرف مادی ترقی کے جذبہ میں کھو کر آدمی ان اندرونی اذیتوں سے نجات پا سکتا ہے۔ جبکہ لیوپولڈ ویس کا

یقین یہ تھا کہ یہ ایک پُر فریب خیال ہے، مادی ترقی کا جذبہ ایک عارضی اور محدود دوا سے زیادہ کچھ اور ثابت نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔۔۔ یہ تھی اپنے ماحول میں وہ لاینحل بے چینی اور اپنی تہذیب کے مستقبل سے اور پھر انسانیت کے مستقبل سے مایوسی جسے پہلو میں لئے ہوئے یورپ کا یہ مسافر جب دنیائے اسلام کی سرزمین پہ اترا تو اسے امید کی ایک دمکتی ہوئی کرن نظر آئی، اسے ایک نئی دنیا دریافت ہوئی جہاں ان مسائل کا نام ونشان نہیں تھا جن میں اسکی اپنی دنیا گلے گلے ڈوبی ہوئی تھی۔ یہاں روح کا ایک قابل رشک سکون تھا، قلب میں جمعیت تھی، دماغوں پر کسی خوف کا سایہ نہیں تھا۔ خود غرضی اور نفسی نفسی کی جگہ انسان دوستی اور ہم آہنگی تھی، بلند نظری اور فراخ حوصلگی تھی، دوسرے الفاظ میں کہئے کہ انسانیت کے پر امید مستقبل کا پورا سامان تھا۔

قدرتی طور پر اس نووارد کو اب جستجو ہوئی کہ اس زندگی کا پس منظر اور سرچشمہ کیا ہے؟ یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے اس مسافر کا سفر اسلام کی طرف شروع ہو گیا، اور پانچ سال کی جستجو، غور وفکر اور مطالعہ کے بعد دنیائے اسلام کا یہ اجنبی سیاح محمد اسد کے نام سے اسلامی برادری کا ایک رکن بن گیا ۔۔۔۔۔۔ اسکے بعد اس نے مستقل طور سے اسلامی دنیا میں سکونت کا فیصلہ کیا، وطن کو خیرباد کہا، اور مرکز اسلام حجاز کا رُخ کیا، جہاں اُس نے چھ سال گزارے، اور اسلامی برادری کے ایک مخلص، اولوالعزم اور باصلاحیت فرد کی طرح دنیائے اسلام کی بہت سی اہم مہموں میں حصّہ لیا۔

اس پوری داستان کو جو روحانی سفر کے ساتھ ساتھ مسلسل جسمانی سفر وحرکت کی بھی داستان ہے ۔۔۔۔۔۔ اور بڑی دلچسپ اور فکر انگیز ہے ۔۔۔۔۔۔ محمد اسد صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کے بیان کے ساتھ، انگریزی میں (ROAD TO MECCA) "روڈ ٹو مکہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اردو میں اسی کتاب کا یہ ترجمہ ہے جو اس وقت سامنے ہے، مگر یہ مکمل ترجمہ نہیں ہے۔ مترجم نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی ہدایت کے مطابق اصل کتاب کا کافی حصّہ ترجمہ میں حذف کر دیا ہے، مولانا کا خیال ہے کہ اس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے اور پوری کتاب میں واقعات کے لحاظ سے جو بے ترتیبی اور انتشار تھا وہ رفع ہو گیا ہے ۔۔۔۔۔۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصل کتاب ہی میں یہ صورت تھی یا ترجمہ میں حذف و انتخاب کا نتیجہ ہو کہ صفحہ ۲۰۱ پر داستان کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے۔ بحری جہاز کے مسافر کو یکایک ٹرین میں سوار دیکھ کر قاری کی دلچسپی کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے ـــــــ

صفحہ ۲۱۳ سے یہ تسلسل باقاعدہ مترجم کی صراحت کے ساتھ ختم ہو گیا ہے اور یہاں سے آخر تک متفرق واقعات درج کئے گئے ہیں۔ یہ واقعات اپنی جگہ پر دلچسپ، سبق آموز اور مؤثر ضرور ہیں مگر یہ کچھ ایسی سر بریدہ شکل میں سامنے آتے ہیں کہ تشنگی رہ جاتی ہے۔ ہماری رائے میں اس حصہ کی ترتیب پر از سر نو محنت کی ضرورت ہے۔

دراصل "طوفان سے ساحل تک" جس کتاب کا نام ہے اُسے باقاعدہ صفحہ ۲۱۲ پر ختم ہو جانا چاہیئے تھا، یہ اُس کا بالکل طبعی اختتام تھا۔ اسکے بعد جو متفرق واقعات درج کرنا تھے وہ ایک بالکل الگ حصے کے طور پر کتاب میں شامل کئے جانے چاہیئے تھے، اور پھر اُن کی ترتیب میں اتنا کام کرنے کی ضرورت تھی کہ لطف کو مکدّر کرنے والی تشنگی نہ رہجاتی۔

اس ترتیبی نقص سے قطع نظر، کتاب بلاشبہ بہت قیمتی ہے ـــــــ اسلام کا ایک حقیقت پسندانہ مطالعہ اور مغربی فکر و تہذیب کا حقیقت پسندانہ جائزہ! ترجمہ بھی سلیس اور رواں ہے، زبان میں زور اور قوت بھی ہے۔ جدید تعلیم پانے والے مسلم نوجوانوں میں اسکی زیادہ سے زیادہ اشاعت ایک اہم دینی خدمت کے مرادف ہے۔ مجلس کو چاہیئے کہ اس میں مزید حذف و انتخاب کرکے اسکے ہندی اڈیشن پر بھی غور کرے۔

علیؓ و حسینؓ از، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، صفحات ۲۴۳، کتابت و طباعت متوسط، کاغذ اخباری، قیمت ۳/۵۰۔ ملنے کا پتہ:۔ (۱) ایجنسی تاج کمپنی ۱۸۸ مسجد اسٹریٹ بمبئی ۳، (۲) مکتبہ دائرۂ ملیہ، مبارکپور ضلع اعظم گڈھ۔

محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کو لوگ ابھی بھولے نہ ہوں گے، یہ کتاب اسی کا جواب ہے، جو اولاً تبصرہ کے طور پہ روزنامہ اخبار انقلاب بمبئی میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ پھر اسکو یہ کتابی شکل دیدی گئی۔ "خلافت معاویہ و یزید" کے مؤلف کا اصل مقصد اموی دورِ خلافت کو ایک قابل قدر اسلامی عہد کی حیثیت سے

اُجاگر کرتا تھا، لیکن ایک طرف اس معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر بہت غالیانہ تھا، دوسری طرف اس حکومت کے ہر حریف کو انھوں نے غلط کار ٹھیرانا بھی ضروری سمجھا جس کے نتیجہ میں انھوں نے ایک طرف اُموی عہد کو خلافت راشدہ کے ہم پلّہ بنا دیا، دوسری طرف حضرت علیؓ وحسینؓ رضی اللہ عنہما وغیرہ کو بہت غلط پوزیشن دینے کی کوشش کی۔ علیؓ وحسینؓ کے مصنّف عباسی صاحب کے اصل مقصد کی حد تک اُن کے بالکل ہمنوا ہیں، البتہ اُن کے غلو کی کارفرمائیوں سے نالاں ہیں، اور اسی کی تردید اُن کی اس کتاب کا مقصد ہے۔

کتاب میں ۹ باب ہیں، اُموی حکومت وخلافت، کتابؔ "خلافت معاویہ ویزید" کا سرسری جائزہ، حضرتؔ علیؓ اور ان کا دورِ خلافت، حضرتؔ حسینؓ اور ان کا مقام وموقف، یزیدؔ کی ولیعہدی اور امارت، تینؔ المناک واقعات (واقعہ کربلا، واقعہ حرّہ، محاصرہ مکۂ مکرمہ) چندؔ متفرق اور اہم مباحث، تصویرؔ کا دوسرا رُخ، ملحقاتؔ۔

اِن ابواب کی فہرست سے کتاب کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ . . . . .

. . . . کتاب اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہے۔ حضرت علی اور حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق جو نامناسب باتیں عباسی صاحب نے لکھی یا وسوسہ انگیزیاں کی تھیں اُن کا جواب تشفی بخش طور پر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی حضرت معاویہؓ کے مقام کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور یزید کے باب میں بھی بے احتیاطی کی مقبول عام روش سے اجتناب کیا گیا ہے "تصویر کا دوسرا رخ" کے عنوان سے ایک پورا باب انھوں نے اسی مقبول عام روش کے خلاف لکھا ہے جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے :۔

> "یزید کے بارے میں ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس کی زندگی کا بدنام رُخ ہے وہاں اس کی زندگی کا وہ رُخ بھی ہے جس سے بدنامی دور ہو سکتی ہے۔ پس صرف ایک طرفہ روایات کو لینا اور انھیں کتابوں سے دوسری روایات کو چھوڑ دینا جانب داری کی روش ہے، اسی لئے علمار نے اس کے بارے میں احتیاطی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔　　　　(ص۲۹۵)

اور اسی باب میں ایک جگہ تو انھوں نے صحابہ کرام و تابعین کے معیار کی بلندی کی طرف توجہ دلاکر، یہاں تک لکھا ہے کہ :-

"صحابہ کرام یا تابعین عظام اگر یزید یا کسی اور شخص کو فاسق و فاجر کے لفظ سے یاد کریں تو وہ شخص ہمارے زمانہ کے اُن عباد و زہاد سے عقیدہ و عمل میں بدرجہا بہتر ہوگا جن کے ظاہر و باطن میں ہم آہنگی نہیں ہے۔" (صفحہ ۲۸)

مگر اس باب کے مندرجات میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جس سے یزید کے بارے میں اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اوراق میں ایک عجیب سا تضاد پایا جاتا ہے، اور یزید کی صفائی اس تضاد میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ آئندہ اڈیشن کی نوبت آئے تو اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ علیٰ ہذا البدایہ والنہایہ کی ایک عبارت جو اس باب میں دو جگہ استعمال ہوئی ہے اس کا ترجمہ بھی اصلاح کا محتاج ہے۔ مصنف نے اگر اس عبارت کا صحیح مطلب سمجھا ہوتا تو اس باب کے تضادات میں کافی کمی بھی ہو جاتی اور عبارت مفیدِ مقصد بھی ہوتی۔ وہ عبارت یہ ہے :-

قلت يزيد بن معاوية اكثر ما نقم عليه في عمله شرب الخمر واتيان الفواحش الخ

اس کا ترجمہ پہلی جگہ یوں کیا گیا ہے :-

"میں کہتا ہوں کہ یزید بن معاویہ پر اسکے شراب پینے اور فواحش کے کرنے میں جو الزام رکھا گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔" ـــــ مگر الخ

دوسرے مقام کا ترجمہ اس مفہوم میں زیادہ واضح ہے، اُسکے الفاظ یہ ہیں :-

"میں کہتا ہوں کہ یزید شراب پینے اور فواحش کے کرنے میں اس سے زیادہ ہے جتنا کہ اُس کے بارے میں کہا گیا ہے" ـــــ مگر الخ

لیکن حقیقت میں اس عبارت کا صحیح ترجمہ یہ ہوتا ہے

"میں کہتا ہوں کہ یزید پر بدعملی کا جو زیادہ سے زیادہ الزام رکھا گیا ہے وہ شراب نوشی اور فواحش کا ارتکاب ہے۔"

عبارت کی نحوی ترکیب کے اعتبار سے بھی یہی ترجمہ صحیح ہوتا ہے۔ اور ابن کثیرؒ کے مسلکِ احتیاط سے بھی یہی قول قریب ہے۔

اسی طرح کتاب میں کچھ جزوی کمزوریاں اور بھی نظر پڑی ہیں جن کی طرف ہم مصنف کی توجہ کے لئے محض اشارات کر دینا چاہتے ہیں۔

۱۔ صـ۱۱۱ پر مصنف نے حضرت حسینؓ کا جو موقف دکھایا ہے اور جس کی تائید و تحسین میں نصوص قرآن و حدیث پیش کئے ہیں، صـ۱۴۲ پر اس موقف کی بالکل نفی کر دی ہے۔

۲۔ پہلے موقف کی تائید میں جو نصوص قرآن و حدیث پیش کئے گئے ہیں، حدیث ۵ ان سب کے مفید مقصد ہونے سے مانع ہو جاتی ہے اور خود حضرت حسینؓ کے خلاف پڑتی ہے۔ — البتہ اگر پہلا موقف چھوڑ دیا جائے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ صـ۱۲۹ پر امام ابن تیمیہ کا جو قول نقل کیا گیا ہے کہ وکان قتل الحسین مما اوجب الفتن اس سے امام ابن تیمیہ کا وہ مطلب کسی طرح بھی ظاہر نہیں ہوتا جو مصنف نے سمجھا ہے۔

۴۔ صـ۱۳۳ پر "اعتراف و احترام" کے ذیل میں حضرت معاویہ کے "اطمینان" کی بات بھی اُن کے پیش کردہ دلائل سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ کچھ اُلٹا ہی ثابت ہوتا ہے۔

غالباً یہ خامیاں اس کتاب کے اصلاً ایک اخباری تبصرہ ہونے کی وجہ سے رہ گئی ہیں۔ اتنے طویل اخباری تبصرہ میں ظاہر ہے کہ بہت زیادہ غور و فکر کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ یہ مصنف کے وسیع تاریخی مطالعہ کی بات ہے کہ اس طرح کے تبصرہ میں بھی انھوں نے بہت سا مواد جمع کر دیا اور مقصد کی حد تک وہ اپنے تبصرہ میں کامیاب رہے۔ کتاب مجموعی طور پر مسلک اہل سنت کے بالکل مطابق اور توازن و اعتدال کی حامل ہے۔ جو اسکی بڑی خوبی ہے، عباسی صاحب کی بے اعتدالیوں کے اثر سے خود عباسی صاحب کے متعلق تو ضرور کچھ سخت الفاظ اس میں آ گئے ہیں، لیکن اصل مسائل میں کہیں جوابی بے اعتدالی کا ارتکاب نہیں کیا گیا ہے۔

اسلام کا نظام عدل | تصنیف استاذ سید قطب، ترجمہ محمد نجات اللہ صدیقی۔ شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۶۔ الفرقان سائز صفحات ۳۰۴

مجلد قیمت -/۶ روپے۔

یہ کتاب مصر کے نامور اخوانی ادیب و مصنف استاذ سید قطب کی عربی تصنیف "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کا ترجمہ ہے۔ ہماری رائے ہے کہ اس کتاب کے ترجمہ سے اُردو کے اسلامی لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ مترجم کو اس خدمت کے لئے جزائے خیر دے۔ بڑے دقت کی چیز انھوں نے اس ترجمہ کے ذریعہ اُردو خواں حلقہ تک پہنچائی ہے۔

اجتماعی عدل و توازن آج کے دور کا سب سے اہم سوال بنا ہوا ہے اور ہر اجتماعی نظام کی کامیابی و ناکامی کی اصل کسوٹی آج یہی ہے۔ کیا اسلام بھی بحیثیت ایک اجتماعی نظام کے اس عہد کے اس پیچیدہ مسئلہ کا سامنا کر سکتا ہے؟ یہ سوال ہے جس کا جواب استاذ سید قطب نے اپنی کتاب کے ذریعہ دیا ہے۔ وہ سب سے پہلے کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کے بنیادی فکر کو سامنے لاتے ہیں ... ... جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں عدل و توازن اسلام کے بنیادی تصوّرات کا تقاضہ ہے اور اس تقاضے میں اتنا پھیلاؤ ہے جس کی بنا پر اسلام میں عدل کا رجحان انسانی زندگی کے کسی ایک دائرہ میں محدود ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ ہر دائرہ پر حاوی ہوتا ہے، اور محدود معاشی مساوات کے بجائے مکمل انسانی مساوات اُس کا نصب العین قرار پاتا ہے۔

اسکے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اسلام مجرّد اپنے بنیادی فکر کے تقاضے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے چند واضح اصولوں کے ذریعہ اس ہمہ گیر عدل کے قیام کے لئے زمین بھی ہموار کرتا، یا بالفاظ دیگر اس عدل کے قیام کی مضبوط بنیادیں اپنے نظام میں پیوست کرتا ہے ـــــ پھر وہ اصولی طریقہ' کار بتاتے ہیں جس سے اسلام اجتماعی عدل کے قیام میں مدد لیتا ہے۔ ـــــ اجتماعی عدل سے نظام حکومت کا جو گہرا تعلق ہے، اُسکے پیش نظر اسلام کے نظام حکومت کا جائزہ بھی عدل کے نقطۂ نظر سے لیتے ہیں۔ کسی نظام کی اقتصادی پالیسی جو اس نظام کے ظلم و عدل کو جانچنے کا آج سب سے واضح معیار سمجھی جاتی ہے، اس معیار سے بھی

اسلام کو جانچنے کی دعوت دینے کے لئے، وہ اسکے بعد اسلام کی اقتصادی پالیسی کی پوری اصولی تفصیل کے ساتھ وضاحت کرتے ہیں۔

یہ اسلام کا عدل پروری کے نقطۂ نظر سے نظریاتی جائزہ تھا، اسکے بعد مصنّف نے اسلامی تاریخ کی مثالوں سے ان اصول و نظریات کو واقعات کی دنیا میں جلوہ گر ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کی بلند پروازی شاعرانہ نہیں ہے بلکہ اسلام انسانوں کو بحیثیت ایک سوسائٹی کے ان بلندیوں تک پہنچانے کا کامیاب تجربہ بھی پیش کر چکا ہے۔ لیکن تیس سال کے وقفہ کے بعد ہی تاریخ میں اسلامی حکومت کا اسلام کے سیاسی اور معاشی نظریات سے عملاً انحراف بھی نظر آتا ہے، مصنّف نے اسکو بھی نظر انداز نہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسکو اسلام کے عملی امکانات کی ناکامی کا نتیجہ سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے یہ صرف حکمراں طبقہ کے انحراف کا نتیجہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسلامی معاشرہ مجموعی طور پر اس کو ناپسند کرتا رہا، اور جب بھی نظام حکومت کے اصل اسلامی معیار کی طرف مراجعت کا کوئی موقع پیش آیا، معاشرہ نے گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

آٹھویں باب میں مصنّف نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ اسلام آج بھی زمانہ کے سارے تغیرات کے باوجود ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے بروئے کار آنے اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اس مقصد کے لئے اسلامی سماج کو بہت عظیم کام کرنے پڑیں گے، ان کاموں کا ایک خاکہ بھی مصنّف نے پیش کیا ہے۔

نواں باب کتاب کا اختتام ہے جس میں آج کے اسلامی سماج کو آگاہ کیا گیا ہے کہ مغربی اور اشتراکی بلاکوں کی جو تقسیم اس وقت نظر آتی ہے اور جس میں سے کسی ایک طرف جھک جانے کی کش مکش میں مسلمان ملک مبتلا ہیں یہ کشمکش کوتاہ نظری ہے۔ یہ تقسیم بہت سطحی ہے، کسی فکری اختلاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض احوال و ظروف کے اختلاف کی بنیاد پر قائم ہے۔ ان احوال و ظروف کی تبدیلی کی دیر ہے کہ مقابلہ کے میدان میں صرف اشتراکیت اور اسلام رہ جائیں گے لہٰذا ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ہم ان دونوں میں سے کس راہ پر جانا چاہتے ہیں

افسوس اوّل سے آخر تک اس قابل تعریف کتاب میں ایک حصّہ ذرا وحشت انگیز ہے۔ یہ ساتویں باب کا وہ حصّہ ہے جہاں مصنّف نے اسلامی حکومت کی تاریخ میں حضرت معاویہؓ کے کردار پر گفت گو کی ہے، وہ حضرت معاویہ کو کسی حسن ظن کا مستحق نہیں سمجھتے، اور کچھ بھی کہنے میں باک نہیں کرتے، یہ بے باکی بڑی وحشت انگیز ہے، حضرت عثمانؓ کا ذکر اگرچہ وہ پورے اَدب سے کرتے ہیں اور ان کے معاملہ میں عذر کے پہلو تلاش کرتے ہیں، مگر اُن روایات کو بالکل قابل کلام نہیں سمجھتے جو قرآن اور حدیث کی روشنی میں حضرت عثمانؓ کی شان سے بعید تر نظر آتی ہیں۔ الغرض کتاب کا یہ حصّہ بہت وحشت انگیز اور صبر آزما ہے۔ اچھا ہوتا کہ مترجم نے جہاں اس باب میں مصنّف کو توجہ دلائی تھی اور انھیں اس حصّہ میں مناسب ترمیم پر آمادگی تک بھی پہنچا دیا تھا وہاں وہ یہ بھی کرتے کہ فٹ نوٹ میں تھوڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اختلافی نوٹ بھی لکھ دیتے۔ ہمارے خیال میں یہ ضروری تھا اور مصنّف کے خیالات کو بلا اختلاف کے نہیں شائع ہونا چاہیئے تھا۔

اسی حصّہ میں مترجم کی توجہ کے لئے بتانا بھی ضروری ہے کہ صفحہ ۲۴۵ پر دوسرے اور تیسرے پیرے کے درمیان بہت محسوس خلا رہ گیا ہے، ہمیں پتہ نہیں اصل میں کیا صورت ہے۔ البتہ ہمارے سامنے اصل کا جو دوسرا اڈیشن ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے پیرے کے بعد حضرت معاویہؓ پر ایک لمبا تبرّا تھا، مگر پانچویں اڈیشن تک پہنچتے پہنچتے اس باب میں جو ترمیمیں ہوئیں اُن میں غالباً یہ ٹکڑا حذف کر دیا گیا، مگر اس ترجمہ میں جس دوسرے پیرے کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں وہ اپنے مابعد ہی کا جزو تھا اور اُسے بھی مابعد کے ٹکڑے کے ساتھ حذف ہو جانا چاہیئے تھا۔ یہ پیرا بھی اگر حذف ہو جائے تو مضمون میں تسلسل قائم ہو جائے گا۔

یہ کتاب کا ایک سرسری تعارف ہے، ہماری نظر میں مجموعی اعتبار سے یہ ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ خصوصاً اس کا تیسرا باب، جس کے اندر اسلامی نظام میں اجتماعی عدل کی نظریاتی بنیادوں کی وضاحت کی گئی ہے، شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، اس باب میں استاذ سید قطب کی شخصیت عبقری نظر آتی ہے آزادیٔ ضمیر، انسانی مساوات اور اجتماعی

کفالت ۔ یہ تین بنیادی افکار اسلام نے اپنے سماج میں جس طرح پیوست کرنے کی کوشش کی ہے سید قطب کا قلم اس کو بیان نہیں کرتا، ایک وجد انگیز تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے، جس میں آزادیٔ ضمیر، انسانی مساوات اور اجتماعی کفالت کا اسلامی تصور اس قدر بلند، اور مکمل نظر آتا ہے کہ آج کے تمام نعرے اس کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔

استاذ سید قطب کی یہ تصنیف اُن کی بالغ نظری، پختہ فکری، مغز شناسی، اعلیٰ ذہانت اور قرآن سے گہری مناسبت کا ثبوت ہے۔ اُن کی اس کتاب میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جگہ جگہ وہ گویا قرآن ہی کی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہیں، اور قرآنی آیات سے اس کثرت کے ساتھ اور اتنا برمحل اور بے تکلف استشہاد کرتے ہیں کہ وجدان جھوم جھوم جاتا ہے۔ اور کہیں اتفاق سے کوئی آیت بے محل نظر آتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ چوک اُن سے کیسے ہو گئی۔ مثلاً صفحہ ۲۶ پر سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ الخ کا استعمال۔ یا صفحہ ۹۵ پر سورۂ توبہ کی آیت قُلِ اعْمَلُوا الخ، صفحہ ۱۵۱ پر سورۂ بقرہ کی آیت ۹۰ کے دو ٹکڑے۔ اسی طرح " وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا " کا استعمال جگہ جگہ جس مقصد سے کیا گیا ہے، اس میں اگرچہ بعض مفسرین کی تائید حاصل ہو سکتی ہو مگر ہمیں تو سید قطب کے ذوق کے اعتبار سے یہ استعمال بھی کچھ بے جوڑ ہی سا لگتا ہے۔

مصنف کی بعض اور رایوں سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر انھیں آنی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً عیش کوشی کے باب میں اسلام کا نقطۂ نظر متعین کرنے کے سلسلہ میں ان کی یہ رائے کہ مردوں کے لئے سونے اور ریشم کی ممانعت اسلام کے ابتدائی عہد کے خاص حالات کے اعتبار سے تھی۔ (صفحہ ۱۹۴) اس رائے سے اتفاق کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دوسرے باب میں اشتراکیت کے تصور عدل کی جو ترجمانی ضمناً صفحہ ۴۲ پر کی گئی ہے وہ محل نظر ہے، معاوضوں میں مساوات اور اعلیٰ و ادنیٰ صلاحیتوں کو برابر قرار دینا، اشتراکیت کا کوئی اصول نہیں ہے۔ یہ غلطی اگرچہ ایک ضمنی بات کی ہے، مگر اس سے کتاب کی قیمت کو نقصان پہنچتا ہے۔ مترجم نے بھی اسکی تصحیح نہیں کی، یہ مزید حیرت کی بات ہے۔

ترجمہ مجموعی حیثیت سے صاف اور رواں ہے اور بہت کم ایسے مواقع آئے ہیں کہ بات مترجم کے قابو میں نہیں آئی اور ترجمہ پن نمایاں ہو گیا۔ لیکن ایک ضخیم کتاب جس کا ادبی معیار بھی بلند ہو، اُس کے ترجمہ میں ایسے مواقع بالکل نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں۔ البتہ کتاب سے دلچسپی کے ماتحت ایک خاص موقع کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ یہ موقع ساتویں باب کی پہلی سطر ہے۔ ہم نے اس سطر سے الجھن محسوس کی تو اصل کی طرف رجوع کیا۔ معلوم ہوا کہ مصنّف کے لفظ "ھناك" کا اشارہ واضح کرنے کے بجائے لفظی ترجمہ جو کر دیا گیا ہے اُس سے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے، جس کا اثر آگے کے پورے سلسلۂ کلام تک پہنچتا ہے۔ آئندہ اڈیشن میں اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم نے ترجمہ کو تنقیدی نظر سے نہیں دیکھا ہے، عمومی طور پر ترجمہ کی سلاست اس کا موقع بھی نہیں دیتی، البتہ صـ۴۳ پر آخری پیرے کی کچھ سطریں لفظی سلاست کے باوجود موقع کے لحاظ سے بے جوڑ محسوس ہوئیں تو اصل کی طرف رجوع کیا جس سے معلوم ہوا کہ یہاں ترجمہ میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ آئندہ اڈیشن میں مترجم کو اس موقع کی بھی تصحیح کر دینی چاہیئے۔ اس لئے کہ اس تسامح سے پوری بات مختل ہو گئی ہے۔ یہ پیراگراف صفحہ کی بیسویں سطر سے شروع ہوتا ہے۔

ایک اور مقام بھی مترجم کی توجہ کا طالب ہے۔ ص۸ پر مصنف نے "ولا تنس نصیبك من الدنیا" کا استعمال جس مقصد سے کیا ترجمہ اس مقصد کے بالکل خلاف ہو گیا ہے۔

بہرحال ہم مترجم کے کام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کی اسلامی کتاب کو اردو میں پیش کرنے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

انوار الھدیٰ فی سیرۃ المصطفیٰ (جلد اوّل) از جناب مولوی فضل احمد صاحب، ناشر پنجاب بکڈپو لاہور، کتابت طباعت روشن، سائز موزوں ($\frac{20 \times 30}{8}$) کاغذ درمیانی، صفحات ۲۹۵، مجلد مع گرد پوش قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب سیرت نبوی پر ایک خاص رنگ کی کتاب ہے۔ جناب مؤلف پنجاب کے ایک خانوادۂ تصوف سے متعلق اور اپنے شیخ کے علمی فیوض کے حامل ہیں، اسی سلسلہ کے اپنے خاص مذاق کے

ماتحت سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ، بیچ بیچ میں، وہ تشریحی، توجیہی اور تذکیری مضامین بھی پیدا کرتے چلے گئے ہیں۔ جن کی مناسبت کے سرے کہیں ظاہر ہیں اور کہیں مخفی، گویا یہ ایک خاص ذوق کے ماتحت سیرت نبوی کا مطالعہ ہے، نری سیرت نگاری نہیں۔

مؤلف کا مقصد، جہاں تک ہم نے سمجھا ہے، سیرت نبوی کی روحانی توجیہ و تشریح ہے، اور اس ضمن میں وہ روحانی رفعت، تزکیۂ نفس اور مجاہدات کی ترغیب بھی دینا چاہتے ہیں زبان صاف اور سلجھی ہوئی ہی نہیں ایک حد تک منجھی ہوئی بھی ہے، جس سے تحریر پر اچھی قدرت ظاہر ہوتی ہے. مگر اسلوب بیان عموماً بہت پرپیچ اور غامض ہے، کہیں طول لاطائل ہے، کہیں سر رشتہ ربط گم ہے۔ اسی زبان میں یہ باتیں اگر سمیٹ کر اور ربط باہمی کا خیال کر کے کہی جاتیں تو کتاب آسانی سے استفادے کے قابل ہوتی۔ کتاب کی موجودہ صورت ایسی ہے کہ باتیں اپنی جگہ کارآمد اور پُر مغز ہونے کے باوجود کم از کم اُن لوگوں کی طبیعت مطالعہ کے دوران گھبرائے بغیر نہیں رہ سکتی جو سیدھی اور مربوط بات ہی سمجھ سکتے ہیں. یا سمجھ تو ہر طرح کی سکتے ہیں مگر اپنا افتاد ذہنی کے اعتبار دلچسپی کسی مربوط اور سیدھی (To the Point) بات ہی میں لے سکتے ہیں —— اچھا ہو کہ جناب مؤلف دوسری جلد کی تالیف میں ہمارے اس تاثر کو ملحوظ رکھیں، اس طرح اُن کی محنت زیادہ ٹھکانے لگے گی.

مکتوبات خواجہ محمد معصوم

ہندستان میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا تجدیدی کارنامہ اپنی مثال آپ ہے. اس بوریہ نشین نے مغلیہ سلطنت کا رُخ بدل دیا اور پھر وہ اپنے رب سے جاملا —— اسکے بعد اسکی مسند ارشاد و ہدایت کو جس ہستی نے سنبھالا اور اسکے ڈالے ہوئے بیج کو تکمیل تک پہنچایا وہ ہیں آپکے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ۔ آپکے مکاتیب بھی آپکے والد ماجد کے مکاتیب کی طرح آپ کی مصلحانہ کاوشوں کے آئینہ دار ہیں. فارسی کے اس خزانہ کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا ہے، اور کتب خانہ الفرقان نے اسکو شائع کیا ہے. کتابت و طباعت قابل دید کاغذ معیاری ضخامت... صفحات کتبخانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ مجلد قیمت چار روپے

انتخاب

(از روزنامہ الجمعیۃ ـــــ دہلی)

حکومت غور کرے ہمارے نامہ نگار نے کٹنی سے ہندو مہا سبھا کے سکریٹری کی ایک تقریر لکھ کر بھیجی ہے جس کا خلاصہ گزشتہ الجمعیۃ میں شائع ہو چکا ہے، ہمیں حیرت ہے کہ حکومت (کی سی، آئی، ڈی) اس قسم کی تقریروں سے حکومت کو باخبر کیوں نہیں کرتی؟ اگر کرتی ہے تو حکومت ان کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی؟ مدھیہ پردیش ہندو مہا سبھا کے سکریٹری گنگا دھر نے ۲۱ر اور ۲۲ر جولائی کو جو ہرچوک کٹنی میں جو تقریریں کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بھارت ورش ہندوؤں کا ملک ہے اس پوتر دھرتی پر بھگوان کے اوتار ہوئے ہیں یہاں بڑے بڑے رشیوں... رشیوں نے جنم لیا ہے، پھر یہاں اللہ کا کیا کام، یہاں تو صرف رام ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ چند لٹیرے مسلمان بادشاہ باہر سے آئے اور رام کے دیش پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے یہاں خون کی ندیاں بہائیں تلوار سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا، مندر توڑ کر مسجدیں کھڑی کیں، ہندو دیویوں اور ناریوں کی عزت لوٹی۔ اس کے بدلہ میں یہاں مسلمانوں کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا، مسلمانوں کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں کانگریس کو ختم کرنا ہوگا کیونکہ یہ مسلمانوں کی مائی باپ ہے ادھر کانگریس ختم ہوئی ادھر مسلمان صاف! ہندو مسلمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام مسلمان ہندو بنا لئے جائیں اور اسی کام کو پورا کرنے کا بیڑا ہندو سبھا نے اٹھایا ہے ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم آج میرے سامنے عہد کرو کہ بھگوان رام بھگوان کرشن اور بھگوان بدھ کے اس پوتر دیش کو مسلمانوں سے پاک کر کے دم لوگے۔ وغیرہ وغیرہ

باہر کی دنیا کیا جانے ہم شروع سے کہہ رہے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی اشتعال انگیزیاں بند نہ ہوں گی مسلمانوں کے خلاف یک طرفہ حملوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ چودہ سال سے مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی نفرت پھیلائی جا رہی ہے لیکن حکومت نے آج تک

(باقی صفحہ ۵ پر)

یو۔پی کی لسانی کمیٹی کا سوالنامہ

[ذیل میں حکومت یو۔پی کی مقرر کردہ لسانی کمیٹی کا جاری کردہ سوالنامہ اطلاع عام کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہو کہ اُردو دوست حضرات اس سلسلہ میں اپنی گہری عملی دلچسپی کا ثبوت پیش کریں گے جواب کی آخری تاریخ ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء ہے[1] ——— ادارہ]

حصّہ اوّل :-

(۱) ان بچّوں کو جن کی مادری زبان اُردو بتائی گئی ہے تعلیم کے ابتدائی دور میں اُردو میں تعلیم دینے کا انتظام۔

(الف) کیا یہ انتظام اطمینان بخش ہے ؟

(ب) کیا آپ کوئی تجویز پیش کرنا چاہتے ؟

(۲) جونیر بیسک اسکول سے درجہ ۵ پاس کرنے والا بچّہ جسے اُردو میں تعلیم دی جاتی ہے، سینیر بیسک اسکول کے درجہ ۶ میں دی جانے والی تعلیم کو کس حد تک سمجھ سکتا ہے جس میں تمام مضامین ہندی میں پڑھائے جاتے ہیں ؟

(۳) ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان اُردو ہے تعلیم کے ثانوی دور میں اُردو میں تعلیم دینے کا موجودہ انتظام۔

(الف) کیا یہ انتظام اطمینان بخش ہے ؟

(ب) کیا آپ کوئی تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں ؟

(۴) کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی خاص مثال ہے کہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں داخلہ اور اُردو کو ایک مضمون کے طور پر پڑھنا چاہنے والے طالب علموں کو مشکل پیش آئی ؟

---

[1] جواب اس پتہ پر جانا چاہیے۔ سکریٹری لینگویج کمیٹی۔ کونسل ہاؤس لکھنؤ۔

(۵) کیا ثانوی دور میں اُردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے کسی ادارہ کو تسلیم (RECOGNITION) کے حصول کی شرطیں پوری کرنے پر بھی تسلیم کے حصول میں کوئی دشواری ہوئی؟

(۶) کیا سرکاری ہدایتوں کے بموجب تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی دور میں اُردو پڑھانے کے لئے ٹیچر مہیا کرنے میں کوئی دشواری ہوئی؟

براہ مہربانی ایسی مثالیں دیجئے جو آپ کے علم میں ہوں۔

(۷) کیا آپ کے علم میں ان جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں جہاں پانچ یا پانچ سے زیادہ طالب علموں نے اُردو کو اختیاری مضمون کے طور پر لیا ہو۔ اُردو پڑھانے کا انتظام کرنے میں کوئی دشواری ہوئی؟

(۸) کیا آپ کے علم میں ایسی مثالیں ہیں کہ منیجمنٹ کو ہائی اسکولوں کے لئے اُردو کی اہلیت رکھنے والے (Qualified) ٹیچروں کی خدمات حاصل کرنے میں اس لئے دشواری ہوئی کہ ایسے ٹیچر نہیں ملتے تھے؟

(۹) کیا آپ کو معلوم ہے کہ تمام درجوں کے لئے ضرورت کے مطابق اُردو کی ٹیکسٹ بکیں (کورس کی کتابیں) نہیں ملتیں؟

(۱۰) کیا آپ کے علم میں کسی ایسے طالب علم کو جس نے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق ہائی اسکول کے امتحان میں سوالوں کے جواب اُردو میں دینے کی خواہش کی ہو کوئی دشواری ہوئی؟

(۱۱) کیا اُردو زبان کے علاوہ دوسرے مضمونوں کی تعلیم اسی زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے سہولتیں ضروری ہیں؟

(۱۲) کیا سکنڈری اسکولوں میں اُردو کے ذریعہ سے دوسرے مضمون پڑھانے کی سہولتیں ہیں؟

حصہ دوم نظم و نسق Administration

(۱۳) کیا آپ کے علم میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کے عدالتوں میں لئے جانے سے متعلق سرکاری ہدایتوں کے نفاذ میں کوئی دشواری ہوئی؟

(۱۴) کیا آپ کے علم میں اُردو دستاویزوں کو عدالتوں میں پیش کرنے کے بارے میں کوئی دشواری ہوئی؟

(۱۵) کیا آپ کے علم میں سرکاری ہدایتوں کے بموجب رجسٹرار کے دفتر میں اردو دستاویزوں کی رجسٹری کرانے میں کوئی دشواری ہوئی؟ اگر ہوئی تو کیا آپ اس بارے میں کوئی تجویز پیش کریں گے؟

حصّہ سوم نوکریاں:-

(۱۶) کیا آپ نیچے لکھے ہوئے مقابلہ کے امتحانوں میں سوالوں کے جواب دینے کے ذریعہ کے بارے میں سرکار کی موجودہ ہدایتوں میں کوئی ترمیم ضروری سمجھتے ہیں؟

(الف) سارڈمی نیٹ گزیٹیڈ اور ریاستی نوکریاں۔

(ب) دفتری (MINISTERIAL) اور دوسری غیر گزیٹیڈ نوکریاں۔ اگر جواب "ہاں" ہے تو براہ مہربانی اپنی تجاویز پیش کیجئے۔

حصّہ چہارم اُردو کی ترقی:-

(۱۷) کیا اُردو زبان وادب کی ترقی کے لئے ریاست کی دی ہوئی امداد کے بارے میں آپ کو کوئی تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حصّہ پنجم عام:-

(۱۸) کیا اور بھی ایسی باتیں ہیں جن کو آپ لسانی کمیٹی کی توجہ کے لئے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(نوٹ) براہ مہربانی اس سوالنامہ کے جواب میں تجاویز پیش کرتے وقت اِلی پہلو کو بھی دھیان میں رکھا جائے۔

(بقیہ انتخاب) ان شرپسندوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا، کیوں نہیں لیا؟ اسکی وجہ حکومت کو معلوم ہوگی، ان ہی تقریروں کا یہ نتیجہ ہے کہ مدھیہ پردیش میں مسلمانوں کی نسل کشی کے لئے منظم پلان بنایا گیا جس میں کیا کہا جائے کہ کون کون شریک تھا۔ اگرچودہ سال کی تقریروں اور تحریروں میں سے صرف ایک سال کی تقریروں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے زیادہ نہیں تو صرف عرب ممالک میں پھیلایا جائے تو ان کی آنکھیں کھل جائیں کہ دعوے کیا ہیں اور عمل کیا ہے، اور مسلمان کن حالات میں دلیری کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں دنیا کو پتہ ہی نہیں کہ یہاں مسلمانوں کے خلاف کیا ہو رہا ہو کیونکہ انھیں ہندستان کے دستور کی وہ دفعات دکھادی جاتی ہیں جن میں بلا امتیاز مذہب وملت ہر شخص کو ترقی کرنے اور مساویانہ زندگی بسر کرنے کا اعلان کیا گیا ہے مدھیہ پردیش میں سب کچھ ہونے کے بعد بھی ہت. وجہا سبھا کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا ہو اور اس نے صفائی سے اعلان کردیا ہو کہ اسکا مقصد ہندستان سے مسلمانوں کا صفایا ہو حکومت فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کے خلاف جو

"بچے ملک و قوم کی دولت ہیں" (نہرو محبوب منا)
ان کی نشان اعتماد
ہم سب کو مل کر حفاظت کرنا چاہیئے۔
بہارِ نو
بچوں کو ہر قسم کی بیماری سے محفوظ رکھتا ہے قیمت فی شیشی ۴ اونس عہ
رسالہ "بچوں کی صحت اور ان کی پرورش" مفت طلب فرمایئے۔
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ایجنسیاں
(۱) اعظم گڈھ، گرڈو ٹولہ (۲) کوپاگنج اعظم گڈھ دیسی دواخانہ
(۳) جونپور سعیدی دواخانہ مال گودام روڈ (۴) بارہ بنکی دھنو کرتالاب

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

ہندستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (ہندستان) ۵؎
سالانہ چندہ (پاکستان) ۶؎

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ چندہ ۱۵؎

فی کاپی آٹھ آنے (۸؎)

جلد ۲۹ | بابتہ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۱ء | شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اسکا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیے۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۵ ستمبر تک دفتر میں ضرور آجانی چاہیئے ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری:۔ خط و کتابت اور منی آرڈر پر اپنا نمبر خریداری لکھنا ہرگز نہ بھولئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کی کوششیں ابھی ختم نہیں ہونے پائی تھیں کہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کی بھی باری آگئی، اور وہ دارالعلوم جس کے چپہ چپہ پر قیام پاکستان کے مخالفت ثبت ہے، جس کی ایک ایک اینٹ سے آج بھی "نہیں بنے گا پاکستان" کے نعروں کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ جس کے بے غرض اکابر نے تحریک پاکستان کی مخالفت پر اپنی عزتیں لٹائیں اور جانوں کی بازی لگائی اور جو بلا نزاع تحریک پاکستان کی مخالفت کا سب سے بڑا اور پرجوش مرکز غیر منقسم ہندستان میں تھا۔ . . . .

——— اسی دارالعلوم پر آج یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ پاکستانی جاسوسوں اور سازشوں کا گڑھ بنا ہوا ہے، یہاں لاتعداد پاکستانی غیر قانونی طور پر طلباء کے بھیس میں پناہ پارہے ہیں، اور دارالعلوم کے ذمہ داران ان کی سرپرستی کررہے ہیں۔ کون ذمہ داران دارالعلوم؟ خصوصیت سے نام بھی لیا گیا ہے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا، جو اس الزام کی مجسم تردید ہیں اور جن کے متعلق اس طرح کا الزام بالکل ویسا ہی ہے جیسے سورج کے متعلق کوئی کہنے لگے کہ اس نے بجائے اجالے کے اندھیرا پھیلانا شروع کردیا ہے۔

دراصل اس وقت ایک رَو چلی ہوئی ہے اور ہندستان کی مسلم دشمن جماعتیں مسلمانوں کے ہر ادارے اور ہر فرد پر "پاکستانیت" کا لیبل چپاں کرکے اکثریت کو جذبات میں اندھا کردینا چاہتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند وہ آخری ادارہ ہوسکتا تھا جس کے متعلق ملک دشمنی اور پاکستان نوازی کا الزام زبان پر لایا جاسکے، اور جس کے متعلق ایسا خیال ملک میں پیدا کردینے میں کامیاب ہوجانا مسلمانوں کے خلاف "پاکستانیت" کی مہم میں انتہا درجہ کی کامیابی کے مرادف تھا۔ چنانچہ ایک ذرا سا موقع ہاتھ آتے ہی دارالعلوم کے خلاف یہ مہم

آناً فاناً اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اسلام اور مسلم دشمنی کا پیشہ رکھنے والے اخبارات نے دارالعلوم کو باقاعدہ نشانہ بنالیا، پوسٹر نکلنے لگے، اور بات یو، پی اسمبلی تک آپہنچی۔

شکر ہے کہ ریاست کے وزیر داخلہ نے توقع کے مطابق، اِن بیہودہ الزامات سے دارالعلوم کی برأت کردی۔ لیکن ہمیں جو اطلاعات ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے متعلق اس تکلیف دہ پروپگنڈے کا موقع دراصل پولیس کی حرکتوں سے پیدا ہوا ہے۔ پولیس کا رویہ آزادی کے بعد ہی سے دارالعلوم کے ساتھ نہایت افسوسناک رہا ہے۔ "احکام عیدالاضحیٰ" والے پوسٹر کے سلسلہ میں جس طرح دارالعلوم کی توہین کی گئی وہ آزادی کے بعد کی ایک تکلیف دہ یادہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوگیا تھا کہ پولیس کا محکمہ دارالعلوم کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی نظر کا یہ نتیجہ ہے کہ اُس نے دارالعلوم کے پاکستانی طلباء کی خبرگیری کے سلسلہ میں چند غلط قسم کے طلباء سے مستقل رابطہ پیدا کیا، یہ طلباء بعض حرکات پر نکال دیئے گئے تو پولیس ان کی سرپرست بن گئی، یہ خارج شدہ طلباء باوجود اخراج کے شہر ہی میں مقیم ہیں اور دارالعلوم کے خلاف جس طرح باقاعدہ محاذ بنائے ہوئے ہیں اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِن طلباء کی محض ناسمجھی اور انتقامی کارروائی نہیں ہے۔ بلکہ وہ پولیس کے غلط اندیش عناصر یا اُن کی وساطت سے بیرونی فرقہ پرست عناصر کا آلۂ کار بن گئے ہیں۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں؟
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں!

پولیس کے رویّہ کو دیکھتے ہوئے دیوبند کے بعض مقامی اخبارات و رسائل نے عجب مایوسی اور شکست خوردگی کے انداز میں لکھا ہے کہ حکومت اگر نہ چاہتی ہو کہ دارالعلوم آزادی کے ساتھ کھلے پھولے، تو وہ صاف صاف بتادے تاکہ ہم خود ہی اپنے اس ادارہ پر فاتحہ پڑھ کر روز روز کا تصفیہ ختم کردیں ـــــ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! یہ کیا اندازِ فکر ہے؟ یہ کیا بات لوگوں کی زبان پر آرہی ہے؟ کیا دارالعلوم کی بساط بس اتنی ہی ہے کہ اذنِ حاکم ہو تو زندہ رہے ورنہ نہیں! کیا دارالعلوم حکومت کی سرپرستی میں قائم ہے کہ پوچھا جائے "حضور کی مرضی کیا ہے"؟ یا یہ مطلب ہو کہ ہم مشکلات کو انگیز کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، پس اگر یہ معلوم ہوجائے کہ

مشکلات کا سلسلہ چلتا ہی رہے گا تو ہم یہ دوکان ہی بڑھا کر عافیت حاصل کریں؟

یہ رسائل واخبارات جن کا ذکر ہے اگرچہ دارالعلوم سے متعلق نہیں ہیں لیکن ہم دارالعلوم کے کسی بھی محب سے اس طرح کی پست ہمتی کی باتیں سُننا پسند نہیں کرتے، خصوصاً فضلاء دارالعلوم کے کسی رسالے میں تو اس طرح کی باتیں دیکھنا بہت ہی باعث افسوس ہے۔ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کا ماحول تو یہ پست ہمتی نہیں سکھاتا ——— دارالعلوم دیوبند کی جو تاریخ رہی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ آزاد ہندوستان کی حکومت اور اُسکی مشینری اس ادارہ کا احترام کرے اور اسے پھلنے پھولنے کے مواقع دے۔ لیکن اگر اس شریفانہ فرض کی ادائگی کی کوئی اہمیت ملک کی فرقہ وارانہ فضا میں نہیں رہ گئی ہے تو یہ بات بہرحال یاد رکھنی چاہیئے کہ دارالعلوم کسی حکومت کی عنایات ومراعات کا پروردہ نہیں ہے، وہ پہلے ہی دن سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ہے اور ایک سامراجی حکومت کا معتوب رہتے ہوئے اس عظمت تک پہنچا ہے۔ آج اگر ملکی حکومت کی فرض ناشناسی کی بدولت اُسکی راہ میں کچھ مشکلات پیدا ہوتی ہیں تو یہ اُسکو تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گی، البتہ قومی حکومت کے دامن پر ضرور دھبہ بنیں گی۔

عذرِ تاخیر افسوس ہے کہ اگست کا الفرقان دو ہفتے کی تاخیر سے شائع ہوا، اور یہ ستمبر کا شمارہ بھی ناظرین کی خدمت میں غالباً ایک ہفتہ لیٹ پہنچے گا، یہ صورتحال راقم (مرتب) کی علالت سے پیدا ہوگئی ہے۔ صحت کئی سال سے کچھ اچھی نہیں رہے، جس کا نتیجہ یہ ہونے لگا ہے کہ معمولی شکایات بھی کام میں حارج ہو جاتی ہیں۔ جولائی کے آخر سے کچھ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شکایات چل رہی ہیں اور ان کا اثر لکھنے پڑھنے کے کاموں پر خاصا پڑ رہا ہے، خدا کرے آئندہ ناظرین کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

محرّم اور صفر (۱۳۸۳ھ) کے پرچے

دفتر میں ختم ہوگئے ہیں۔ وقت کے اندر جتنی شکایتیں ان پرچوں کی آگئی تھیں اُن کی تلافی کی جا چکی ہو، اب اگر کوئی شکایت ان پرچوں کی آئے گی تو اسکی تلافی نہیں کی جاسکے گی۔ منیجر الفرقان

مَعَارِفُ الحَدِیث

(مسلسل)

مَساجِد

اُن کی عظمت و اہمیت اور آداب و حقوق

جو عظیم و وسیع مقاصد نماز سے وابستہ ہیں جن میں سے بعض کی طرف حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے کچھ اشارے بھی کیے جا چکے ہیں[1]، ان کی تحصیل و تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ نماز کا کوئی اجتماعی نظام ہو، اسلامی شریعت میں اس اجتماعی نظام کا ذریعہ مسجد اور جماعت کو بنایا گیا ہے۔ ذرا سا غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس امت کی دینی زندگی کی تشکیل و تنظیم اور تربیت و حفاظت میں مسجد اور جماعت کا کتنا بڑا دخل ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو جماعتی نظام کے ساتھ نماز ادا کرنے کی انتہائی تاکید فرمائی اور ترک جماعت پر سخت سے سخت وعیدیں سنائیں (جیسا کہ ناظرین عنقریب ہی پڑھیں گے) اور دوسری طرف آپ نے مساجد کی اہمیت پر زور دیا اور کعبۃ اللہ کے بعد بلکہ اسی کی نسبت سے ان کو بھی "خدا کا گھر" اور اُمت کا دینی مرکز بنایا اور ان کی برکات اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کی عظمت و محبوبیت بیان فرما کر اُمت کو ترغیب دی کہ ان کے جسم خواہ کسی وقت کہیں ہوں لیکن ان کے دلوں اور ان کی روحوں کا رُخ ہر وقت مسجد کی طرف رہے، اسی کے ساتھ

---

[1] زیر عنوان "نماز کی عظمت و اہمیت" (الفرقان بابت جمادین …ھ)

آپ نے مساجد کے حقوق اور آداب بھی تعلیم فرمائے ـــــ اس سلسلہ کے آپ کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے !۔

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰهِ اَسْوَاقُهَا ـــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شہروں اور بستیوں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ مبغوض اُن کے بازار اور منڈیاں ہیں۔ ـــــ (صحیح مسلم)

(تشریح) انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں، ایک ملکوتی و روحانی، یہ نورانی اور لطیف پہلو ہے، اور دوسرا مادی و بہیمی جو ظلماتی اور کثیف پہلو ہے ـــ ملکوتی و روحانی پہلو کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر جیسے مقدس اشغال و اعمال ہیں، انھیں سے اس پہلو کی تربیت و تکمیل ہوتی ہے اور انھیں کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و محبت کا مستحق ہوتا ہے، اور ان مبارک اشغال و اعمال کے خاص مراکز مسجدیں ہیں جو ذکر و عبادت سے معمور رہتی ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو "بیت اللہ" سے ایک خاص نسبت ہے، اس لیے انسانی بستیوں اور آبادیوں میں سے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب یہ مسجدیں ہی ہیں ـــ اور بازار اور منڈیاں اپنے اصل موضوع کے لحاظ سے انسانوں کے مادی و بہیمی تقاضوں اور نفسانی خواہشوں کے مراکز ہیں، اور وہاں جاکر انسان عموماً خدا سے غافل ہو جاتے ہیں اور ان کی فضا اس غفلت اور منکرات و معاصی کی کثرت کی وجہ سے ظلماتی اور مکدر رہتی ہے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انسانی آبادیوں کا سب سے زیادہ مبغوض حصہ ہیں۔

حدیث کی اصل روح اور اس کا منشا یہ ہے کہ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ مسجدوں سے زیادہ سے زیادہ تعلق رکھیں اور ان کو اپنا مرکز بنائیں اور منڈیوں اور بازاروں میں صرف

ضرورت سے جائیں اور ان سے دل نہ لگائیں اور وہاں کی آلودگیوں سے (مثلاً جھوٹ فریب اور بددیانتی سے) اپنی حفاظت کریں، ان حدود کی پابندی کے ساتھ بازاروں سے تعلق رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، بلکہ ایسے تاجروں اور سوداگروں کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اصولِ دیانت و امانت کی پابندی کے ساتھ تجارتی کاروبار کریں۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ بیت الخلا غلاظت اور گندگی کی جگہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ اصلاً سخت ناپسندیدہ مقام ہے لیکن ضرورت کے بقدر اس سے بھی تعلق رکھا جاتا ہے، بلکہ وہاں کے آنے جانے میں اور قضاء حاجت میں اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و سنن کا لحاظ رکھے تو بہت کچھ ثواب بھی کما سکتا ہے۔

(۵۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ۔ اِمَامٌ عَادِلٌ وَشَابٌّ نَشَاَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰہِ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰی یَعُوْدَ اِلَیْهِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰہِ اِجْتَمَعَا عَلَیْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰہَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ اِمْرَاَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ ———— رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا جس دن کہ اس کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا، ایک عادل و انصاف پسند حکمراں [illegible] دوسرا وہ جوان جس کا نشوونما اللہ کی عبادت میں ہوا، یعنی جو بچپن سے عبادت گزار رہا اور جوانی میں بھی عبادت گزار رہا اور جوانی کی

منیتوں نے اُسے غافل نہیں کیا) تیسرا وہ مرد مومن جس کا حال یہ ہے کہ مسجد سے باہر جانے کے بعد بھی اس کا دل مسجد ہی سے اٹکا رہتا ہے جب تک کہ پھر مسجد میں نہ آجائے۔ اور چوتھے وہ دو آدمی جنھوں نے اللہ کے لیے باہم محبت کی اُسی پر جڑے اور اسی پر الگ ہوئے (یعنی ان کی محبت صرف منھ دیکھے کی محبت نہیں جیسی اہل دنیا کی محبتیں ہوتی ہیں، بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ جب یکجا اور ساتھ ہیں جب بھی محبت ہے اور جب ایک دوسرے سے الگ اور غائب ہوتے ہیں جب بھی ان کے دل للّٰہی محبت سے لبریز ہوتے ہیں۔) پانچواں خدا کا وہ بندہ جس نے اللہ کو یاد کیا تنہائی میں تو اس کے آنسو بہہ پڑے، اور چھٹا وہ مرد خدا جسے حرام کی دعوت دی کسی ایسی عورت نے جو خوبصورت بھی ہے اور صاحب وجاہت وعزت بھی، تو اس بندے نے کہا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں (اس لیے حرام کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتا) اور ساتواں وہ شخص جس نے اللہ کی راہ میں کچھ صدقہ کیا اور اس قدر چھپا کر کیا کہ گویا اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں کہ اس کا داہنا ہاتھ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کر رہا ہے۔ اور کس کو دے رہا ہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں تیسرے نمبر پر اُس شخص کو اللہ کے سایۂ رحمت کی بشارت سنائی گئی ہے جس کا حال یہ ہو کہ مسجد سے باہر ہونے کی حالت میں بھی اس کا دل مسجد میں اٹکا رہے بیشک مومن کا حال یہی ہونا چاہیے ـــــــ اللہ تعالیٰ ان سات باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

(۵۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَدَا اِلَی الْمَسْجِدِ وَرَاحَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهٗ نُزُلَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا اَوْرَاحَ ـــــــ رواه البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ جس وقت بھی صبح کو یا شام کو اپنے گھر سے نکل کر

مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنت کی مہمانی کا سامان تیار کرتا ہے وہ جتنی دفعہ بھی صبح یا شام کو جائے۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بندہ صبح یا شام جس وقت بھی اور دن میں جتنی دفعہ بھی خدا کے گھر میں (یعنی مسجد میں) حاضر ہوتا ہے، رب کریم اس کو اپنے عزیز مہمان کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ کی حاضری پہ جنت میں اس کے لیے مہمانی کا خاص سامان تیار کراتا ہے جو وہاں پہونچنے کے بعد بندہ کے سامنے آنے والا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رب کریم کے جنت والے سامان مہمانی کا بیان کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کنز العمال میں تاریخ حاکم کے حوالے سے بروایت عبداللہ بن عباس ایک حدیث کے الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں۔

اَلْمَسَاجِدُ بُيُوتُ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنُونَ زُوَّارُ اللّٰهِ وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُورِ اَنْ يُكْرِمَ زَائِرَهُ.	مسجدیں اللہ کے گھر ہیں اور ان میں حاضر ہونے والے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ملاقاتی (اور مہمان) ہیں، اور جس کی ملاقات کو کوئی آئے اس پر حق ہے کہ وہ آنے والے ملاقاتی کا اکرام اور اس کی خاطر داری کرے۔
کنز العمال ص ۱۲۲ ج ۴	

"تاریخ حاکم" جس کے حوالے سے یہ روایت کنز العمال میں نقل کی گئی ہے اس کی روایتیں محدثین کے نزدیک عموماً ضعیف ہیں (خود کنز العمال کے مقدمہ میں بھی اس کی تصریح کر دی گئی ہے) لیکن اس کی اس روایت کا مضمون بخاری و مسلم کی مندرجہ بالا ابوہریرہ والی حدیث کے بالکل مطابق ہے۔ اس لیے تشریح میں یہاں اس کو نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا[۱]۔

(۵۴) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةُ الرَّجُلِ فِى الْجَمَاعَةِ تُضَعَّفُ عَلٰى صَلٰوتِهٖ فِىْ بَيْتِهٖ وَفِىْ سُوْقِهٖ خَمْسَةً وَّعِشْرِيْنَ ضِعْفًا وَذٰلِكَ اَنَّهٗ اِذَا تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُخْرِجُهٗ اِلَّا

[۱] بعد میں کنز العمال ہی میں بالکل اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت ابن مسعود کی روایت سے معجم کبیر طبرانی کے حوالہ سے بھی مل گئی ۱۲۔

الصَّلٰوۃُ لَمْ یَخْطُ خُطْوَۃً اِلَّا رُفِعَتْ بِھَا دَرَجَۃٌ وَحُطَّ عَنْہُ بِھَا خَطِیْئَۃٌ فَاِذَا صَلّٰی لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِکَۃُ تُصَلِّیْ عَلَیْہِ مَادَامَ فِیْ مُصَلَّاہُ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُ وَلَا یَزَالُ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلٰوۃٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلٰوۃَ   رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کی نماز جو وہ جماعت سے مسجد میں ادا کرے اس کی اس نماز کے مقابلہ میں جو وہ اپنے گھر میں یا بازار میں پڑھے (ثواب میں) پچیس گنی زیادہ ہوتی ہے، اور وجہ یہ ہے کہ جب وہ بندہ اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف جاتا ہے اور اس جانے میں نماز کے سوا اس کا کوئی دنیوی مقصد نہیں ہوتا، تو اس کے ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی ایک خطا معاف کر دی جاتی ہے، پھر جب وہ نماز پڑھتا ہو تو فرشتے اس وقت تک برابر اس کے حق میں عنایت اور رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھنے کی جگہ میں رہے، ان فرشتوں کی دعا یہ ہوتی ہے اے ہمارے اللہ اپنے اس بندے پر خاص عنایت فرما۔ اس پر رحمت فرما! اور جب تک تم میں سے کوئی نماز کے انتظار میں (مسجد میں) رہتا ہے، اللہ کے نزدیک اور اس کے حساب میں وہ برابر نماز ہی میں رہتا ہے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے پر بہ نسبت گھر اور دوکان وغیرہ کے ۲۵ گنا ثواب، اور راستہ کے ہر قدم پر ایک درجہ کی بلندی اور ایک گناہ کی معافی، یہ کتنی بڑی اور کتنی ارزاں دولت ہے؟ اور پھر اس سے بھی آگے فرشتوں کی دعا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُ" کیسی عظیم نعمت ہو۔ اس کے علاوہ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں فرشتوں کی اس دعا میں "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ" کا اضافہ بھی ہے۔ (یعنی اے اللہ اس بندے کی مغفرت فرما دے، اس کی توبہ قبول فرما لے) ——— نیز اسی

روایت کے آخر میں ایک اضافہ یہ بھی ہے کہ "مَا لَمْ يُؤْذِ فِيهِ مَا لَمْ يُحْدِثْ" یعنی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنے والے اس بندے کے حق میں فرشتے یہ دُعائیں اس وقت تک برابر کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ کسی کو اپنے ہاتھ یا اپنی زبان سے ایذا نہ پہونچائے، یا اس کا وضو ٹوٹ نہ جائے۔

(۵۵) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِئْذَنْ لَنَا فِي التَّرَهُّبِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ تَرَهُّبَ اُمَّتِي الْجُلُوْسُ فِي الْمَسَاجِدِ اِنْتِظَارَ الصَّلٰوةِ۔

رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ

(ترجمہ) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت نماز کے انتظار میں مسجدوں میں بیٹھنا ہے۔ (شرح السنہ)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ میں دنیوی معاملات اور دنیا کی لذتوں سے بے تعلق اور کنارہ کش ہوجانے کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور وہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض معروض کرتے تھے، اس حدیث کے راوی عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ میں یہ رجحان بہت تیز تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ کئی باتیں اسی طرح کی حضور سے عرض کیں ان میں کی آخری بات یہ تھی کہ ہمیں رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دے دی جائے، جس کے بعد ہم تارک الدنیا راہبوں والی زندگی گزاریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جن روحانی مقاصد اور اخروی منافع کے لیے پہلی امتوں میں رہبانیت تھی میری امت کو وہ چیزیں نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنے ہی پر اللہ تعالیٰ عطا فرمانے والے ہیں اور بس یہی میری امت کی رہبانیت اور درویشی ہے۔ دراصل نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا بھی ایک طرح کا "اعتکاف" ہے۔ کاش ہم اس کی قدر و قیمت جانیں۔

(۵۶) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ——— رواہ الترمذی وابوداؤد

(ترجمہ) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے جو بندے اندھیریوں میں مسجدوں کو جاتے ہیں، اُن کو بشارت سناؤ کہ (اُن کے اس عمل کے صلہ میں) قیامت کے دن اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کامل عطا ہوگا۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) رات کی اندھیریوں میں نماز کے لیے پابندی سے مسجد جانا بلاشبہ بڑا مجاہدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کی دلیل ہے، ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بشارت سنوائی ہے کہ اُن کے اس عمل کے صلہ میں قیامت کی اندھیریوں میں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کامل عطا فرمایا جائے گا۔ فَبُشْرٰى لَهُمْ وَطُوْبٰى لَهُمْ۔

(۵۷) عَنْ اَبِيْ اُسَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاِذَا خَرَجَ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ۔

——— رواہ مسلم

(ترجمہ) ابو اُسید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہونے لگے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب مسجد سے باہر جانے لگے تو دعا کرے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ (اے اللہ میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہوں تو میرے لیے اس کا فیصلہ فرمادے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) قرآن و حدیث میں رحمت کا لفظ زیادہ تر اُخروی اور دینی و روحانی انعامات کے لیے اور فضل کا لفظ رزق وغیرہ دنیوی نعمتوں کی داد و دہش اور ان میں زیادتی کے لیے استعمال کیا گیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے داخلہ کے لیے فتح باب رحمت

کی دعا تعلیم فرمائی، کیونکہ مسجد دینی و روحانی اور اُخروی نعمتوں ہی کے حاصل کرنے کی جگہ ہو۔ اور مسجد سے نکلتے وقت کے لیے اللہ سے اس کا فضل یعنی دنیوی نعمتوں کی فراوانی مانگنے کی تلقین فرمائی، کیونکہ مسجد سے باہر کی دنیا کے لیے یہی مناسب ہے ——
ان دونوں باتوں کا خاص منشا یہ ہے کہ مسجد میں آنے اور جانے کے وقت بندہ غافل نہ ہو اور دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ سائلانہ ہو۔

(۵۸) عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَّجْلِسَ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مسجد کو اللہ تعالیٰ سے ایک خاص نسبت ہو۔ اور اسی نسبت سے اس کو خانۂ خدا کہا جاتا ہے، اس لیے اس کے حقوق اور اس میں داخلہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں جاکر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی جائے، یہ گویا بارگاہ خداوندی کی سلامی ہے، اسی لیے اس کو "تحیۃ المسجد" کہتے ہیں۔ (تحیۃ کے معنی سلامی کے ہیں) لیکن یہ حکم جمہور ائمہ کے نزدیک استحبابی ہے ——

(ف) اس حدیث میں صراحۃً حکم ہے کہ تحیۃ المسجد کی یہ دو رکعتیں مسجد میں بیٹھنے سے پہلے پڑھنی چاہئیں، بعض عوام کو دیکھا گیا ہے کہ وہ مسجد میں جاکر پہلے قصداً بیٹھتے ہیں اس کے بعد کھڑے ہو کر نماز کی نیت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے رواج پا گئی ہے، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے چار صدی پہلے ان کے زمانہ کے عام مسلمانوں میں بھی یہ غلطی رائج تھی۔

(۵۹) عَنْ کَعْبِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَقْدَمُ مِنْ سَفَرٍ اِلَّا نَهَارًا فِی الضُّحٰی فَاِذَا قَدِمَ بَدَءَ بِالْمَسْجِدِ

فَصَلَّىٰ فِيهِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ فِيهِ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت کعب بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ سفر سے واپسی میں آپ دن ہی میں چاشت کے وقت مدینہ میں تشریف لاتے اور پہلے مسجد میں رونق افروز ہوتے تھے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد وہیں (کچھ دیر تک) تشریف رکھتے تھے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) دوسری بعض حدیثوں میں یہ تفصیل آتی ہے کہ آپ سفر سے واپسی میں آخری منزل عموماً مدینۂ طیبہ کے قریب ہی فرماتے تھے، جس کی وجہ سے مدینۂ طیبہ میں یہ اطلاع ہو جاتی تھی کہ آپ فلاں مقام پر ٹھہر گئے ہیں اور کل صبح تشریف لانے والے ہیں۔ پھر علی الصبح آپ اس منزل سے روانہ ہو کر کچھ دن چڑھے یعنی چاشت کے وقت مدینۂ طیبہ میں رونق افروز ہوتے تھے اور سب سے پہلے سیدھے اپنی مسجد مبارک میں تشریف لاتے تھے، گویا گھر والوں کی ملاقات سے بھی پہلے بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو کر اس کے حضور میں ہدیۂ عبودیت پیش کرتے تھے پھر اس کے بعد بھی کچھ دیر تک مسجد ہی میں تشریف رکھتے تھے اور مشتاقانِ زیارت وہیں آکر آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل کرتے تھے ـــــ یہ تھا مسجد کے تعلق کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ، اللہ تعالیٰ ہم امتیوں کو اس کی روح کو سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے۔

(۶۰) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ـــــ (رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی)

(ترجمہ) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خدمت اور نگہداشت کرتا ہے تو اس کے لیے ایمان کی شہادت دو۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد وہی لوگ کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز اور دین مقدس کا شعار و نشان ہو، اس لیے اس کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور اس کی خدمت و نگہداشت اور اس بات کی فکر و سعی کہ وہ اللہ کے ذکر و عبادت سے معمور اور آباد رہے، یہ سب سچے ایمان کی نشانی اور دلیل ہے۔

(۶۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ فِي الدُّوْرِ وَاَنْ يُّنَظَّفَ وَيُطَيَّبَ —

رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا محلوں میں مسجدیں بنانے کا اور یہ بھی حکم دیا کہ ان کی صفائی کا اور خوشبو کے استعمال کا اہتمام کیا جائے۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ جو محلے اور آبادیاں دور دور ہوں (جیسا کہ مدینہ کے قرب و جوار کی بستیوں کا حال تھا) تو ضرورت کے مطابق وہاں مسجدیں بنائی جائیں اور ہر قسم کے کوڑے کرکٹ سے ان کی صفائی کا اور ان میں خوشبو کے استعمال کا انتظام کیا جائے۔ مسجدوں کی دینی عظمت اور اللہ تعالیٰ سے ان کی نسبت کا یہ بھی خاص حق ہے۔

(۶۲) عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔

رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اللہ کے لیے (یعنی صرف اس کی خوشنودی اور اس کا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے) مسجد تعمیر کرائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک شاندار[۱] محل تعمیر فرمائیں گے۔

---

[۱] ہمارے نزدیک حدیث کے لفظ "بیتاً" کی تنوین تعظیم کے افادہ کے لیے ہو، اسی بنا پر ہم نے اس لفظ کا ترجمہ "شاندار محل" کیا ہے —— واللہ اعلم۔

(تشریح) حدیث و قرآن کے بہت سے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں ہر عمل کا صلہ اس کے مناسب عطا ہوگا۔ اس بنیاد پر مسجد بنانے والے کے لیے جنت میں ایک شاندار محل عطا ہونا یقیناً قرین حکمت ہے۔

مسجدوں کی ظاہری شان و شوکت اور ٹیپ ٹاپ پسندیدہ نہیں:-

(۶۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى ـــــــــ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے خدا کی طرف سے حکم نہیں دیا گیا ہو مسجدوں کو بلند اور شاندار بنانے کا (یہ حدیث بیان فرمانے کے بعد) حدیث کے راوی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے (بطور پیشین گوئی) فرمایا کہ یقیناً تم لوگ اپنی مسجدوں کی آرائش و زیبائش اسی طرح کرنے لگو گے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنی عبادت گاہوں میں کی ہے۔　　　　(سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيْدِ الْمَسَاجِدِ" کا منشا اور اس کی روح یہ ہے کہ مسجدوں میں ظاہری شان و شوکت اور ٹیپ ٹاپ مطلوب اور محمود نہیں ہو بلکہ ان کے لیے سادگی ہی مناسب اور پسندیدہ ہے ـــــــ آگے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مسجدوں کے متعلق امت کی بے راہ روی کے بارہ میں جو پیشین گوئی فرمائی، ظاہر یہی ہے کہ وہ بات بھی انہوں نے کسی موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سُنی ہوگی ـــــــ سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ ابن عباس ہی کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے

أَرَاكُمْ سَتُشَرِّفُوْنَ مَسَاجِدَكُمْ	میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بھی ایک وقت
بَعْدِىْ كَمَا شَرَّفَتِ الْيَهُوْدُ كَنَائِسَهُمْ	(جب میں تم میں نہ ہوں گا) اپنی مسجدوں کو

وَكَمَا شَرَّفَتِ النَّصَارَىٰ بِيَعَهَا۔ — اسی طرح شاندار بناؤ گے جس طرح یہودنے اپنے کنیسے بنائے ہیں اور نصاریٰ نے اپنے گرجے۔

(کنز العمال بحوالہ ابن ماجہ)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً ساٹھ سال تک اس دنیا میں رہے) مسلمانوں کے مزاج اور طرز زندگی میں تبدیلی کا رخ اور اس کی رفتار دیکھ کر یہ پیشین گوئی فرمائی ہو ـــــ بہرحال پیشین گوئی کی بنیاد جو بھی ہو وہ حرف بحرف پوری ہوئی ، خود ہم نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان ہی کے بعض علاقوں میں ایسی مسجدیں دیکھی ہیں جن کی آرائش و زیبائش کے مقابلہ میں کوئی کنیسہ اور کوئی گرجا پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(۴۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَّتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ۔

ــــــ رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجہ

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسجدوں کے بارہ میں لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر و مباہات کرنے لگیں گے (یعنی اپنا تفوق اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے ایک کے مقابلہ میں ایک شاندار مسجد بنائے گا)

(سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مسند دارمی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) قیامت کی نشانیوں میں سے بعض تو وہ ہیں جو اس کے بالکل قریب ظاہر ہوں گی جیسے خروج دجال اور آفتاب کا مغرب کی سمت سے طلوع ہونا وغیرہ وغیرہ ۔ اور بعض وہ ہیں جو قیامت سے پہلے کسی نہ کسی وقت ظاہر ہوں گی ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت میں پیدا ہونے والی جن خرابیوں اور جن فتنوں کو قیامت کی نشانیوں میں سے بتایا ہے وہ اکثر اسی قسم کی ہیں ۔ اور مسجدوں کے بارہ میں فخر و مباہات بھی انھیں میں سے ہو اور مسلمان اب سے بہت پہلے اس میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت :-

(۶۵) عن جابر قال قال رسول اللهِ صلى الله عليه وسلّم مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْمُنْتِنَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَاَذّٰى مِمَّا يَتَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ ——— رواه البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس بدبودار درخت (پیاز یا لہسن) کھائے وہ ہماری مسجد میں نہ آئے، کیونکہ جس چیز سے آدمیوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) مسجدوں کی دینی عظمت اور حق تعالیٰ کے ساتھ ان کی خاص نسبت کا ایک حق یہ بھی ہو کہ ہر قسم کی بدبو سے ان کی حفاظت کی جائے، چونکہ لہسن اور پیاز میں بھی ایک طرح کی بدبو ہوتی ہے (اور بعض مخصوص علاقوں میں پیدا ہونے والی ان دونوں چیزوں کی بو بہت ہی تیز اور سخت ناگوار ہوتی ہے۔) اور حضور کے زمانے میں لوگ ان کو کچا بھی کھاتے تھے، اس لیے آپ نے حکم دیا کہ ان کو کھا کر کوئی آدمی مسجد میں نہ آئے، اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جس چیز سے سلیم الطبع آدمیوں کو اذیت ہوتی ہے اس سے اللہ کے فرشتوں کو بھی اذیت ہوتی ہے اور مسجدوں میں چونکہ فرشتوں کی آمد و رفت بڑی کثرت سے ہوتی ہے اور خاص کر نمازوں میں وہ بنی آدم کے ساتھ بڑی تعداد میں شریک رہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ بدبو جیسی کسی بھی چیز سے ان مقدس اور محترم مہمانوں کو ایذا نہ پہونچے۔

ایک دوسری حدیث میں صراحت کے ساتھ پیاز اور لہسن دونوں کا نام لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو کھا کر کوئی ہماری مسجد میں نہ آیا کرے ——— اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی کو یہ چیزیں کھانی ہی ہوں تو پکا کر ان کی بدبو زائل کر لیا کرے۔[۱]

ان حدیثوں میں اگرچہ صرف پیاز اور لہسن کا ذکر آیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر بدبودار

---

[۱] رواہ ابوداؤد عن معاویۃ بن قرۃ ۱۲

چیز بلکہ ہر اس چیز کا جس سے سلیم الفطرت انسانوں کو اذیت ہو یہی حکم ہے۔

مسجدوں میں شعر بازی اور خرید و فروخت کی ممانعت:۔

(۶۶) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَنَاشُدِ الْاَشْعَارِ فِى الْمَسْجِدِ وَعَنِ الْبَيْعِ وَالْاِشْتِرَاءِ فِيْهِ وَاَنْ يَّتَحَلَّقَ النَّاسُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فِى الْمَسْجِدِ ــــــــــ رواہ ابو داؤد والترمذی

(ترجمہ) عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور وہ روایت کرتے ہیں اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدوں میں شعر بازی کرنے سے اور خرید و فروخت کرنے سے منع فرمایا اور اس سے بھی منع فرمایا کہ جمعہ کے دن مسجد میں نماز سے پہلے لوگ اپنے حلقے بنا بنا کر بیٹھیں۔ (سنن ابی داؤد و جامع ترمذی)

(تشریح) مسجدوں کی دینی عظمت کا یہ بھی حق ہے کہ جو مشغلے اللہ کی عبادت سے اور دین سے قریبی تعلق نہ رکھتے ہوں وہ اگرچہ فی نفسہ جائز ہوں (خواہ کاروباری ہوں جیسے تجارت سوداگری یا تفریحی ہوں جیسے مشاعرے، اور ادبی مجلسیں) مسجدیں ان کے لیے استعمال نہ کی جائیں۔ مسجد میں شعر بازی اور خرید و فروخت کی ممانعت کی بنیاد یہی ہے۔ حدیث کا آخری جز جو جمعہ کے دن سے متعلق ہے اس کا منشا اور مطلب بظاہر یہ ہے کہ جو لوگ جمعہ کے دن نماز کے لیے پہلے سے مسجد پہونچ جائیں (جس کی خود حدیثوں میں ترغیب دی گئی ہے) ان کو چاہیے کہ وہ نماز تک یکسوئی کے ساتھ ذکر و عبادت اور دعا جیسے اشغال میں مشغول رہیں، اپنے الگ الگ حلقے اور مجلسیں قائم نہ کریں۔ واللہ اعلم۔

چھوٹے بچوں سے اور شور و شغب وغیرہ سے مسجدوں کی حفاظت:۔

(۶۷) عَنْ وَاثِلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جَنِّبُوا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ وَمَجَانِيْنَكُمْ وَشِرَاءَكُمْ وَبَيْعَكُمْ وَخُصُوْمَاتِكُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِكُمْ وَإِقَامَةَ حُدُوْدِكُمْ وَسَلَّ سُيُوْفِكُمْ

رواہ ابن ماجۃ

(ترجمہ) واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنی مسجدوں سے دور اور الگ رکھو اپنے چھوٹے بچوں کو اور دیوانوں کو (ان کو مسجدوں میں نہ آنے دو) اور اسی طرح مسجدوں سے الگ اور دور رکھو اپنی خرید و فروخت کو اور اپنے باہمی جھگڑوں ٹنٹوں کو اور اپنے شور و شغب کو اور حدوں کے قائم کرنے کو اور تلواروں کے نیاموں سے نکالنے کو (یعنی ان میں سے کوئی بات بھی مسجدوں کی حدود میں نہ ہو، یہ سب باتیں مسجد کے تقدس اور احترام کے خلاف ہیں) (سنن ابن ماجہ)

مسجدوں میں دنیا کی بات نہ کی جائے:-

(۶۰) عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَكُوْنُ حَدِيْثُهُمْ فِيْ مَسَاجِدِهِمْ فِيْ أَمْرِ دُنْيَاهُمْ فَلَا تُجَالِسُوْهُمْ فَلَيْسَ لِلّٰهِ فِيْهِمْ حَاجَةٌ -

رواہ البیہقی فی شعب الایمان

(ترجمہ) حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مسجدوں میں لوگوں کی بات چیت اپنے دنیوی معاملات میں ہوا کرے گی، تمھیں چاہیے کہ ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھو، اللہ کو ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں۔ (شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مسجد چونکہ خانۂ خدا ہے اس لیے اس کے ادب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس میں ایسی باتیں نہ کی جائیں جن کا اللہ کی رضا طلبی سے اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو ــــ ہاں مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی مسائل کے بارہ میں خواہ ان کا تعلق مسلمانوں کی زندگی کے کسی شعبہ سے ہو،

مسجدوں میں مشورے کیے جا سکتے ہیں اور اس سلسلے کے کاموں کے لیے مسجدوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن اس میں بھی مسجدوں کے عام آداب کا لحاظ ضروری ہوگا، نیز یہ بھی شرط ہوگی کہ یہ جو کچھ ہو اللہ کی ہدایت کے تحت ہو اس سے آزاد ہو کر نہ ہو۔

(ف) اس حدیث کے راوی حضرت حسن بصریؒ تابعی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کو یہ حدیث کسی صحابی کے واسطہ سے پہونچی ہوگی، لیکن انھوں نے ان صحابی کا حوالہ نہیں دیا۔ ایسی حدیث کو جسے کوئی تابعی صحابی کا حوالہ دیے بغیر روایت کرے محدثین کی اصطلاح میں "مرسل" کہا جاتا ہے۔

مسجد میں نماز کے لیے عورتوں کا آنا :-

(۶۹) عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَاْذَنَکُمْ نِسَاءُکُمْ بِاللَّیْلِ فَأْذَنُوْا لَھُنَّ ۔ رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمھاری بیویاں رات کو مسجد جانے کے لیے تم سے اجازت مانگیں تو ان کو اجازت دے دیا کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۷۰) عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَکُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ ۔ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے منع نہ کرو، اور ان کے لیے بہتر ان کے گھر ہی ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں جبکہ مسجد نبوی میں پانچوں وقت کی نماز بہ نفس نفیس آپ خود پڑھاتے تھے تو آپ کی طرف سے بار بار اس کی وضاحت کے باوجود کہ عورتوں کے لیے اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھنا افضل اور زیادہ ثواب کا باعث ہے، بہت سی نیک بخت عورتوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ کم از کم رات کی نمازوں میں (یعنی

عشاء اور فجر میں) مسجد جاکر حضور کے پیچھے نماز پڑھا کریں۔ لیکن بعض لوگ اپنی بیویوں کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے، اور ان کا یہ اجازت نہ دینا کسی فتنہ کے اندیشہ سے یا کسی بدگمانی کی وجہ سے نہ تھا (کیونکہ اس وقت کا پورا اسلامی معاشرہ اس لحاظ سے ہر طرح قابلِ اطمینان تھا) بلکہ ایک غیر شرعی قسم کی غیرت اس کی بنیاد تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عورتیں اگر رات کی نمازوں میں مسجد آنے کی اجازت مانگیں تو ان کو اجازت دے دینا چاہئے۔ لیکن خود عورتوں کو آپ برابر یہی سمجھاتے رہے کہ بیویو تمہارے لیے زیادہ بہتر اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھنا ہے جیسا کہ آگے درج ہونے والی حدیث سے اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

(۷) عَنْ اُمِّ حُمَيْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ عَلِمْتُ اَنَّكِ تُحِبِّيْنَ الصَّلٰوةَ مَعِيَ وَصَلٰوتُكِ فِيْ بَيْتِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ حُجْرَتِكِ وَصَلٰوتُكِ فِيْ حُجْرَتِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ دَارِكِ وَصَلٰوتُكِ فِيْ دَارِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ مَسْجِدِ قَوْمِكِ وَصَلٰوتُكِ فِيْ مَسْجِدِ قَوْمِكِ خَيْرٌ مِّنْ صَلٰوتِكِ فِيْ مَسْجِدِيْ۔

(رواہ احمد۔ کنز العمال)

(ترجمہ) مشہور صحابی ابو حمید ساعدیؓ کی بیوی ام حمید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ (یعنی میرے پیچھے جماعت کے ساتھ) نماز پڑھنے کی بڑی چاہت ہے اور مسئلہ شریعت کا یہ ہے کہ تمہاری وہ نماز جو تم اپنے گھر کے اندرونی حصہ میں پڑھو وہ اس نماز سے افضل اور بہتر ہے جو تم اپنے بیرونی دالان میں پڑھو اور بیرونی دالان میں تمہارا نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر کے صحن میں پڑھو اور اپنے گھر کے صحن میں تمہارا نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے قبیلہ کی مسجد میں (جو تمہارے مکان سے قریب ہے) نماز پڑھو اور اپنے قبیلہ والی مسجد میں تمہارا نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم میری مسجد میں آکر نماز پڑھو۔ (کنز العمال بحوالہ مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی

نماز کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی وضاحت بار بار اور مختلف موقعوں پر فرمائی ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سی صحابیات کا دلی جذبہ یہی ہوتا تھا کہ چاہے ہمارے لیے اپنے گھروں میں نماز پڑھنا افضل اور زیادہ ثواب کی بات ہو لیکن ہم کم از کم رات کی نمازیں مسجد میں حاضر ہو کر حضور کے پیچھے ہی پڑھ لیا کریں۔ اور چونکہ اس جذبہ کی بنیاد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کی سچی ایمانی محبت تھی اور اس زمانہ میں کسی فتنہ کا اندیشہ بھی نہیں تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ عورتیں اگر رات کو مسجدوں میں جانے کی اجازت چاہیں تو ان کو اجازت دے دیا کرو۔ بہرحال یہ اجازت دینے کا حکم اس وقت کا ہے جبکہ عورتوں کے مسجد جانے میں کسی برائی کا خطرہ اور کسی فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا اور بعض صحابہ کرام صرف عرفی غیرت یا اپنی خاص افتاد طبع کی وجہ سے اپنی بیویوں کو مسجد میں جانے سے منع کر دیتے تھے۔ ____ لیکن جب عورتوں اور مردوں دونوں کے حالات میں تبدیلی آگئی اور فتنوں کے اندیشے پیدا ہو گئے تو خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے (جن سے زیادہ کوئی بھی عورتوں کے ظاہری و باطنی حال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج و منشاء سے واقف نہیں ہو سکتا) وہ فرمایا جو آگے درج ہونے والی حدیث میں آپ پڑھیں گے(۱)۔

(۲۷) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَوْ اَدْرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسَاجِدَ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ

---

(۱) ان حدیثوں کی تشریح میں اور اس مسئلہ پر یہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دو سطروں کی توضیح و تفصیل ہے جو "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم "اذا استاذنت امرأة احدكم الى المسجد فلا يمنعها" وبين ما حكم جمهور الصحابة من منعهن اذ المنهي الغيرة التي تنبعث من الانفة دون خوف الفتنة والجائز ما فيه خوف الفتنة و ذالك قوله صلى الله عليه وسلم الغيرة غيرتان وحديث عائشة ان النساء احدثن ، الحديث ____ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۶ / ۲۷

بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ ـــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو دیکھتے جو عورتوں نے اپنے (طرز زندگی میں) اب پیدا کرلی ہیں تو آپ خود ان کو مسجدوں میں جانے سے منع فرمادیتے جس طرح کہ (اسی قسم کی باتوں کی وجہ سے) بنی اسرائیل کی عورتوں کو (ان کی عبادت گاہوں میں جانے سے اگلے پیغمبروں کے زمانہ میں) روک دیا گیا تھا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ بات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور کے وصال کے بعد اپنے زمانہ میں فرمائی تھی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ اسی بنا پر جمہور صحابہ کی رائے یہ ہوگئی تھی کہ اب عورتوں کو مسجدوں میں نہ جانا چاہیے۔ بعد کے زمانوں میں ان تبدیلیوں میں جو اور ترقی ہوئی اور ہمارے معاشرے کی خرابیوں میں جو بے حساب اضافہ ہوا اس کے بعد تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔

مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا ضروری بیان

دیوبند میں مختلف ناموں کے بہت سے تجارتی کتب خانے ہیں اور متعدد رسالے بھی یہاں سے نکلتے ہیں خود دارالعلوم دیوبند کا بھی ایک رسالہ "ماہنامہ دارالعلوم" نکلتا ہے اس کے علاوہ کسی رسالہ یا اخبار سے اور کسی تجارتی کتب خانہ یا کمپنی سے دارالعلوم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حال ہی میں بعض قابل اعتماد ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے بعض رسالے بھی ایسا کرتے ہیں اور بعض تجارتی کتب خانے بھی کہ دارالعلوم سے مخلصانہ تعلق رکھنے والوں کا پتہ لگا کر اپنی کتابیں اور اپنے رسالے ان کے نام وی پی کردیتے ہیں اور ان کو باور کراتے ہیں کہ دارالعلوم کے ذمہ دار اکابر کی ہدایت ہے کہ آپ کے نام کتاب یا رسالہ کا یا اخبار کا وی پی کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کو اس طرح کے وی پی کیے گئے خود انھوں نے اس قسم کی شکایت لکھی ہے۔ اس لیے دارالعلوم کی طرف سے ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان رسالوں یا کتب خانوں سے دارالعلوم کا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ طریقہ بہت ہی مذموم ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا رسالہ صرف "دارالعلوم دیوبند" ہے اور اس کے دفتر کو بھی ہدایت کردی گئی ہے کہ اپنے قدیم خریداروں کے علاوہ کسی کو بھی بغیر طلب اور آرڈر کے رسالہ کا وی پی نہ کیا جائے۔

محمد طیب عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

شیخ احمد سرہندیؒ

(مجدد الف ثانی)

(جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے حیدرآباد سندھ)

[امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اور ان کے تجدیدی کام پر الحمد للہ اردو میں اب بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تحدیث نعمت کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ کے ذریعہ ایک نئی روشنی کا دور اور ایک نئے باب کا افتتاح ہوا ہے اور اس وقت سے اب تک کہ ۲۴-۲۵ سال کا عرصہ ہوا الفرقان اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہا ہے۔ اسی موضوع پر عنوان بالا کے تحت ایک مقالہ جناب پروفیسر مسعود صاحب ایم اے (حیدرآباد سندھ) کا موقر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہونا شروع ہوا ہے اس مقالہ کی علمی و تحقیقی حیثیت اور فاضل مقالہ نگار کی قابل قدر محنت کا حق ہے کہ اسکو الفرقان میں بھی شائع کیا جائے۔ آج اس کی پہلی قسط ہدیہ ناظرین ہے۔]

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
(اقبال)

بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

"حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی بھی من جملہ ان اکابر امت کے ہے جن کی تعظیم و توقیر تو حسن اعتقاد کی بنا پر بہت کی جاتی ہے لیکن ان کی زندگی کے اصل کارناموں پہ پردے پڑ گئے ہیں۔"

(ابوالکلام آزاد تذکرہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۵)

آزاد نے شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ) کی زندگی کے کارناموں کے اخفاء و اضمار پر اظہار افسوس کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔
علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے خطبات مدراس میں لکھا ہے کہ:-

"بہتر سے بہتر فلسفہ، عمدہ سے عمدہ تعلیم، اچھی سے اچھی ہدایت زندگی نہیں پا سکتی اور کامیاب نہیں ہو سکتی اگر اس کے پیچھے کوئی ایسی شخصیت اس کی حامل اور عامل ہو کر قائم نہیں ہے جو ہماری توجہ، محبت اور عظمت کا مرکز ہو۔"

(سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۲ء ص۳۵)

علامہ اقبال نے ایسی ہی شخصیت کے متعلق کہا ہے:۔

اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاک چمنستاں شرر آمیز

ہندوستان میں ایسی ہستی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی تھی، جو علوم نبوت کی حامل اور اس کا پیکر تھی، اور جس کے نفس گرم کی تاثیر سے چمنستان ہند کی خاک شرر بار بن گئی اور دین کا بجھا ہوا چراغ ایک مرتبہ پھر روشن ہو گیا اور اپنی نورانی شعاعوں سے بدعات و اوہام کی تاریکی دور کر کے سنت کے نور سے ارض ہند کو منور کر دیا۔ آئندہ سطور میں اس روشنی کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔

خاندان شیخ مجددؒ شیخ مجددؒ کے خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات (۱۰۳۷ھ) میں شیخ مجددؒ کا شجرۂ نسب اس طرح لکھا ہے:۔

شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد بن شیخ زین العابدین بن شیخ عبدالحی بن شیخ محمد بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ امام رفیع الدین بن شیخ نصیر الدین بن شیخ سلیمان بن شیخ یوسف بن شیخ اسحٰق بن شیخ عبداللہ بن شیخ شعیب بن شیخ احمد بن شیخ یوسف ... ... بن شیخ شہاب الدین فرخ شاہ کابلی بن شیخ نصیر الدین بن شیخ محمود بن شیخ سلیمان بن شیخ مسعود بن شیخ عبداللہ (واعظ الاصغر) بن شیخ عبداللہ (واعظ الاکبر) بن شیخ ابوالفتح بن شیخ اسحٰق بن شیخ ابراہیم بن شیخ ناصر بن حضرت عبداللہ بن عمر الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

[1] محمد احسان اللہ عباسی نے 'جواہر مجددیہ' کے حوالے سے یہاں سلسلہ اس طرح شروع کیا ہے۔ شیخ عبداللہ بن شیخ عمر بن شیخ حفص بن شیخ عاصم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(مجدد الف ثانی، مطبوعہ رام پور ۱۹۲۶ء ص۲۶)

(محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ ص ۹۱-۹۰)

شاہ محمد فضل اللہ (م ۱۳۱۲ھ) عمدۃ المقامات (۱۲۳۳ھ) میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ
شیخ مجددؒ کے چودھویں جد شیخ سلطان شہاب الدین عرف فرخ شاہ کابلی والی کابل
تھے، آپ نے کئی بار ہندوستان پر لشکر کشی کی، کفار سے جہاد کیا، بتوں کا قلع قمع کیا اور اسلام کی ترویج
و اشاعت کی، بارہا بکثرت مال غنیمت لے کر فتح و نصرت کے ساتھ ہندوستان سے لوٹے، آخر میں ترک
سلطنت کر کے فقر اختیار کر لیا اور سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہو گئے، کوہستان کابل میں سکونت اختیار کی،
مخلوق کو اپنے روحانی فیوض و برکات سے مستفیض فرماتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا، شیخ ضیاء الحق
علیہ الرحمہ نے یہاں خانقاہ اور مسجد تعمیر کرائی ہے۔ آج کل یہ موضع دَرۂ فرخ شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

(محمد فضل اللہ، عمدۃ المقامات مطبوعہ لاہور ۱۳۵۵ھ ص ۹۹)

شیخ مجددؒ کے پانچویں جد شیخ امام رفیع الدین، حضرت جلال الدین بخاریؒ کے مرید و خلیفہ
تھے، اپنے مرشد کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے، جب یہ دونوں بزرگ موضع سرائے سہند پہنچے جو سرہند
سے پانچ چھ کوس ہے۔ تو وہاں کے باشندوں نے درخواست کی کہ جب آپ دہلی رونق افروز ہوں
تو سلطان فیروز شاہ (مرید جلال الدین بخاریؒ) سے فرما دیں کہ سرائے سے سامانہ آنے والوں کے
لئے راستہ پر خطر ہے، کیونکہ جنگل میں وحشی درندے ہیں۔ اس لئے ان دونوں موضعوں کے درمیان
ایک شہر آباد کر دیا جائے، تاکہ یہ لوگ سامانہ سے مالیہ ادا کرنے سرائے آنا چاہیں تو ان کو تکلیف
نہ ہو، دہلی پہنچ کر حضرت جلال الدین بخاریؒ نے سلطان فیروز شاہ سے سرائے والوں کی سفارش
کر دی، چنانچہ سلطان نے شیخ امام رفیع الدین کے برادر بزرگ خواجہ فتح اللہ کو حکم دیا کہ وہ اس
مقام پر جا کر شہر آباد کریں، چنانچہ موصوف، دس ہزار سوار لے کر یہاں پہنچے اور قلعہ کی تعمیر شروع کر دی،
لیکن یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ دن میں قلعہ کا جتنا حصہ تعمیر ہوتا رات کو وہ سب منہدم پایا
جاتا، حضرت جلال الدین بخاریؒ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے امام رفیع الدین کو
تحریر لکھا کہ وہ جا کر خود قلعہ کی بنیاد رکھیں اور شہر میں آباد ہوں، چنانچہ آپ نے قلعہ تعمیر کیا اور
یہیں متوطن ہو گئے، یہ قلعہ پہلے موجودہ شہر سے دور تھا، اب آبادی کی وجہ سے شہر کے اندر آ گیا
ہے، اس کو سہرند کہا جاتا تھا جس کے معنی "بیشۂ شیر" (شیر کا جنگل) کے ہیں، امتداد زمانہ کی وجہ

سہرند، سرہند ہو گیا، شیخ مجددؒ کی ولادت باسعادت اسی شہر میں ہوئی؟

(محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء ص ۸۹-۹۱)

شیخ مجدد کے والد بزرگوار شیخ عبد الاحد (م ۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء) اپنے زمانہ کے عارفان کامل میں تھے، تحصیل علم کے دوران ہی شیخ طریقت کی طلب میں شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ (م ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کی خدمت میں پہنچے، اور استفاضہ کیا، مگر شیخ موصوف نے تحصیل علم کی تلقین فرمائی، چنانچہ آپ فارغ ہو کر دوبارہ حاضر ہوئے تو شیخ ممدوحؒ کا وصال ہو چکا تھا، اس لئے ان کے خلف شیخ رکن الدین (م ۹۸۳ھ / ۱۵۷۵ء) نے آپ کی روحانی تربیت کی اور قادریہ و چشتیہ سلسلوں کا خرقۂ خلافت عنایت فرمایا، اس کے ساتھ ایک اجازت نامہ (۹۶۹ھ) بھی مرحمت فرمایا۔

شیخ عبد الاحد تمام علوم میں مہارت رکھتے تھے اور جملہ کتب معقول و منقول بڑی صحت اور تحقیق کے ساتھ طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ فقہ اور اصول فقہ میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا، اس کے ساتھ ساتھ طالبین حق کو علوم باطنی سے بھی بہرہ مند کیا کرتے تھے"

(پروفیسر فرمان علی، حیات مجدد، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۱۱)

ولادت شیخ مجددؒ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی ولادت باسعادت ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں سرہند میں ہوئی، خواجہ محمد ہاشم کشمی تحریر فرماتے ہیں۔

"طلوع ایں آفتاب ولایت بود از آنجا شریف حضرت ایشاں کہ تحسین می فرمودند ونیز ایں بندہ از بعضے ... در یافتہ ... شنیدہ چوں ولادت پیر بزرگوار ایشاں در حدود سنہ احدی و سبعین و تسعمائۃ (۹۷۱ھ) و تاریخ یافتہ کہ "خاشع" بیان آں سال سعادت قریں تا یہ دایں در بلدۂ شریفہ سرہند بودہ"

(محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور، ص ۱۲۰)

ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب نے بھی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں یہی سنہ تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"آپ ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں سرہند (ریاست پٹیالہ، مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے"

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ ... جلد اول ص ۲۹۰)

سی، اے، اسٹوری (C.A. Storey) نے بھی یہی سنہ لکھا ہے۔

"امام ربانی، محبوب سبحانی، مجدد الف ثانی سنہ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں سرہند میں پیدا ہوئے"

(اسٹوری دی پرشین لٹریچر جلد اول حصہ دوم ص ۹۸۸)

تعلیم و تعلم | شیخ مجددؒ نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالاحد (م سنہ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء) سے علوم معقول و منقول کی تحصیل کی، خواجہ محمد ہاشم اور ان کے علاوہ دیگر سوانح نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ شیخ مجددؒ نے ابتدائی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا، مگر خود شیخ مجددؒ کے مکتوب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حفظ قرآن کی دولت قلعۂ گوالیار میں نظر بندی (سنہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء تا سنہ ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء) کے دوران میں حاصل ہوئی، شیخ مجددؒ اپنے صاحبزادگان خواجہ محمد سعیدؒ (م سنہ ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء) اور خواجہ محمد معصوم (م سنہ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء) کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

.... دیگر ختم قرآن را تا سورۂ عنکبوت رسانیدہ ام۔ شب کہ از ان مجلس (مجلس شاہی) برگشتہ می آیم به تراویح اشتغال می یابم، این دولت عظمیٰ حفظ دریں فرصت کہ عین جمعیت بود حاصل گشت۔ الحمد للہ اولاً و آخراً۔ (مکتوبات شریف دفتر سوم "معرفت الحقائق" (سنہ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء) مرتبہ خواجہ ہاشم کشمی مکتوب ۱۱، مطبوعہ امرتسر سنہ ۱۳۳۳ھ)

حفظ قرآن کے بعد والد ماجد سے تحصیل علم شروع کی اور بیشتر تعلیم انہی سے حاصل کی، بعض علماء عصر سے بھی استفادہ کیا۔ کتب حدیث کی سند حضرت شیخ یعقوب کشمیری سے حاصل کی اور اس زمانے میں ایک مقدس عالم حضرت قاضی بہلول بدخشانی تھے، ان سے حسب ذیل کتب کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ امام واحدی کی تفسیر بسیط، تفسیر وسیط، اسباب النزول، قاضی بیضاوی کی تفسیر اور دوسری تصنیفات مثل منہاج الوصول، الغایۃ القصویٰ وغیرہ اور امام بخاری کی صحیح اور دوسری تالیفات مثل ثلاثیات، ادب المفرد، افعال العباد اور تاریخ وغیر ذالک، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، جامع صغیر للسیوطیؒ اور قصیدۂ بردہ وغیرہ۔ مولانا کمال کشمیری سے عضدی پڑھی تھی غرضیکہ ہر علم و فن کو اسکے مشہور اور مستند اساتذہ سے حاصل کیا۔ (تذکرہ مجدد الف ثانی مرتبہ محمد منظور نعمانی مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۲۴،۲۲۵) (زبدۃ المقامات، مولفہ محمد ہاشم کشمی، مطبوعہ کانپور سنہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء ص ۱۲۵۔)

سفر اکبرآباد | تحصیل علم سے فراغت کے بعد حضرت مجدد اکبرآباد تشریف لے گئے، اور درس و تدریس

کا سلسلہ شروع کیا آپ کے حلقۂ درس میں فضلائے عصر بھی شریک ہوتے تھے، اس زمانہ میں اکبر (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) تخت ہند پر متمکن تھا، اور پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اکبرآباد علمی مرکز بنا ہوا تھا۔

اسی زمانہ میں ابوالفضل (م ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) اور ان کے بھائی ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) سے شیخ مجددؒ کے مراسم ہوئے، یہ دونوں بھائی شیخ مجدد کا احترام کرتے تھے، خواجہ محمد ہاشم کشمی بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے ابوالفضل کے ایک شاگرد نے کہا کہ استاد گرامی اپنے کسی دوست کو خط لکھ رہے تھے، اثنائے تحریر میں جب ہمارے شیخ کا ذکر آیا تو تعریف و توصیف میں بہت سے القاب لکھے، شیخ مجددؒ دونوں بھائیوں کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ فیضی کے یہاں تشریف لے گئے تو وہ تفسیر سواطع الالہام (۱۰۰۲ھ) لکھنے میں مصروف تھے، اچانک آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو کہا:۔

"خوب رسیدید، موضعے از تعبیر پیش آمدہ کہ آں را بہ حرف غیر معجمہ تاویل و تفسیر نمودن متعسر شدہ، من دماغ بسیار سوختم اما عبارت دل خواہ بہ دست نیامدہ"

(خواجہ محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء ص ۱۳۲)

شیخ مجددؒ نے اسی وقت کمال بلاغت کے ساتھ قلم برداشتہ ایک صفحہ لکھ دیا جس کو دیکھ کر فیضی حیران ہو گئے۔

(محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ص ۱۳۲)

ابوالفضل سے شیخ مجددؒ کے تعلقات خوشامدانہ نہ تھے، بلکہ عین مسترشدانہ تھے، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز آپ ابوالفضل کے یہاں تشریف لے گئے، اتفاقاً اس نشست میں ابوالفضل نے فلاسفہ کی تعریف شروع کی شیخ مجددؒ کو ناگوار معلوم ہوا، آپ نے فلاسفہ کے رد میں امام غزالی علیہ الرحمہ (م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) کا قول پیش کیا، اس پر ابوالفضل نے کہا:۔

"غزالی نامعقول گفتہ"　　　(زبدۃ المقامات ص ۱۳۲)

شیخ مجددؒ کو یہ گستاخانہ بات کہاں برداشت ہو سکتی تھی، چنانچہ جو کچھ ہوا وہ خود ابوالفضل کے ایک شاگرد کی زبانی سنیے، خواجہ محمد ہاشم کشمی کا بیان ہے کہ

حضرت شیخ تو نیز از استماع ایں حروف　　　تمہارے حضرت شیخ بھی ان کلمات کو سنکر

از متغیر شدہ از مجلس او برخاستند و وقت
برخاستن فرمودند "اگر ذوق صحبت ما
اہل علم داری ازیں حرف ہائے دور از
ادب زبان نگہ دار" ـــ و برفتند
و چند روز بہ مجلس او حاضر نہ شدند تا
او خود کس فرستادہ و معذرت خواستہ
طلب نمود (خواجہ محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات
مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ ص ۱۳۲)

متغیر ہوگئے اور اس کی مجلس سے اٹھ کر
کھڑے ہوئے اٹھتے ہوئے فرمایا "اگر ہم
علماء کی صحبت کا ذوق رکھتا ہے تو
اس قسم کی بے ادبانہ کلمات سے اپنی
زبان باز رکھ" یہ کہکر آپ تشریف لے گئے
اور چند روز اس کی مجلس میں نہیں آئے
حتیٰ کہ ابوالفضل نے خود کسی کو بھیج کر معذرت
خواہی کی اور آپ کو بلوایا۔

نکاح شیخ مجددؒ کو جب اکبر آباد میں ایک عرصہ گزر گیا تھا تو آپ کے والد ماجد شیخ عبدالاحد (م ۱۰۰۷ھ) بیتاب ہوکر آپ کو لینے اکبر آباد تشریف لے گئے، سرہند جاتے ہوئے واپسی میں جب تھانیسر پہنچے تو وہاں کے رئیس شیخ سلطان نے جو اکبر کے خاص مقربین میں تھا، اپنی صاحبزادی کے ساتھ شیخ مجددؒ کا عقد کرنا چاہا، آپ نے قبول فرمایا اور نکاح ہو گیا، اسکے بعد آپ والد ماجد کے ہمراہ سرہند تشریف لے آئے۔

(کمال الدین، روضۃ القیومیہ مطبوعہ لاہور، ص ۶۷، ۶۸)

اکتساب باطنی شیخ مجددؒ نے ابتداء میں اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالاحدؒ ہی سے روحانی فیض حاصل کیا، آپ نے چشتیہ سلسلے کا خرقہ خلافت عطا کیا، شیخ مجددؒ خود تحریر فرماتے ہیں:-

ایں درویش را نسبت فردیت
از پدر بزرگوار خود حاصل شدہ بود و
پدر بزرگوار او را از عزیزے از شیخ
کمال کیتھلیؒ (م ۹۸۱ھ) کہ جذبہ قوی
داشتند و بہ خوارق مشہور بودند بدست
آمدہ بود و نیز ایں درویش را توفیق عبادات

اس فقیر کو نسبت فردیت اپنے والد بزرگوار
سے ملی ہے والد بزرگوار نے اس کو ایک عزیز
(شیخ کمال کیتھلیؒ م ۹۸۱ھ) سے حاصل کیا
تھا، جو جذبہ قوی رکھتے تھے، اور خوارق میں
مشہور تھے، اس کے علاوہ اس فقیر کو عبادات
نافلہ خصوصاً نماز نافلہ کی توفیق اپنے

تا فاید خصوصاً ادائے صلوٰۃ نافلہ مردے	والد بزرگوار سے ملی ہے، اور انھوں نے
از پدرشے است و پدر بزرگوار او را ایں	یہ سعادت سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ
سعادت از شیخ خود (شیخ عبدالقدوس	(شیخ عبدالقدوس م ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) سے
م ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) کہ در سلسلہ چشتیہ بودہ اند حاصل	حاصل کی تھی۔
شدہ بود۔ ——	(شیخ مجدد الف ثانی، مبدا و معاد)

شیخ کمال کیتھلیؒ (م ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) نے شیخ مجددؒ کو ایام طفولیت میں توجہ خاص سے نوازا تھا اور نسبت قادریہ بخشی تھی، بعد میں خرقۂ خلافت اور اجازت بھی عطا فرمائی، اس واقعہ کی تفصیل خواجہ محمد ہاشم کشمی نے یہ لکھی ہے:۔

جب آپ پہلی مرتبہ خواجہ محمد باقی باللہؒ (م ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) کی صحبت سے مستفیض ہوکر دہلی سے واپس سرہند تشریف لائے تو ایک روز مریدین کے حلقہ میں مراقبہ فرما رہے تھے، اثنائے مراقبہ میں شاہ سکندرؒ (م ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء) نبیرۂ شیخ کمال کیتھلیؒ (م ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) تشریف لائے اور شیخ موصوف کا خرقہ آپ کے شانوں پر ڈال دیا، شیخ مجدد جب مراقبہ سے فارغ ہوئے تو اس کو زیب تن فرمایا، اور مکان کے اندر تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد باہر تشریف لائے تو فرمایا:۔

"بعد از پوشیدن خرقۂ حضرت شاہ کمالؒ تصفیہ عجیب روئے دادہ"

(محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء ص ۱۳۵)

شیخ مجدد کو سلسلۂ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت خواجہ محمد باقی باللہ نے عطا فرمایا تھا، ان تینوں نسبتوں کا آپ اس طرح ذکر فرماتے ہیں:۔

"ارادت من بہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ وسائط کثیرہ است در طریقہ نقشبندیہ بست و یک واسطہ درمیان است، و در طریقہ قادریہ بست و پنج و در طریقہ چشتیہ بست و ہفت" (مکتوبات شریف، دفتر سوم "معرفت الحقائق" (۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء) مرتبہ محمد ہاشم کشمی مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۲ھ مکتوب ۸۷)

تینوں سلسلوں میں شیخ مجددؒ کو سلسلۂ نقشبندیہ سے خاص لگاؤ تھا، اس لئے اس نسبت کے متعلق ذرا تفصیل سے عرض کیا جاتا ہے۔

سفر دہلی

شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالاحدؒ کی حیات میں زیادہ تر سرہند ہی میں مقیم رہے، کچھ عرصہ کے لئے اکبرآباد تشریف لے گئے تھے، ۱۰۰۷ھ میں والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو ۱۰۰۸ھ میں شیخ مجددؒ حج کے ارادے سے روانہ ہوگئے، اثنائے راہ میں جب دہلی پہنچے تو آپ کے محب خاص مولانا حسن کشمیری نے خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) سے ملاقات کی تحریک کی چنانچہ انھیں کی تحریک سے آپ خواجہ موصوف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے، خواجہ باقی باللہ نے آپ پر بڑی شفقت فرمائی اور فرمایا:۔

"......ہر چند ارادہ سفر مبارک در پیش دارید تا چند روز می تواں بہ فقرا صحبت داشت لا اقل، ماہے یا ہفتہ، چہ مانع است"؟

(محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء، ص ۱۳۹)

شیخ مجددؒ خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) کی خدمت میں دو تین ماہ رہے اور اس قلیل عرصہ میں وہ کچھ پا لیا جو بہت سے طالبوں کو برسوں میں بھی نہیں ملتا تھا، شیخ مجددؒ کو پہلے ہی اس کا اندازہ ہوگیا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمی سے فرمایا:۔

"ازاں روز کہ در خدمت علیہ حضرت
خواجہ قدس اللہ سرہ تعلیم طریقت گرفتم مرا
بہ یقیں پیوست کہ عن قریب اللہ سبحانہ، بہ محض
کرم مرا بہ نہایہ ایں راہ خواہد رسانید
ہر چند از راہ دید قصور حال را اکمال نفی
ایں یقیں می نمودم صورت نمی بست و اکثر
ایں بیت در روز بانم بود ؎
ازیں نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقیں دانم کہ آخر خواہمت یافت
(خواجہ محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات
مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء ص ۱۴۵)

جس روز سے کہ فقیر نے اپنے حضرت خواجہ
قدس اللہ سرہ کی خدمت عالی میں تعلیم
طریقت حاصل کرنی شروع کی، اسی وقت
یقین ہوگیا تھا کہ عن قریب اللہ سبحانہ وتعالیٰ
محض اپنے کرم سے مجھ کو اس راستے کی معراج
تک پہنچائے گا، ہر چند کہ اپنے احوال و اعمال پر
نظر جاتی تو اس یقین کی نفی کرتا مگر چین
نہیں آتا اور اکثر زبان پہ یہ شعر آتا:۔
اے محبوب! میرے دل پہ جو تیرا نور چمکا ہے
یقیناً اسی کی چمک میں، تجھ کو پالوں گا۔
....

شیخ مجددؒ نے پیرزادگان خواجہ عبید اللہ (م [illegible]) اور خواجہ عبداللہ ([illegible]) کے نام جو مکتوب ارسال فرمایا تھا اس میں خواجہ باقی باللہؒ سے روحانی استفاضہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

.... "یہ فقیر از سر تا قدم آپ کے والد بزرگوار کے احسانوں میں غرق ہے، اس راہ میں "الف"، "بے" کا سبق انہی سے لیا ہے اور اس راہ کے حروف تہجی انہی سے سیکھے ہیں اور ابتدا میں انتہا کے مدارج حاصل ہونے کی دولت انہی کی صحبت کی برکت سے حاصل کی ہے، اور "سفر در وطن" کی سعادت انہی کی خدمت کے صدقہ میں پائی ہے، ان کی توجہ شریف نے ڈھائی ماہ میں اس ناقابل کو نسبت نقشبندیہ تک پہنچا دیا اور اکابر نقشبندیہ کا "حضور خاص" عطا فرمایا، اس قلیل مدت میں جو تجلیات، ظہورات، انوار، الوان اور بے رنگیاں اور بے کیفیاں حاصل ہوئیں ان کی شرح و تفصیل کو کیا بیان کیا جائے؟"

(مکتوبات شریف، دفتر اول "درّ المعرفت" (۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) مرتبہ خواجہ یار محمد بدخشی، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ، حصہ چہارم، مکتوب ۲۲۶، ترجمہ از مولانا عبدالشکور[۵]، تذکرہ مجدد الف ثانی ص ۲۲۷، مطبوعہ لکھنؤ)

خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) اپنے ایک مکتوب میں شیخ مجددؒ کی باطنی استعداد و صلاحیت کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:۔

شیخ احمد نام مرد است از سرہند کثیر العلم و قوی العمل، روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کردہ، عجائب بسیار از روزگار او قات او مشاہدہ نمودہ بآں ماند کہ چراغے	شیخ احمد سرہند کے رہنے والے ہیں، بڑے عالم اور عامل ہیں، فقیر نے چند روز ان کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے اور بہت سی عجیب باتیں مشاہدہ کیں معلوم

---

۵ محترم مضمون نگار کو یہاں سہو ہو گیا ہے۔ "تذکرہ مجدد الف ثانی" میں حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب کے مقالہ ــــ امام ربانی ــــ کی فارسی عبارات کے تمام تر ترجمے مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنوی کے کئے ہوئے ہیں۔ "تذکرہ مجدد الف ثانی" کے ابتدائی تمہیدی صفحات میں اسکی تصریح کر دی گئی ہے ــــ الفرقان

شود کہ عالمہا ازو روشن گردد، الحمدللہ تعالیٰ
احوال کاملہ او مرا بیقین پیوستہ، و
ایں شیخ مشار الیہ برادراں و اقربا دارد
ہمہ صالح و از طبقہ علماء، چندے را دعاگو
ملازمت کردہ، از جواہر عالیہ دانستہ استعداد
ہائے عجیب دارند، فرزندان آں شیخ کہ
اطفال اند اسرار الٰہی اند، بالجملہ شجرہ طیبہ اند
انبتہ اللہ نباتا حسنا۔" (محمد ہاشم کشمی،
زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ~~۱۳۰۷ھ~~ ۱۸۹۰ء ص ۱۳۵)

ایسا ہوتا ہے کہ وہ آگے چل کر ایک ایسا
چراغ بنے گا جس سے دنیا روشن ہوگی،
الحمدللہ ان کے احوال کامل کو دیکھ کر مجھے
اس بات کا یقین ہو گیا ہے، شیخ مذکور کے
بھائی اور رشتہ دار بھی ہیں اور سب کے
سب نیک اور صالح ہیں اور طبقہ علماء
میں سے ہیں، ان میں سے چند سے اس
دعاگو نے بھی ملاقات کی ہے جواہر عالیہ
ہیں اور عجیب صلاحیتیں رکھتے ہیں شیخ مذکور
کے صاحبزادگان جو ہنوز بچے ہی ہیں اسرار
الٰہی ہیں، ایک ایسا شجرۂ طیبہ ہیں جس کو
اللہ نے بڑھایا اور خوب چڑھایا۔

غرض شیخ مجددؒ نے خواجہ محمد باقی باللہ کی صحبت سے "ترقیات عالیہ اور عروجات متعالیہ" حاصل کیں اور اس میں شک نہیں کہ ان ترقیات و عروجات کا سہرا مولانا حسن کشمیری کے سر ہے۔ شیخ مجددؒ موصوف کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"فقیر در ادائے شکر نعمت دلالت شما اعتراف بہ قصور دارد و در مکافات آں احسان شما معترف بہ عجز، ایں کار و بار مبنی بر آں نعمت است و ایں دید و داد مربوط بہ آں احسان، بہ حسن توسط شما آں دادہ اند کہ کم کسے دیدہ است و بہ یمن توسل شما آں بخشیدہ اند کہ کم کسے چشیدہ۔"

(زبدۃ المقامات، مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء ص ۱۳۵)

خواجہ محمد باقی باللہؒ سے فیض یاب ہونے کے بعد خواجہ موصوف نے بیعت کرنے سے پہلے کے کچھ واقعات سنائے، جن سے شیخ مجددؒ کی روحانی عظمت پر روشنی پڑتی ہے خواجہ باقی باللہ نے فرمایا:-

"جب فقیر کے شیخ طریقت خواجہ امکنگی علیہ الرحمہ (م ۱۰۰۸ھ) نے فقیر کو ہندستان جانے کا حکم دیا تو اپنے کو اس سفر کے شایان شایان نہ پاکر فقیر نے تو اضعاً پس وپیش کیا خواجہ موصوف نے استخارے کے لئے فرمایا، استخارہ کیا تو خواب میں دیکھا کہ ایک شاخ پر طوطا بیٹھا ہوا ہے، دل میں یہ خیال آیا کہ اگر یہ طوطا شاخ سے اڑکر ہاتھ پر آبیٹھے تو اس سفر میں کچھ سہولت ہو جائے، معاً وہ طوطا اڑکر فقیر کے ہاتھ پر آبیٹھا، فقیر نے اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور اس نے فقیر کے منہ میں شکر ڈالی۔"

(زبدۃ المقامات، ص ۱۴۰-۱۴۱)

دوسرے روز خواجہ امکنگیؒ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا:-

"طوطا ہندوستانی پرندہ ہے، ہندوستان میں تمھارے دامن سے ایک ایسا عزیز وجود میں آئے گا جس سے عالم منور ہوگا اور تم بھی اس سے مستفیض ہوگے۔"

(زبدۃ المقامات، ص ۱۴۱)

چنانچہ خواجہ محمد باقی باللہؒ کابل سے روانہ ہو کر لاہور پہنچے، پھر وہاں سے دہلی روانہ ہوئے راستہ میں سرہند سے گذر ہوا، اس شہر میں جو واقعہ پیش آیا وہ خواجہ موصوف نے شیخ مجددؒ سے اس طرح بیان فرمایا:-

"جب فقیر تمھارے شہر سرہند میں پہنچا تو عالم واقعہ میں دکھایا گیا کہ تو "قطب" کے جوار میں اترا ہے۔ اس 'قطب' کے حلیہ سے بھی آگاہ کیا گیا، چنانچہ دوسرے روز اس شہر کے درویشوں اور گوشہ نشینوں کی تلاش میں نکلا، مگر کسی کو بھی اس حلیے کے مطابق نہ پایا اور کسی پر آثار قطبیت مشاہدہ نہیں کئے، ناچار یہی سمجھا کہ شاید اہل شہر میں آیندہ کوئی اس قابل ہوگا، جونہی کہ فقیر نے تم کو دیکھا تمھارا حلیہ اس حلیہ کے عین موافق پایا اور اس قابلیت کے آثار بھی تم میں مشاہدہ کئے۔"

(زبدۃ المقامات، ص ۱۴۱)

خواجہ محمد باقی باللہؒ نے ایک اور واقعہ کا اس طرح ذکر فرمایا:-

.... فقیر نے دیکھا کہ ایک بڑا چراغ روشن کیا گیا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی

روشنی بڑھتی گئی، لوگ اس سے ہزاروں چراغ روشن کر رہے ہیں، حتیٰ کہ میں سرہند کے قریب پہنچا تو وہاں کے دشت و در کو چراغوں سے منور پایا۔ یہ اشارہ بھی تمھاری ہی طرف تھا۔ (زبدۃ المقامات، ص ۱۴۱)

غرض حضرت خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ) نے حضرت مجددؒ کو فیض و برکات سے مالامال کر کے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازت مرحمت فرمائی اور سرہند رخصت فرمایا:۔

"اللہ! اللہ! دیارِ مقدس کا راہی ابھی منزل مقصود تک بھی نہ پہنچا تھا کہ راستے ہی میں نوازا گیا، طلب صادق ہو تو کیا نہیں ملتا، جو مانگئے وہ ملتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو بن مانگے بھی ملتا ہے، شیخ مجددؒ جو سرہند سے حج کے ارادہ سے نکلے تھے، دہلی ہی سے واپس لوٹ آتے ہیں اور بہ صد ناز ش و افتخار فرماتے ہیں:۔

"باز آمدیم با صد ہزار خلعت و فتوح"

(زبدۃ المقامات، ص ۱۴۶)

دیکھنے والی آنکھوں نے تو یہ دیکھا کہ دیار محبوب کی طرف جانے والا، راستہ ہی سے واپس آگیا، شاید نامراد آیا ہو! ــــ مگر کسی کو کیا معلوم کہ برق نظر کہاں گری اور کیا اپنا کام کر گئی۔

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

شیخ مجددؒ فرماتے ہیں:۔

ایں فقیر بہ یقیں می دانست کہ مثل ایں صحبت اجتماع و مانند آں تربیت و ارشاد بعد از زمان آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات ہرگز بوجود نہ آمدہ است و شکر ایں نعمت بجا می آرد کہ اگرچہ بہ شرف صحبت خیر البشر علیہ وعلیٰ	یہ فقیر یقینی طور پر جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے بعد اس قسم کی صحبت اور تربیت وارشاد ہرگز وجود میں نہیں آئی ہوگی، فقیر اس نعمت کا شکر ادا کرتا ہے کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے مشرف نہیں ہوا

آلہ الصلوٰت والسلام مشرف نہ شدیم لیکن اس صحبت کی سعادت سے بھی
بارے از سعادت ایں صحبت محروم محروم نہیں رہا۔"
نا عدیم ——— (شیخ مجددؒ، مبدأ و معاد)

دوسرا سفر دلی سے سرہند آنے کے بعد شیخ مجددؒ دوبارہ خواجہ محمد باقی باللہ کی خدمت بابرکت میں دہلی حاضر ہوئے، اور عرصہ دراز تک شیخ کی صحبت فیض اثر سے مستفیض ہوتے رہے، ان صحبتوں نے دونوں بزرگوں کی موانست و مودت میں بہت اضافہ کر دیا، شہزادہ دارا شکوہ (م ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء) نے اس کمال محبت اور ایک دوسرے کے کمال ادب و احترام کو عجائبات زمانہ میں شمار کیا ہے، صاحب مرآۃ العالم اور صاحب مرآۃ جہاں بھی عجائبات میں شمار کرتے ہیں، خواجہ محمد ہاشم کشمی تحریر فرماتے ہیں:۔

ایں محبت و معاملہ کہ میان ایں پیر و ایں مرید قدس سرہما بظہور رسیدہ کم کسے شنیدہ واز عجائب روزگار است و موجب حیرت الوالابصار۔"

(زبدۃ المقامات، ص ۱۵۵)

یہ اس مرید کے خیالات ہیں جس کو خود شیخ مجددؒ نے میر محمد نعمان برہان پوری (م ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) کو خط لکھ کر بلوایا تھا:۔

"خواجہ ہاشم را فرستند کہ چند روز در صحبت باشد و اخذ بعض علوم و معارف نماید کہ جواں قابل ظاہر می شود، مشارالیہ مربار شما است و نداق دان شما۔"

(مکتوبات شریف دفتر سوم مکتوب ۱۵ مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ)

خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجددؒ کی خدمت میں دو برس رہے، سی، اے، اسٹوری (C. A. Story) لکھتا ہے:۔

"۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱-۲ء میں (محمد ہاشم کشمیؒ) شیخ احمد سرہندی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقریباً دو سال تک مستقل آپ کی خدمت میں رہے۔"

(سی، اے، اسٹوری، پرشین لٹریچر جلد اول حصہ دوم لندن ۱۹۵۳ء)

اس لئے شیخ کے بارہ میں آپ کے بیانات ہر حیثیت سے مستند اور قابل اعتبار ہیں، شیخ مجددؒ

کے متعلق موصوف ایک اور واقعہ میر محمد نعمان (م ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:۔

...... روزے حضرت ایشاں در حجرۂ خود برعریش خود غنودہ بودند ناگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ تنہا بہ شیوۂ سائر درویشاں بہ قصد دریافت ایشاں بہ در حجرہ رسیدند خادم حضرت ایشاں خواست کہ حضرت ایشاں را بیدار کند حضرت خواجہ بہ مبالغہ تمام او را از بیدار کردن منع فرمودند وہم چناں بہ نیاز و ادب تمام بردن و نزدیک آستانہ انتظار بیداری حضرت ایشاں می کشیدند، لمحہ یگذشتہ بود کہ حضرت ایشاں بیدار شدہ آواز دادند کہ "بیرون کیست؟" حضرت خواجہ بہ ادب تمام گفتند کہ "فقیر محمد باقی" حضرت ایشاں از عریش خود بہ اضطراب برجستہ بیروں آمدہ بہ افتقار و انکسار تمام در خدمت نشستند۔"

ایک روز حضرت (شیخ مجددؒ) حجرہ میں تخت پر آرام فرما رہے تھے کہ خواجہ باقی باللہ تن تنہا دوسرے درویشوں کی طرح آپ کو بھی دیکھنے آئے، حجرے کے دروازے پر پہنچے تو خادم نے چاہا کہ حضرت صاحب کو بیدار کردے مگر حضرت خواجہ نے سختی سے منع فرما دیا، اور نیاز و ادب کے ساتھ دروازے کے باہر آستانے کے نزدیک حضرت کے جاگنے کے منتظر رہے تھوڑی دیر میں حضرت کی آنکھ کھلی تو (آہٹ سن کر) آواز دی کہ "باہر کون ہے؟" حضرت خواجہ نے بڑے ادب کے ساتھ فرمایا "فقیر محمد باقی"۔ حضرت صاحب (آواز سنتے ہی) تخت سے مضطربانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آکر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ حضرت خواجہ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔

دہلی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد شیخ مجددؒ سرہند واپس تشریف لے گئے، اس سفر نے آپ کی روحانی ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ سرہند آکر بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری کیا اور طالبان راہ حقیقت حلقہ بگوش ہونے لگے، خود آپ کے مرشد حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نے مریدین کو آپ ہی کی طرف رجوع کی ہدایت کی، اس سے شیخ مجددؒ کے باطنی کمالات کا پتہ چلتا ہے، وہ خود تحریر فرماتے ہیں:۔

...... سرگرمی حضرت خواجہ ما قدس سرہ ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہٗ طالبانِ طریقت

بہ تربیت طالبان تا زمانے بود کہ معاملہ
با بہ انتہا نہ رسیدہ بود چوں از کار من فارغ
شد ند مرئی گردید کہ خود را از کار شخیت
کشید ند و طلاب را با حوالہ نمودہ فرمودند
کہ این تخم را از بخارا و سمرقند آوردیم و
در زمین برکت آئین ہند کشتیم۔
(زبدۃ المقامات)
مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء ص۱۵۶

کی تربیت میں اس وقت تک سرگرم رہے
جب تک کہ ہمارا معاملہ انتہا تک نہیں پہنچا۔
لیکن جب ہماری تربیت سے فارغ ہوئے
تو دیکھا کہ آپ نے شیخت کی تمام امور یا
ترک کر کے طالبان طریقت کو ہمارے حوالے
کردیا اور فرمایا :- بخارا او رسمرقند سے ہم
اس بیج کو لائے تھے اور ہم نے ہندوستان
کی متبرک زمین میں اس کو بو دیا۔

شیخ مجددؒ کے اس قول کی تصدیق خواجہ باقی باللہؒ کے ایک مکتوب سے بھی ہوتی ہے، جو انھوں نے موصوف کو بھیجا تھا، تحریر فرماتے ہیں :-

...... جناب سیادت مآب امیر صالح
نیشاپوری سلمہ اللہ اظہار طلب نمودند
چوں وقت مقتضی این نہ بود تضیع اوقات
ایشاں دادن از مسلمانی نہ نمود۔ لاجرم
بصحبت شما فرستادہ شد، انشاء اللہ
بقدر استعداد بہرہ مند گردند و توجہ
لطف کامل یابند والدعا۔ (محمد ہاشم کشمی
زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء ص۱۴۵)

جناب سیادت مآب امیر صالح نیشاپوری
سلمہ اللہ نے طلب ظاہر کی تھی، چوں کہ
تقاضائے وقت نہ تھا، اس لئے ان کی
تضیع اوقات کو مسلمانی کے منافی سمجھا،
اس لئے تمہارے پاس بھیجا گیا، انشاء اللہ
اپنی استعداد کے مطابق وہ بہرہ مند
ہوں گے اور کامل توجہ اور لطف
خاص سے ان کو نوازا جائے گا۔

تیسرا سفر

شیخ مجددؒ نے دہلی کا تیسرا سفر تقریباً ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء اور ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء کے درمیان خواجہ باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کے آخری ایام میں کیا تھا، اس مرتبہ مرشد بزرگوار نے اپنے دونوں شیر خوار فرزندوں خواجہ محمد عبید اللہ (مولود ۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء) اور خواجہ محمد عبد اللہ (مولود ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء) کو طلب کیا، اور ان پر توجہ ڈالنے کے لئے فرمایا، پھر ان دونوں کی ماؤں پر بھی غائبانہ توجہ ڈالنے کے لئے ارشاد فرمایا، شیخ مجددؒ نے دونوں پیرزادگان کے نام جو مکتوب

ارسال کیا تھا اس میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے، فرماتے ہیں:۔

.... اس فقیر کو تین مرتبہ حضرت کے در دولت کی عتبہ بوسی کا شرف حاصل ہوا، جب آخری مرتبہ زیارت ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ضعف بدن غالب آگیا ہے (اب) امید حیات کم رہ گئی ہے تم بچوں کے احوال سے باخبر رہنا (پھر) آپ کو اپنے سامنے طلب فرمایا، اس وقت آپ دودھ پیتے بچے تھے، اس فقیر کو حکم دیا کہ "ان پر توجہ دو" حضرت کے حکم سے ان کی موجودگی میں میں نے آپ کو توجہ دی، یہاں تک کہ اس کا اثر بھی ظاہر ہوا، اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ والدات کو بھی غائبانہ توجہ دو، چنانچہ ان کو بھی غائبانہ توجہ دی گئی، امید ہے کہ حضرت کی موجودگی کی برکت سے اس توجہ کے بھی اچھے نتائج ظاہر ہوئے ہوں" (مترجمہ مولانا عبدالشکور، مکتوبات شریف دفتر اول" درالمعرفت" ۱۰۲۵ھ-۱۴۱۶ھ مرتبہ خواجہ یار محمد بدخشی) مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۰ھ حصہ چہارم، مکتوب ۲۶۹)

خواجہ باقی باللہ کی حیات مبارکہ میں شیخ مجددؒ کا یہ آخری سفر تھا، دلی سے واپس آنے کے بعد آپ کچھ روز سرہند میں رہے، اس کے بعد پیر بزرگوار کی ہدایت کے مطابق لاہور تشریف لے گئے، اور وہاں تعلیم وارشاد کا سلسلہ جاری کیا۔ فضلائے عصر آپ کی صحبت سے مستفیض ہوئے، مولانا جمال تلویؒ اکثر خدمت بابرکت میں حاضر ہوتے تھے۔

چوتھا سفر ابھی شیخ مجدد لاہور ہی میں تھے کہ ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ کو دہلی میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کا وصال ہوگیا، یہ جانکاہ خبر لاہور پہنچی تو آپ فوراً دہلی روانہ ہوگئے، یہ چوتھا سفر تھا، دہلی پہنچکر مزار مبارک کی زیارت، فاتحہ خوانی اور اہل خانہ سے تعزیت کے بعد سرہند واپس تشریف لے گئے، اس کے بعد پانچویں مرتبہ مرشد کے عرس میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لے گئے، واپسی کے بعد پھر سرہند ہی میں رہے، البتہ دو تین مرتبہ اکبر آباد تشریف لے گئے، اور آخری عمر میں جہانگیر کی مزاحمت کی وجہ سے لشکر شاہی کے ساتھ چند مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی وفات (۱۰۱۲ھ) کے بعد شیخ مجددؒ نے اپنی تبلیغی مساعی

کو تیز تر کر دیا تا آنکہ سرزمین ہند کی کایا پلٹ گئی، ع

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

اس سے قبل کہ ہم شیخ مجددؒ کی اصلاحی و تبلیغی مساعی کا جائزہ لیں، بہتر ہوگا کہ اس کا پس منظر پیش کر دیں، تاکہ اسکے صحیح محرکات اور مقاصد کا پتہ چل سکے، اس لئے آئندہ "دورِ اکبری" کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔ (باقی)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

(از، محمد منظور نعمانی)

کئی مہینے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق اخبارات میں ایسی خبریں آ رہی تھیں جو انکی صحت کی طرف سے بہت ہی مایوس کرنے والی تھیں اور انھیں پڑھ کر دل میں یہی خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید احکم الحاکمین کی مشیت اور اس کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس مرض ہی میں دنیا سے اٹھائے جائیں۔ یہی ہوا اور پچھلے ہفتہ ۲۲ اگست کے اخبارات میں ان کی وفات کی خبر آگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــ

دل اس خبر سے بہت متأثر ہوا۔ اور حافظہ نے بھولی بسری باتوں کی ایک ضخیم کتاب دل کی آنکھوں کے سامنے کھول دی۔ ان کی خبر وفات سن کر میں اپنے گھر کے بچوں کے سامنے جن میں سے اکثر نے تو ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، ہاں میری ہی زبان سے نام بار بار سُنا تھا، اُن کا تذکرہ کرنے لگا، اسی سلسلۂ گفتگو میں ان کی زندگی کے بعض ایسے اہم اور قابل ذکر واقعات بھی ذکر میں آگئے جو شاید کہیں لکھ کر محفوظ نہ کئے گئے ہوں، جی چاہا کہ ان کو قلمبند کرا کے محفوظ کر دیا جائے۔

آج وہ ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور انکو ہمارے کسی خراج عقیدت اور کسی تحسینی تذکرے کا انتظار بھی نہیں ہے ـــــ جو چیز اُس دوسرے عالم میں انکی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہے۔ اور جس کا پہنچنا بھی انشاء اللہ یقینی ہے، وہ اچھی ساعتوں میں ان کے لئے رحمت و مغفرت کی پرخلوص دعائیں اور اعمال خیر کے ثواب کا ہدیہ ہے۔ اور یہی انکی بہت کا اُن کے محبین پر خاص حق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

اسی کے ساتھ یقین ہے کہ ان کی بعض ایمانی خصوصیات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات کا تذکرہ انشاء اللہ زندوں کے لئے ضرور نافع ہوگا، اسی اُمید پر یہ سطریں ایک عزیز سے بطور املا لکھا رہا ہوں۔

جہاں تک اب یاد آتا ہے اخبارات میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سب سے پہلے اس ناچیز نے اُس وقت پڑھا جب لاہور کے ایک دریدہ دہن آریہ سماجی نے اللہ کے آخری رسول سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک نہایت گندی اور رسوائے عالم کتاب لکھ کر شائع کی، اُس کتاب کا نام بھی اتنا خبیث اور دل آزار تھا کہ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کسی مذہب ملت سے تعلق رکھتا ہو، دلی تکلیف کے بغیر وہ نام نہیں لے سکتا ــــــ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا شدھی سنگھٹن کی فتنہ انگیز تحریک نے پہلے ہی سے کافی خراب کر دی تھی، اس کتاب کی اشاعت نے آگ پر تیل کا کام کیا ــــــ اور مسلمانوں میں سخت ہیجان بلکہ طوفان برپا ہوگیا اس سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی، اُس کا اثر یہ ہوا تھا کہ پردہ نشین خواتین نے اپنے بچے اُن کے قدموں میں ڈالدیئے تھے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان کر دو۔ سید عطاء اللہ شاہ اس تقریر پر گرفتار کر لئے گئے، ان پر مقدمہ چلا اور بالآخر ان کو غالباً دو سال کی قید سخت ہوئی ــــــ بہرحال جہاں تک اب یاد ہے میرے دل میں ان کی غائبانہ محبت کا بیج اسی زمانہ میں، اخبارات میں ان کا تذکرہ دیکھ دیکھ کر پڑا۔ پھر مختلف تحریکوں اور سرگرمیوں کے سلسلہ میں اخبارات میں اُن کا نام آتا رہا،

یہاں تک کہ ایک وقت اخبارات میں آیا کہ انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں (جس میں پنجاب کے علماءِ حق کی ایک بڑی تعداد شریک تھی) سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیرِ شریعت قرار دیئے گئے اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالمِ دین اور سب سے بڑی دینی درسگاہ (دارالعلوم دیوبند) کے صدر و شیخ الحدیث، استاذ الاساتذہ ذوالعلم حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری (قدس سرہ) نے بھی بحیثیت امیرِ شریعت ان کے ہاتھ پر بیعت کی ـــــ اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر میری نظر میں شاہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی عظمت و اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور دید و ملاقات کا دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہوگیا ـــــ ان کے نام کے ساتھ

"بخاری" اور "شاہ" کے دو پُرعظمت ضمیمے لگے ہونے کی وجہ سے میرا تصور اُس وقت ان کے بارہ میں یہ تھا کہ اُن کی شکل و صورت بخاری علماء کی سی اور وضع و ہیئت مشائخ طریقت کی سی ہوگی۔ لیکن اتفاق کی بات عرصہ تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میں ۱۹۳۰ء میں امروہہ (ضلع مرادآباد) میں مدرس تھا، حسن اتفاق کہ اس سال جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ ہی میں ہونا طے ہوگیا، اُس زمانہ میں مجھے جمعیۃ العلماء اور اسکے کاموں سے خاصی دلچسپی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ چند ہی مہینے پہلے آل انڈیا کانگرس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۲۸ء والی اُس نہرو رپورٹ کو منسوخ قرار دیکر جس کی بناء پر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند بھی کانگرس سے الگ ہوگئی تھی آزادیٔ کامل کی تجویز پاس کی تھی، اور پھر اسکے بعد گاندھی جی نے نمک سازی کی شکل میں انگریزی اقتدار کے خلاف سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کر دی تھی۔ بہرحال امروہہ میں جمعیۃ العلماء کا یہ اجلاس اس زمانہ اور اس ماحول میں ہونے والا تھا۔

اِدھر ایک بات اسی درمیان میں یہ ہو چکی تھی، کہ مولانا محمد علی مرحوم اور جمعیۃ العلماء کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوگیا تھا، اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے مقابلہ میں ایک دوسری "جمعیۃ العلماء" بنالی گئی تھی۔ جس کے صدر خود مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ یہ کشمکش تلخی میں کس حد تک جاچکی تھی، اس کا اندازہ بس اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند دہلی کا اجلاس امروہہ میں جن تاریخوں میں ہونا طے ہوا تھا۔ ٹھیک انہی تاریخوں میں امروہہ ہی میں اس دوسری جمعیۃ کا اجلاس بھی طے کیا گیا۔ اور ہوا! اور خود مولانا محمد علی مرحوم نے اسکی صدارت کی۔

الغرض جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ والے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کانگرس کی طرف سے نہرو رپورٹ کی تنسیخ اور آزادی کامل کے رزولیوشن اور گاندھی جی کے سول نافرمانی کی جنگ چھیڑ دینے کے بعد جمیعۃ العلماء کے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آگیا تھا کہ کانگرس اور اسکی جنگ آزادی کے بارے میں اب اس کا رویہ کیا رہے گا؟ کیوں کہ نہرو رپورٹ کی منسوخی کے بعد وہ بنیاد ختم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے جمیعۃ نے ۱۹۲۹ء میں کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اور اسی بنا پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (جو اگرچہ اس وقت جمیعۃ کے اکابر میں یا ہائی کمانڈ میں نہیں تھے لیکن اپنے سیاسی ذہن اور جرأت و فعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں

سب سے زیادہ ممتاز تھے) کانگریس کے ساتھ اشتراک کے بارے میں ایک رزولیوشن بھی اجلاس کے لئے بھیج دیا تھا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی ہوگئی تھی اور خود جمعیۃ کی صفوں میں اس وقت اس بارہ میں خاصا اختلاف رائے تھا ـــ بہرحال امروہہ کے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں وقت کا یہ اہم اور سخت اختلافی مسئلہ سامنے آنے والا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم والی جمعیۃ کے اجلاس نے قدرتی طور پر ایک مقابلہ اور کشمکش کی فضا بنا دی تھی ـــ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب سنئے!

جمعیۃ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دو دن پہلے ہی قریبی مقامات سے جمعیتی رضاکاروں کے جتھے انتظام کے لئے آنا شروع ہوگئے۔ میرے وطن سنبھل کا ایک جتھا ایک دن پہلے پہنچنے والا تھا اُس میں کے بعض آدمی علی الصبح پہنچ گئے، اور انھوں نے بتایا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہمارا جتھا ایک جلوس کی شکل میں امروہہ میں داخل ہو، اس جلوس میں کچھ اونٹ ہوں، ان پر نقارے ہوں، اس لئے ہمارے واسطے اونٹوں اور نقاروں کا انتظام کر دیا جائے (دراصل سنبھل کے رضاکار اس طرح کے "حجازی" جلوس نکالا کرتے تھے۔) ہم لوگ جو امروہہ میں اس وقت اجلاس کے کاموں کے ذمہ دار تھے، ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا، قریباً ۸-۹ بجے صبح کا وقت تھا مجلس استقبالیہ کے دفتر میں بیٹھے ہم اسی مسئلہ پر مشورہ کر رہے تھے کہ اونٹوں نقاروں والا یہ حجازی نما جلوس یہاں نکلنا مناسب ہے یا نہیں۔ میری اور اکثر کارکنوں کی رائے اس وقت کے حالات میں جلوس کے حق میں تھی۔ لیکن ہم سب کے مخدوم اور ہر حیثیت سے بزرگ حضرت حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ امروہہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے نہیں تھی۔ ان کو غالباً اسکے جواز میں بھی شبہ تھا۔ یا وہ اسکو ثقاہت اور سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ مشورہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک دو حضرات دفتر میں داخل ہوئے ان میں ایک تو حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے جو میرے لئے جانے پہچانے ہی نہیں بلکہ میرے استاد تھے اور ان کے ساتھ جو دوسرے صاحب تھے ان کو ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا، ان کی وضع یہ تھی کہ ہاتھ میں بہت موٹا سا ایک سونٹا، جسم پر کھدر کا چھوٹا سا قمیص نما نیم آستین کرتا، اور غالباً کھدر ہی کا رنگا ہوا نیلا تہبند، جسم بالکل پہلوانوں کا سا۔ میں سمجھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ

کوئی رضا کار ہیں، اتنے میں خود مفتی صاحب نے بتایا کہ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں، یہ سن کر سب کی، خاص کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ میرے تصور میں تو انکی صورت اور وضع بخاری کے کسی مقدس شیخ خانقاہ کی سی تھی، مصافحہ اور ملاقات کے بعد بڑی بے تکلفی کے ساتھ شاہ صاحب نے ہم لوگوں سے فرمایا، کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا ہم لوگ ایک چھوٹے سے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ سنبھل کے رضا کاروں کا جتھا آرہا ہے وہ اس طرح کا جلوس نکالنا چاہتا ہے، ہم میں سے کچھ کی رائے ہے کہ نکلنا چاہیئے اور بعض حضرات اس کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ اس وقت کے مفتی ہم ہیں، ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسا جلوس نکلنا چاہیئے۔ منگواؤ اونٹ اور نقارے ایک اونٹ پر میں خود بھی بیٹھوں گا۔

اس عاجز کی سب سے پہلی ملاقات شاہ صاحب سے یہی تھی۔ اور ان کے انداز مزاج کا یہ پہلا تجربہ تھا، جہاں تک یاد ہے یہ جمعہ کا دن تھا۔ جلوس کی تیاریاں فوراً شروع ہوگئیں۔ اور اسی شان سے جلوس نکلا، اور پورے بازار کا اس نے گشت کیا، مشورہ سے یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ آج بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں شاہ صاحب کی تقریر ہوگی۔ (واضح رہے کہ اجلاس بھی جامع مسجد ہی میں ہونے والا تھا، اسی میں پنڈال بنا تھا) جلوس ہی نے شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان کیا۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب کی اخبارات میں بہت دھوم تھی اور ان کی زندگی کے بعض واقعات نے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا۔ پھر امروہہ میں بلکہ ہمارے اس علاقہ ہی میں شاہ صاحب کی یہ پہلی آمد تھی۔ اور اس دن امروہہ میں کوئی دوسرا جلسہ بھی نہیں تھا۔ (کیونکہ دونوں جمعیتوں کے باقاعدہ جلسے کل سے شروع ہونے والے تھے۔) اس لئے شاہ صاحب کی تقریر سننے کے لئے آج بہت سے وہ لوگ بھی آگئے جن کی دلچسپی دوسری جانب تھی اور جمعیۃ علماء ہند کے وہ سخت مخالف تھے۔

نماز جمعہ کے بعد تقریر شروع ہوئی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو اس ناچیز نے شاہ صاحب کی سنی، اس میں انشاء اللہ بالکل مبالغہ نہیں کہ پورا مجمع بالکل مسحور تھا۔ جمعیۃ العلماء کے

مخالفین کی طرف سے اُس وقت دو باتوں کا خاص طور سے پروپگنڈا کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ یہ لوگ کانگریس سے اور ہندوؤں سے مِلجانے والے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ یہ دیوبندی وہابی ہیں، نجدیوں کے حامی ہیں۔ دشمن رسول ہیں (معاذ اللہ) اس دوسری بات کے اُچھالے جانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دوسری جمعیۃ کے اجلاس کا داعی اتفاق سے امروہہ کا وہ عنصر تھا جس کے نزدیک دیوبندی وہابیوں کی تکفیر کے سوا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ قابل توجہ نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے علم میں یہ صورت حال ہم لوگوں کے ذریعہ آچکی تھی، اسلئے ساری تقریر کا محور یہی دو مسئلے رہے۔ اس تقریر نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ اپنی پوری زندگی میں کسی تقریر کا ایسا اثر مجھے یاد نہیں۔ رسول دشمنی والے ناپاک اتہام کے سلسلہ میں کچھ کہتے ہوئے جب شاہ صاحب نے مولانا جامیؒ کے دو شعر ایک موقع پر پڑھے تو دو آدمی تڑپ کر بیہوش ہو گئے، جن کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا ـــــ یہ تقریر قریباً ڈھائی گھنٹہ تک ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اس پہلی تقریر نے سبھوں کو انگریز دشمنی کے جذبہ سے بھر دیا اور امروہہ کی فضا کو جمعیۃ کے حق میں اور آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک کے حق میں بالکل ہموار کر دیا۔

یہ بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ شاہ صاحب اجلاس سے ایک دن پہلے اچانک کیوں اور کیسے آئے؟ ہوا یہ کہ جب گاندھی جی نے سول نافرمانی شروع کردی تو شاہ صاحب نے اسکی حمایت و تائید میں حسب عادت پرجوش تقریریں شروع کردیں، اُن کو پتہ چلا کہ وہ بہت جلد گرفتار کرلئے جانے والے ہیں اور اندیشہ یہ تھا کہ امروہہ کے اجلاس کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں غالباً ان کو گرفتار کیا جائے گا اس لئے وہ چکر کاٹ کے اور کچھ راستہ کار کے ذریعہ طے کرکے ایک دن پہلے ہی امروہہ پہنچ گئے کہ کسی طرح اجلاس میں شریک ہو سکیں اور کانگریس کے ساتھ اشتراک کا رزولیوشن پاس کراسکیں۔ اگلے دن اجلاس باقاعدہ شروع ہوا، صدر استقبالیہ حکیم سید ابوالمظفر رضوی (مرحوم) تھے، اُن کا خطبہ بڑا وقیع اور جاندار تھا لیکن اس میں مدلل طور پر کانگریس کے ساتھ اشتراک کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی، صدر اجلاس مولانا معین الدین صاحب اجمیری (رحمۃ اللہ علیہ) تھے اور

اُن کے خطبہ میں بھی اس مسئلہ میں یہی رہنمائی کی گئی تھی، ان دونوں خطبوں نے کانگرس کے ساتھ اشتراک کے مسئلہ کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا لیکن آخر کار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز کے حق میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس فضا میں اس تجویز کے پاس کرا لینے میں سب سے زیادہ حصہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کا تھا۔ عام وخاص مجالس کی اس شخص کی تقریروں نے فضا پلٹ دی، معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا بندہ تقریر نہیں کرتا سحر کرتا ہے۔

ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری کا ہر وقت خطرہ تھا، اِدھر یہ پالیسی طے تھی کہ جہاں تک اور جس طرح ہو سکے اس وقت وہ اپنے کو گرفتاری سے بچائیں اور جمعیۃ کا یہ تازہ پیغام ہندوستان بھر میں پہنچائیں اور مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ امروہہ میں اجلاس کے دوران ہی میں بعض مخصوص ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی گرفتاری کے احکام آ گئے ہیں اور وہ اجلاس ختم ہونے کے بعد روانگی کے وقت گرفتار کر لئے جائیں گے۔

چونکہ طے شدہ پالیسی یہ تھی کہ وہ حتی الامکان گرفتاری سے اپنے کو بچائیں اس لئے یہ چال چلی گئی کہ آخری رات کے آخری اجلاس کے لئے اُن کی تقریر کا خاص طور سے اور بار بار اعلان کیا گیا اور اس طرح عوام کو مشتاق بنانے کے ساتھ پولیس کو بھی شاہ صاحب کے بارہ میں مطمئن کر دیا گیا، اور ہوا یہ کہ شاہ صاحب ایک بڑے عجیب وغریب طریقہ پر دن ہی میں امروہہ سے نکل گئے اور امروہہ کا اسٹیشن چھوڑ کر ایک دوسرے قریبی اسٹیشن سے انھوں نے سفر کیا، اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ ان کی روانگی کا انتظام کرنے والے دو چار آدمیوں کے سوا اجنبوں میں بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی، رات کو مولانا احمد سعید صاحب (علیہ الرحمۃ) کی تقریر شروع ہوئی اس دن مولانا کی تقریر بھی بڑی غیر معمولی قسم کی ہوئی، اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا رہا کہ مجمع بڑی بے چینی کے ساتھ شاہ صاحب کی تقریر کا منتظر اور مشتاق ہے، مولانا نے رات کے قریب دو بجا دیئے اور ایک دم کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے فرمایا، ادھو دو بجنے کے قریب ہیں! لو بھئی السلام علیکم، اب شاہ صاحب کی تقریر پھر کبھی سن لینا! یہ سن کر پولیس والے بھی

ہکا بکا رہ گئے۔

شاہ صاحب نے امروہہ سے نکل کر ایک طوفانی دورہ شروع کیا، وہ عرصہ تک گرفتار نہ ہو سکے، انھوں نے قریباً پورے شمالی ہند کا دورہ کر لیا، ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جو ہزارہا مسلمان جیل گئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی بہت بڑی تعداد تنہا شاہ صاحب ہی کی پرجوش اور آتشیں تقریروں کے حساب میں تھی۔

——— اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی کشش اور تاثیر دی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ غالباً اپنے اسی دورہ میں وہ بدایوں بھی گئے، مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مرحوم کے مہمان ہوئے، معلوم ہے کہ موصوف اپنے بدایونی مسلک میں کیسے پختہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (بریلوی حضرات کی اصلاح کے مطابق) ٹھیٹ وہابی ہیں، اسکے علاوہ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم امروہہ کے اجلاس میں "کانگرس کی جنگ آزادی میں شرکت" والے رزولیوشن کے اہم مخالفین میں تھے ——— لیکن اس اختلافِ مسلک اور سیاسی اختلاف رائے کے باوجود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور اُن کے خلوص سے ان کا قلب اتنا متاثر تھا کہ کھانے کے لئے ہاتھ دھونے کے وقت خود سلیچی اور لوٹا ہاتھ میں لے کر شاہ صاحب کے ہاتھ دُھلاتے تھے اور اپنے شدید اصرار سے شاہ صاحب کو اس معاملہ میں مجبور کر دیتے تھے ——— اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمتیں فرمائے۔

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات درمیان میں آگئی تھی ورنہ ذکر ان کے ۱۹۳۰ء کے دورہ کا ہو رہا تھا، انھوں نے پنجاب سے بنگال تک کا دورہ کیا اور بنگال جاکر گرفتار ہوئے اور سزا پاکر وہیں علی پور جیل میں رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شاہ صاحب اور اسی طرح اُن کے خاص رفقا کو اپنی اس جد و جہد اور قربانی سے اسکی امید بالکل نہیں تھی کہ کانگرس اور اسکے لیڈروں کی طرف سے اُس کا اعتراف بھی کیا جائے گا، یا وہ اس قربانی کے ذریعہ کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل کر سکیں گے، بلکہ اسکے برعکس انھیں سابق تجربوں کی بنا پر پورا یقین تھا کہ کوئی ایسا مسلمان

کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کرسکتا جو اسلام اور مسلمانوں کا بھی پورا وفادار اور اس موضوع پر بھی لڑ جانے والا ہو ـــــ اور بالکل یہی چیز سامنے آئی ۱۹۳۰ء کی اس جنگ آزادی کے بعد جب دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے گاندھی اِروِن پیکٹ ہوا، اور سارے سیاسی قیدی رہا کئے گئے اور اس کے بعد کراچی میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ہوا تو پنجاب کانگرس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ اور ان کے رفیقوں کو کانگرس کے نظام سے دور رکھا یہاں تک کہ کراچی کے اجلاس میں یہ لوگ صرف مشاہد کی حیثیت سے شریک ہوسکے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ اور اُن کے رفقاء کے سامنے اس جد وجہد اور قربانی کا محرک صرف یہ تھا کہ کانگرس انگریز کو ہندوستان سے بیدخل کرنے کے لئے ایک لڑائی لڑ رہی ہے۔ ہمیں صرف اس مقصد کی خاطر اس میں حصہ لینا چاہئیے ـــ

کانگرس کے اس رویہ اور مزاج ہی کا تجربہ کر کے شاہ صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی ایک مستقل سیاسی تنظیم "مجلس احرار اسلام" قائم کرنے کی ضرورت بھی تھی، لیکن اسکے باوجود ۱۹۴۷ء تک برابران کا رویہ اور مسلک یہی رہا کہ وہ انگریزی اقتدار کے خلاف کانگرس کے ہر اقدام میں اسکے ساتھ بلکہ عمل اور قربانی میں آگے رہے اور اسی طرح لیگ کانگرس آویزش میں بھی وہ اپنی رائے اور ضمیر کے فیصلہ کے مطابق لیگ کے خلاف صف آرا رہے اور آزادی سے پہلے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے دونوں جنرل الکشنوں میں بھی انھوں نے اپنی پوری طاقت کانگرس کے حق میں استعمال کی۔ اور اگر آزادی کا حصول کانگرس کی جد وجہد کا نتیجہ ہے تو بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن ہندوستان کے لئے یہ بات کتنی شرمناک ہے اور تاریخ اس کو کس طرح معاف کرسکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو سید عطاء اللہ شاہ کو اپنے وطن امرتسر سے نکل کر اُس پاکستان میں جانا پڑا جس کی اُس نے آخری وقت تک (بلکہ کانگرس کے پاکستان قبول کرلینے کے بعد تک بھی) بھرپور مخالفت کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے لئے بھی یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اپنے رفیق خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم کی طرح پاکستان کی طرف ڈھکیلے جانے کے بعد پھر ہندوستان واپس آجاتے اور شاید ہم مسلمانان ہندوستان کے لئے اُن کا یہاں آجانا کچھ مفید ہی ہوتا لیکن

غالباً اُن کے بعض حضرات نے اُن کو اس پر آمادہ نہیں ہونے دیا کہ ایسے طوطا چشموں کا وہ کوئی احسان لیں اور ان سے کوئی امید رکھیں ...... دوسری طرف پاکستان میں کئی حکومتیں بدلیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کے باوجود قریباً ہر حکومت ہی کے وہ معتوب رہے ـــــ کیسی بدقسمتی ہے اس ملک اور قوم کی جس کے پاس سید عطاء اللہ شاہ جیسی ایک طاقت موجود ہو اور وہ اس سے کوئی کام نہ لے بلکہ اُس کو کوئی کام کرنے کا موقع بھی نہ دے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات نے ایک طویل تاریخ یاد دلا کر ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ایسے مسئلہ کی طرف ذہن کو بڑی شدت سے متوجہ کر دیا جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے کچھ نظرانداز سا ہوتا جا رہا ہے، حالانکہ اس سے پہلے کم از کم مسلمانوں کے اُس مذہبی طبقہ کے نزدیک جو آزادی کی جنگ میں اور اس کے سلسلہ کی قربانیوں میں آگے آگے رہا، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل میں اس مسئلہ کو خاص اہمیت بلکہ اولیت حاصل تھی، اس سے میری مراد ہے آزاد ہندوستان میں ہماری دینی و ملّی خصوصیات اور ہمارے مخصوص شرعی قوانین (پرسنل لا) کے تحفظ کا مسئلہ ـــــ میرا خیال ہے کہ گزشتہ دور کے جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبات میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا خطبہ نہ ہوگا جس میں اس مسئلہ کا تذکرہ مسلمانوں کے خاص الخاص اور سب سے اہم مسئلہ کی حیثیت سے نہ کیا گیا ہو، اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر جمعیۃ نے جو قرارداد تجویز کئے اُن سب میں بھی اس مسئلہ کو مسلمانوں کی دینی و ملّی زندگی کا اہم ترین مسئلہ قرار دے کر دفعات مرتب کی گئی تھیں ...... اور مولانا سید محمد سجادؒ (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) نے ۱۹۳۹ء میں "نظارت امور شرعیہ" کے عنوان سے ایک مکمل دستوری خاکہ بھی تیار کر کے شائع کیا تھا، جس کے متعلق مرحوم کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کی جمہوری حکومت کا جو نقشہ کانگریس کے سامنے ہے یہ خاکہ آسانی سے اس میں فٹ ہو سکے گا ـــــ بہرحال ۱۹۴۷ء سے پہلے تک ہمارے حلقہ میں یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور وہ وقت آیا جس کے لئے یہ ساری تجویزیں اور سارے فارمولے تھے تو ملک کے حالات اتنے خراب اور فضا اتنی تاریک تھی کہ ان حالات کے اٹھانے کی واقعۃً کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ۱۴ برس گزر جانے کے بعد فضا وہ نہیں رہی ہے اور جس طرح جان و مال، عزت و آبرو اور دوسرے عام شہری حقوق میں مساوات کے سوالات ملک کے ذمہ داروں کے سامنے آ چکے ہیں، اسی طرح

ضروری ہے کہ یہ مسئلہ بھی اُس سنجیدگی کے ساتھ جو اِس کا حق ہے سامنے آئے ـــــ اس کے بتانے کی ضرورت نہیں ہو کہ اس معاملہ میں اب جتنی تاخیر ہوگی وہ مسئلہ کے لئے اُتنی ہی قدر مضر ہو گی ـــــ

ہمارے دوسرے مسائل جن کا تعلق ہماری مادی اور دنیوی ضرورتوں سے ہے، بہت اہم ہونے کے باوجود بھی ہمارے خاص مسائل نہیں ہیں، وہ تو ملک کے دوسرے بھی بہت سے طبقوں کے مسائل ہیں ہمارے خاص مسائل تو دراصل وہی ہیں جن کا تعلق ہماری اسلامیت سے ہے ـــــ کم از کم اس مذہبی حلقہ کا تو ہر واقف کار خوب ہی جانتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے لیکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تک اس قافلہ کے تمام ہی مجاہدین نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے انہی مسائل کو نصب العین کے طور پر سامنے رکھ کر قربانیاں دی تھیں اور اسی بنیاد پر وہ اپنی جدوجہد اور اپنی قربانیوں کو اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور قربانی سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اجر کی توقع رکھتے تھے۔

یاد آتا ہے، کہ اب سے ۴۱-۴۲ سال پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی یا علی گڑھ کے اپنے خطبہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد مقامات مقدسہ اور ممالک اسلامیہ پر صلیبی طاقتوں کے تسلط کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس صورت حال سے آج ابو عبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کی روحیں بےچین ہیں ـــــ ان سطور کا لکھنے والا جو ایک سخت گنہگار قسم کا آدمی ہونے کے علاوہ نہایت درجہ بےعمل اور نکما بھی ہے ایسی کوئی بات کہنے کا ہرگز اہل نہیں ہے لیکن اس کا اپنا یہ احساس اور یقین ضرور ہے کہ اس مسئلہ میں ہماری کوتاہی اور بے پروائی فی الحال ہمارے ان بزرگوں کی روحوں کے لئے یقیناً قلق اور بےچینی کا باعث ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا یہ باتیں یہاں ایک خاص تاثر کے تحت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ذکر کے سلسلہ میں بے اختیار زبان پر آگئیں ان کا مقصد ہرگز کسی پر تنقید نہیں ہے، یہ ناچیز اس کام کے تمام امور میں سب سے زیادہ قصوروار اور مسئول اپنے ہی کو سمجھتا ہے۔

یہ سلسلہ بالکل غیر ارادی طور پر بہت طویل ہو گیا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو کا اس میں ذکر آیا اور وہ بھی بہت ناتمام ـــ اب اسی پر ختم کیا جاتا ہے اُنکے لکھنے والے دوستوں نے بہت کچھ لکھا ہوگا اور لکھیں گے ـــ آخر میں ناظرین سے رسمی طور پر نہیں بلکہ دل کی گہرائی سے یہ درخواست ہو کہ اس عاجز کے تعلق سے بھی شاہ صاحب کے لئے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا فرمائیں، اور ساری باتیں تو یہیں رہ جائیں گی لیکن آپ کا یہ تحفہ ضرور ان شاء اللہ موصوف کے خدمت میں پہنچکر ان کی راحت اور مسرت کا باعث ہوگا ـــــ واجرکم علی اللہ!

صحبتے با اولیاء

دوسری صدی ہجری کے ایک جلیل القدر بزرگ ہیں ابوبکر بن عیّاش حضرت عبداللہ بن مبارک اور عبدالرحمٰن بن مہدی اور علی بن المدینی جیسے ائمہ حدیث اور اساطین علم ان کے شاگردوں میں ہیں، امام بخاری اور امام مسلم جیسے اکابر اُن کے شاگردوں کے شاگرد رہیں ــــ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اُنکے صاحبزادے ابراہیمؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ " والد ماجد (ابوبکر بن عیّاش) نے مجھ سے فرمایا " خدا کا فضل ہے تمھارے باپ سے کبھی بے حیائی اور بد اخلاقی کا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے فواحش سے میرا دامن پاک رکھا ہے) ــــ اور اسی اللہ کی توفیق سے پورے تیس سال سے میرا معمول ہے کہ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کر لیتا ہوں "

انھیں ابوبکر بن عیاش کے متعلق مروی ہے کہ اپنے صاحبزادہ سے انھوں نے فرمایا، " دیکھو اپنے کو اس سے بہت بچانا کہ میرے اس حجرہ میں تم سے کوئی معصیت سرزد ہو، میں نے اس میں بارہ ہزار دفعہ قرآن مجید ختم کیا ہے " (یعنی قرآن پاک کے جو انوار اس حجرہ کے در و دیوار اور اس کی فضا میں سرایت کر گئے ہیں، ان کی حرمت کا حق ہے کہ اس حجرہ میں اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ ہو)۔

انتقال کے وقت ان کی صاحبزادی رونے لگیں تو فرمایا:-

" بیٹی مت روؤ رونے کی کوئی بات نہیں ہے کیا تمھیں اس کا ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے باپ کو عذاب میں ڈالے گا، میں نے اپنے گھر کے اس گوشہ میں چوبیس ہزار دفعہ قرآن پاک ختم کیا ہے (اس لئے تمھیں اپنے ارحم الراحمین مالک سے رحمت و مغفرت ہی کی امید رکھنی چاہیئے)۔

انھیں ابوبکر بن عیاش کے متعلق اُنکے ہمعصر جلیل القدر امام یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ:-

لم یضع جنبہ الی الارض	چالیس سال تک پہلو زمین سے نہیں لگایا
اربعین سنۃ	(یعنی ۴۰ سال تک لیٹے ہی نہیں[1]۔)

(ماخوذ از شرح مسلم للنوادی وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال للخزرجی)

---

[1] آجکل کی طبائع کو ہو سکتا ہے اس میں کچھ استبعاد ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خاص بندوں نے ایسی بہت سی مثالیں چھوڑی ہیں۔

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
ہماری دعوت
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ادارۂ الفرقان
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ ...... چھ روپے
ششماہی ...... ۳ روپے
فی کاپی ...... ۵۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
افریقی خریداروں سے
سالانہ چندہ ۱۵ شلنگ

جلد ۲۹	بابتہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۱ء	شمارہ ۶

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ دسمبر تک دفتر میں ضرور آجانی چاہیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار } اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت } الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آ جانی چاہیے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

چندہ کے بارے میں ضروری اعلان صفحہ ۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

جنوری ۶۲ء مطابق رجب ۸۱ھ سے

الفرقان کے سالانہ چندے میں

۳۱ دسمبر تک نیا خریدار بننے والوں کے لئے رعایت

پاکستانی خریداروں کا چندہ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر عرصہ سے چھ روپے چل رہا تھا لیکن اب بعض تازہ حالات کی بنا پر ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ ہندوستانی خریداران الفرقان کے لئے بھی سالانہ چندہ چھ روپے اور (پاکستان کے علاوہ) غیر ممالک کے لئے ۱۲ شلنگ کر دیا جائے۔ اس کا سبب مختصر الفاظ میں کچھ تو ہر چیز کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں جو بہت دن سے چندہ میں اضافہ کا تقاضہ کر رہی تھیں لیکن ادھر ایک خاص مجبوری یہ پیدا ہوئی ہے کہ الفرقان کے سائز کا 20x26 اخباری کاغذ کئی ماہ سے نایاب ہو گیا ہے، مجبوراً 20x30 یعنی بڑے سائز کا کاغذ خرید کر (اور اپنے سائز کے مطابق بنا کر) استعمال کرنا پڑ رہا ہے جس کی قیمت خاصی زیادہ ہے۔ ادھر چند ماہ کے اندر اندازہ ہوا کہ اخراجات میں اس خاص اضافہ کا تحمل الفرقان اسکے بغیر نہیں کر سکتا کہ چندہ میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ پس مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جنوری ۶۲ء مطابق رجب ۸۱ھ سے

ہندوستان کے خریداروں کے لئے بھی سالانہ چندہ چھ روپے

اور

پاکستان کے علاوہ غیر ممالک کے لئے بارہ شلنگ (12 SHILINGS)

کر دیا جائے ——— جن قدیم خریداروں کا چندہ اس ماہ جمادی الاخری مطابق دسمبر پر ختم ہو رہا ہو وہ اور جو لوگ نئے خریدار بننا چاہتے ہوں ۳۱ دسمبر تک پرانی شرح کے مطابق (یعنی ہندوستان -/۵ اور غیر ملکی ۱۰ شلنگ) ہی بھیج سکتے ہیں لیکن

۳۱ دسمبر کے بعد بھیجا ہوا کوئی چندہ پرانی شرح کے مطابق قبول نہیں کیا جا سکے گا

نگاہِ اوّلین

از مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندو مسلم مسئلہ

ہندوستان کے مسلمان کس ماحول میں گھرتے جا رہے ہیں؟ مدھیہ پردیش اور اترپردیش کی مسلم اقلیت کے حالیہ قتل و غارت کی روشنی میں اس ماحول کی جو جھلک ہم نے دیکھی تھی اس کو گذشتہ اشاعت کے اداریہ میں ہم نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ "ہم ایک قومی تذلیل کے ماحول میں گھرتے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اکثریت کے کسی فرد کے حق میں کسی مسلمان فرد سے کسی خطا کی افواہ اڑ جائے یا فی الواقع خطا سرزد ہو جائے تو نہ افواہ کی تحقیق کی حاجت ہو اور نہ خطا کی قانونی [illegible] بلکہ اس کی سزا میں پہلے پوری مسلمان قوم کی عوامی سطح پر پٹائی اور گوشمالی ہونی چاہیے خواہ اس غلطی کا کوئی ... ہو سکتا ہے — یعنی ایک کمتر درجہ کی قوم جیسا سلوک۔" — ہم نے مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ اس ماحول میں اپنے انجام کی فکر کریں ورنہ انجام معلوم ہے۔

شکر ہے کہ یہ احساس صرف ایک مسلمان ہی کا نہیں رہا، بلکہ الہ آباد (اترپردیش) ہائیکورٹ کے فاضل جج مسٹر ایس ایس دھون کی ۲ نومبر کی ایک تقریر کی جو رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی اس نے ہمیں بتایا کہ ہم مسلمانوں کے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے میں کسی جذباتیت کو دخل نہیں دے رہے ہیں۔ کچھ انسانیت دوست غیر مسلم بھی یہاں ہیں جو ملک کی اکثریت میں اس طرح کے خطرناک رجحانات کو محسوس کر رہے ہیں۔

جسٹس دھون نے الہ آباد یونیورسٹی کی فلسفہ ایسوسی ایشن کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا :-

"علی گڑھ اور میرٹھ کے فسادات پچھلے فسادات سے بالکل مختلف نوعیت کے تھے کیونکہ اس میں تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک سماجی فلسفہ سے متاثر ہوکر قتل و غارتگری میں حصہ لیا ـــــ کہ معصوم (بے گناہ) لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے کیونکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک معمولی جھڑپ میں چند (ہندو) لڑکے زخمی ہوگئے تھے۔"

اس "سماجی فلسفہ" کی وضاحت کرتے ہوئے جسٹس دھون نے کہا کہ یہ "اعلیٰ نسل" کا فلسفہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "ہندوستان مختلف ادنیٰ اور ایک اعلیٰ فرقہ کا وطن ہے جس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اقلیت کے ساتھ ظلم و تشدد روا رکھے۔" انھوں نے کہا کہ یہ ہٹلر کا "شیطانی فلسفہ" ہے، جس کی شیطنت پر" ایک کروڑ ایشیائی، یورپی اور امریکیوں اور ۶۰ لاکھ یہودیوں کی لاشیں گواہ ہیں" ـــــ انھوں نے علی گڑھ اور میرٹھ کے فسادات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس ہولناک سماجی فلسفہ کے جراثیم ہم میں بھی سرایت کرگئے ہیں۔"

ہم اس بے لاگ اظہار حقیقت پر جسٹس دھون کو اپنے انسانی جذبات کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اُن کی تقریر نے جہاں ہمیں یہ بتایا کہ ہم ہندوستان کے ماحول کو سمجھنے میں کوئی جذبات آمیز غلطی نہیں کر رہے ہیں وہاں یہ اطمینان بھی دلایا کہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ہم ملک کی اکثریت سے مکمل طور پر مایوس پہلے بھی نہیں تھے، اور شاید ایسی مایوسی کسی وقت بھی صحیح نہیں ہوگی۔ لیکن جب یو۔ پی کے چودھری چرن سنگھ جیسے لوگوں کو ـــــ جن کی ایمانداری کی اچھی شہرت ہے ـــــ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سامنے کے واقعات بیان کرنے میں تو اپنی ایمانداری کا پاس رکھتے ہیں لیکن علل و اسباب کے دائرہ میں آزادیٔ رائے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مظلوم اقلیت کو بھی "برابر کا ذمہ دار" گردانتے سے نہیں شرماتے ـــــ اور ایماندارانہ

لہجے میں ایسے چھینٹے اُڑاتے ہیں کہ شرانگیزی کے موجودہ ماحول میں اس سے خوب خوب فائدہ اٹھاکر ظلم وستم کا بازار بار بار گرم کیا جاسکتا ہے ـــــ تو ایک حد تک مایوسی قدرتی ہوجاتی ہے۔ مگر اسکے برعکس جب مسٹر دھون جیسے لوگ ہمارے سامنے آتے ہیں جو اس دائرے میں بھی حق کہتے ہیں جہاں ڈنڈی ماری جاسکتی ہے اور زبان نہیں پکڑی جاسکتی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب وہ اپنے فرقہ کے منھ پر یہ رندانہ جرأت بھی دکھا جاتے ہیں کہ:-

"ہم اپنے روحانی ورثہ کی بات کرتے ہیں! ہماری زبان پر بھگوت گیتا اور دلوں میں فرقہ وارانہ نفرت بھری ہے"

تو ہماری مایوسیاں بھی بڑی حد تک گھٹ جاتی ہیں ـــــ کاش اس چراغ سے اور چراغ بھی جلیں اور دلوں کی یہ بُرائی ہر آنکھ میں بُری بن جائے۔

ہم جسٹس دھون کی اس تقریر پر کسی فرقہ دارانہ جذبہ سے خوش نہیں ہورہے ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ اس غیر مہذب اور انسانیت سوز ذہنیت کے لئے ہمارے دل و دماغ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ مسٹر دھون نے اگر اکثریت کو اسکی نفرت پرستی پر لتاڑا ہے اور مسلم اقلیت پر کوئی ہلکے سے ہلکا چارج بھی نہیں کیا۔ تو ہم اسکے نتیجہ میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے والوں میں سے نہیں ہیں کہ دلوں کی تبدیلی کی ضرورت مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ گزشتہ سیاسی کشمکش کی بدولت دونوں فرقوں کے دلوں میں جو میل آگیا تھا اُس کا اثر بلاشبہ مسلمانوں کے اندر بھی ابھی باقی ہے۔ اور ملک کا ہندو مسلم مسئلہ جبھی حل ہوگا جب دونوں طرف سے میل بالکل نکال دیا جائے۔ یہ بات اگر کوئی غیر مسلم کہے تو ہم اس کا برا نہیں مانیں گے۔ یو۔پی کے وزیر داخلہ مسٹر چرن سنگھ بھی اگر یہ بات کہتے ہیں تو ہم اس کو بالکل غلط نہیں کہتے، ہمیں جو کچھ اعتراض ہوتا ہے وہ اُن کی بات کے موقع و محل پر ہوتا ہے۔ وہ موقع و محل کے لحاظ سے اس حقیقت کا بالکل ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس میل کے نتیجہ میں مسلمان کوئی فرقہ درانہ چپقلش پیدا کرتا ہے اور پھر سخت مظالم کا تختۂ مشق بنتا ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اپنی مظلومیت کا خود بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن اگر وہ میل رکھے ہوئے ہو مگر کہتا کسی سے کچھ نہیں، بالکل زبردستی اس پر تہمتیں تراشی جاتی ہیں۔

انواع کی زیادتیاں کی جاتی ہیں اور پھر مظالم توڑے جاتے ہیں۔ تو انصاف کُش ہے وہ شخص، جو مظالم کی مذمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ان مظالم کی ذمہ داری مظلوموں پر بھی ہے — یہ نہ صرف انصاف دشمنی ہے بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں اور میل بھرنے والی بات ہے، انھیں چڑھانے والی بات ہے۔ اور ایسی باتیں کرنے والے کم سے کم یہ سمجھ کر ہندو مسلم مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں پہنچاتے۔

بے شک مسلمانوں کے دلوں میں بھی میل ہے۔ اور اس کو بھی دور ہونا چاہئے۔ مگر انسانی فطرت کے ماہر قارئین ہی یہ بھی تو دیکھو کہ جب پرانے قضیے ختم ہو کر ایک نئے دور کا آغاز ملک میں ہوا تو اس وقت سے آج تک ایسی فضا بھی ملک میں قائم ہو سکی جس کے اندر مسلمان کی انسانی سرشت سے **یہ توقع بجا ہوتی کہ وہ اکثریتی فرقہ سے صاف دل ہو جائے اور اپنے آپ کو غیر نہ سمجھے؟ اگر** اخباری رپورٹ صحیح ہے تو کس قدر صحیح کہا ہے یو۔پی کانگریس کے صدر مسٹر اجیت پرشاد جین نے

> کہ اقلیت اس وقت تک اکثریت کو غیر سمجھتی رہے گی جب تک اکثریت اُسے اپنا نہ سمجھے اور اس کے ساتھ مکمل مساوات اور برادرانہ برتاؤ نہ کیا جائے۔[1]

درحقیقت ہندو مسلم اتحاد میں اس وقت کی سب سے بڑی رکاوٹ عوامی سطح پر مسلم کش فسادات (اور جن سنگھی دعوتوں کی زبان میں اعلیٰ نسل کے شیطانی فلسفہ کے تحت اقدامات) اور سرکاری سطح پر مسلمانوں کے خلاف برتے جانے والے امتیازات ہیں۔ اس لئے ہندو مسلم مسئلہ کا حل اس وقت (کم از کم پہلے قدم کے طور پر) اکثریتی فرقہ اور اکثریت سے تعلق رکھنے والے با اقتدار لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کریں اور پھر دیکھیں کہ مسلمان اپنی حد تک صاف دل ہوتا ہے یا نہیں! سچ ہے، جین صاحب نے یہ سچ کہا کہ

> "ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہونے میں وقت لگے لیکن ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس خوفناک نظریہ کو ختم کر دیں کہ ہندوستان مختلف ادنیٰ اور ایک اعلیٰ فرقہ کا وطن ہو جس کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اقلیت کے ساتھ ظلم و تشدد روا رکھے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ جس دن مسلمانوں کو یہ محسوس ہونے کا موقع ملے گا کہ یہ غیر مہذب نظریہ ختم ہو گیا، اسی دن سے ان کے دلوں کا رنگ بغیر کسی وعظ و نصیحت کے بدل جائے گا، اس لئے کہ

---

[1] [illegible] ... نے جاری ... کے بعد ... [illegible]

اُن کے حالات کا تقاضا یہی ہے اور اس تقاضے کے بروئے کار آنے میں محض اسی نظریہ کے مختلف مظاہر رکاوٹ بن رہے ہیں۔

لیکن جو لوگ اس نظریہ کے علمبرداروں کے آگے ہتھیار ڈالدینے کی ذہنیت سے یا اس نظریہ کے پیدا کردہ حالات سے فائدہ اٹھانے کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو اُن کے مفاد میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ کسی حیثیت سے اپنا جداگانہ کوئی وجود ہی باقی نہ رکھیں "ایک سماج اور ایک کلچر" کی دعوت کو قبول کرلیں اور اپنی تعلیمی، تمدنی اور مذہبی خدمات انجام دینے والی جماعتوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیں، تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مسلمان جان کی خیر منانے کے لئے اس جابرانہ سودے پر راضی نہیں ہوگا۔ اور اس طرح کی کوششوں سے ملک کو نقصان پہنچے گا۔

کیا یہ سچ ہے؟ | الفرقان کے گزشتہ اداریہ کا ایک حصہ نقل فرماکر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ۱۲ نومبر کے صدق میں تحریر فرمایا ہے:۔

"لیکن مولانا چاہے اس سے کہیں زیادہ دردمندانہ مقالہ لکھ ڈالیں، اور اپنا کلیجہ نکال کر سامنے رکھ دیں۔ اطمینان رکھیں کہ انکی قوم ٹس سے مس نہ ہوگی۔ وہ اسی پر خوش ہوتی رہے گی، فخر کرتی رہے گی کہ وہ محبوب کی اُمت ہے۔ اُمت مرحومہ ہے۔ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا اور ایک وقتی جزع و فزع اور ہنگامی جوش و خروش کے بعد وہ بدستور اپنی رنگ رلیوں میں پڑی رہے گی۔ سینما دیکھے گی۔ قوالی سنے گی۔ عرس اور طرح طرح کے نوایجاد جشن مناتی رہے گی۔ زمینداریاں مٹ جانے پر بھی ٹھاٹھ تعلقہ داروں، رجواڑوں کے رکھے گی۔ شادیاں دھوم دھام سے منائے گی، پر اٹھے اور شیرمال، مرغ اور پلاؤ اڑاتی رہے گی، زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے اور جھوٹ سے لدے ہوئے سہرے لہک لہک کر پڑھے گی۔ مشاعرے کی راتیں واہ واہ کے نعروں میں جاگ جاگ کر کاٹے گی۔ اور تعیش کا حق دل کھول کر ادا کرتی رہے گی۔ عاقبت اندیشی، انجام بینی اور نصیحت کی بات سننے کی صلاحیت بھی اب ان میں کب باقی رہ گئی ہے؟ فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم۔ اور نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم کا قانون کیا بے اثر رہ جانے والا ہے؟"

دل بیٹھ گیا ہمارا تو اس حصے کو پڑھ کر آپ بھی پڑھیئے اور سوچیئے، کہ اگر اپنا یہی حال رہا اور یہی رہا تو انجام کیا ہوگا!

برخیز از یں خواب گراں، خواب گراں خیز

ایک ہفت روزہ اخبار کی ضرورت

آزادی کے بعد سے مسلمانوں کے لئے جو حالات و مسائل پیدا ہوئے ہیں اُن کے پیش نظر عرصہ سے رہ رہ کر خیال ہوتا رہا ہے کہ ایک ایسا بلند پایہ (اردو) اخبار نکلنے کی کوئی صورت ہو جاتی جو مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچتا اور موجودہ حالات و مسائل میں اُن کی ایسی صحیح رہنمائی کرتا جس کی اُنکو فی الواقع ضرورت ہے، اور مسلسل وہ پیام اُن کو دیتا جو اُن کو موجودہ حالات و مسائل سے نپٹنے کا اہل بنا سکے۔

ہمارے اخبارات بہت سے نکل رہے ہیں، مگر کسی کی یہ واحد اور خاص مہم نہیں ہے کہ مسلمانوں میں، ان نئے مسائل اور اُن سے نپٹنے کے صحیح طریقہ کار کا شعور اور اس پر کاربند ہونے کا حوصلہ اور لگن پیدا کی جائے۔ یہ کمی اور اس کو پورا کرنے کی ضرورت جیسا کہ عرض کیا گیا اس چودہ سال کے عرصہ میں برابر رہ رہ کر محسوس ہوتی رہی ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ یہ خیال بھی ہوا کہ الفرقان ہی کو ہفتہ وار کی شکل دیدی جائے۔ مگر اسکے حق میں نہ اپنی ہی طبیعت مطمئن ہو سکی اور نہ دوسرے اہل الرائے نے اسکے حق میں رائے دی۔

اِدھر کے چند مہینوں میں جو خصوصیت سے وہ واقعات اور اُنکے نتیجے میں وہ حالات رونما ہوئے جن پر دو تین مہینے سے الفرقان میں لکھا جا رہا ہے تو طبیعت اس ضرورت کے لئے انتہائی حد تک بیچین ہوئی۔ کچھ دردمند اور ہوشمند دوستوں سے ذکر کیا، جنھوں نے اس ضرورت اور مقصد سے پورا اتفاق کرتے ہوئے گرمجوشی کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کا بیڑا اُٹھا لیا۔

طے یہ پایا کہ اس مقصد کے لئے فی الحال سب سے زیادہ مفید شکل ہفت روزہ اخبار ہی کی ہو سکتی ہے، جسے جلد سے جلد ایک اجتماعی انداز پہ جاری ہو جانا چاہیئے۔

اجتماعی انداز کا مطلب یہ ہے کہ اخبار کسی کی شخصی ملکیت اور شخصی نقطۂ نظر کا ترجمان نہ ہو بلکہ ہم مقصد اور ہم خیال اشخاص کا ایک بورڈ اس کا متولی (ٹرسٹی) اور پالیسی کا ذمہ دار ہو۔ اور ابتدائی سرمایہ اُن صاحب استطاعت افراد کے عطیوں سے حاصل کیا جائے جو اس مقصد سے ہمدردی رکھتے ہوں۔

چنانچہ ایک ایسے بلند پایہ ہفت روزہ کا ہر پہلو سے مکمل اور اطمینان بخش خاکہ بنانے کے بعد جو قبول عام کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو اور کم سے کم مسلمانوں کے اکثر ... میں وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے، سرمایہ کی تحصیل کا کام اور دیگر انتظامات شروع کر دیئے گئے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی اس اخبار کے اجراء کا اعلان کیا جا سکے گا۔

قدرتی طور پر سب سے زیادہ ناظرین الفرقان ہی سے امید ہے کہ وہ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن جد و جہد فرمائیں گے، اور خود ان میں سے اور اُن کے ذریعہ سے دوسرے صاحب استطاعت حضرات سے فراخدلانہ مالی تعاون بھی منتظمین اور محرکین کو حاصل ہوگا۔

مختلف سہولتوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم سے کم سو روپے کا عطیہ اس سلسلہ میں مقرر کیا گیا ہے ــــ

ترسیل زر کا پتہ حسب ذیل ہوگا۔

جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
کرامت منزل، اکبری گیٹ لکھنؤ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مسلمان اور ہندوستانی پور وَج

(از، شری سمپورنا نند جی سابق وزیر اعلیٰ اترپردیش)

[گزشتہ اشاعت میں شری سمپورنا نند جی کی ایک تقریر پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک مضمون مذکورہ بالا عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر الفرقان کے نام حسب ذیل مراسلہ سمپورنا نند جی کی طرف سے موصول ہوا ہے اس پر ہم اپنی گزارشات مراسلہ ختم ہونے کے بعد درج کر رہے ہیں۔ مراسلہ پر پیراگراف نمبر ہمارے قائم کردہ ہیں ــــ اڈیٹر]

مکرمی! تسلیم

(۱) میں نے آپکے رسالہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے اس مضمون کو دیکھا جس کی سرخی "مسلمان اور ہندوستانی پوروج" ہے۔ میرے اس کہنے کا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ۹۰ فیصدی سے زیادہ لوگ ہیں جن کے پُوروَج ہندو تھے۔ دوسرے لفظوں میں جو ہندوؤں کی اولاد ہیں، کافی چرچا ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس سلسلہ میں اس سنجیدگی سے غور کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی جس کی اُمید کی جا سکتی تھی ــــ میرے پاس اس سلسلے میں گالی گلوج سے بھرے ہوئے خطوط آئے ہیں اس قسم کی باتیں کہنے اور لکھنے والے بھول جاتے ہیں کہ گالی دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا کرتا۔

(۲) مولانا ابوالحسن صاحب نے جس سطح پر اس بحث کو پہونچایا ہے، اسکے لئے میں اُن کا ممنون ہوں، کسی کی بات ہم کو خوش گوار معلوم ہوتی ہے، یا کڑوی، لیکن ہم لوگوں کو کم سے کم اترپردیش کے رہنے والوں کو اس تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئیے۔ جس پر ہم سب فخر کرتے ہیں۔ میں مولانا کے اس بیان سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ "احترام" اور افتخار و انتساب

میں فرق ہے۔ میں مانے لیتا ہوں کہ ان لفظوں کے اصطلاحی معنی وہی ہیں جن میں مولانا نے ان کو استعمال کیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی ہندوستانی مسلمان سے یہ تقاضہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے ہندو "پوروج" کے لئے افتخار وانتساب کے جذبات رکھے۔

(۳) "پوروج" کے لغوی معنی پہلے پیدا ہونے والے کے ہیں۔ اصطلاحاً اس کو ان لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کو آبا واجداد، یعنی مورث کہا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ لوگ جن کے خاندان میں اپنی پیدائش ہوتی ہے۔ میں نے تو محض اوار رخ کی طرف توجہ دلائی ہے۔

(۴) اسلام اس ملک میں قریب ایک ہزار برس سے آیا ہے۔ اسکے پہلے یہاں جو لوگ رہتے تھے ان کو مذہباً ہندو ہی کہا جاسکتا ہے۔ آج جو لوگ مسلمان ہیں وہ سبکے سب یا اُن کے بزرگ باہر سے نہیں آئے۔ اگر ان کے گھروں میں خاندانی شجرے ہوں تو وہ ایک ہزار برس پہلے یکایک رک تو نہیں جائیں گے۔ اس وقت اُن کے خاندان میں جو بھی بزرگ رہے ہوں گے، اُن کے بھی تو والد اور والد کے مورث رہے ہی ہوں گے، اور وہ غالباً ہندو رہے ہوں گے۔

(۵) میرا اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر آج میں مسلمان ہو جاؤں تو جو لوگ میرے خاندان میں میرے بعد پیدا ہوں گے، ان کو یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ میرے والد ہندو اور اُن کے پہلے بھی سب ہی بزرگ ہندو تھے۔ اگر میری اولاد اس تعلق کو مانتی ہے اور اس لحاظ سے خاندان میں جو لوگ مجھ سے پہلے پیدا ہوئے اُن کا احترام کرتی ہے تو کسی کو شکایت کا موقع نہیں ہو سکتا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، ہمارے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں اس وقت بھی ملک میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راجپوت مسلمان کہلاتے ہیں، وہ لوگ اپنے کو سورج بنسی، چندر بنسی، چندیل وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ اپنا رشتہ رام، کرشن، راجا بھوج سے جوڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب وہ مسلمان ہیں تو مذہبی باتوں میں ان بزرگوں کو قابل تقلید نہیں مانتے مگر ان کی عزت کرتے ہیں اور ان خاندانوں میں پیدا ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ میں اس سے زیادہ کسی چیز کی مانگ نہیں کرتا۔

(۶) مولانا فرماتے ہیں" معلوم نہیں کیوں سمپورنانند جی نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہندستان

کے۔ ۹۰ فیصدی مسلمان سب آرین نسل کے اجداد اور ناموروں کی اولاد اور جانشین ہیں"
مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس جگہ مولانا کو کچھ وہم ہو گیا ہے میں نے کبھی ایسا فرض نہیں کیا مسلمان کیا یہاں کے ہندو بھی سب آرین نسل کے نہیں ہیں۔ میں نے ہندو لفظ استعمال کیا تھا۔ آرین نہیں۔ آج جو لوگ ہندو کہلاتے ہیں اور اپنے کو ہندو کہتے ہیں ان میں آرین، ڈرود ڈ، سیرین، منگولین، سب قسم کے لوگ ہیں اور یہ سب آپس میں اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ میں نے رام، کرشن کا نام لیا تھا جو غالباً آریہ نسل کے تھے۔ اسکی وجہ محض یہ تھی کہ یہ پرانے زمانے کی ایسی ہستیاں تھیں جن کے ناموں کا دنیا میں ہر طرف شہرہ ہے۔ اسلئے آسانی سے ان کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ان کے پہلے کے جن ناموں کو میں جانتا ہوں وہ بھی اتفاق سے آرین ہی تھے۔ لیکن اگر آریوں کے علاوہ کہیں پرانے بزرگوں کے نام کسی کو معلوم ہوں تو میں شوق سے اور پورے احترام کے ساتھ ان کو شامل کر لوں گا۔

(۷) مولانا کو اور شاید دوسرے مسلمان دوستوں کو یہ نہیں معلوم ہو گا کہ کئی موقعوں پر میں نے خاندان مغلیہ کے اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک کے بادشاہوں اور اسی طرح حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو اپنے بزرگوں میں گنایا ہے۔ جن پر یہاں کے رہنے والے، ہندو اور مسلمان دونوں کو فخر کرنا چاہیئے، یہ لوگ ہر نقطۂ نظر سے ہمارے تھے۔ گو آرین نہیں تھے، اور بحیثیت ہندو کے اورنگ زیب کی کئی باتیں میرے لئے بہت تکلیف دہ تھیں۔

(۸) یہ شکایت بھی کی جاتی ہے کہ میں نے ایسے لوگوں کے نام چنے ہیں، جن کی پوجا کی جاتی ہے اور جن کو اوتار مانا جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر ہندو بھی ان لوگوں کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ آریہ سماجی ہندو ہیں مگر کسی کو اوتار نہیں مانتے۔ میں خود آریہ سماجی نہیں ہوں۔ مگر رام، کرشن یا کسی ایسی شخصیت کو اوتار نہیں مانتا۔ ہندو ہونے کے لئے اوتار کے خیال کو ماننا لازمی نہیں ہے ۔۔۔ میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ان لوگوں کے نام اس لئے لئے جاتے ہیں کہ دنیا میں ان کی شہرت ہے۔ ایک اور بات ہے، اگر کچھ لوگ، ان کو اوتار

مانتے ہیں تو ہر شخص کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کو اوتار مانے اور اگر اوتار نہ مانیں تو ان کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کے والد کو کچھ لوگ بہت بڑا خدا رسیدہ فقیر مانتے ہوں، اور وہ اس بات کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ مگر اس وجہ سے والد کو والد کہنا نہیں چھوڑ سکتا۔

(۹) ایک اور بات یاد رکھنی چاہیئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ رام، کرشن پوروج تھے تو پوروج لفظ کا لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ لغوی معنوی میں وہ ہر ہندو کے پوروج نہیں تھے۔ چھتری خاندان میں پیدا ہوئے تھے، براہمن ان کو اپنا پوروج نہیں مان سکتا، ہر چھتری کے بھی پوروج نہیں تھے۔ یہ تو اسی قسم کی اصطلاح ہے جیسے مصطفےٰ کمال پاشا کو اتاترک کہنا۔ ظاہر ہے ہر ترک ان کی اولاد نہیں ہے، کتنے شان کی بات ہوتی، اگر اس ملک میں بھی کوئی فردوسی پیدا ہوتا، احترام کہیئے یا افتخار، جن لفظوں میں اس شاعر نے پرانے آتش پرست بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔ ان پر آفرین کہتے ہی بنتا ہے، اور پھر ان بزرگوں کی عزت کرنے کی وجہ سے کسی نے اس کو شکایت کے قابل نہیں سمجھا۔ شیخ سعدی کہتے ہیں ؎

چہ خوش گفت فردوسی پاک ذات[1]
کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد

انوری کے یہ لفظ شاید اور آگے جاتے ہیں:-

آں نہ اُستاد بود ما شاگرد
آں خداوند بود و ما بندہ

(۱۰) مولانا نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کل ہندوستان میں برہمنی تہذیب کے تقلید کی باتیں کی جا رہی ہیں اور مسلمانوں کو اس طرف بازگشت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس شبہ کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، لوگ کہتے ہیں وہم کا علاج

---

[1] خط میں اسی طرح لکھا ہے ہمارے علم میں "پاک زاد" ہے۔ (الفرقان)

لقمان بھی نہیں کر سکتے تھے اگر کوئی بات صحیح ہے تو ہم اس لئے تو نہیں چھوڑ سکتے کہ کچھ لوگ اسکی آڑ میں کوئی غلط کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نیک ارادے غلط ارادہ پر فتح پائیں گے اتنا یقین تو رکھنا ہی چاہیئے یوں ہر شخص کو اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے کا اختیار ہے۔ اپنے مضمون کے آخر میں مولانا لکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں جذباتی ہم آہنگی کے لئے اس قسم کا چرچا نہ صرف یہ کہ بے ضروری ہے بلکہ مضر بھی ثابت ہو سکتا ہے اس میں میری اور ان کی رائے میں اختلاف ہے۔

نیازمند

سمپورنانند

[سمپورنانند جی کا مکتوب گرامی ختم ہوا]

"**الفرقان**" (۱) سمپورنانند جی کے نام "گالی گلوچ سے بھرے ہوئے خطوط" کی اطلاع سے ہمیں بھی اتنی ہی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تکلیف ہوئی اور ہر شریف آدمی کو ہونی چاہیئے، جتنی کہ سمپورنانند جی کو ہوئی ہوگی ___ اختلافات و نزاعات میں گالی بکنے کو ہمارے ہادی اور اللہ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے "منافق کی نشانی" بتلایا ہے۔

(۲) سمپورنانند جی کی اس تصریح کے بعد کہ وہ احترام اور "افتخار و انتساب" میں فرق تسلیم کرتے ہیں اور کسی مسلمان سے یہ تقاضہ نہیں کرتے کہ وہ اپنے ہندو پوروج کے لئے افتخار و انتساب کے جذبات رکھے "یہ بحث بالکل ختم ہو جاتی ہے اور فریقین کے نقطۂ نظر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا کیونکہ "ہندوستانی پوروج" یا "ہندو پوروج" کے "احترام" سے مولانا ندوی کو اختلاف نہیں ہے اور نہ کسی مسلمان کو ہونا چاہیئے، اس بارہ میں اسلام کی واضح تعلیم ہے "أكرموا كريم قومه" (ہر قوم کے باعزت لوگوں کی عزت کرو) مولانا ندوی نے اپنے مضمون میں جو بحث کی ہے وہ صرف "افتخار و انتساب" میں کی ہے اور اسی سے انھوں نے اختلاف کیا ہے ___ لیکن سمپورنانند جی کے اسی خط کے بعض آگے کے حصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف "احترام" نہیں بلکہ "افتخار" بھی چاہتے ہیں، ہم اُس فقرہ پر آگے نشاندہی کرینگے۔ اگر اسکے سمجھنے میں ہم کوئی غلطی کر رہے ہیں تو امید ہے کہ شری سمپورنانند جی اس کو دور فرما کر ہم کو ممنونیت کا موقع دیں گے۔

(۳) سمپورنانند جی کے اس خط کے پیرا ۲، ۳، ۴، ۵ سے ہم نے یہ سمجھا ہے کہ موصوف ان ہندستانی مسلمانوں سے جو ہندوستانی نسلوں سے ہیں، نسلی اور خاندانی تعلق کی بنا پر مطالبہ یا اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے قدیم مورثوں (ہندوستانی پوروج) کا احترام کریں۔ نیز انہی پیراگرافوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مطالبہ میں "پوروج" سے ان کی مراد نسلی اور خاندانی مورث یعنی آباء و اجداد ہیں۔ لیکن آگے اسی خط میں انھوں نے بتایا ہے کہ "پوروج" سے مراد نسلی اور خاندانی بزرگ (آباء و اجداد) نہیں ہیں بلکہ اُس سے "ملک کے بڑے" مراد ہیں ——— ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اگر یہاں بھی ہماری سمجھ کوئی غلطی کر رہی ہے تو سمپورنانند جی اس کو بھی دور فرما کر ہم کو مزید ممنونیت کا موقع دیں۔

(۴) سمپورنانند جی نے اپنے بلند علمی مقام اور وسیع تاریخی واقفیت کے باوجود پیرا ۶ کے آخر میں بڑی صفائی سے اعتراف فرمایا ہے کہ آرین نسل کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قدیم تر نسلوں کے بزرگوں کے نام بلکہ کسی ایک بزرگ کا نام بھی ان کو معلوم نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کا یہ اعتراف ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ لیکن اس کے بعد قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پھر "ہندوستانی پوروج" سے یہاں کے مسلمانوں کی ناواقفی کچھ زیادہ قابل اعتراض یا لائق تعجب بات ہے؟

(۵) سمپورنانند جی پیرا ۸ میں فرماتے ہیں کہ رامچندر جی اور کرشن جی کے ایسی شخصیتیں ہونے سے جن کو اوتار مانا جاتا ہے، یہ سوال نہیں پیدا ہونا چاہیئے کہ مسلمان اُن کو کیسے اپنا پوروج مانیں؟ اس لئے کہ کسی شخص کے والد کو اگر کچھ لوگ بڑا خدا رسیدہ بزرگ مانتے ہوں لیکن اس کو یہ بات تسلیم نہ ہو تو وہ اس اختلاف کی بنا پر والد کو والد کہنا نہیں چھوڑ سکتا ——— ہماری گزارش ہے کہ مولانا ندوی نے تو اوتار کا لفظ نہیں استعمال کیا تھا بلکہ رام اور کرشن جی کی خاص مذہبی شہرت اور ایک ایسے عقیدۂ و فلسفۂ زندگی کے بانی یا داعی کی حیثیت سے نام پانے کا سوال اُٹھایا تھا جو بنیادی طور پر اسلام سے متصادم ہے، البتہ اکتوبر کے الفرقان کے اداریہ میں اوتار مانے جانے کے لفظ استعمال کئے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ اداریہ بھی سمپورنانند جی کی نظر سے الفرقان یا اُن اخبارات کے ذریعہ گزرا ہو جنھوں نے اسکو نقل کیا تھا۔ بہرحال مذکورہ اداریہ کے اندر اس بات میں

جو کچھ کہا گیا تھا اس کا حاصل تو یہ تھا کہ اگر کوئی انسان اپنے کردار، اعلیٰ صفات اور شاندار کارناموں کی وجہ سے عزت و احترام کا مستحق ہے تو بلا اس لحاظ کے کہ وہ ہمارے باپ دادوں میں سے ہے یا نہیں، اور بلا اس امتیاز کے کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے اس کی عزت اور اس کا احترام انسانیت کا تقاضہ ہے۔ لیکن اگر کسی شخصیت کا تعارف ہم سے ایک اوتار اور مافوق البشر دیوتا کی حیثیت سے کرایا جاتا ہے' (جیسا کہ رام چندر جی اور کرشن جی وغیرہ کا معاملہ ہے اور ہمارے سیکولر حکومت کی منظور کردہ درسی کتابوں میں بھی انھیں اسی دیوتائی رنگ میں پیش کیا جاتا ہو۔ اور ان کتابوں کے اسی رنگ پر اعتراض کے جواب میں خود سمپورنانند جی اپنی وزارت عالیہ کے دور میں فرماتے ہیں کہ پوروجوں کو تو ماننا ہی ہوگا) تو کوئی مسلمان بھی ان کو اس حیثیت سے بڑا اور قابل احترام ماننے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ ہاں اسلام کی تعلیم کے مطابق اس حیثیت سے ان کا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے گا کہ انھیں ایک قوم اپنا دیوتا مانتی ہے ــــ یہ تھا ہمارا مدعا، والد یا نسلی مورث اعلیٰ ماننے کی کوئی بحث ہی نہیں تھی۔ اور اس میں بحث ہو بھی کیا سکتی ہے؟ والد یا جدامجد اگر کوئی فی الواقع ہے تو [illegible] اور اس کا (ذاتی) احترام ہی کیا جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ، اگر سمپورنانند جی کا اشارہ ہمارے اداریہ کی طرف ہے تو، انھوں نے ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں فرمائی۔ اسی طرح اگر ان کا اشارہ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مولانا ندوی کے اٹھائے ہوئے سوال کی طرف ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جناب سمپورنانند جی نے اس سوال کے اصل منشا سے تغافل فرمایا ہے۔ مولانا ندوی کا صاف مدعا یہ تھا کہ کسی خاص شہرت کے مالک کی طرف فخریہ انتساب[1] کا مطلب نفسیاتی طور پر اس خاص وصف یا حیثیت کو آئیڈیل اور واجب التعظیم سمجھ لینا ہوتا ہے جس میں ممدوح کی عظیم شہرت ہوتی ہو پس کوئی مضائقہ نہیں کہ بہادری اور شہ زوری میں شہرہ عام رکھنے والے رستم و سہراب کی طرف ایک ایرانی النسل مسلمان اپنی فخریہ نسبت کرے، اس لئے کہ رستم و سہراب کا سرمایہ

---

[1] واضح رہے کہ خالی انتساب تو ہر شخص کی طرف ہو سکتا ہے مگر اُس انتساب پر افتخار یا کہئے کہ فخریہ انتساب، منسوب الیہ کی کسی خاص شہرت ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

جماعت میں صف بندی

نماز کے لیے جو اجتماعی نظام "جماعت" کی شکل میں تجویز کیا گیا ہے اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ تعلیم فرمایا کہ لوگ صفیں بنا کر برابر برابر کھڑے ہوں، ظاہر ہے کہ نماز جیسی اجتماعی عبادت کیلئے اس سے زیادہ حسین و سنجیدہ اور اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کی تکمیل کے لیے آپ نے تاکید فرمائی کہ صفیں بالکل سیدھی ہوں۔ کوئی شخص ایک انچ نہ آگے ہو اور نہ پیچھے، پہلے اگلی صف پوری کر لی جائے اس کے بعد پیچھے کی صف شروع کی جائے، بڑے اور ذمہ دار اور اصحابِ علم و فہم اگلی صفوں میں اور امام سے قریب جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، چھوٹے بچے پیچھے کھڑے ہوں اور اگر خواتین جماعت میں شریک ہوں تو اُن کی صف سب سے پیچھے ہو۔ امام سب سے آگے اور صفوں کے درمیان میں کھڑا ہو۔ —— ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کا مقصد جماعت کی تکمیل اور اس کو زیادہ مفید اور مؤثر بنانا ہے —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان باتوں کا عملاً اہتمام فرماتے اور وقتاً فوقتاً اُمت کو بھی ان کی ہدایت و تلقین فرماتے اور ان کا ثواب بیان فرما کر ترغیب دیتے نیز ان امور میں بے پروائی کرنے والوں کو سخت تنبیہ فرماتے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

ان تمہیدی سطروں کے بعد اس سلسلہ کی مندرجۂ ذیل چند حدیثیں پڑھیے!

صفوں کو سیدھا اور برابر کرنے کی اہمیت اور تاکید:-

(۴۸) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ اَقَامَةِ الصَّلٰوةِ۔

(رواہ البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، لوگو نماز میں صفوں کو برابر کیا کرو۔ کیونکہ صفوں کا سیدھا اور برابر کرنا نماز اچھی طرح ادا کرنے کا جزہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ "اقامت صلوٰۃ" جس کا قرآن مجید میں جا بجا حکم دیا گیا ہے اور جو مسلمانوں کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس کی کامل ادائیگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جماعت کی صفیں بالکل سیدھی اور برابر ہوں ـــــ سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوتے تو پہلے داہنی جانب رُخ کر کے لوگوں سے فرماتے کہ "برابر برابر ہو جاؤ اور صفوں کو سیدھا کرو"۔ پھر اسی طرح بائیں جانب رُخ کر کے ارشاد فرماتے کہ برابر برابر ہو جاؤ اور صفوں کو سیدھا کرو۔ ـــــ اس حدیث سے اور اس کے علاوہ بھی بعض دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت اکثر و بیشتر یہ تاکید فرماتے تھے۔

(۸۵) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا حَتّٰى كَاَنَّمَا يُسَوِّيْ بِهَا الْقِدَاحَ حَتّٰى رَاٰى اَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ ثُمَّ خَرَجَ يَوْمًا فَقَامَ حَتّٰى كَادَ اَنْ يُّكَبِّرَ فَرَاٰى رَجُلًا بَادِيًا صَدْرُهٗ مِنَ الصَّفِّ فَقَالَ عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ ـــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو اس قدر سیدھا اور برابر کراتے تھے گویا کہ ان کے ذریعہ آپ تیروں کو سیدھا کریں گے۔ یہاں تک کہ آپ کو خیال ہو گیا کہ اب ہم لوگ سمجھ گئے (کہ ہم کو کس طرح برابر کھڑا ہونا چاہیے) اس کے بعد ایک دن ایسا ہوا کہ آپ باہر تشریف لائے اور نماز پڑھانے کے لیے اپنی جگہ پر کھڑے بھی ہو گئے۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ آپ تکبیر کہہ کے نماز شروع فرما دیں کہ

آپ کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جس کا سینہ صف سے کچھ آگے نکلا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا کہ
اللہ کے بندو اپنی صفوں کو سیدھا اور بالکل برابر کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے رخ ایک دوسرے
کے مخالف کر دے گا۔ (صحیح مسلم)

تشریح) حدیث کے الفاظ "حَتّٰی کَاَنَّمَا یُسَوِّی بِہَا الْقِدَاحَ" (گویا کہ آپ صفوں کے ذریعہ تیر سیدھے کریں گے) کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اہل عرب شکار یا جنگ میں استعمال کے لیے جو تیر تیار کرتے تھے اُن کو بالکل سیدھا اور برابر کرنے کی بڑی کوشش کی جاتی تھی۔ اس لیے کسی چیز کی برابری اور سیدھے پن کی تعریف میں مبالغے کے طور پر یوں کہا جاتا تھا کہ وہ چیز ایسی برابر اور اسقدر سیدھی ہے کہ اس کے ذریعہ تیروں کو سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ تیروں کو سیدھا اور برابر کرنے میں معیار اور پیمانہ کا کام دے سکتی ہے۔ الغرض اس حدیث کے راوی حضرت نعمان بشیرؓ کا مطلب بس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو اس قدر سیدھی اور برابر کرنے کی کوشش فرماتے تھے کہ ہم میں سے کوئی سوت برابر بھی آگے یا پیچھے نہ ہو۔ یہاں تک کہ طویل مدت کی اس مسلسل کوشش اور تربیت کے بعد آپ کو اطمینان ہوگیا کہ ہم کو یہ بات آگئی، لیکن اس کے بعد جب ایک دن آپ نے اس معاملے میں ایک آدمی کی کوتاہی دیکھی تو بڑے جلال کے انداز میں فرمایا کہ اللہ کے بندو، میں تم کو آگاہی دیتا ہوں کہ اگر صفوں کو برابر اور سیدھا کرنے میں تم بے پروائی اور کوتاہی کروگے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا میں تمہارے رُخ ایک دوسرے سے مختلف کر دے گا۔ یعنی تمہاری وحدت اور اجتماعیت پارہ پارہ کر دی جائے گی اور تم میں پھوٹ پڑ جائے گی، جو اُمتوں اور قوموں کے لیے اس دنیا میں سو عذابوں کا ایک عذاب ہے۔ صفوں کو برابر اور سیدھا کرنے میں کوتاہی اور غفلت پر باہمی اختلاف اور پھوٹ کی وعید متعدد حدیثوں میں وارد ہوئی ہے۔ اور بلاشبہ اس قصور اور اس کی اس سزا میں خاص مناسبت ہے — افسوس بہت سی دوسری چیزوں کی طرح اس معاملہ میں بھی کوتاہی خاص کر بعض علاقوں میں بہت عام ہو چکی ہے۔

(۸۶) عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْسَحُ مَنَاکِبَنَا فِی الصَّلٰوۃِ وَیَقُوْلُ اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُکُمْ لِیَلِیَنِیْ مِنْکُمْ اُولُوا الْاَحْلَامِ وَالنُّهٰی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔ ——— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں (یعنی نماز کے لیے جماعت کھڑے ہونے کے وقت) ہمیں برابر کرنے کے لیے ہمارے مونڈھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور فرماتے تھے برابر برابر ہو جاؤ اور مختلف (یعنی آگے پیچھے) نہ ہو کہ خدانخواستہ اس کی سزا میں تمہارے قلوب باہم مختلف ہو جائیں (اور فرماتے تھے کہ) تم میں سے جو دانش مند اور سمجھ دار ہیں وہ میرے قریب ہوں، اُن کے بعد وہ لوگ ہوں جن کا نمبر اس صفت میں ان کے قریب ہو، اور اُن کے بعد وہ لوگ جن کا درجہ اُن سے قریب ہو۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں صفوں کی برابری کے علاوہ صف بندی ہی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری ہدایت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ میرے قریب وہ لوگ کھڑے ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے فہم و دانش میں امتیاز عطا فرمایا ہے، اُن کے بعد اس لحاظ سے دوم درجہ والے اور اُن کے بعد سوم درجہ والے ۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ ترتیب بالکل فطری بھی ہے اور تعلیم و تربیت کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اچھی اور ممتاز صلاحیتوں والے درجہ بدرجہ آگے اور قریب رہیں۔

(۸۷) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا إِذَا قُمْنَا إِلَى الصَّلٰوةِ فَإِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ ۔۔۔ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب ہم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو پہلے آپ ہماری صفوں کو برابر فرماتے اور جب ہماری صفیں درست اور برابر ہو جاتیں تو آپ تکبیر کہتے یعنی نماز شروع فرماتے۔

(سنن ابی داؤد)

پہلے اگلی صفیں مکمل کی جائیں :-

(۸۸) عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ فَمَا كَانَ مِنْ نَقْصٍ فَلْيَكُنْ فِي الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ۔

رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو پہلے اگلی صف پوری کیا کرو، پھر اس کے قریب والی تاکہ جو کمی کسر رہے وہ آخری ہی صف میں رہے۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھی جائے تو لوگوں کو چاہیے کہ آگے والی صف پوری کر لینے کے بعد پیچھے والی صف میں کھڑے ہوں اور جب تک کسی اگلی صف میں جگہ باقی رہے پیچھے کھڑے نہ ہوں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگلی صفیں سب مکمل ہوں گی اور جو کمی کسر رہے گی وہ سب سے آخری ہی صف میں رہے گی۔

صفِ اول کی فضیلت :-

(۸۹) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَعَلَی الثَّانِیْ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَعَلَی الثَّانِیْ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَعَلَی الثَّانِیْ قَالَ وَعَلَی الثَّانِیْ۔ رواہ احمد

(ترجمہ) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور اس کے فرشتے دعاءِ رحمت کرتے ہیں پہلی صف کے لیے بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اور دوسری کے لیے بھی؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے دعاءِ رحمت کرتے ہیں پہلی صف کے لیے، پھر عرض کیا گیا اور دوسری صف کے لیے بھی؟ آپ نے پھر پہلی ہی بات دُہرادی یعنی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور اس کے فرشتے دعاءِ خیر کرتے ہیں پہلی صف کے لیے پھر آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ اور دوسری صف کے لیے بھی؟ آپ نے تیسری مرتبہ بھی وہی پہلی بات دُہرادی کہ اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے دعاءِ رحمت کرتے ہیں پہلی صف والوں کے لیے۔ ان لوگوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اور دوسری صف کے لیے بھی؟ تو اس چوتھی دفعہ میں آپ نے فرمایا اور دوسری صف والوں کے لیے بھی۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور فرشتوں کی دعاءِ رحمت کے

خصوصی مستحق اگلی صف والے ہی ہوتے ہیں، دوسری صف والے بھی اس سعادت میں اگرچہ شریک ہیں، لیکن بہت پیچھے ہیں، مطلب یہ ہو کہ پہلی اور دوسری صف میں بظاہر اور ہماری نگاہوں میں فاصلہ تو بہت ہی تھوڑا سا ہوتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں بہت فاصلہ ہے، اس لیے اللہ کی رحمت کے طالب کو چاہیے کہ وہ حتی الوسع پہلی ہی صف میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جس کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہو کہ مسجد میں اول وقت پہونچ جائے ـــــ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ پہلی صف میں کھڑے ہونے کا کیا اجر و ثواب ہو اور اس پر کیا صلہ ملنے والا ہو تو لوگوں میں اس کے لیے ایسی سابقت اور کشمکش ہو کہ قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے۔

صفوں کی ترتیب :-

(۹۰) عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِصَلٰوۃِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَصَفَّ الرِّجَالَ وَصَفَّ خَلْفَهُمُ الْغِلْمَانَ ثُمَّ صَلّٰی بِهِمْ فَذَكَرَ صَلٰوتَهٗ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوۃُ اُمَّتِیْ ـــــ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت ابو مالک اشعری سے روایت ہو کہ انھوں نے لوگوں سے کہا، میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا بیان کروں؟ پھر بیان کیا کہ آپ نے نماز قائم فرمائی، پہلے آپ نے مردوں کی صف بستہ کیا، ان کے پیچھے بچوں کی صف بنائی، پھر آپ نے ان کو نماز پڑھائی۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہی طریقہ ہے میری اُمت کی نماز کا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس سے معلوم ہوا کہ صحیح اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ مردوں کی صفیں آگے ہوں، اور چھوٹے بچوں کی صفیں اُن کے پیچھے الگ ہوں۔ ـــــ اور آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں سے معلوم ہوگا کہ اگر عورتیں بھی شریک جماعت ہوں تو وہ چھوٹے بچوں سے بھی پیچھے کھڑی ہوں۔

امام کو وسط میں کھڑا ہونا چاہیے!

(۹۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

تَوَسَّطُوْا الْاِمَامَ وَسُدُّوْا الْخَلَلَ ـــــــــــ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو امام کو اپنے وسط میں لو (یعنی اس طرح صف بناؤ کہ امام تمہارے درمیان میں ہو۔ اور صفوں میں جو خلا ہو اس کو پُر کرو۔ (سنن ابی داؤد)

جب ایک یا دو مقتدی ہوں تو کس طرح کھڑے ہوں:۔

(۹۲) عَنْ جَابِرٍ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُصَلِّيَ فَجِئْتُ حَتّٰى قُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَاَخَذَ بِيَدِيْ فَاَدَارَنِيْ حَتّٰى اَقَامَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ جَاءَ جَبَّارُ بْنُ صَخْرٍ فَقَامَ عَنْ يَسَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ بِيَدَيْنَا جَمِيْعًا فَدَفَعَنَا حَتّٰى اَقَامَنَا خَلْفَهٗ ـــــــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت جابر سے روایت ہے کہ (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے، (یعنی آپ نے نماز شروع فرمائی) اتنے میں میں آگیا اور (نیت کر کے) آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا، تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے پیچھے کی جانب سے مجھے گھما کے اپنی داہنی جانب کھڑا کر لیا۔ پھر اتنے میں جبار بن صخر آ گئے وہ نیت کر کے آپ کی بائیں جانب کھڑے ہوگئے۔ تو آپ نے ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ کے پیچھے کی جانب کر دیا اور پیچھے کھڑا کر لیا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب امام کے ساتھ صرف ایک مقتدی ہو تو اس کو امام کی داہنی جانب کھڑا ہونا چاہیے۔ اور اگر وہ غلطی سے بائیں جانب کھڑا ہو جائے تو امام کو چاہیے کہ اس کو داہنی جانب کر لے اور جب کوئی دوسرا مقتدی آکر شریک ہو جائے تو امام کو آگے اور ان دونوں کو صف بنا کر پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔

صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہونے کی ممانعت:۔

(۹۳) عَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ قَالَ رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يُصَلِّيْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهٗ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُّعِيْدَ الصَّلٰوةَ ـــــــــــ

ـــــــــــ رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد۔

(ترجمہ) وابصۃ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ صف کے پیچھے اکیلا کھڑا نماز پڑھ رہا ہے تو آپ نے اس کو دوبارہ نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں چونکہ جماعت اور اجتماعیت کی شان بالکل نہیں پائی جاتی اس لیے شریعت میں یہ اس قدر مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو نماز دوبارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

(ف) اگر کوئی شخص ایسے وقت جماعت میں شریک ہو کہ آگے کی صف بالکل بھر چکی ہو اور اس کے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی دوسرا نمازی موجود نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ آگے کی صف میں سے کسی جاننے والے کو پیچھے ہٹا کے اپنے ساتھ کھڑا کر لے بشرطیکہ یہ امید ہو کہ وہ آسانی سے پیچھے ہٹ آئے گا۔ اور اگر ایسا کوئی آدمی اگلی صف میں نہ ہو تو پھر مجبوراً پیچھے اکیلا ہی کھڑا ہو جائے۔ اور اس صورت میں عند اللہ یہ شخص معذور ہوگا۔

عورتوں کو مردوں سے حتیٰ کہ بچوں سے بھی الگ پیچھے کھڑا ہونا چاہیے:۔

(۹۳) عَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلَّيْتُ اَنَا وَيَتِيْمٌ فِىْ بَيْتِنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا ـــــــــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نماز پڑھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اپنے گھر میں اور میرے ساتھ (میرے بھائی) یتیم[1] نے بھی (یعنی ہم دونوں صف بنا کر حضور کے پیچھے کھڑے ہوئے) اور ہماری والدہ اُم سلیم ہم دونوں کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت میں صرف ایک عورت بھی شریک ہو تو اس کو بھی مردوں اور بچوں سے الگ سب سے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر بالفرض آگے صف میں اس کے سگے بیٹے ہی ہوں تب بھی وہ اُن کے ساتھ کھڑی نہ ہو۔ بلکہ الگ پیچھے کھڑی ہو ــــ صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ بھی تصریح ہے کہ اُم سلیم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے پیچھے کھڑا کیا تھا۔

اوپر کی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا کس قدر ناپسندیدہ ہے لیکن عورتوں کا مردوں بلکہ کمسن لڑکوں کے ساتھ بھی کھڑا ہونا چونکہ شریعت کی نگاہ میں اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ اور خطرناک ہے اسلیے عورت اگر اکیلی ہو تو اس کو نہ صرف اجازت بلکہ حکم ہے کہ وہ اکیلی ہی صف کے پیچھے کھڑی ہو کر نماز پڑھے۔

---

[1] یتیم سے مراد حضرت انس کے ایک بھائی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لقب تھا۔

شیخ مجددؒ کے اصلاحی کارنامے

(از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ)

(۴)

اب ہم شیخ مجددؒ کے ان اصلاحی کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے اپنے عہد میں فکری اور علمی انقلاب پیدا کر کے شہرتِ دوام حاصل کی، بقول مولانا مسعود عالم ندوی:

"دین اور دینی اصلاح کا ہر شعبہ ان کی افادیت کا مرہونِ منت ہے ... شریعت اور ہندووانہ تصوف کی باہمی کشمکش بھی انہی کے ہاتھوں دور ہوئی، انھوں نے اس باطل تصوف کی اصلاح کی، اتباعِ سنت پر زور دیا، اور لوگوں کو کتاب و سنت کے چشمۂ صافی کی طرف واپس لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔"[۵۱]

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود | شیخ مجددؒ سے پہلے تمام صوفیا میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا، ابن العربی کا فلسفۂ "وحدۃ الوجود" البتہ اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے، لیکن حضرت مجددؒ نے ایک ایسا جداگانہ فلسفہ مدون کیا جو فلسفۂ "وحدۃ الوجود" کا مدمقابل ہو سکتا تھا، یہ فلسفہ "وحدۃ الشہود" تھا، جو معنوی لحاظ سے "وحدۃ الوجود" کی ضد یعنی "تثنیۃ الوجود" کا فلسفہ کہلا سکتا ہے۔"[۵۲]

شیخ مجددؒ نے "وحدۃ الشہود" فلسفہ و منطق کے بے جانی طلسمات میں نہیں پیش کیا بلکہ صوفیانہ تجربات اور مکاشفات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کی کامیابی اسی حقیقت میں مضمر ہے پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتا ہے:

---

۵۱ الفرقان: شاہ ولی اللہ نمبر، بریلی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء، ص ۵۱

۵۲ محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۲۶۰

"شیخ سرہندی کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے ہندی اسلام کو متصوفانہ انتہاپسندی سے خود تصوف کے ذریعہ نجات دلائی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس نظریہ کی انھوں نے تردید کی اس کے مطلب و مفہوم اور قدر و قیمت کا ان کو ذاتی طور پر عمیق ادراک تھا۔"[۵۱]

شیخ مجددؒ کے تصور وحدۃ الشہود کے متعلق لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصور وحدۃ الوجود کے متعلق اجمالی طور پر کچھ عرض کر دیا جائے۔

"حسین بن منصور الحلاج (م ۳۰۹ھ/۹۲۲ء) کے متصوفانہ تصورات نے اسلامی تصوف میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کے نظریات کو سامنے رکھ کر عرصۂ دراز کے بعد شیخ محی الدین ابن العربی (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) اور پھر ان کے بعد عبدالکریم جیلی نے اپنے متصوفانہ اصول منضبط کیے۔"[۵۲]

شیخ محی الدین ابن العربی اندلس میں بمقام مرسیہ پیدا ہوئے اور ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء میں دمشق میں وفات پائی۔ ان کی بکثرت تصانیف ہیں، جن میں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم زیادہ مشہور ہیں۔ نظریۂ وحدۃ الوجود موصوف نے پیش کیا تھا جو بعد میں پورے عالم اسلام پر چھا گیا۔

پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) نے اس نظریہ کی یہ اجمالی تعریف کی ہے:

"وجود ایک ہے، وہی اللہ ہے، ہر شے اسی کا مصدر یا مظہر ہے۔ خدا نہ ورا والورا ہے اور نہ محیط کل، وہ سب کچھ ہے۔ تخلیق تو صرف خدا کی خود کو ظاہر کر کے جاننے کی خواہش ہے۔ سلوک کے آخری مقام "فنا" پر سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہی ہے، اور ذات و صفات خدا (سالکین راہ طریقت) ایک ہیں۔"[۵۳]

شیخ محی الدین ابن العربی اسی نظریہ کے تحت لکھتے ہیں:۔

"انسان مثال خدا ہے اور خدا روح انسان، خدا انسان ہی کی مدد سے ... مظاہر موجودات عالم کا مشاہدہ کرتا ہے ... صفات سے بھی انسان خدا کو متصف کرتا ہے، وہ خود ان صفات کا مصدر ہے۔ ... انسان خدا کا تصور کرتا ہے تو وہ اپنا ... [illegible] ... اور جب خدا انسان کا تصور کرتا ہو تو گویا وہ ... اپنا ہی ... کرتا ہے۔"[۵۴]

---

۵۱ Wm. Theodre de Bary Sources of Indian Tradition, New York, 1959, P 448.
۵۲ ڈاکٹر ... اسلامی افکار ترجمہ راقم ص ...
۵۳ Wm Theodre de Bary Sources of Indian Tradition, New York, P- 448.
۵۴ محی الدین ابن العربی = ترجمان الاشواق۔

ابن العربی کا نظریہ تھا کہ فنا فی اللہ ہونے کے بعد ہی ذات الٰہی کا صحیح تحقق ہوتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کی برہانی اور فکری قوت سلب ہوجاتی ہے، غایت حیرت ہی انتہائے معرفت ہے، یہاں انسان خود کو غیر خدا نہیں بلکہ عین خدا سمجھتا ہے۔ کیونکہ صفات عین ذات خدا ہیں۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وجود صرف ایک ہی ہے۔

نظریۂ وحدۃ الوجود سے بظاہر یہ علمی استخراج کیا گیا کہ جب پوری کائنات غیر خدا نہیں بلکہ عین خدا ہے، تو پھر خدا کی عبادت ہر صورت سے کی جاسکتی ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مذاہب عالم کے درمیان مفاہمت مساوات نہ ہوسکے، چنانچہ خود ابن العربی لکھتے ہیں:۔

"ہر شخص اسی خدا کی تعریف کرتا ہے جو اپنی صورت میں اس کے سامنے ہو اور جس سے اس نے خود کو وابستہ کر رکھا ہے (اگر حقیقت یہ ہے) کہ اس کا خدا خود اس کی تخلیق ہے۔ جب وہ خدا کی تعریف کرتا ہے، تو گویا خود اپنی ہی تعریف کرتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کے عقائد پر حرف زنی کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ منصف مزاج ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا۔ اس کی ناپسندیدگی اس کے جہل کی وجہ سے ہو۔ اگر اس کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول یاد ہوتا کہ "پانی جس برتن میں ہوتا ہے اسی برتن کا رنگ اختیار کرتا ہے" تو وہ دوسروں کے عقائد میں دخل نہ دیتا، بلکہ ہر صورت اور ہر عقیدے میں اس کو خدا ہی کا جلوہ نظر آتا۔"[۱]

اسی نظریہ کے تحت ابن العربی عقیدہ "صلح کل" کے مؤید ہیں، وہ کہتے ہیں:۔

"میرے دل میں ہر کسی کی سمائی ہے، وہ راہب کا گرجا، بتوں کا مندر، غزالوں کا مرغزار، اور عابدوں کا کعبہ ہو۔ تورات بھی یہی ہے اور قرآن بھی یہی ہے، میرا مسلک تو مسلکِ عشق ہے۔"[۲]

شیخ محی الدین ابن العربی کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد عبدالکریم جیلی کا زمانہ آتا ہے، یہ بھی نظریۂ وحدۃ الوجود کے مؤید تھے۔ ان کا نظریہ یہ ہے:۔

---

[۱] ابن العربی: فصوص الحکم، Rom Landau: The Philosophy of Ibn Arabi, London, 1959, P. 74-5 Nicholson: Studies In Islamic Mysticism, [۲] S.T. Arnold etc: The Legacy of Islam. London, 1962, P. 226.

"تمام مذاہب کے معتقدات گو بظاہر مختلف نظر آتے ہیں، لیکن اصل میں ایک ہی حقیقت سے وابستہ ہیں، عبادت کسی طرح بھی کی جائے اسی واحد مطلق کی کسی نہ کسی صفت کی آئینہ دار ہے۔ اور آپس میں جو اختلافات نظر آتے ہیں وہ محض اسماء و صفات کی بوقلمونی کی وجہ سے ہیں، فی الحقیقت یہ اختلافات ایک "کل" کی تکمیل میں معاونین کی حیثیت رکھتے ہیں۔"[۹]

بہر حال نظریۂ وحدۃ الوجود رفتہ رفتہ ہندوستان میں بھی پھیل گیا، بارھویں صدی عیسوی کے اواخر اور پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہندوستان میں عراق و ایران سے تین بڑے سلسلے آئے، چشتی، سہروردی اور فردوسی، اس کے بعد مغل دورِ حکومت میں ایران سے چند اور نئے سلسلے شطاری، قادری اور نقشبندی آئے۔ ان سلاسل میں شطاری اور قادری تصورِ وحدۃ الوجود سے بہت متاثر تھے، ان کے شیوخ کے اثر و نفوذ سے یہ نظریہ دوسرے سلسلوں میں بھی پھیل گیا، حتیٰ کہ مشائخ طریقۂ نقشبندیہ بھی اس کے مؤید ہوگئے، خود شیخ مجددؒ بھی ابتدا میں اس تصور سے بہت متاثر تھے، ان کے والد بزرگوار اور شیخ طریقت کا بھی یہی مسلک تھا۔

چنانچہ شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) درّ المعرفت کے مکتوب ۲۹۰ میں جو شیخ صوفی کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والد ماجد حضرت شیخ عبد الاحد (م ۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء) کا بظاہر یہی مشرب تھا۔ جس زمانے میں شیخ مجددؒ مسلک "توحید وجودی" کے مؤید تھے، ایک مکتوب اپنے شیخ طریقت خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کو تحریر فرمایا تھا۔ اس میں یہ رباعی بھی تھی:

اے دریغا کیں شریعت ملتِ اعمائی است | ملتِ ما کافری و ملتِ ترسائی است
کفر و ایماں زلف و روئے آں پری زیبائی است | کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

یہ کیفیت کئی سال تک رہی تا آنکہ:

"اچانک اللہ کی عنایت بے غایت پردۂ غیب سے ظاہر ہوئی اور یکونی و بیچگونی کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ علوم سابق جو اتحاد و وحدت کی خبر دیتے تھے، تنزل پذیر ہونے لگے۔ اور قرب و معیت ذاتیہ اور احاطہ و سریان جو اس مقام پر ظاہر ہوا تھا، مخفی ہو گیا۔ اور یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو گئی کہ صانع کو اس عالم سے مذکورہ نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی نہیں ہے .... اور اگرچہ عالم مرایائے کمالاتِ

---

[۹] ڈاکٹر تارا چند: تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ترجمہ راقم ص ۹۷

صفاتی اور مجالی ظہورات آسمانی ہے لیکن مظہر عین ظاہر نہیں ہے، اور ظل عین اصل نہیں ہے، جیسا کہ اہل توحید وجودی کا مذہب ہے۔" (مکتوبات امام ربانی: دفتر دوم ص ۴۰۳، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۲ھ)

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) بھی ابتدا میں توحید وجودی کے قائل تھے لیکن بعد میں ایک بلند منزل کی طرف صعود فرمایا، شیخ مجددؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"معرفت پناہی، قبلہ گاہی حضرت خواجہ قدس اللہ سرہ کچھ عرصہ تک مشرب توحید وجودی پر قائم اور اپنے رسائل و مکتوبات میں اس کا اظہار بھی فرماتے رہے لیکن آخر کار حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کمال عنایت سے اس مقام سے ترقی عطا فرمائی اور شاہ راہ پر گامزن کر دیا۔ اور معرفت کو اس تنگی سے نجات دی، میاں عبد الحق (محدث دہلوی) جو ان کے مخلصوں میں ہیں بیان کرتے تھے کہ (خواجہ محمد باقی باللہؒ) نے مرض موت سے ایک ہفتہ قبل فرمایا تھا: "مجھے عین الیقین ہو گیا ہو کہ توحید ایک تنگ کوچہ ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری شاہ راہ بھی ہے جس کو میں پہلے بھی جانتا تھا، مگر اب اس کا یقین حاصل ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد شیخ مجددؒ اپنے مسلک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ حقیر بھی کچھ عرصہ تک حضرت کی خدمت میں یہی مسلک توحید رکھتا تھا، اور اس طریق کی تائید میں بہت سے مقامات کشفیہ بھی ظاہر ہو گئے تھے، مگر خداوند تعالیٰ کی عنایت نے اس مقام سے آگے بڑھا کر جس مقام سے چاہا مشرف فرمایا۔"[۵۱]

احسان اللہ عباسی نے لکھا ہے:۔ "حضرت مجددؒ کی توجہ نے حضرت خواجہ باقی باللہ کو بھی توحید وجودی سے توحید شہودی تک پہونچایا۔"[۵۲]

اسی طرح ڈاکٹر برہان الدین فاروقی نے بھی زبدۃ المقامات کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"خواجہ باقی باللہ نے خود تسلیم کیا ہے کہ میں شیخ احمد کے فیض روحانی کی بدولت وحدت وجود کے کوچہ تنگ سے نکلا ہوں۔"[۵۳]

شیخ مجددؒ کی جو تحریر اوپر نقل کی گئی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ محمد باقی باللہ خود ہی توحید وجودی

---

۵۱ محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۲۲۱ ۵۲ احسان اللہ عباسی: مجدد الف ثانی، مطبوعہ رام پور ۱۹۲۶ء ص ۹۷۔
۵۳ برہان الدین فاروقی: تصور توحید، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۰ء ص ۲۹۷

کے تنگ کوچہ سے نکلے ہیں۔ زبدۃ المقامات میں راقم کی نظر سے کوئی ایسی عبارت نہیں گزری جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس سلسلے میں شیخ مجددؒ نے اپنے شیخ طریقت کی رہنمائی فرمائی، متاخر سیرت نگاروں نے اس قسم کی عقیدتمندانہ باتیں لکھی ہیں جو ایک محقق کے درخور اعتنا نہیں، مثلاً صاحب روضۃ القیومیہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے:۔

"انھوں نے (شیخ مجددؒ) جلد مدارج سلوک کو تمام کرلیا اور اتنی ترقی کی کہ خواجہ باقی باللہؒ مریدوں کی طرح آپ کے حلقہ میں بیٹھنے لگے۔"[۵۱]

اگر شیخ مجددؒ اس دنیا میں تشریف رکھتے تو خود اس قسم کی تحریروں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے، اہل نظر کو معلوم ہو کہ خواجہ باقی باللہؒ کے شیخ مجددؒ پہ کتنے احسانات ہیں، ان احسانات کو یکسر فراموش کردینا مستحسن نہیں اور سوانحی دیانتداری کے سراسر خلاف ہے۔

بہرحال شیخ مجددؒ، توحید وجودی کے کوچۂ تنگ سے نکل کر جس راہ پر گامزن ہوئے وہ توحید شہودی کی شاہ راہ تھی، شیخ فرید بخاری کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا ہو اس میں توحید وجودی اور توحید شہودی کے فرق کو اس طرح اجمالاً بیان فرمایا ہے:۔

"جو توحید اس جماعت گرامی کی راہ میں آتی ہے، دو قسم کی ہے، توحید شہودی اور توحید وجودی۔ توحید شہودی" ایک دیکھنا ہے" یعنی یہ کہ سالک کا مشہود سوائے ایک کے اور کوئی نہ ہو، اور توحید وجودی "ایک موجود جاننا ہے"۔ اور اس کے غیر کو معدوم سمجھنا" اور باوجود عدمیت کے اس کے مجالی و مظاہر کو ایک خیال کرنا، پس توحید وجودی" علم الیقین" کے قبیل سے ہے اور توحید شہودی عین الیقین کی قسم سے۔"[۵۲]

نظریۂ توحید وجودی کے اثر سے" تصوف" میں جو غلط خیالات پیدا ہوگئے تھے، شیخ مجددؒ نے ان کی اصلاح فرمائی، اور شیخ محی الدین ابن العربی کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی، بقول پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) آپ نے فرمایا:۔

"محی الدین ابن العربی اور ان کے مکتب فکر نے سلوک کی صرف ایک منزل یا حال" فنا" کے متعلق کہا ہے، یہ کوئی آخری منزل نہیں ہے، مقام" فنا" پر جاکر سالک خود فراموش ہوجاتا ہے اور

---

۵۱ خواجہ کمال الدین: روضۃ القیومیہ، رکن اول، ص ۱۱۳ ۵۲ مکتوبات امام ربانی دفتر اول، حصہ دوم مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ مکتوب ۴۳، ص ۶

ذاتِ باری میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ غیر اللہ کا اس کو احساس تک نہیں رہتا۔"

واقعہ یہ ہے کہ ابن العربی داخلی اور خارجی میں تمیز نہیں کر سکے۔ حالانکہ اس مقام پر بھی ان کو اہلِ دنیا کا ضرور احساس رہنا چاہیے تھا تاکہ وہ خالق و مخلوق میں تمیز کر سکیں ورنہ ان کی گفتگو صرف خدا ہی کے بارے میں ہوگی۔"

"شیخ احمد فرماتے ہیں کہ منزل "فنا" سے اوپر بھی ایک اور منزل ہے، جہاں ابن العربی نہیں پہنچے۔ اس منزل پر سالک کو یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا کو محض وجدان کے ذریعہ نہیں پہچانا جا سکتا۔ .... اس لیے انسان کو وحی اور علوم دینیہ کی قدر و منزلت کرنی چاہیے۔ جن کی بنیاد تمام تر وحی پر ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ شریعت کی قدر و منزلت کرنی چاہیے۔ شیخ احمد پرزور طریقہ پر کہتے ہیں:۔

"دنیا اور خدا میں وہی رشتہ ہے جو خالق و مخلوق میں ہوتا ہے۔ اتحاد و حلول کی تمام تقریریں الحاد ہیں، جو سالک کی باطنی غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہیں۔"

شیخ احمد نے اپنے نظریات کی اشاعت مکتوبات کے ذریعہ کی ہے جو انھوں نے اپنے مریدین اور دوسرے لوگوں کو لکھے ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۵۳۰ ہے اور مذہبی لٹریچر میں ان کی حیثیت "ادبِ عالیہ" کی ہے۔[۵۱]"

شیخ مجددؒ نے نظریۂ وحدۃ الشہود اس طرح نہیں پیش کیا ہے کہ اس میں اکابر صوفیہ کے نظریہ کی تردید اور اس پر نکیر کی ہو بلکہ انھوں نے اربابِ توحید وجودی کے تصورات اور مکاشفات کی بڑی خوبی کے ساتھ تاویل فرمائی ہے، اس طرح ان بزرگوں کو مخالفانہ خردہ گیری سے بچا لیا ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ علمائے ظاہر میں سے کسی نے کہا ہو کہ یہ مسئلہ باطل ہے، لیکن ان حضرات (اربابِ توحید وجودی) نے تو پوری جلالیت کے ساتھ کہا ہے اور لکھا ہے۔ ان بزرگوں کے معاملے میں باطل کا کیا دخل؟ اس مقام کا بطلان بھی نہیں کیا جا سکتا، جس مقام پر کہ ان حضرات نے اس عالی شان مسئلہ کے متعلق کہا ہے، وہاں تو استیلائے حق ہے اور بطلان باطل، ان بزرگوں نے تو حق تعالیٰ کے عشق میں

---

[۵۱] Wm. Theodre de Bary: Sources of Indian Tradition, New York, 1959, P. 449)

خود کو اور غیر خود کو کھو دیا ہے، اپنا نام و نشان بھی نہیں چھوڑا، قریب ہے کہ باطل بھی ان کے سایہ سے گریزاں ہو۔[۱]"

اسی طرح ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"...... متصوفہ گرامی میں سے جو کوئی وحدۃ الوجود کا قائل ہے اور اشیاء کو عین حق دیکھتا ہے، اور ہمہ اوست کا حکم دیتا ہے، اس کا مقصود یہ نہیں ہو کہ اشیاء اور حق جل و علا متحد ہو گئے ہیں۔ تنزیہہ سے تنزل کر کے تشبیہ پر آ گئے ہیں۔ واجب، ممکن اور بے مثال، مثال ہو گیا ہے۔ یہ سب باتیں کفر و بے دینی اور گمراہی و زندقہ ہیں .... بلکہ ہمہ اوست کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خود نہیں ہیں، صرف اللہ تعالیٰ موجود ہے۔[۲]"

حسین بن منصور الحلاج (م ۳۰۹ھ / ۹۲۲ء) کے قول "انا الحق" اور حضرت بایزید بسطامی کے قول "سبحانی ما اعظم شانی" کی تاویل کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو غلبۂ حال کی وجہ سے یہ احکام دیتے ہیں، مگر ایسا غلبۂ محبت اور استیلائے عشق محبوب کی وجہ سے ہوتا ہے کہ سب کی نظر میں غیر محبوب اوجھل ہو جاتا ہو اور وہ سوائے محبوب کے کچھ نہیں دیکھتا نہ کہ حقیقت ہے کہ محبوب کے ماسوا کوئی چیز موجود ہی نہیں ہو کیونکہ یہ چیز عقل اور شریعت دونوں کے مخالف ہے۔[۳]"

لیکن توحید وجودی سے صوفیائے خام نے جو مطلب لیا ہے، شیخ مجددؒ نے اس کی پرزور تردید کی، چنانچہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"ممکن کو عین واجب کہنا اور اس کی صفات و افعال کو واجب تعالیٰ کے صفات و افعال کے عین قرار دینا، بے ادبی ہو اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں کجروی اور بے دینی ہے۔[۴]"

ایک اور مقام پر نہایت زوردار الفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں :۔

"پس عالم کے ساتھ اس کو کسی طرح بھی نسبت نہیں ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ عالمین سے

---

[۱] محمد اکرام : رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۲۰۵ [۲] نور الخلائق : مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ مکتوب ۲۴۴
[۳] در المعرفت : مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ مکتوب ۲۱۲ [۴] محمد اکرام ۔ رود کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۲۶۷ ۔ (رود کوثر کے اصل اقتباس میں ترجمہ کی کچھ غلطیاں تھیں اس لئے اس اقتباس میں تصرف کیا گیا ہے ۔ الفرقان)

بے نیاز ہے، اللہ سبحانہ کو عالم کے ساتھ عین اور متحد بتانا بلکہ اس سے نسبت دینا بھی فقیر پر بہت گراں ہے۔"[۱۵]

شیخ مجددؒ پر یہ بھی گراں تھا کہ رام اور رحمان کو ایک ہی حقیقت سے وابستہ کر دیا جائے ہندوؤں میں تو یہ خیال تھا ہی مسلمان بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان میں صرف نام کا فرق ہے، مگر حقیقت ایک ہے، اس تصور میں بھی توحید وجودی سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو بڑا دخل تھا چنانچہ شیخ مجددؒ نے ہردے رام نامی ایک ہندو کو جو مکتوب لکھا ہے اس میں صاف صاف فرمایا ہے کہ رحمان سے رام کو کوئی نسبت بھی نہیں، سرنامہ یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم　　تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

اس کے بعد نفس مطلب کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

"جان اور آگاہ رہ کہ ہمارا اور تمہارا پروردگار بلکہ تمام اہل دنیا کا پالنہار، کیا آسمان والے اور کیا زمین والے، کیا عالم بالا والے اور کیا عالم اسفل والے، سب کا پروردگار ایک ہے، بیچون و بیچگون تشبیہ و مثال سے پاک ہے اور شکل و صورت سے منزہ ہے، حق تعالیٰ سبحانہ کے حق میں پدری اور فرزندی محال ہے، مثال و ہمسری کو اس جناب میں کیا مجال ہے، اس کی شان میں اتحاد و حلول کردہ ہے اور کون و مکان کا گمان بلا ہے۔ کوئی زمانہ نہیں جو اس کا محیط نہ ہو، کوئی مکان نہیں جو اس کا بنایا ہوا نہ ہو، نہ اس کے وجود کی ابتدا ہے اور نہ اس کی زندگی کی انتہا جس چیز کا تعلق نیکی اور کمال سے ہے وہ اس تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہے، اور جس چیز کا تعلق نقص و زوال سے ہے وہ اس تعالیٰ سے مسلوب ہے، پس مستحق عبادت وہی تعالیٰ ہے اور لائق پرستش بھی وہی ہے، رام اور کرشن اور اسی قسم کے ہندوؤں کے جو اوتار ہیں اس کی ادنیٰ ترین مخلوقات میں سے ہیں۔"[۱۶]

مذکورہ بالا مکتوب میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"رام جسرتھ کا بیٹا اور لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے، جب رام اپنی بیوی پر نگاہ نہ رکھ سکا تو دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے، عقل دور اندیش سے کام لینا چاہیے اور ان کی تقلید

---

[۱۵] محمد اکرام: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۰۔ [۱۶] درالمعرفت، مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ، ص ۱۰۵۔ حصہ سوم مکتوب ۱۶۷

نہ چلنا چاہیے، بڑے عار کی بات کی ہے کہ کوئی تمام جہانوں کے پروردگار کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کرے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عظیم الشان بادشاہ کو ادنیٰ خاک روب کے نام سے یاد کرے۔ رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بیوقوفی ہے۔ خالق، مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا اور بےچون، چون کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔"

غرض شیخ مجددؒ نے نظریۂ توحید شہودی پیش کر کے خالق و مخلوق کے اتحاد و حلول کے تصور کی پوری بیخ کنی کی جو تمام بدعات کی جڑ تھا، اور ان دونوں کے فرق کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، اور توحید وجودی سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کیا، اور بتایا کہ مقام وجودیت سے بڑھ کر مقام ظلیت اور پھر سب سے اعلیٰ و ارفع مقام عبدیت ہے۔

شیخ مجددؒ کے بعد جو بزرگ پیدا ہوئے اُن میں سے بعض نے آپ کے نظریہ سے اتفاق نہیں کیا اور توحید شہودی کو تسامح پر مبنی قرار دیا، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) تحریر فرماتے ہیں:۔

"شیخ مجددؒ کا یہ سمجھنا کہ وحدت وجود اور وحدت شہود میں تباین ہے، فقط تسامح ہے۔ ابن عربی کا مذہب بھی وہی ہے جو شیخ مجددؒ کا، وحدت وجود اور وحدت شہود میں محض نزاع لفظی ہے۔[1]"

ایک اور مقام پر ان دونوں نظریات کو اس طرح ایک ثابت کیا ہے:۔

"وحدت شہود سے مراد صرف یہ ہے کہ واجب کے کامل ہونے پر اور ممکن کے ناقص اور ہیچ ہونے پر اصرار کیا جائے، لیکن ابن عربی بھی یہی کہتے ہیں کہ ممکن ناقص اور ہیچ ہے اور کمال فقط ذات واجب ہی کو حاصل ہے۔[2]"

شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء) کا مسلک بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"وحدت وجود اُصولی مسئلہ ہے، یہی حقیقت اسلام ہے، اسی لیے اکابر صوفیا نے اس کو اختیار کیا ہے۔ وحدت شہود نیا نظریہ ہے، جسے شیخ مجددؒ نے بیان کیا ہے، وہ ابن عربی کی تقریر کو نہیں سمجھے اور یہ خیال کیا، وحدت وجود وحدت شہود سے کلیۃً مختلف ہے۔[3]"

[1] شاہ ولی اللہ: فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود، ص ۲۹، بحوالہ برہان الدین فاروقی، تصور توحید، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۰ء۔
[2] ایضاً ص۔، [3] شاہ رفیع الدین: دمغ الباطل ص ۳-۵، بحوالہ مذکور۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے مولوی اسمٰعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا بھی یہی مسلک ہے[۱]۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جس نے شیخ مجددؒ کے تصور توحید شہودی کی تائید کی ہے۔ خواجہ میر ناصر عندلیب تحریر فرماتے ہیں :-

> "حقیقت کے اعتبار سے وحدت وجود سراسر غلط ہے اور وحدت شہود قرین صواب ہے گو کیفیت و حال کے اعتبار سے دونوں کا منشا ایک ہی کیوں نہ ہو، یعنی ماسوائے نظر کا ہٹ جانا۔"[۲]

ان کے صاحبزادے خواجہ میر درد (م ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء) نے بھی توحید شہودی کی پرزور تائید کی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں :-

> "دوسرا مسئلہ وحدت شہود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذات واجب کے بغیر موجودات ممکنہ کا وجود نہیں ہو سکتا، اور جملہ موجودات اسی ایک ذات کے نور سے موجود ہیں، اکثر ناواقف جو شیخ مجددؒ کے کلام کی حقیقت کو نہیں سمجھے اپنے گمان میں انھیں ظل کا قائل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ رائے محض وسط سلوک میں تھی، اکثر صوفیائے خام و ناتمام جو اپنے زعم میں اپنے آپ کو عارف کامل سمجھتے ہیں، شیخ مجددؒ کی تصانیف کو دیکھ کر جن میں "اثنینیت اور ہمہ از وست" کا بیان ہے، خیال کرتے ہیں کہ وہ حقیقت سے ناواقف تھے، کیونکہ مسئلہ توحید بہت مشکل ہے، اس لیے وہ ان پر پوری طرح منکشف نہیں ہوا تھا، مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ "کل من عند اللہ" کے مطابق ہمہ از وست" کی تصدیق وحی سے ہوتی ہے، اس لیے ہمہ اوست غلط ہے اور ہمہ از وست صحیح ہے۔"[۳]

حضرت مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء) بھی مسلک توحید شہودی کے قائل تھے، ان کے ایما پر مولانا غلام یحییٰ (م ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء) نے شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کی تردید اور شیخ مجددؒ کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

> "شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ وحدۃ الوجود اور وحدت الشہود، حقیقت اشیاء اور حادث و قدیم کے مابین ربط کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے، سراسر غلط ہے، ان دونوں مسلکوں کے درمیان کوئی تطابق کسی طرح ممکن ہی نہیں کیونکہ

---

[۱] عبقات ص ۶ و ۱۰۷ [۲] نالۂ عندلیب ص ۲۰۶ بحوالہ جلال الدین جاجی ذکی [۳] خواجہ میر درد : علم الکتاب ص ۴۴۰، بحوالۂ مذکور

وحدت وجود کی بنا عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے اور وحدت شہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریت تامہ ہے[..]"

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی (م ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء) بھی ان دونوں نظریات کی تطبیق کو تسلیم نہیں کرتے، وہ لکھتے ہیں:-

"وحدت وجود اور وحدت شہود کشف کے دو جدا جدا مقام ہیں، جو اہل سلوک ان مقامات سے گذرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی تطبیق محال ہے[..]"

"تاہم اس میں شک نہیں کہ شیخ مجددؒ کے نظریۂ توحید شہودی نے اسلامی ہندی تصوف سے عجمی اثرات کو بڑی حد تک زائل کر کے ایک نیا اسلامی فکر عطا کیا، عہد جدید کے اکثر فضلا نے اس کی تعریف کی ہے، چنانچہ لندن یونیورسٹی کے فاضل پیٹر ہارڈی لکھتے ہیں:-

"بہرکیف اکبر اور متصوفہ کی مذہبی بے راہ روی کے جواب میں جو شخصیت رد عمل کے طور پر میدان عمل میں آئی وہ شیخ احمد سرہندیؒ (۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء) کی ممتاز شخصیت تھی، موصوف نے ابن العربی کے نظریۂ توحید وجودی پر صوفیانہ مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں بحث کی اور مسلمانوں کو اس چیز کا از سر نو احساس دلایا کہ مذہب اسلام میں وحی الٰہی کا ایک بلند مقام ہے[..]"

علامہ اقبال نے اپنے لکچروں میں شیخ مجددؒ کے نظریۂ وحدۃ الشہود کو سراہا ہے، فرماتے ہیں:-

"سترھویں صدی کا ایک گراں قدر مفکر ..... شیخ احمد سرہندی ..... جن کی ہم عصر تصوف پر بیباکانہ تشریحی تنقید ایک نئی تکنیک کی ترقی پر منتج ہوئی، متصوفہ کے جو مختلف طریقے شمالی ایشیا اور عرب سے ہندوستان آئے ان میں صرف موصوف کی وہ تکنیک ہے جس نے ہندوستانی سرحد کو عبور کیا اور آج بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک زندہ قوت ہے[۲۵]"

[..] غلام یحییٰ: کلمۃ الحق ص ۲۲، بحوالہ مذکور ص ۱۲۲ [..] شاہ غلام علی: مقالات مظہری: ص ۱۱، بحوالہ مذکور ص ۱۲۲

[..] Wm. Theodre de Bary: Sources of Indian Traditon. New York. 1959, P 437

[..] Dr. Mohd. Iqbal: Construction of Religious Tiought in Islam Lahore, 1944, P. 192

شریعت و طریقت | متصوفہ میں ایک غلط خیال یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ شریعت و طریقت دو جداگانہ حقیقتیں ہیں۔ اس میں کچھ تصور توحید وجودی سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو بھی دخل تھا اس لیے شیخ مجددؒ نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ اس فاحش غلطی کا بھی ازالہ کیا، اور یہ واضح کیا کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ سید احمد قادری کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"شریعت و طریقت ایک دوسرے کے عین ہیں، حقیقت میں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں۔ ان میں صرف اجمال و تفصیل، استدلال و کشف و غیبت و شہادت اور تعمل اور عدم تعمل کا فرق ہے۔ وہ احکام و علوم جو شریعت غرا کی روشنی میں ظاہر اور معلوم ہو گئے ہیں، حقیقت حق الیقین کے تحقق کے بعد یہی احکام و علوم بعینہا مفصل طور پر منکشف ہوتے ہیں، غیبت سے شہادت میں آتے ہیں۔ اور وہ حصول اور فریب عمل درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور حقیقت حق الیقین تک پہونچنے کی علامت یہ ہے کہ علوم و معارف شرعیہ سے اس مقام کے علوم و معارف مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر دونوں میں بال برابر بھی فرق ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ "حقیقت الحقائق" تک ابھی رسائی نہیں ہوئی اس کے برخلاف مشائخ طریقت میں سے جس کسی سے بھی کوئی علم و عمل مخالف شریعت ظہور پذیر ہوا ہے وہ حالت سکر پر مبنی ہے اور سکر صرف اثنائے راہ میں ہوتا ہے۔ منتہیان نہایۃ النہایۃ کو تو صحو ہی صحو ہے۔"[1]

ملا حاجی احمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"........ پس شریعت تمام دینی اور دنیوی سعادات کی متکفل ہوئی اور کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جس کی ضرورت شریعت کے مقابلے میں پڑے، جزو ثالث یعنی اخلاص کی تکمیل کے لیے طریقت و حقیقت ہے جس سے متصوفہ ممتاز ہوئے ہیں اور جو شریعت کی خادم ہے، پس ان دونوں کے حاصل کرنے کا مقصد تکمیل شریعت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"[2] (ص ۸ - ۹۷)

ایک مکتوب میں شیخ محمد یوسف کو اس طرح تلقین فرماتے ہیں:۔

"اس طرح سے زندگی گزاریں کہ انبیاء کی وراثت کے حقدار ہو جائیں، اپنے ظاہر کو ظاہر شریعت سے اور باطن کو باطن شریعت سے جو حقیقت سے عبارت ہے آراستہ و پیراستہ کریں، کیونکہ حقیقت و

---

[1] درالمعرفت، حصہ دوم، مطبوعہ امرت سر ۱۳۳۲ھ، مکتوب نمبر ۴۰، ص ۸۰، [2] ایضاً حصہ اول، مکتوب ۳۶

طریقت حقیقت شریعت اور اسی حقیقت کی طریقت سے عبارت ہیں، نہ کہ شریعت دوسری چیز ہے
اور طریقت وحقیقت دوسری چیزیں، یہ تو الحاد و زندقہ ہے۔"[۵۱]

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"شریعت کے تین حصے ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص، جب تک یہ تینوں چیزیں متحقق نہیں ہو جائیں شریعت متحقق نہیں ہو سکتی۔ اور جب شریعت متحقق ہو گئی تو پھر حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی رضا حاصل ہو گئی جو تمام دینی و دنیوی سعادات سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ورضوان من اللہ اکبر"[۵۲] (باقی)

---

[۵۱] درالمعرفت، حصۂ دوم، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۲ھ، مکتوب ۲۵، ص ۲۰۔ [۵۲] نور وخلائق، مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ ص ۹۔

زیارتِ حرمین

نقوش و تاثرات

(مولانا نسیم احمد فریدی)

۱۹؍اپریل (شنبہ) ـــــ آج کتب خانۂ شیخ الاسلام (ترکی) جاکر دیکھا، یہ کتب خانہ مسجد نبوی سے متصل ہے، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا مکان اسی جگہ تھا۔ اس کے قریب ہی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ منورہ سے تشریف لاکر سب سے پہلے قیام فرمایا تھا ـــــ کتب خانے کے نائب ناظم عبدالوہاب صاحب سے فہرستیں طلب کیں، ایک عام فہرست اور ایک مخطوطات کی لاکردی، اول الذکر کو ازاول تا آخر دیکھ لیا۔ دوسری دیکھ ہی رہا تھا کہ اذان ظہر ہوگئی۔ نماز کے لیے مسجد نبوی چلا گیا، معلوم ہوا تھا کہ ظہر کے بعد کتب خانہ نہیں کھلتا ـــــ

شب یکشنبہ کو مولانا حکیم محمد احسن صاحب نے ایک مدنی مقرر کی تقریر مصریوں کے مجمع میں لے جاکر سنوائی۔ یہ مقرر روزانہ بعد مغرب مسجد نبوی میں تقریر کرتے ہیں، حکیم صاحب قریب قریب روزانہ ہی ان کی تقریر سنتے رہے۔ واقعی ان کی تقریر شنیدنی تھی۔ فصاحت و بلاغت سے لبریز، ایسی رواں جیسے دریا موجیں مار رہا ہو، پراثر اور پُراز معلومات ـــــ موقع موقع سے آیاتِ قرآن اور احادیثِ نبویہ کی شمولیت سے تقریر کی تاثیر میں اضافہ ہوجاتا تھا ـــــ یہ مقرر مدینۂ منورہ کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔

۲۰؍اپریل (یکشنبہ)۔ حضرت مولانا بدر عالم محدث میرٹھی (مہاجر مدینہ) کے یہاں احقر، مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولوی منظور احمد صاحب مظاہری حاضر ہوئے ـــــ انھوں نے رفع نزول مسیح علیہ السلام پر لیٹے لیٹے تقریر فرمائی۔ بڑی جامع اور مدلل تقریر تھی، دورانِ تقریر میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ملاقات کے لیے

اخباروں میں خصوصاً زمیندار میں برابر دیکھتا رہتا تھا۔ زمیندار اُن کا مخالف تھا اس کے مطالعہ سے ان کی جو تصویر ذہن میں قائم ہو گئی تھی وہ اب تک موجود تھی۔ انھوں نے دوسری ملاقات میں خود ہی فرمایا کہ ہمارا خاندان حضرت "شور بازار" کے نام سے افغانستان میں مشہور ہے۔ اخبار والوں نے ہم کو "ملّا شور بازار کر دیا ـــــ سلطان امان اللہ خاں سے اپنے اور اپنے بھائی نور المشائخ مرحوم کے اختلاف کی وجہ بھی بتائی جو بظاہر دینی و مذہبی تھی ـــــ اپنا شجرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ تک لکھوایا ـــــ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا ذکر بھی آیا جو الفرقان میں شائع ہو رہے ہیں۔ مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کا عربی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے اس کا ذکر بھی فرمایا۔ کچھ دیر کے بعد اُن سے رخصت ہوئے، دوبارہ ملاقات کے لیے فرمایا۔

۵ مئی (جمعہ) ـــــ ہندوستان سے مصر گئی ہوئی تبلیغی جماعت مدینہ منورہ آ گئی ہے، ڈاکٹر سعید صاحب مصری اس کے ہمراہ ہیں۔ اب تک بعض مصری واعظ انفرادی حیثیت سے تقریر کرتے تھے، اب ڈاکٹر سعید کی آمد سے مصریوں کی محفل کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا ہے، بڑے جوشیلے، بڑے جذبے والے ہیں۔ اتباعِ سنت کا ذوق اندرون انکے چہرے سے نمایاں ہے۔ مولانا ضیاء الدین صاحب بجنوری، حاجی عزیز الرحمن دہلوی، حاجی سعید صاحب مرادآبادی۔ اور دیگر اشخاص کی ایک جماعت مصر گئی تھی، ڈاکٹر صاحب کا حج و زیارت کے لیے آنا اور تبلیغی جدوجہد کرنا اسی جماعت کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

۷ مئی (اتوار) ـــــ مولانا عبد الملک مرادآبادی کے ہمراہ شیخ محمد صادق مجددی سے ملنے دوبارہ گیا۔ انھوں نے دیوان عبد الباقی مجددیؒ اور ایک کتاب شاہ غلام محمد صدیق مجددیؒ کی مرتب کی ہوئی (جس میں اُن کے مورثِ اعلیٰ شاہ عبد الباقی کے ملفوظات بھی تھے، اور چند قلمی رسائل حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جو غالباً شائع ہو چکے ہیں) دکھائے ـــــ ان کے بھائی نور المشائخ مجددی مرحوم کا کتب خانہ پشاور میں ہے اس میں کثیر تعداد میں اس سلسلے کی کتابیں موجود ہیں، جیسا کہ انھوں نے دورانِ گفتگو میں فرمایا ـــــ میں نے ترجمۂ مکتوبات خواجہ محمد معصوم کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا (جو ہندوستان آ کر مولانا عبد الملک مرادآبادی کی معرفت بھیجا گیا) ـــــ

شیخ محمد صادق مجددی کے مکان کے قریب ہی بیر بُضاعہ ہے جس کا ذکر ابو داؤد شریف میں مفصل ہے مولانا عبد الملک کی رہنمائی میں اس متبرک تاریخی کنوئیں کو بھی دیکھا۔ یہ اب ایک عالی شان کوٹھی کے احاطے میں آ گیا ہے۔ مالک مکان سے اجازت لے کر اندر جانا ہوا۔ بغیر رہنما کے یہاں تک پہونچنا سخت مشکل تھا۔ بیر بُضاعہ

کے حوض سے ایک چلّو پانی لے کر پیا۔ طبیعت کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ اب اس کنوئیں سے مشین کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے، پانی نہایت صاف اور شیریں ہے۔

کتب خانہ شیخ الاسلام کی چند کتابیں اس عظیم الشان کتب خانے میں بڑا نایاب و نادر ذخیرۂ کتب ہے۔ قلمی کتابیں خوشخط اور اچھی حالت میں ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے کا قرآن مجید بھی یہاں رکھا ہوا ہے۔ علاوہ عربی و فارسی کے ترکی زبان کا لٹریچر بھی بہت ہے۔ بہت سے دواوین ترکی شعراء کے بھی یہاں موجود ہیں بہت سی تاریخ و تصوف کی کتابیں ترکی زبان میں ہیں جن میں سے کچھ کتابیں فارسی و عربی کے تراجم ہیں۔ دو تین مرتبہ جا کر میں علاوہ دوسرے عجائب کے ان چند کتابوں کو نکلوا کر دیکھ سکا۔

(۱) تراجم علماء المشائخ الاحراریہ المجددیہ لمیرزا معصوم الدھبیدی بخط المؤلف۔ نمبر ۱۹۲۔ تاریخ۔

(۲) تراجم المشائخ المذکورین فی السلسلۃ المجددیہ تخلیل صاحب السہرندی مکتوبہ ۱۲۴۹ھ نمبر ۱۹۴، تاریخ

(۳) گلزستان فی تراجم المشائخ للعلامہ بہاری۔ نمبر ۱۴۰۵ تاریخ۔

(۴) معجم المشائخ لعلامہ زبیدی (علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدی م ۱۲۰۵ھ) نمبر ۵۰۵ تاریخ۔

معجم المشائخ کا ایک اقتباس علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدی نے مولانا خیرالدین محدث سورتیؒ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"خیرالدین بن محمد زاہد الہاشمی الحنفی النقشبندی السورتی شیخنا الامام الفقیہ المحدث البارع الصوفی المحقق وُلِدَ بمدینۃ سورت احد ثغور الھند و قرءَ ھناک علی فضلاء عصرہٖ وورد علی الحرمین فسمع الحدیث علی الشیخ محمد حیات السندھی واکثر ملازمتہٗ فیہ وفی بقیۃ العلوم وحضر دروس الشیخ محمد قائم السندی وآخرین وعاد الی بلدہٖ وتلقّن الذکر من القطب الکامل السیّد شاہ نوراللہ الحُسینی النقشبندی وتسلک علی یدیہ وحصل النسبۃ ولما توفی جعل المترجم خلیفتہٗ من بعدہٖ لقیتہٗ فی سنۃ ۱۱۶۰ھ فسمعت علیہ الصحیح اکثرہٗ بقراءتی وحضرتُ دروسَہٗ الفقہیۃ والاصولیۃ وتلقنتُ منہ الذکر واجازنی ــــ

ترجمہ ــــ (مولانا) خیرالدین بن محمد زاہد الہاشمی الحنفی النقشبندی السورتی ــــ میرے شیخ ہیں۔ فقیہ و محدث اور صوفی و محقق ہیں۔ سورت میں پیدا ہوئے وہاں کے فضلاء سے پڑھ کر بغرض تحصیل علم حرمین شریفین گئے۔ وہاں شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث سماعت کی اور حدیث نیز دیگر علوم حاصل کرنے کے لیے اُن کے

یہاں طویل مدت تک شیخ محمد قائم سندھی اور دیگر علماء کے حلقہ ہائے درس میں بھی حاضر ہوئے، پھر اپنے وطن (سورت) لوٹ آئے ۔۔۔ یہاں ذکر کی تعلیم، قطب کامل سید شاہ نور اللہ الحسینی النقشبندیؒ سے حاصل کی اور ان سے سلوک طے کر کے صاحب نسبت ہوئے، جب سید نور اللہؒ کا وصال ہوا تو مولانا خیر الدینؒ ان کے خلیفہ ہوئے، میں نے ان سے سورت میں ۱۱۶۲ھ میں ملاقات کی اور حدیث پڑھی۔ ان کے فقہ و اصول فقہ کے درس میں بھی حاضر ہوا، ان سے ذکر بھی سیکھا انھوں نے مجھے اس کی اجازت دی۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کتاب نمبر ۱۹۳ و ۱۹۴ سے جو اقتباسات میں نے لیے ہیں ان کا ترجمہ بطور تلخیص پیش کر دوں ان اقتباسات سے اولاد مجدد الف ثانیؒ اور سلسلۂ مجددیہ کے بعض اکابر سے متعلق مجھے کچھ وہ معلومات حاصل ہوئیں جو کسی دوسری جگہ نظر سے نہیں گزریں ۔۔۔ یہ دونوں کتابیں بھی ہندوستان میں غالباً کسی کتب خانے میں نہیں ہیں۔ ٹرکی سے یہ دونوں کتابیں مدینہ منورہ آئی ہیں۔

حضرت شاہ محمد رضاؒ | شاہ محمد رضا ابن خواجہ محمد پارسا ابن مروج الشریعۃ خواجہ محمد عبد اللہ ابن خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ انھوں نے کسب کمالات باطن اپنے نانا شاہ فضل احمد سے کیا۔ سرہند شریف کی تباہی و بربادی کے بعد شہر بریلی میں ساکن ہوئے، فقر و فاقہ میں زندگی گزاری۔ کسی امیر و وزیر کے دروازے پر نہیں گئے، حالانکہ بہت سے پٹھان امراء آپ کے معتقد تھے، حضرت شاہ عزت اللہ ان کی صحبت میں رہ چکے تھے اور ان کی خدمت کرتے تھے ۔۔۔ انھوں نے بریلی میں تخمیناً ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

حضرت شاہ عزت اللہؒ | حضرت شاہ معصوم ثانیؒ کے فرزند ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۱۲۲ھ یا ۱۱۲۴ھ میں ہوئی۔ ابتداءً کسب سلوک اپنے والد سے کیا، بعد ان کی وفات کے اپنے بڑے بھائی حضرت شاہ غلام محمد سے سلوک تمام کیا اور اجازت و خلافت پائی، سلاطین و اُمراء آپ کے آستانے پر آتے تھے۔ جو ہدیہ و نذرانہ آتا تھا سب کو فقراء و مساکین پر صرف کر دیتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر میں چراغ جلانے کو تیل بھی نہ ہوتا تھا، بہت مقروض تھے۔ سرہند کی بربادی کے بعد اعیال و اطفال اور اقربا کے ساتھ پورب کی طرف عزیمت کی، مدتوں شہر بریلی میں ساکن رہے۔ حافظ رحمت خاں ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ اولاد حضرت مجدد الف ثانیؒ سے جو حضرات بریلی میں رہتے تھے ان سب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جب افغانوں اور شجاع الدولہ والیٔ لکھنؤ کے درمیان جنگ ہوئی تو شجاع الدولہ انگریزوں کی حمایت سے تمام علاقۂ پورب پر قابض ہو گیا اور حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ اس کے بعد اس علاقے میں رفض پھیلا، تو شاہ صاحب بجانب کاشغر و یارکند چلے گئے وہاں سے پھر

ہندستان آئے اور اہل وعیال کو لے کر کابل آ گئے، اور وہیں رہنے لگے، تیمور شاہ ابن احمد شاہ ابدالی اس وقت بادشاہ کابل تھا۔ اس نے شاہ صاحب کا آنا غنیمت شمار کیا، اُن کا معتقد ہوا۔ تمام ارکان وخواص وعلما اُن کے معتقد ہوئے۔
کچھ دنوں بعد بعض مفسدوں کی وجہ سے بادشاہ اور اُن کے درمیان رنجش ہوگئی اور آپ نے بجانب ترکستان رخ کیا، موضع امام میں جو کہ قریب قندوز ہے اقامت اختیار کی، وہاں بھی معتقدوں کا ہجوم ہوا، بعد کو تیمور شاہ نادم ہوا، رسل ورسائل اور نذور وہدایا بھیج کر پھر کابل بلایا۔

آپ علماء وطلبار کی بہت تعظیم فرماتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار جاتے ہوتے اور کسی طالب علم کے ہاتھ میں کتاب دیکھ لیتے تو فی الفور نیچے اتر آتے تھے ____ تقریباً ساٹھ سال کی عمر ہوئی سنہ ۱۲۰۷ھ میں تیمور شاہ سے چھ ماہ پہلے وفات پائی، بیرون شہر کابل، طرف دروازۂ لاہوری دفن ہوئے۔

شاہ عزت اللہؒ کے سات فرزند تھے اور ایک صاحبزادی تھیں، منجملہ اُن کے ایک حافظ محمد عباس تھے جو کہ عالم وفاضل تھے اور سند حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے حاصل کی تھی ۔ اپنے والد کی وفات کے بعد دہلی میں ساکن ہوگئے وہاں کے مشائخ وقت سے تعلق رکھا، آخر میں یارکند، چند سال وہاں رہ کر سنہ ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی۔

اخوند ملا تیمور خاں باجوڑیؒ | حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے خلفاء میں سے تھے ۔ ۲۰ سال خدمت اقدس میں رہے اور سلوک طے کیا، بعد واقعہ شہادت پیر ومرشد اپنے وطن باجوڑ کو چلے گئے، وہاں خلق کثیر آپ کی مرید ہوئی، انعام اتنا ہوتا تھا کہ ہر رات تقریباً چالیس بکریاں مہمانوں کے لیے ذبح ہوتی تھیں، غزوات میں مشغول رہتے تھے، بہت سے آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اگرچہ تحصیل علم کم تھی مگر غایت صفائے باطن کی وجہ سے اُن علمار کو جو مناظرہ وامتحان کے لیے آتے تھے شافی جواب دیتے تھے، مناظرہ میں عاجز نہیں ہوتے تھے، اور ان علمار میں سے اکثر معتقد ہو جاتے تھے۔ فصیح اللسان، بلند قامت اور خوش چہرہ تھے، قرأت بھی اچھی تھی۔ قصبۂ کوناتیر میں جو حدود یوسف زئی میں قریب باجوڑ ہے اور جس کو آپ نے خود آباد کیا تھا ____ مدفون ہوئے ___ آپ کے بعد آپ کے جانشین صاحبزادہ محمد معصومؒ ہوئے، وہ بھی عالم وفاضل، اور خلیق ومتواضع تھے۔ کسب باطن اپنے والد سے کیا تھا۔ بعض علوم پشاور میں وہاں کے علمار سے پڑھے تھے، فقہ واصول کو باجوڑ میں پڑھا، مکتوبات وبعض کتب تصوف کو اپنے والد سے پڑھا۔ بہت ذکی تھے، اپنے والد کے ساتھ ترکستان کا سفر بارہا کیا۔ بعد وفات پدر شہرت عظیم پائی۔ دیار کفار کو مسخر کیا تھا۔ بہت سے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے تھے۔ سنہ ۱۲۳۵ھ کے لگ بھگ

اہلِ بدخشاں کی درخواست پر علماء و طلباء کے مجمع کے ساتھ بدخشاں گئے، موضع آق بلاق میں جو کہ بدخشاں و قندوز کے درمیان ہے انتقال کیا۔

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا ایک مکتوب گرامی یہ مکتوب گرامی حضرت سید موسیٰ خاں دہبیدی[1] کے نام ہے۔ کلماتِ طیبات یا اور کسی دوسری مطبوعہ کتاب میں یہ نظر سے نہیں گذرا۔ بطور تبرک اس مکتوب کو بھی مع ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

الحمد للہ علی نوالہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ وصحبہ وآلہ ـــ از فقیر جانجاناں بحضرت سید موسیٰ خاں صاحب سلمہ الرحمٰن مطالعہ نمایند۔ فقیر در اوائل ماہ صفر ۱۱۸۸ھ (یک ہزار و ہشتاد و ہشت) در محروسہ پانی پت بعافیت است و مردم محلہ دہلی بخیر اند و عمر قریب بہشتاد رسیدہ و ضعف پیری مستولی است ہر روز چہار وقت حلقہ می شود صبح و نصف النہار و شام (و وقت) خفتن مردماں حاضر می شوند..... از علماء و سادات طائفہ طائفہ از مقامات گزشتہ اجازت یافتہ ببلاد رخصت مراجعت می یابند و از اقران و امثال کسے کم ماندہ است و ممالک ہندوستان پر از آشوب است در ہر ناحیہ فتنہ ہا پیدا است و کارخانہ معاش و معاد اینجا افتادہ است۔ ارادۂ حج داریم ناتوانی و بے سامانی رخصت نداد...... سفر دراز آخرت در پیش است۔ حق تعالیٰ بتصدقات حضرات، بآسانی بمنزل مقصود رساناد و از روز مفارقت تا امروز خبر معتبر از ولایت نرسید بعد انتظار بسیار حاجی عبد القادر نام عزیزے از مخلصان ایشان پیام سلامتی ایشان رسانید جانِ تازہ در قالب این کہ صد سالہ دمید، ایّام صحبتہا رگذشتہ بیاد آمد اوسبحانہٗ و تعالیٰ در عمر و ارشاد ایشان بیفزاید کہ آں بلاد را منور ساختہ اند و اظہار اشتیاق حاصلے ندارد۔ ملاقاتہا نظر باسباب مقصود نیست ان شاء اللہ تعالیٰ بشرط حسنِ خاتمہ در بہشت جاودان برخورِ خاطر خواہ میسر خواہد شد۔ چوں از بُعدِ مسافت کمتر مردم از ہندوستان آں بلاد میروند در ارسال نامہ ما مقصریم و ایشان ہم معذور اند۔ الحمد للہ از دعا غافل نیستیم و ایشان ہم دعائے خیرِ خاتمہ را فراموش نمائند ـــ و از پیرانِ ادریں مملکت غیر از میرزا مظفر کہ مشغول بارشاد است ہیچ کس زندہ نیست، بلکہ از خاندانِ عالیشان صاحبزادگان کہ صاحبِ ارشاد و تاثیر باشند نیستند[2] والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ۔

---

[1] آپ حضرت مرزا صاحب شہیدؒ کے پیر بھائی تھے۔ نوادر المعارف سے جو کہ خود آپ کی تالیف ہو، معلوم ہوتا ہو کہ آپ ۱۱۵۱ھ میں حضرت شیخ محمد عابدؒ کی خدمت میں دہلی آئے اور نو سال تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے۔

[2] اس مکتوب پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

حیف باد احیف باد ا بر چنیں زندگی — خانخاناں بودن و بے جانجاناں زیستن

دسبب ترکِ اقامت در دہلی آنست کہ طالبانِ خدا در شہر کمتر اند و در قصبات بیشتر۔ اسبابِ تنعم و تجمل (کہ) سرمایۂ غفلت است در شہر بسیار تر می باشد و در دہات و قریٰ کمتر والسلام۔

(ترجمہ) بعد حمد و صلوٰۃ، فقیر جانجاناں کی طرف سے حضرت سید موسیٰ خاں صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ فقیر اس وقت اوائل ماہ صفر ۱۱۹۴ھ میں پانی پت کے اندر عافیت سے ہے۔ محلہ دہلی کے لوگ بھی بخیر ہیں۔ میری عمر اسی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بڑھاپے کا ضعف غالب ہے۔ روزانہ چار وقت حلقہ ہوتا ہے صبح، دوپہر، شام اور رات کو۔۔۔ لوگ حاضر ہوتے ہیں علماء و سادات سے گروہ گروہ اجازت حاصل کرکے (اپنے اپنے) شہروں کو جانے کی رخصت پاتے ہیں۔ اب میرے ہم عمروں میں کم لوگ باقی رہے ہیں۔۔۔ اس وقت ہندوستان کی حالت ابتر ہے۔ ہر طرف فتنہ برپا ہے ..... ارادۂ حج تھا، ناتوانی اور بے سامانی نے اجازت ہی نہ دی اب تو سفر دراز آخرت درپیش ہے حق تعالیٰ بزرگوں کے صدقے میں آسانی سے منزلِ مقصود تک پہونچا دے۔۔۔ آپ کے جدا ہونے کے بعد سے آج تک آپ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ بعد انتظار بسیار حاجی عبدالقادر نے جو آپ کے مخلصوں میں سے ہیں آپ کی سلامتی کا پیام پہونچایا جس سے اس مردۂ صد سالہ کے جسم میں جانِ تازہ آگئی اور ایام گذشتہ کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور ارشاد و تلقین میں برکت عطا فرمائے۔ آپ نے اس علاقے کو منور کر دیا ہے۔ آپ سے اظہارِ اشتیاقِ ملاقات کروں تو بیکار ہے۔ اسبابِ ظاہری کے پیش نظر آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بشرطِ حسنِ خاتمہ، بہشتِ جاوداں میں بہ اطمینان خاطر ملاقات میسر آئے گی۔۔۔ چونکہ بُعدِ مسافت کے باعث بہت کم ہندوستانی آپ کے علاقے میں آتے جاتے ہیں اس لیے ارسالِ خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں اور آپ بھی معذور ہیں۔۔۔ الحمد للہ دعا سے غافل نہیں ہوں۔ آپ بھی خاتمہ بالخیر کی دعا سے مجھ کو فراموش نہ فرمائیں۔ ہمارے ہم پیروں (پیر بھائیوں) میں سے اس ہندوستان میں سوائے مرزا مظہر کے جو کہ ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں، اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ بلکہ خاندان عالیشان میں بھی ایسے صاحبزادگان جو صاحبِ ارشاد و تاثیر ہوں۔۔۔ نہیں ہیں۔۔۔ والسلام۔۔۔ (دیگر یہ کہ) اقامتِ دہلی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ طالبانِ خدا شہر میں کم اور قصبات میں زیادہ ہیں۔۔۔ تنعم و تجمل کے اسباب جو سرمایۂ غفلت ہوا کرتے ہیں شہر میں زیادہ اور دیہات و قصبات میں کم ہیں۔ والسلام۔

خالد جاوید شمسی، بی۔ اے (علیگ)

(طلباء کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا جس میں ہندو طلباء بھی شریک تھے۔)

دُنیا کی تاریخ نے آج تک کوئی مثال ایسی نہیں پیش کی کہ ایک بالکل ناخواندہ آدمی جس کو نہ کہیں غیرمعمولی عالمانہ ماحول ملا ہو، نہ کوئی خاص تربیت، وہ لکھنا نہیں جانتا، وہ پڑھنا نہیں جانتا جو دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرکے اپنی معلومات بڑھا سکے۔ اس کے باوجود وہ دنیا کے سامنے ایک فلسفۂ زندگی، ایک مکمل نظام حیات پیش کرے........ جس میں انسان کے لیے پیدائش سے موت تک ایک سوچا سمجھا، جچا تلا، اور بالکل موافق فطرت پروگرام ہو، اور چودہ سو برس کے تجربے میں آجانے کے بعد تک دُنیا اس نظام میں کوئی واقعی سقم۔ کوئی جھول اور کوئی خامی نہ نکال سکے۔

اُمّی (ناخواندہ) ہونے کے باوجود اس کی نظر اتنی کائناتی ہو کہ وہ ابتدائے آفرینش سے لے کر رہتی دنیا تک کا ایک ایسا کھاتہ پیش کرے جس کی تائید و تصدیق تمام پرانی شہادتیں اور دستاویزیں کریں۔ وہ خود کوئی سائنٹسٹ (Scientist) نہیں، کبھی اس نے سائنس کا کوئی تجربہ نہیں کیا، لیکن اس کے اقوال (Remarks) کی تصدیق آئندہ زمانے کی تمام علمی تحقیقات کرتی چلی جائیں۔

پھر وہ سب چیزیں ایک ایسی زبان اور اسلوب میں پیش کرے جس کی فصاحت و بلاغت چیلنج کرتی ہو۔

"اگر تمھیں کچھ تردّد ہو تو اس جیسی ایک لائن ہی بنا کر دکھا دو۔ مددگاروں کو اکٹھا کر لو۔"

اور اس کا یہ چیلنج پوری دنیا کو مغلوب کردے، خدا کی وسیع کائنات میں کوئی فردِ بشر کسی زبان میں اس طویل و جامع شہپارہ کے مقابلہ میں ایک لائن تک پیش کرنے سے قاصر رہے۔ وہ کتاب دُنیا کی ساری کتابوں میں اپنی مثال آپ بن جائے۔ اس کی کسی بات میں لاتعداد تنقیدی دور گذر جانے کے باوجود کوئی نقص ثابت نہ ہوا ہو۔

ــــــــــ دراں حالیکہ وہ کتاب ایسے زمانے میں ظاہر ہوئی ہو جبکہ انسان نام نہاد ترقی کے دور سے کوسوں دُور ہو۔ نہ رسل و رسائل، نہ ایجادات و انکشافات، نہ تجربہ گاہیں، نہ لائبریریاں، نہ "مصر کی روشنی" نہ "یونان کا علم و فن"۔ بلکہ ؎

عرب جس کا چرچہ ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — زمانے سے پیوند اس کا جدا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا — نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا

تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا!
ترقی کا واں تک قدم تھا نہ آیا (حالیؔ)

لیکن پھر بھی وہ کتاب اتنی مکمل ہو، اور انسانی فطرت کے برعکس نقائص سے اس قدر بالاتر کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں کی توں رہتے ہوئے اس کے اندر کسی قسم کی قدامت کے آثار اُبھرنے نہ پائیں۔

آپ نے دُنیا کے بڑے بڑے فلاسفہ اور ادبا کے انمول شہپارے دیکھے ہوں گے یا ان کے بارے میں سنا ہوگا، لیکن ان کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنے زمانے میں خوب چلے۔ لیکن جیسے جیسے زبان و بیان اور مذاقِ زمانہ میں تبدیلی ترقی رونما ہوئی، ان کی قسمت کے تارے بادلوں میں آگئے، یہاں تک کہ وہ ادبِ قدیم (classics) بن کر کتب خانوں کی الماریوں میں محفوظ کر دیے گئے۔ اس کام میں چودہ سو سال کی مدت نہیں لگی۔ صرف تین چار صدیوں میں ان کا عروج و زوال سامنے آگیا ــــــ لیکن آپ نے کسی ایسی کتاب کے بارے میں بھی سنا جو چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی قدیم و جدید اسالیبِ بیان (styles) کی ساری وسعتوں کو سمیٹے رہے۔ اس میں نہ تو کوئی لفظ زائد ہو نہ کم، اس کی افادیت (utility) آج بھی اتنی ہی بھرپور ہو جتنی اس زمانے میں جب وہ ظاہر ہوئی تھی۔ اس میں سبکے سب معقدی اصول ہوں، اور ہر اصول اپنے دور میں حال پر چیاں اور مستقبل کی خبر دینے والا ہو، گویا زمانہ چاہے جتنی ہی ترقی کر لے وہ اصول بہرحال ان ترقیوں پر حاوی رہیں گے۔

کتاب کے بعد اس انسان کی زندگی کو دیکھئے۔ ایک ایسے دور میں پیدا ہونے کے باوجود جبکہ لکھنے کو کاغذ بھی نہ ایجاد ہوا ہو اور پیڑ کے پتے ہی اس کام میں لائے جاتے ہوں، ایک ایک ورق اس زندگی کا بالتفصیل محفوظ ہے۔ لغزشوں سے یکسر پاک اور ہر قول و عمل علم و حکمت کا ایک مکمل خزانہ!۔

ناخواندہ (اُمّیؐ) تو خیر درکنار، ایسی مثال تو دنیا کے کسی نابغہ (genius) نے بھی پیش نہیں کی۔ لامحالہ انسانی عقل مجبور ہے کہ اس کتاب کو انسان کے کارناموں سے بالاتر اور خدا کا کارنامہ تسلیم کرے۔ اور مذکورہ

سیرت (life) رکھنے والے ایسی کتاب کے حامل انسان کو خدا کا منتخب اور انتہائی پسندیدہ (The most favourite) انسان مانے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ یاد دلانا چاہتا تھا کہ یہ الہامی کتاب میرا ہی پیغام ہے اور یہ عالمگیر تعلیمات میری ہی تعلیمات ہیں۔ اسی لیے اس کے پرچار کے لیے یہ اعجازی ذریعہ اختیار کیا۔ یعنی ایک اُمّی پر قرآن کریم نازل ہوا تاکہ اس کی صداقت میں کسی کو کلام اور خود اس کے شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور یقیناً ایک انصاف پسند نکتہ شناس کے لیے اس کے بعد کسی تامل اور کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا کی گئی۔ آپ کی نبوت سے قبل کی زندگی ایک فرشتہ کی زندگی ہے۔ آپ کی سچائی اور امانت داری کو دیکھتے ہوئے لوگ آپ کو 'امین' کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ نے ایک خدا کی عبادت و طاعت کا پیغام سنانے سے قبل صفا کی چوٹی پر چڑھ کر اپنی قوم سے یہ سوال کیا: "اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک زبردست فوج تیار کھڑی ہے کہ تمہیں موقع پاکر لوٹ لے، کیا تم میرا یقین کروگے؟" آپ کی پوری قوم نے یک زبان ہو کر جواب دیا تھا کہ آپ ہمیشہ سے سچ بولتے آئے ہیں۔ ہم آپ کا فوراً یقین کریں گے۔

آپ نے انسانوں کو بتایا کہ خدائے تعالیٰ کا یہ انتظام ہدایت ہمیشہ سے رہا ہے، جب کبھی قوموں کی بے راہ روی اور گمراہی حد سے تجاوز کر گئی ہے اور لوگ اپنے خالق اور اپنے مقصد حیات کو بھول گئے ہیں تو اس نے اپنی تنبیہات سے آراستہ کر کے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ میں خدا کا آخری ایلچی ہوں، میرے بعد ہدایت کا کام میرے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی انسان براہ راست آسمانی روشنی لے کر نہ آئے گا۔ اب عالم کے ہر فرد کے لیے میرا لایا ہوا پیغام کفایت کرے گا۔ اب جو کوئی بھی خدا کی دی ہوئی ہدایت حاصل کرنا چاہے گا صرف میرے ہی واسطے سے کر سکے گا۔"

اس نے انسانوں کو ان کے بھولے ہوئے سبق یاد دلائے، ان کو عالم کا مبدا اور منتہا (The begining and The end) بتایا۔ ان کو ازل و ابد (Eternity) کی حقیقت بتائی، خدا کا مقام اور اس کی شان سمجھائی، اور یہ بھی بتایا کہ انسان کے لیے یہ دنیا ایک امتحان گاہ (Examination Hall) ہے۔ انسان کے پیدا کرنے والے نے بہت سی صلاحیتیں اس کو دے کر یہاں بھیجا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن عرصۂ امتحان ختم ہو جائے گا۔ تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا نتیجہ سنا دیا جائے گا، اور خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کے

غلط اور صحیح استعمال پر ان کو سزا اور جزا دی جائے گی ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اس قوم کو جس نے خدا کو پیچھے چھوڑ کر لاکھوں معبود بنا رکھے تھے۔ کہیں آگ کو پوجا جاتا تھا کہیں سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش ہوتی تھی، اور بتوں کا تو ذکر ہی کیا، ہر قبیلہ کا الگ الگ بت تھا، راہب اور کاہن انسانی عقائد کے اجارہ دار تھے ؎

وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

اس قوم کو اس ہادیؐ نے رُخِ حقائق سے پردہ اٹھا کر دکھایا۔ بھٹکے ہوئے انسانوں کی پیشانیوں کو لاکھوں معبودوں سے ہٹا کر صرف ایک معبودِ حقیقی کے آگے سرنگوں کر دیا۔ بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑ دیا، باطل خداؤں کو اُن کے ذہنوں سے محو کر دیا اور اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ؎

وہ ہو ذات واحد عبادت کے لائق زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لَو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ

آپ نے فرمایا۔ تم ہمیشہ اسی پر "بھروسہ کرو" اور اُسی کے "عشق کا دم بھرو"۔۔۔ اور

اُسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اُسی کی طلب میں مرو گر مرو تم

اور یہ بھی کہا کہ ؎

مُبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

انسانوں نے اپنی نا سمجھی سے خدا کے بعض برگزیدہ بندوں کے اعمال دیکھ کر ان کو "مافوق الانسان" (Superman) جان لیا۔ چنانچہ حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے قریبی نبی حضرت عیسیٰؑ کو

اُن کے پیروؤں (Followers) نے خدا کا بیٹا سمجھ لیا تھا اور اب تک سمجھے ہوئے ہیں۔ لیکن حضرت محمدؐ نے تاکید فرمادی کہ تم اوروں کی طرح دھوکا نہ کھانا۔ کسی کو خدا کا بیٹا نہ بنانا۔ مجھے اتنا ہی سمجھنا جتنا کہ فی الواقع میرا رُتبہ ہے۔ جس طرح تمام انسان اس ذاتِ واحد کے آگے سرنگندہ ہیں اُسی طرح میں بھی ہوں۔ خبردار اگر تم نے مجھے یا میری قبر کو پوجا! بندگی اور بیچارگی میں تم اور میں سب برابر ہیں۔ البتہ ؎

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

آپ نے انسانی اعتقاد کے لیے مندرجہ ذیل باتیں ضروری قرار دیں۔

۱۔ خدا پر ایمان کامل۔ ۲۔ خدا کے تمام فرشتوں پر ایمان کامل۔ ۳۔ خدا کی نازل کی ہوئی تمام کتابوں پر ایمانِ کامل۔ ۴۔ خدا کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر ایمانِ کامل۔ ۵۔ عالم کی فنا پر ایمانِ کامل۔ ۶۔ خدا کی مقرر کردہ تقدیر پر ایمانِ کامل۔ ۷۔ موت کے بعد اٹھائے جانے پر ایمانِ کامل۔

ان اعتقادات کے بعد حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی تعلیمات میں عبادات کا پروگرام ہے جو انسان کی روزمرہ زندگی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ عبادات کے بعد انسانی زندگی جن جن شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اُن سب کے بارے میں ایسی بچی تُلی، اور حکمت آموز تعلیمات آپؐ کے ذریعہ انسانیت کو ملیں جس نے ایک بار پورے عالم کی کایا پلٹ دی۔ اور آج انسانیت ایک بار اور "اسی" کایا پلٹ کی خواہاں ہے۔ ان تمام امور کی اُصولی تعلیم قرآنِ پاک میں اور تفصیلات حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے بے شمار اقوال زریں میں جن کو اصطلاحاً حدیث شریف کہا جاتا ہے آپ کو بکھری ہوئی ملیں گی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ـــــ

(بقیہ مضمون صـ۱۶)

(سرمایۂ) شہرت صرف بہادری اور شہ زوری ہے اور اس میں اپنے کسی غیر مسلم مورث کو آئیڈیل بنا لینے سے ایک مسلمان کے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے برعکس رام اور کرشن کی شہرت جس مذہبی حیثیت سے ہے اس کو اگر کوئی مسلمان ایک آئیڈیل کا مقام دیدیتا ہے اور اُس کے سامنے سرنیاز جھکاتا ہے تو وہ مشکل ہی سے مسلمان باقی رہ سکتا ہے۔ یہ فرق ہے رستم و سہراب اور رام اور کرشن میں، جس کی بنا پر ایک کی طرف فخریہ نسلی یا قومی انتساب ایک مسلمان کرسکتا ہے اور دوسرے کی طرف نہیں کرسکتا ــــ یہ تھا مولانا ندوی کا نقطۂ نظر جو انھوں نے کافی واضح انداز میں پیش کیا تھا تعجب ہے کہ جناب سمپورنانند جی نے اسکے جواب میں وہ بات کہنے ارشاد فرمائی جس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

(۶) پیرا ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں "پوروج" سے سمپورنانند جی کی مراد نسلی اور خاندانی مورث (آباء و اجداد) نہیں ہیں، بلکہ ملک کے بڑے مراد ہیں، ہمارے نزدیک یہ بات جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اس سے مختلف ہے جو سمپورنانند جی نے اسی خط میں اوپر لکھی ہے۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اگر "پوروج" سے نسلی اور خاندانی بزرگ مراد نہیں ہیں بلکہ صرف "ملک کی عظیم شخصیتیں" مراد ہیں تو پھر اس بحث اور مطالبہ کے سلسلہ میں سمپورنانند جی نے اپنی اس سلسلہ کی تقریروں میں اور اس تحریر میں بار بار اس کا ذکر کیوں فرمایا کہ ہندوستان کے ۹۰ فیصدی مسلمان یہاں کے ہندوؤں کی اولاد ہیں، ان کی ان تقریروں کی جو رپورٹیں اخبارات میں ہم نے پڑھی ہیں اُن میں تو اِس بات کا ذکر اس مطالبہ کی بنیاد کے طور پر ہی کیا گیا ہے۔ اور کچھ یہی حال اُن کی اس تحریر کے ابتدائی حصہ کا بھی ہے۔

(۷) اس خط کے شروع میں سمپورنانند جی نے کھلے الفاظ میں احترام اور افتخار کے فرق کو تسلیم کرتے ہوئے یہ مانا تھا کہ وہ مسلمانوں سے افتخار کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ اور آگے بڑھ کر انھوں نے فرمایا تھا کہ وہ تو محض ایک تاریخی حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ۹۰ فی صدی ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کی اولاد سے ہیں لہٰذا انھیں اس تعلق کے ناتے ہندو پوروجوں کو اپنا پوروج سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اسی ۲ نمبر پیرے کے آخر میں اُن کی یہ خواہش کہ "کتنے شان کی بات ہوتی، اگر اس ملک میں بھی کوئی فردوسی پیدا ہوتا" اور پھر یہ الفاظ دیکھ کر کہ "احترام کہیے یا افتخار جن لفظوں میں اس شاعر نے پرانے آتش پرست بادشاہوں

کا ذکر کیا ہے ان پر آفریں کہتے ہی بنتا ہے ۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمپورنانند جی نے اپنی تقریر میں جو مطالبہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے رکھا تھا اس کا ردعمل دیکھ کر انھیں دراصل کچھ تکلف پیش آگیا ہے اور الفاظ میں وہ مسلمانوں کے ردعمل کی کچھ رعایت کرنا چاہتے ہیں ، ورنہ مطالبہ وہی ہے ۔ جو مولانا علی میاں نے سمجھا تھا ، اور جس پر انھوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے وہ بحث کی تھی جس کا خلاصہ اوپر دیا جا چکا ہے ـــــ اگر ہمارا یہ احساس صحیح ہے ، تو پھر ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے یہ بحث کسی شایان شان نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی ۔ جب سمپورنانند جی کا مطالبہ مسلمانوں سے وہ ہے جو فردوسی نے کیا ، تو اس سلسلہ میں مولانا ندوی کے اُٹھائے ہوئے ایک بہت واضح نکتہ اعتراض سے انھیں تغافل نہیں برتنا چاہیے تھا ۔

اُمید ہے کہ سمپورنانند جی اس گزارش کی طرف توجہ فرمائیں گے ۔

(۸) سمپورنانند جی کے اس ارشاد پر کہ فردوسی کے شاہنامہ کے اشعار پر کسی کو شکایت نہیں ہوئی ، محض اظہار واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ شاہنامہ سامنے آتے ہی اس کے جواب میں عمرنامہ لکھا گیا (دیکھئے شعر العجم از مولانا شبلی جلد اوّل) اور ایک دوسرا منظوم جو اب صولت فاروقی کے نام سے لکھا گیا ، جس کا ایک ہی شعر " شکایت نہ ہونے " کی شکایت کو رفع کرسکتا ہے ـــــ فردوسی کے متعلق کہا گیا ؎

دلش گبر وجانش گبر و گبری زباں　　ز گبراں بگبری زباں قصہ خواں

(۹) بابو سمپورنانند جی نے سعدی اور انوری کے جو شعر فردوسی کی تعریف میں پیش کئے ہیں ، اُن سے کسے انکار ہوسکتا ہے ، مگر ناظرین میں سے کسی کو یہ غلط فہمی ہونی چاہیئے کہ فردوسی کی یہ تعریف وتحسین آتش پرست پورزجوں کی مدح وثنا پر ہے ، جہاں تک سعدی علیہ الرحمہ کے شعر کا تعلق ہے ، اس میں " چہ خوش گفت " کا اشارہ فردوسی کے ایک نصیحت آموز شعر کی طرف ہے ۔ ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است　　کہ جاں دارد وجان شیریں خوش است

ـــــ جو بوستان میں ایک حکایت کے ذیل میں سعدی علیہ الرحمہ نے نقل فرمایا ہے ۔ رہا انوری کا شعر ، اس کا تعلق بھی مجرد شاعرانہ کمال سے ہے (جو اگرچہ شاہنامہ ہی کے ذریعہ

ظاہر ہوا) اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدۂ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

الغرض ان شعروں سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ فردوسی کی یہ تحسین و آفرین پرانے آتش پرست بادشاہوں کی مدح و ثنا پر تھی۔

(۱۰) سمپورنانند جی نے خط کے سب سے آخری پیرے میں ارشاد فرمایا ہے کہ برہمنی تہذیب کے احیاء کی باتوں سے ڈر کر ہمیں ایک صحیح بات کو نہیں چھوڑنا چاہئے ـــــ اس بارے میں عرض ہے کہ مولانا ندوی کی اصل بحث تو یہی ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت مسلمانوں کو دے رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، برہمنی تہذیب کے احیاء کی بات تو مولانا نے آخر میں "مزید برآں" کے طور پر کہی ہے۔ اور ہندوستان کے موجودہ ماحول میں کوئی ہوشمند اس خطرہ کو وہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(۱۱) سمپورنانند جی کے سب سے آخری فقرے کے متعلق عرض ہے ـــــ کہ "جذباتی ہم آہنگی" پیدا کرنے میں وہی طریقے مفید اور مددگار ہو سکتے ہیں جو متعلقہ عناصر کے لئے یکساں طور پر خوشگوار ہوں اور کسی چھوٹے سے چھوٹے عنصر کو بھی ان کے بارہ میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ ہماری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ایک ترکیب ہے۔ ہم پوری دیانت داری سے اپنے ذاتی علم کی بنا پر مسلمانوں کے متعلق تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سمپورنانند جی کی اس سلسلہ کی تقریروں نے (جن کی رپورٹیں ہم نے اخبارات ہی میں پڑھی ہیں) ان پر برا اثر ڈالا اور وہ بجائے قریب ہونے کے اور زیادہ دور ہوئے۔

(۱۲) اب صرف ایک بات اور عرض کرنے کو رہ جاتی ہے۔ سمپورنانند جی نے ایک جگہ اسی خط میں فرمایا ہے کہ "مولانا کو اور شاید دوسرے مسلمان دوستوں کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ کئی مرتبہ ہم میں نے خاندان مغلیہ کے اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک کے بادشاہوں اور ٹیپو سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو اپنے بزرگوں میں گنا ہے" ـــــ بے شک سمپورنانند جی کا خیال قریب قریب صحیح ہے، بس ابھی چند دن پہلے ہی ایک اخباری انٹرویو کے ذریعہ

یہ اطلاع ملی ہے کہ سمپورنانند جی کئی بار پبلک جلسوں میں ایسا فرما چکے ہیں ورنہ واقعی اس کی کوئی اطلاع کبھی پہلے نہیں ملی تھی۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس موقع پر مولانا ندوی ہی کے الفاظ پیش کر کے محترم سمپورنانند جی سے ایک سوال کر لیں ــــ جو انھوں نے موصوف کے مذکورہ انٹرویو پر اڈیٹر قومی آواز (لکھنؤ) کے نام ایک مراسلہ میں تحریر فرمائے تھے، اور مذکورہ اخبار میں شائع ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر (سمپورنانند) صاحب کے اس بیان میں پہلی مرتبہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ موصوف ہندوستان کی قدیم مسلمان شخصیتوں کو بھی موجودہ ہندستانی نسل کا پوروج سمجھتے ہیں اور ان کی عظمت کا اعتراف اور ان سے تعلق کا اظہار جائز سمجھتے ہیں۔ انھیں کے بیان سے یہ انکشاف بھی نہایت خوشگوار ہے کہ انھوں نے پبلک میٹنگ میں بھی کئی بار اورنگ زیب تک کو ہندستانی پوروج تسلیم کیا ہے۔ ہم اس پر کوئی جرح کرنا نہیں چاہتے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر کس پبلک میٹنگ میں ہوئی تھی اور اس کی روئداد کس اخبار میں شائع ہوئی، ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اطلاع پر شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم ادب کے ساتھ یہ ضرور پوچھیں گے کہ جہاں انھوں نے مسلمانوں کو اتنی بلند آہنگی کے ساتھ اور بار بار تلقین کی ہے وہ غیر مسلم ہندستانی شخصیتوں کو اپنا پوروج تسلیم کریں اور ان پر فخر کرنا سیکھیں، اکثریت کو انھوں نے کتنے مرتبہ مسلمان شخصیتوں کے پوروج تسلیم کرنے اور ان پر فخر کرنے کی تلقین فرمائی ہے، اور ان دونوں باتوں کا تناسب انکی تقریروں اور بیانوں میں کیا رہا ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ عرصہ سے اپنی کسی اہم تقریر اور مضمون میں مسلم اقلیت کے حق میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے اس نکتہ کو فراموش نہیں فرماتے لیکن ایک ایسی اکثریت جس کے اندر کسی بڑی سے بڑی لائق فخر مسلم شخصیت کو ہندستانی تک تسلیم نہ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کے بہت سے مصنف اور مفکر آٹھ سو برس کے اس دور کو جو ہندستان کی تاریخ کا جدا نہ کیا جا سکنے والا جز اور بیش قیمت سرمایہ ہے بدیشی اور سامراجی دور سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے سامنے اس نکتہ کے بیان میں وہ ایسی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور مسلمان شخصیتوں کو بھی اپنا پوروج ماننے کی تلقین ایسی دبی زبان سے کرتے ہیں کہ اگر وہ خود اس بیان میں اس کی اطلاع نہ دیتے تو کسی کو اس کا علم نہ ہوتا۔"

University Library,
HYDERABAD (DECCAN)
الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ
ہماری دعوت
مسئول
محمد منظور نعمانی
مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہندوستان و پاکستان سے

سالانہ چندہ - چھ روپئے

ششماہی - تین روپئے

فی کاپی آٹھ آنے (۸/)

غیر ممالک سے

سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ

اعزازی خریداروں سے

سالانہ چندہ ۱۵/

جلد ۲۹ | بابتہ رجب ۱۳۸۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۱ عیسوی | شمارہ ۹

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۳ جنوری ۱۹۶۲ء تک دفتر میں ضرور آجانی چاہئیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار } اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری } خط و کتابت اور منی آرڈر پر اپنا نمبر خریداری لکھنا ہرگز نہ بھولئے۔

تاریخ اشاعت } الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۳۰ تاریخ کے اندر آنی چاہئیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں
از مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تشدّد اور عدمِ تشدّد

چودہ برس کے صبر و ضبط کے بعد گوا کی آزادی کے لئے ہندوستان کو بالآخر عدم تشدد کی پالیسی چھوڑ کر تشدد اور فوجی اقدام کا راستہ اختیار کرنا پڑا، یعنی

تنگ آمد بجنگ آمد

بین الاقوامی مصلحت کا تقاضا تھا کہ ہندوستان اپنے پرتگالی مقبوضات کی واپسی کے لئے پُر امن جد و جہد کرتا رہے، جنگ سے گریز کرے اور گفت و شنید اور دوسرے اثرات سے کام لے کر مقصد برآری کی کوشش کرے، چودہ سال تک ہندوستان نے یہی راہ اپنائے رکھی، لیکن پرتگال اس نرم اور مصالحانہ پالیسی سے اور ڈھیٹ ہوتا چلا گیا، اُسے غلط فہمی ہوگئی کہ عدم تشدد کا ماننے والا ہندوستان اُس کی جارحیت کا جواب کبھی طاقت سے نہ دے گا۔ ہندوستان اپنے ایک جائز حق کے حصول میں عدم تشدد اور صلح پسندی کی طاقت کو ناکام دیکھکر مجبور ہوگیا کہ بین الاقوامی حالات کے تقاضے اور مصالح نیز اپنی ایک خاص شہرت اور وقار کے سوال کو نظر انداز کرے اور فوجی طاقت کے زور پر پرتگالی جارحیت کو ختم کرے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ عدم تشدد اور صلح جوئی ہر موقع کی دوا نہیں ہے، اور بالکل ضروری نہیں ہے کہ ہر جبر و جارحیت کے مقابلہ میں یہ حربہ کارگر ہو سکے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو عدم تشدد اور اہنسا کا منادی و مبلغ ہندوستان کبھی گوا پر طاقت

کے استعمال کی بات نہ سوچا۔ حقیقت یہی ہے کہ عدم تشدد اور صلح جوئی کی ایک حد ہے اور اس حد سے آگے عدم تشدد پر کاربند رہنا ہلاکت، جب دیکھا جاتا ہو کہ ظالم طاقت عدم تشدد کی اخلاقی اپیل سے متاثر ہونے کے بجائے، ظالم سے ظالم تر بنتی جا رہی ہے تو انسانی شرافت غیرت اور اخلاقی مصلحت ہر ایک کا تقاضہ یہ ہے کہ ظلم کی طاقت پر ایک کاری ضرب لگائی جائے اور ظالم کا حوصلہ توڑ دیا جائے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا

قرآن نے مکہ کے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (کفار مکہ کے ظلم پر ہاتھ روکے رہو اور نماز قائم کرو) مگر جب مکہ چھوڑ دینے پر بھی ظالموں کو صبر نہیں آیا اور مدینہ پر ترکتازیاں ہونے لگیں تو مذکورہ بالا الفاظ میں فرمایا گیا کہ اب حد ہو گئی، اب دنیا نے دیکھ لیا کہ سراسر یک طرفہ ظلم اور جارحیت ہے اس لئے اجازت دی جاتی ہو کہ مسلمان بھی ہتھیار اٹھائیں اور حملہ آوروں کو طاقت سے جواب دیں۔ چنانچہ پھر ظلم کی کمر ٹوٹ گئی، اور ایسا مثالی امن قائم ہوا، جس کی نظیر نہیں ملتی۔

عدم تشدد کے باب میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مظلوم جماعت، مظلوم گروہ اور مظلوم قوم اگر قصد و ارادہ کے ساتھ ضبط سے کام لے رہی ہے تو اس کا نام عدم تشدد ہے اور اس میں مظلوم قوم کیلئے بجز مادی نقصانات کے اور کوئی خطرہ نہیں، لیکن اگر کوئی جماعت اور کوئی قوم بزدلی، کم ہمتی اور تھڑدلی کے ماتحت ہاتھ باندھ کر مار کھاتی ہے، تو یہ اس قوم اور اس جماعت کے جانی، مالی اور دیگر مادی نقصانات کے ساتھ اسکی اخلاقی گراوٹ انسانی پستی اور مستقبل کی تاریکی کا بھی پیش خیمہ ہے۔

پھر عدم تشدد بذات خود کوئی خوبی اور کوئی طاقت نہیں ہے، اس میں خوبی مقصدیت سے پیدا ہوتی ہے اور طاقت اس وقت آتی ہے جب جاں سپاری اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا جائے، ظالم ایک سر اڑائے تو دس سر اسکی جگہ لیتے ہوئے نظر آئیں، ایک سینے پر گولی

پڑے تو دس سینے اُسکی جگہ پر تن جائیں، ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے جانباز سرخ پوشوں کو یاد کیجئے، جنھوں نے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں انگریز افسر کا حکم ماننے سے انکار کرکے گولیوں کا چیلنج قبول کرنے کے لئے سینے کھولدیئے، اور اس شان سے کھولے کہ اپنی خوشی سے چند منٹ میں سینکڑوں لاشے زمین پر تڑپتے ہوئے نظر آئے —— یہ ہے وہ عدم تشدد جس میں طاقت ہوتی ہے اور جس کی طاقت سے ظلم لرزہ براندام ہوجاتا ہے۔

فروری ۱۹۶۱ء میں جبل پور اور اُسکے قریبی اضلاع میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد کی جو قیامت ٹوٹی، اس پر ملک بھر میں جو ایک ایسا ہمدردانہ تأثر ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اس کا حوالہ دیتے ہوئے ایک ہم عصر قوم پرست روزنامے نے لکھا تھا کہ یہ عدم تشدد کا پھل ہے، مسلمانوں نے جو اتنی بڑی غارتگری کے جواب میں کسی کی نکسیر نہیں پھوڑی یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ظالموں پر اس قدر لے دے ہو رہی ہے۔ اور فرقہ وارانہ جارحیت کے خلاف ایک عمومی ردعمل ہوا ہے —— ہم اس منطق کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے۔ اس لئے کہ جبل پور وغیرہ کے مسلمانوں نے بے شک تشدد کا مقابلہ تشدد اور طاقت سے نہیں کیا، لیکن یہ وہ عدم تشدد نہیں جس میں کوئی خوبی اور کوئی تاثیر ہو، اِن مظلوم مسلمانوں سے عام ہمدردی اِن کے عدم تشدد کی وجہ سے نہیں ہوئی، اِن کی بے پناہ مظلومیت اور ظلم کی انتہا کی وجہ سے ہوئی۔ ظلم ہی اس درجہ کا تھا کہ پتھر دل کے دل بھی پسیج جاتے تو عجب نہیں تھا۔ بے شک خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کی اس مظلومیت سے ایک حرکت ملک کے ضمیر میں ہوئی، مگر مسلمانوں کے کسی خیر خواہ کی یہ انتہائی بے دانشی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل پر جو جبل پور کے واقعات میں نظر آتا ہے خوشی کا اظہار کرے۔ اور اس طرح یہی راہ پورے ملک کے مسلمانوں کو دکھانے کی کوشش کرے —— یہ عدم تشدد تو گاندھی جی کی نظر میں بھی تشدد سے بدتر تھا۔ انھوں نے کبھی کمزوری اور بے ہمتی کے عدم تشدد کی نہیں، طاقت اور جرأت کے عدم تشدد کی تلقین کی تھی۔ مسلمان ہوں یا کوئی اور ہو کسی کا بھی کمزوری اور کم ہمتی کے ماتحت عدم تشدد نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ اس میں کوئی

تاثیر۔ اس عدم تشدد سے ظالموں کا حوصلہ ٹوٹتا نہیں، بڑھتا ہے، اور اسکے برعکس مظلوموں کی پوری جماعت اور پوری قوم کی ہمتیں پست ہوتی ہیں، اُن کے دل ٹوٹتے ہیں اور اس طرح وہ جی چھوڑ بیٹھتے ہیں کہ جس وقت جو چاہے انھیں لقمہ تر بنالے۔ عدم تشدد یا تو اس طرح کا ہونا چاہیئے جس کی مثال شہیدانِ پشاور نے پیش کی، جو ہنستے ہنستے سر ہتھیلیوں پر لئے بیٹھے ہیں۔ یہ موت سے بھاگتے نہیں اس طرح پیار کرتے ہیں جیسے کوئی زندگی سے پیار کرتا ہو۔ اس لئے اِن کی زندگیوں سے کھیلنے کا کھیل خطرناک بھی ہوسکتا ہے ——— اس عدم تشدد میں بے شک ایک طاقت ہے، ایک حُسن ہے، ایک اثر ہے۔ اور ایسا اثر ہے جس سے ظالموں کے حوصلے پست ہوجائیں اور مظلوموں کی جماعت قربانی اور جانبازی کے نشہ سے سرشار ہوجائے۔ لیکن اگر کسی میں یہ دم خم، یہ حوصلہ اور یہ جاں سپاری نہیں ہے تو پھر اس کے سر چھپاتے، جان بچاتے اور تھرڈ دلی دکھاتے ہوئے مارے جانے اور گھر لٹوانے کو قابل فخر عدم تشدد کا نام دے کر اسکو بزدلی پر نازاں نہیں بنانا چاہیئے، بلکہ اس سے کہنا چاہیئے کہ یا تو موت سے پیار دکھاتے ہوئے عدم تشدد کی راہ اپناؤ ورنہ بزدلی کی موت مارے جانے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے بچاؤ (سلف ڈیفنس) کے قانونی حق کے مطابق بھرپور طاقت سے جواب دو، اور مارا ہی جانا ہے تو بزدلی کی بیماری پھیلاتے ہوئے مت مارے جاؤ ———
جس کو جان سے اتنا پیار ہے کہ وہ اپنی خوشی سے جان ہتھیلی پر رکھ کر موت کے سامنے نہیں آسکتا تو پھر یہی راہ اس کے لئے عقل و دانش کی ہے کہ وہ موت کا اپنے ممکن ذرائع سے مقابلہ کرے جو نہ جان اپنی خوشی سے موت کے سامنے رکھے اور نہ موت کے دیو سے لڑ کر اسکو زیر کرنے کی کوشش کرے تو یہ بیوقوفی بھی ہے اور قطعی ہلاکت بھی! اسی عقلی بنیاد پر بالکل صحیح ہے، عدم تشدد کے معلّم گاندھی جی کا یہ کہنا کہ "بزدلانہ عدم تشدد تشدد سے بھی بدتر ہے" اور "جو تشدد کا مقابلہ مردانہ وار عدم تشدد سے نہیں کرسکتا اسکو چاہیئے کہ تلوار لے اور تلوار سے تلوار کا مقابلہ کرے"[۱]

---

[۱] اسی گوا کے تصفیہ میں پنڈت نہرو نے اپنی ۲۸ دسمبر کی پریس کانفرنس میں گاندھی جی کے حوالہ سے یہ الفاظ کہے ہیں۔

IF ONE COULD NOT FIGHT NON-VIOLENTLY WITH COURAGE, ONE SHOULD TAKE OUT A SWORD AND FIGHT. (NATIONAL HERALD - DEC.29. P.5.COL.5)

معارف الحدیث

(مسلسل)

امامت

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، دین کے تمام اعمال میں سب سے اہم اور مقدم نماز ہے اور دین کے نظام میں اس کا درجہ اور مقام گویا وہی ہے جو جسم انسانی میں قلب کا ہے، اس لیے اس کی امامت بہت بڑا دینی منصب، اور بڑی بھاری ذمہ داری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طرح کی نیابت ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ امام ایسے شخص کو بنایا جائے جو موجودہ نمازیوں میں دوسروں کی بہ نسبت اس عظیم منصب کے لیے زیادہ اہل اور موزوں ہو، اور وہ وہی ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبۃً زیادہ قرب و مناسبت حاصل ہو اور آپ کی دینی وراثت سے جس نے زیادہ حصہ لیا ہو، اور چوں کہ آپ کی وراثت میں اول اور اعلیٰ درجہ قرآن مجید کا ہے اس لیے جس شخص نے سچا ایمان نصیب ہونے کے بعد قرآن مجید سے خاص تعلق پیدا کیا، اس کو یاد کیا اور اپنے دل میں آتارا، اس کی دعوت، اس کی تذکیر اور اس کے احکام کو سمجھا، اس کو اپنے اندر جذب اور اپنے اوپر طاری کیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے خاص حصہ داروں میں ہوگا، اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اس سعادت میں اس سے پیچھے ہوں گے آپ کی اس نیابت یعنی امامت کے لیے زیادہ اہل اور زیادہ موزوں ہوگا۔ اور اگر بالفرض سارے نمازی اس لحاظ سے برابر ہوں تو چونکہ قرآن مجید کے بعد سنت کا درجہ ہے اس لیے اس صورت میں ترجیح اس کو دی جائے گی جو سنت و شریعت کے علم میں دوسروں کے مقابلہ میں امتیاز رکھتا ہوگا۔ اور اگر بالفرض اس لحاظ سے بھی سب برابر کے سے ہوں، تو پھر جو کوئی ان میں تقویٰ اور پرہیزگاری اور

محاسنِ اخلاق جیسی دینی صفات کے لحاظ سے ممتاز ہوگا امامت کے لیے وہ لائقِ ترجیح ہوگا۔ اور اگر بالفرض اس طرح کی صفات میں بھی یکسانی سی ہو تو پھر عمر کی بڑائی کے لحاظ سے ترجیح دی جائے گی۔ کیونکہ عمر کی بڑائی اور بزرگی بھی ایک مسلّم فضیلت ہے۔

بہرحال امامت کے لیے یہ اصولی ترتیب عقلِ سلیم کے بالکل مطابق اور مقتضائے حکمت ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت ہے۔

امامت کی ترتیب :-

(۴۹) عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُھُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَاءَۃِ سَوَاءً فَاَعْلَمُھُمْ بِالسُّنَّۃِ فَاِنْ کَانُوْا فِی السُّنَّۃِ سَوَاءً فَاَقْدَمُھُمْ ھِجْرَۃً فَاِنْ کَانُوْا فِی الْھِجْرَۃِ سَوَاءً فَاَقْدَمُھُمْ سِنًّا وَلَا یَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِیْ سُلْطَانِہٖ وَلَا یَقْعُدُ فِیْ بَیْتِہٖ عَلٰی تَکْرِمَتِہٖ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ـــــــ

ـــــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جماعت کی امامت وہ شخص کرے جو ان میں سب سے زیادہ کتاب اللہ کا پڑھنے والا ہو، اور اگر اس میں سب یکساں ہوں تو پھر وہ آدمی امامت کرے جو سنت و شریعت کا زیادہ علم رکھتا ہو، اور اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو وہ جس نے پہلے ہجرت کی ہو، اور اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں (یعنی سب کا زمانۂ ہجرت ایک ہی ہو) تو پھر وہ شخص امامت کرے جو سن کے لحاظ سے مقدم ہو، اور کوئی آدمی دوسرے آدمی کے حلقۂ سیادت و حکومت میں اس کا امام نہ بنے اور اس کے گھر میں اس کے بیٹھنے کی خاص جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے لفظ "اَقْرَأُھُمْ لِکِتَابِ اللّٰہِ" کا لفظی ترجمہ وہی ہے جو بیان کیا گیا ہو یعنی کتاب اللہ کا زیادہ پڑھنے والا" لیکن اس کا مطلب نہ تو صرف حفظ قرآن ہے اور نہ مجرد کثرتِ تلاوت، بلکہ اس سے مراد ہے حفظِ قرآن کے ساتھ دین کا خاص علم اور اس کے ساتھ خاص شغف۔ عہدِ نبوی میں جو

لوگ قُرّاء کہلاتے تھے اُن کا یہی امتیاز تھا، اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز کی امامت کے لیے زیادہ اہل اور موزوں وہ شخص ہے جو کتاب اللہ کے علم اور اس کے ساتھ شغف و تعلق میں دوسروں پر فائق ہو، اور ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں یہی سب سے بڑا دینی امتیاز اور فضیلت کا معیار تھا، اور جس کا اس سعادت میں جتقدر زیادہ حصہ تھا وہ اسی قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت و امانت کا حامل اور امین تھا، اس کے بعد سنت و شریعت کا علم فضیلت کا دوسرا معیار تھا (اور یہ دونوں علم یعنی علم قرآن اور علم سنت جس کے پاس بھی تھے، عمل کے ساتھ تھے۔ علم بلا عمل کا وہاں وجود ہی نہیں تھا)۔

فضیلت کا تیسرا معیار عہد نبوت کے اس خاص دور میں ہجرت میں سابقیت تھی اس لیے اس حدیث میں تیسرے نمبر پر اسی کا ذکر فرمایا گیا ہے، لیکن بعد میں یہ چیز باقی نہیں رہی اس لیے فقہائے کرام نے اس کی جگہ صلاح و تقوے میں فضیلت و فوقیت کو ترجیح کا تیسرا معیار قرار دیا ہے جو بالکل بجا ہے۔

ترجیح کا چوتھا معیار اس حدیث میں عمر میں بزرگی کو قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگر مذکورۂ بالا تین معیاروں کے لحاظ سے کوئی فائق اور قابل ترجیح نہ ہو تو پھر جو کوئی عمر میں بڑا اور بزرگ ہو وہ امامت کرے۔

حدیث کے آخر میں دو ہدایتیں اور بھی دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی آدمی کسی دوسرے شخص کی امامت و سیادت کے حلقہ میں جائے تو وہاں امامت نہ کرے بلکہ اس کے پیچھے مقتدی بن کر نماز پڑھے، (ہاں اگر وہ شخص خود ہی اصرار کرے تو دوسری بات ہے)۔

اور دوسری یہ کہ جب کوئی آدمی کسی دوسرے کے گھر جائے تو اس کی خاص جگہ پر نہ بیٹھے، ہاں اگر وہ خود بٹھائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ان دونوں ہدایتوں کی حکمت و مصلحت بالکل ظاہر ہے۔

اپنے میں سے بہتر کو امام بنایا جائے :۔

(۹۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْعَلُوْا اَئِمَّتَكُمْ خِيَارَكُمْ فَاِنَّهُمْ وَفْدُكُمْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ رَبِّكُمْ۔

(رواہ الدارقطنی والبیہقی و کنز العمال)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا تم میں جو اچھے اور بہتر ہوں ان کو اپنا امام بناؤ کیونکہ تمھارے رب اور مالک کے حضور میں وہ تمھارے نمائندے ہوتے ہیں۔ ——— (دار قطنی، بیہقی)

(**تشریح**) یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کے حضور میں پوری جماعت کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے خود جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس اہم اور مقدس مقصد کے لیے اپنے میں سے بہترین آدمی کو منتخب کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رونق افروز رہے خود امامت فرماتے رہے اور مرض وفات میں جب معذور ہو گئے تو علم و عمل کے لحاظ سے اُمت کے افضل ترین فرد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے نامزد اور مامور فرمایا ——— حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث میں حق امامت کی جو تفصیلی ترتیب بیان فرمائی گئی ہے اس کا منشا بھی دراصل یہی ہے کہ جماعت میں جو شخص سب سے بہتر اور افضل ہو اس کو امام بنایا جائے "اقرأهم لكتاب الله" اور "اعلمهم بالسنة" یہ سب اسی بہتری اور افضلیت فی الدین کی تفصیل ہے ——— افسوس ہے کہ بعد کے دور میں اس اہم ہدایت سے بہت تغافل برتا گیا اور اس کی وجہ سے اُمت کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔

امام کی ذمہ داری اور مسئولیت :-

(۹۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَمَّ قَوْمًا فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ وَلْيَعْلَمْ اَنَّهٗ ضَامِنٌ مَسْئُوْلٌ لِمَا ضَمِنَ وَاِنْ اَحْسَنَ كَانَ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ صَلّٰى خَلْفَهٗ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَا كَانَ مِنْ نَقْصٍ فَهُوَ عَلَيْهِ ———

——— (رواہ الطبرانی فی الاوسط، کنز العمال)

(**ترجمہ**) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جماعت کی امامت کرے اس کو چاہیے کہ خدا سے ڈرے اور یقین رکھے کہ وہ مقتدیوں کی نماز کا بھی ضامن یعنی ذمہ دار ہے اور اس سے اس ذمہ داری کے بارے میں بھی سوال ہوگا، اگر اس نے اچھی نماز پڑھائی تو پیچھے نماز پڑھنے والے سب مقتدیوں کے مجموعی ثواب کے برابر اس کو ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ مقتدیوں کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے، اور نماز میں جو نقص

اور قصور وار ہو گا اس کا بوجھ تنہا امام پر ہو گا۔ (معجم اوسط للطبرانی)

مقتدیوں کی رعایت:-

(۹۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيهِمُ السَّقِيمَ وَالضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَإِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَا شَاءَ ——— رواه البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی لوگوں کا امام بن کر نماز پڑھائے تو چاہیے کہ ہلکی نماز پڑھائے (یعنی زیادہ طویل نہ کرے) کیونکہ مقتدیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی اور بوڑھے بھی (جن کے لیے طویل نماز باعثِ زحمت ہو سکتی ہے) اور جب تم میں سے کسی کو بس اپنی نماز اکیلے پڑھنی ہو تو جتنی چاہے لمبی پڑھے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) بعض صحابہ کرام جو اپنے قبیلہ یا حلقہ کی مسجدوں میں نماز پڑھاتے تھے اپنے عبادتی ذوق وشوق میں بہت لمبی نماز پڑھتے تھے جس کی وجہ سے بعض بیمار یا کمزور یا بوڑھے یا تھکے ہوئے مقتدیوں کو کبھی کبھی بڑی تکلیف پہونچ جاتی تھی، اس غلطی کی اصلاح کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر اس طرح کی ہدایت فرمائی، آپ کا منشا اس سے یہ تھا کہ امام کو چاہیے کہ وہ اس بات کا لحاظ رکھے کہ مقتدیوں میں کبھی کوئی بیمار یا کمزور یا بوڑھا بھی ہوتا ہے اس لیے نماز زیادہ طویل نہ پڑھے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ اور ہر وقت کی نماز میں بس چھوٹی سے چھوٹی سورتیں ہی پڑھی جائیں اور رکوع، سجدہ میں تین دفعہ سے زیادہ تسبیح بھی نہ پڑھی جائے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی معتدل نماز پڑھاتے تھے وہی اُمت کے لیے اس بارہ میں اصل معیار اور نمونہ ہے۔ اور اسی کی روشنی میں ان ہدایات کا مطلب سمجھنا چاہیے ——— انشاء اللہ وہ حدیثیں آگے اپنے موقعہ پر آئیں گی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تفصیلی کیفیت اور قرأت وغیرہ کی مقدار معلوم ہو گی۔

(۹۸) عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو مَسْعُودٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ

فَلَانٍ مِمَّا يُطِيلُ بِنَا فَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فِي مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَباً مِنْهُ يَوْمَئِذٍ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ
فَاَيُّكُمْ مَا صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ
وَذَا الْحَاجَةِ ——————— رواہ البخاری و مسلم

(ترجمہ) قیس بن ابی حازم سے روایت ہے کہ مجھ سے ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ بخدا میں فلاں شخص کی وجہ سے صبح کی نماز میں شریک نہیں ہوتا (مجبوراً اپنی نماز الگ پڑھتا ہوں) کیونکہ وہ بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں (جو میرے بس کی نہیں) ۔ حدیث کے راوی ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس بارہ میں خطبہ دیا، اور میں نے کبھی آپ کو وعظ اور خطبہ کی حالت میں اس دن سے زیادہ غضبناک نہیں دیکھا، پھر اس خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو (اپنے غلط طرز عمل سے اللہ کے بندوں کو) دور بھگانے والے ہیں، جو کوئی تم میں سے لوگوں کا امام بنے اور ان کو نماز پڑھائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ نماز مختصر پڑھائے (زیادہ طویل نہ پڑھائے) کیونکہ ان میں ضعیف بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی اور حاجت والے بھی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ صحابی جن کے طویل نماز پڑھانے کی شکایت اس حدیث میں مذکور ہوئی ہے، حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں، اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ہی میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا بھی مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ عام طور سے نماز عشاء دیر کر کے پڑھتے تھے، ایک دن حسب معمول نماز دیر سے شروع کی اور اس میں سورۂ بقرہ پڑھنی شروع کر دی، مقتدیوں میں سے ایک صاحب نے جو بیچارے دن بھر کے تھکے ہارے تھے، نیت توڑ کے اپنی نماز الگ پڑھی اور چلے گئے، آخر معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، آپ نے حضرت معاذ کو ڈانٹا اور فرمایا: "اَفَتَّانٌ اَنْتَ يَا مُعَاذُ" (اے معاذ کیا تم لوگوں کے لیے باعث فتنہ بننا چاہتے ہو اور ان کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہو) آگے اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ان سے

فرمایا کہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، اور وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى، اور وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى یہ سورتیں پڑھا کرو۔

(۹۹) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلٰوةِ وَأَنَا أُرِيدُ إِطَالَتَهَا فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ۔

—— رواہ البخاری

(ترجمہ) ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا ارادہ کچھ طویل پڑھنے کا ہوتا ہے، پھر میں کسی بچہ کے رونے کی آواز سن لیتا ہوں تو نماز میں اختصار کر دیتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کے رونے کی آواز سے اس کی ماں کا دل کتنا زیادہ پریشان ہوگا۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھانے کی حالت میں جب کسی بچہ کے رونے کی آواز میرے کان میں آ جاتی ہے تو میں اس خیال سے کہ شاید اس بچہ کی ماں جماعت میں شریک ہو اور اس کے رونے سے اس کا دل پریشان ہو رہا ہو، میں نماز مختصر پڑھ کے جلدی ختم کر دیتا ہوں۔

(۱۰۰) عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ إِمَامٍ قَطُّ أَخَفَّ صَلٰوةً وَلَا أَتَمَّ صَلٰوةً مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنْ كَانَ لَيَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَيُخَفِّفُ مَخَافَةَ أَنْ تُفْتَنَ أُمُّهُ۔

—— رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی امام کے پیچھے ایسی نماز نہیں پڑھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے ہلکی اور ساتھ ہی مکمل ہو، (یعنی آپ کی نماز ہلکی بھی ہوتی تھی اور بالکل مکمل بھی) اور ایسا ہوتا تھا کہ نماز پڑھانے کی حالت میں کسی بچے کے رونے کی آواز آپ سن لیتے تو نماز کو مختصر اور ہلکا

کرتے اس خطرہ کی وجہ سے کہ اس کی ان بچہ ہو۔ (اور اس بیچارے کی نماز خراب ہو)

(صحیح بخاری، وصحیح مسلم)

(تشریح) امام کے لیے صحیح معیار اور رہنما اصول یہی ہے کہ اس کی نماز ہلکی پھلکی ہو اور ساتھ ہی مکمل اور تام بھی، یعنی ہر رکن اور ہر چیز ٹھیک ٹھیک اور سنت کے مطابق ادا ہو جس کی تفصیلات انشاء اللہ آئندہ اپنے موقع پر آئیں گی۔

مقتدیوں کو ہدایت :-

(۱۰۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبَادِرُوا الْاِمَامَ اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ وَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ ——— رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو امام پر سبقت نہ کرو، (بلکہ اس کی اتباع اور پیروی کرو) جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو، اور جب وہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب وہ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہے تو تم اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہو۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ نماز کے تمام ارکان اور اجزاء میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے رہنا چاہیے۔ کسی چیز میں بھی اس پر سبقت نہیں کرنی چاہیے ——— مسند بزار میں ابوہریرہ رضی ہی کی روایت سے ایک حدیث مروی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدہ سے سر اٹھاتا ہے، اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے ایسا کراتا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ ہی کی روایت سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدہ سے سر اٹھاتا ہے اس کو ڈرنا چاہیے کہ مبادا اس کا سر گدھے کا سا نہ کر دیا جائے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

(۱۰۲) عَنْ عَلِيٍّ وَّمُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَا. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. إِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الصَّلٰوةَ وَالْاِمَامُ عَلٰى حَالٍ فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْاِمَامُ ــــــــ رواہ الترمذی

(ترجمہ) حضرت علی اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے آئے اور امام کسی حال میں ہو (یعنی وہ قیام یا رکوع یا سجدہ وغیرہ میں ہو) تو آنے والے کو چاہیے کہ جو امام کر رہا ہو وہی کرے۔ (جامع ترمذی)

(۱۰۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جِئْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ وَنَحْنُ سُجُوْدٌ فَاسْجُدُوْا وَلَا تَعُدُّوْهُ شَيْئًا وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ ــــــــ رواہ ابوداؤد

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کو آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو تم سجدہ میں شریک ہو جاؤ اور اس کو کچھ شمار نہ کرو، اور جس نے امام کے ساتھ رکعت پالیا اس نے نماز (یعنی نماز کی وہ رکعت) پالی۔

(سنن ابو داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ مقتدی اگر امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہو جائے تو رکعت کی شرکت کے قائم مقام ہے، اور اگر صرف سجدہ میں شرکت ہو سکے تو اگرچہ اللہ تعالیٰ اس سجدہ کا بھی پورا ثواب یقیناً عطا فرمائیں گے لیکن یہ سجدہ رکعت کے قائم مقام نہ ہوگا بلکہ وہ شمار بھی نہ ہوگا۔

شیخ مجدّدؒ کے اصلاحی کارنامے

(از جناب پروفیسر مسعود احمد صاحب، حیدرآباد سندھ)

(۵)

ردِّ بدعات

اس غلط تصور سے کہ شریعت و طریقت دو علیحدہ حقیقتیں ہیں، ایک طرف تو تکلیفاتِ شرعیہ کی ادائیگی میں تساہل پیدا ہوگیا، دوسری طرف بدعات کا زور ہوا۔ اس لیے شیخ مجدد نے جہاں یہ بتایا کہ شریعت و طریقت دو علیحدہ حقیقتیں نہیں ہیں، وہاں یہ بھی بتایا کہ بدعت خواہ حسنہ ہو یا سیئہ متابعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں غیر مستحسن ہے، چنانچہ خواجہ عبدالرحمٰن کابلی کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ فقیر حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے ظاہر و باطن طریقہ پر نہایت تضرع و زاری، التجا و افتقار، اور ذلّ و انکسار کے ساتھ دعا کرتا ہے کہ دین میں جو نئی نئی باتیں نکل آئی ہیں، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین علیہم السلام کے عہد مبارک میں نہ تھیں، خدا مجھ کو اس عمل محدث میں گرفتار نہ کرے، اگرچہ وہ صبح کے اجالے کی طرح ہی کیوں نہ چمک رہا ہو۔ اور اس بدعت کا شیدا بھی نہ کرے (بحرمت سید الختار و آلہ الابرار علیہ و علیہم الصلوات والسلام) کہتے ہیں کہ بدعت دو قسم کی ہوتی ہے، حسنہ اور سیئہ، حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین (علیہ و علیہم من الصلوات اتمہا و من التحیات اکملہا)

کے زمانۂ مبارک کے بعد ایجاد ہوا ہو اور رفع سنت بھی نہ کرتا ہو، سیئہ وہ عمل ہے جو رافع سنت بھی ہو۔ اس فقیر کو ان دونوں قسم کی بدعتوں میں سے کسی میں بھی حُسن و نورانیت نظر نہیں آتی اور سوائے ظلمت و کدورت کے اور کچھ محسوس نہیں ہوتا، بالفرض اگر آج کچھ لوگ عمل مبتدع میں ضعف بصارت کی وجہ سے خوبی و نضارت پاتے ہیں تو جب دہ صحیح النظر ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خسارت و ندامت کے اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔

به وقت صبح شود همچو روز معلومت
که باکه باختهٔ عشق در شب دیجور[1]

یہ مکتوب بہت طویل ہے، مذکورہ بالا تحریر کے بعد شیخ مجددؒ نے بدعات حسنہ کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اور پھر ان کی برائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ من جملہ ان تمام بدعات کے آپ نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ زبان سے نماز کی نیت پر اصرار کرنا ایک ایسی بدعت ہے جس سے غفلت قلبی کا قوی احتمال ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہی بدعت ہے جو علماء نے نیت نماز میں مستحسن بنا رکھی ہے (وہ کہتے ہیں) کہ ارادہ قلب کے باوجود زبان سے ضرور نیت کرنی چاہیے، حالانکہ یہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، نہ روایت صحیح سے اور نہ روایت ضعیف سے، اور نہ صحابۂ کرام و تابعین عظام سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے نماز میں زبان سے نیت کی تھی۔ بلکہ وہ تو اقامت کے فوراً ہی بعد تکبیر تحریمہ کہتے تھے۔ پس زبان سے نیت کرنا بدعت ہوگا اور اس بدعت کو حسنہ کہا گیا ہے۔ یہ فقیر تو یہ کہتا ہے کہ اس بدعت سے سنت تو کجا فرض بھی چھوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ نیت کرنے میں بہت سے لوگ صرف زبانی نیت کر لینے پر اکتفا کرتے ہیں اور دل کی غفلت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ پس اس صورت میں نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ترک ہو جاتا ہے یعنی نیت قلبی اور اس سے نماز کے فساد کی نوبت آ پہنچتی ہے" (ایضاً ص ۷۲)

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نماز میں یکسوئی کے اس اہتمام کے باوجود شیخ مجددؒ نماز میں تصور شیخ کو منافی نماز خیال نہیں کرتے بلکہ اس کو مستحسنات میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ ایک مکتوب میں خواجہ

---

[1] درۃ المعرفت، حصہ سوم، مطبوعہ امرتسر، ۱۳۲۳ھ۔ مکتوب ۱۸۶، ص ۷۲

محمد اشرف کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"نجیب الطرفا! یہ دولت تو طالبوں کی مطلوب ہے۔ ہزاروں میں سے کسی ایک کو دیجاتی ہے۔ جس پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے وہ مستعد تام المناسبت ہے اور قریب ہو کہ رہنمائے طریقت کی تھوڑی سی صحبت سے اس کے تمام کمالات کو اپنے اندر جذب کر لے، آپ رابطہ کی کیوں نفی کرتے ہیں۔ وہ تو مسجود الیہ ہے نہ کہ مسجود لہٗ (اگر یہی بات ہے) تو پھر محرابوں اور مسجدوں کی کیوں نفی نہیں کرتے ہیں؟ اس قسم کی دولت کا ظہور سعادت مندوں ہی کو میسر ہوتا ہے۔ تاکہ وہ تمام احوال میں صاحب رابطہ کو اپنا وسیلہ سمجھے اور ہر وقت اسی کی طرف متوجہ رہے، نہ کہ اس بے دولت جماعت کی طرح جو خود کو اس سے بے نیاز سمجھتی ہے۔ اور قبلہ توجہ کو اپنے شیخ سے منحرف کرتی ہے، اور اپنے معاملہ کو درہم برہم کر دیتی ہے"[۵۱]

اتباع سنت پر زور دیتے ہوئے شیخ مجددؒ نے ہر بدعت کی مخالفت کی ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ شیخ مجددؒ لفظ بدعت ہی کے مخالف تھے، تفصیلات کے لیے مکتوبات شریف کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

احیائے شریعت شیخ مجددؒ نے اپنے بیشمار مکاتیب میں ظاہر شریعت اور باطن شریعت کی پیروی پر بڑا زور دیا ہے اور شریعت کی پیروی ہی کو تمام بدعات کا علاج اور انسانی سعادت کی معراج بتایا ہے، احیائے شریعت کے سلسلے میں شیخ مجددؒ نے جو کارنامے انجام دیئے اس کو غیر مسلم فضلاء نے بھی سراہا ہے۔ چنانچہ پروفیسر ایس' ایچ، اے، آر، گب لکھتا ہے:۔

"سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں چند ممتاز فضلاء نے یکے بعد دیگرے شریعت اسلامیہ کے قیام کی سعی کی، انھوں نے صرف ظاہر شریعت ہی پر نہیں باطن شریعت پر خاص طور سے زور دیا اور مذہب کی نفسیاتی اور اخلاقی خوبیوں کو اُجاگر کیا لیکن اس تحریک پر پوری توجہ نہیں دی گئی۔ اس تحریک کی ممتاز شخصیتیں یہ ہیں، ملک شام کے عبدالغنی نابلسی (۱۶۴۱ء تا ۱۷۳۱ء) ہندوستان کے احمد سرہندی (۱۵۶۳ء تا ۱۶۲۴ء) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۲ء تا ۱۷۶۲ء)"[۵۲]

---

[۵۱] زبدۃ المقامات، حصہ ششم، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ، مکتوب ۳۰ ص ۷۰۔

[۵۲] Mohammadanism, London 1955-P.125

پروفیسر گب نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے وہ شیخ مجددؒ کے اس مکتوب میں بھی ہے، جو سید شاہ محمد کے نام تحریر فرمایا ہے:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت دینی اور دنیوی سعادت کا سرمایہ ہے، اس کے مختلف درجات اور مراتب ہیں..... متابعت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان اقوال و اعمال کی پیروی کی جائے جن کا تعلق باطن سے ہے، اور جن سے تہذیب اخلاق سے آراستگی اور صفات ذمیمہ اور باطنی امراض کا ازالہ مقصود ہو، یہ درجہ ارباب سلوک کے لیے مخصوص ہے۔"

(نور الخلائق، مکتوب ۵۴) (مولوی سکندر علی: ہدیہ مجددیہ مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۱۳۶)

شیخ مجددؒ نے ارکان سلطنت اور اپنے مریدین و معتقدین کو بے شمار خطوط لکھے ہیں جن میں اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی تاکید کی گئی ہے، ہم صرف اُن خطوط کے اقتباسات پیش کریں گے جو دفتر اول (موسوم بہ درالمعرفت ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء، مرتبہ خواجہ یار محمد بدخشیؒ) میں ارکان سلطنت اور اعیان دولت کے نام لکھے گئے ہیں، اور جن میں اتباع شریعت کی تلقین کی گئی ہے۔ شیخ فرید بخاری کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"کل قیامت کے دن شریعت کے متعلق پوچھا جائے گا، تصوف کی پرسش نہ ہوگی، دخول جنت اور تقرب محبوب، اتباع شریعت سے وابستہ ہے، انبیاء علیہم السلام جو کائنات میں سب سے افضل ہیں انھوں نے شریعت ہی کی طرف دعوت دی ہے۔ اور نجات اخروی کا مدار بھی اسی پر ہے، ان اکابر کی بعثت سے مقصود تبلیغ شریعت ہے۔ پس سب سے بڑھ کر نیکی یہی ہے کہ شریعت کی ترویج میں کوشش کی جائے۔ اور احکام شرعیہ کے کسی حکم کو بھی زندہ کیا جائے، خصوصاً ایک ایسے دور میں جب کہ شعائر اسلام منہدم ہو گئے ہیں۔" (درالمعرفت، حصہ دوم، مکتوب ۴۷ ص ۲۱ مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ)

خواجہ جہان کے نام عربی میں ایک مکتوب ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:-

"...... یہ سب کچھ، بلکہ روح، سر خفی اور اخفی کے جتنے بھی کمالات ہیں وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے وابستہ ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، اور تابعین کرام کی متابعت کریں، یہ لوگ ہدایت کے تارے اور ولایت کے خورشید ہیں۔ پس جو شخص بھی ان کی متابعت سے مشرف ہوا، اس نے بڑی کامیابی حاصل کی، اور جو شخص ان کی مخالفت پر آمادہ ہوا تو وہ

بڑی ہی گمراہی میں گر پڑا۔"　　(ایضاً حصہ اول، مکتوب ۳۵، ص ۹۹)

بہادر خاں کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ظاہر کو شریعت غرا کے ظاہر سے آراستہ کرنا اور باطن کو ہمیشہ حق جل وعلا سے وابستہ رکھنا بڑا ہی اونچا کام ہے، دیکھیں کس خوش قسمت کو ان دو عظیم نعمتوں سے مشرف کیا جاتا ہے۔! آج ان دونوں نسبتوں کا یک جا ہونا بلکہ صرف ظاہر شریعت ہی پر مستقیم رہنا بھی بہت ہی نادر الوجود ہے۔۔۔۔ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے کمال کرم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی متابعت پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔"　　(ایضاً حصہ دوم، مکتوب ۴۷، ص ۷۰-۷۱)

شیخ فرید بخاری کے نام ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت کا عین قرار دیا ہے۔ پس خدائے عزوجل کی ایسی اطاعت جو غیر رسول کی اطاعت کے وسیلہ سے کی جا رہی ہو اس کی اطاعت نہیں ہے۔ اس پر زور دینے کے لیے کلمہ "قد" لایا گیا۔ تاکہ کوئی بوالہوس ان دونوں اطاعتوں کے درمیان فرق وجدائی نہ پیدا کر سکے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ دے۔ دوسری جگہ حق سبحانہ وتعالیٰ ان لوگوں کی شکایت فرماتے ہیں جنھوں نے ان دو اطاعتوں میں فرق کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۝۔

(ایضاً حصہ سوم، مکتوب ۱۵۲، ص ۳۰)

عبد الرحیم خان خاناں کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سعادت ابدی اور نجات سرمدی متابعت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ وابستہ ہے، بالفرض اگر ہزار سال عبادت کی جائے اور سخت سے سخت ریاضتیں اور مشکل سے مشکل مجاہدات کیے جائیں، مگر ان حضرات کے نور متابعت سے سینے منور نہ ہوں تو ان تمام ریاضات اور مجاہدات کو ایک جو کے بدلے بھی نہ خریدا جائے گا، لیکن اگر دوپہر کا سونا (قیلولہ) جو سراسر غفلت وتعطل ہے ان حضرات کی متابعت میں ہے تو یہ ان ریاضات ومجاہدات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔"

(ایضاً حصہ سوم مکتوب ۱۹۱ ص ۷۷)

(درپچے طبقے خصوصاً امراء ووزراء سلطنت میں دنیا سے وابستگی و پوشگی نے بے شمار خرابیاں پیدا کردی تھیں، اس لیے شیخ مجددؒ نے اس طبقہ کی خرابیوں کا استیصال فرمایا اور مکاتیب کے ذریعہ اتباع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید شدید فرمائی، چنانچہ شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء) کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"جس طرح کفر اسلام کی ضد ہے، اسی طرح آخرت بھی دنیا کی ضد ہے، دنیا اور آخرت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں، ترکِ دنیا دو قسم کا ہے، ایک تو یہ کہ سوائے ضرورت کے مباحات دنیوی بھی ترک کردی جائیں، یہ اعلیٰ قسم کا ترکِ دُنیا ہے، دوسرے یہ کہ دنیا کے محرمات اور مشتبہات سے بچا جائے اور مباحات سے راحت حاصل کی جائے۔ یہ قسم بھی خصوصاً اس دور میں نادر الوجود ہے ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود
ورنہ بس عالی ست پیشِ خاک تود

پس مجبوراً سونے، چاندی، ریشمی کپڑے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے، ان سے بچتے رہیں، سونے چاندی کے ظروف کو اگر سجانے کے لیے استعمال کریں تو گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ان کا استعمال حرام ہے۔ مثلاً ان میں پانی پینا، کھانا کھانا عطریات ڈالنا، سرمہ دانی بنانا وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے امور مباحہ کے دائرے کو بڑا وسیع کر دیا ہے، اور ان کے تنعمات و تمتعات سے جو لذت و عیش حاصل ہوتا ہے وہ امورِ محرمہ سے کہیں زیادہ ہے۔ مباحات میں خدا کی رضا و خوشنودی ہے اور محرمات میں ناراضگی و خفگی۔" (در المعرفت، حصہ سوم، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ مکتوب ۱۹۳ ص ۷۶-۷۵)

اسی طرح عبد الرحیم خان خاناں (م ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء) کے نام جو مکتوب تحریر فرمایا ہے، اس میں بڑے حکیمانہ انداز سے امورِ محرمہ سے نفرت اور امورِ مباحہ کی طرف ترغیب دلائی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"ماکولات، مشروبات اور ملبوسات میں بہت سی چیزیں حلال کردی ہیں اور صرف تھوڑی سی چیزوں کو حرام کیا ہے، اور وہ بھی بندوں ہی کے فائدے کے لیے۔ ایک پُرضرر اور بدمزہ

شراب کو حرام کیا ہے، لیکن کتنے ہی خوش ذائقہ اور نفع بخش مشروبات کو اس کے بدلے حلال کر دیا ہے۔ عرق قرنفل اور عرق دارچینی خوشبو اور ذائقہ کے ساتھ ساتھ جتنے منافع اور فوائد رکھتا ہے وہ کیا بیان کیے جائیں! ایک کڑوی، بدمزہ، تند بو، بدخو، ہوش ربا اور پُرخطر چیز کو اس خوشبودار اور خوش ذائقہ عرق سے کیا مناسبت ہے! شتان ما بینھما ——— پھر اس کے ساتھ ان دونوں کے درمیان حلال اور حرام ہونے کا جو فرق ہے وہ اس کے ماسوا ہے اور پروردگار جل مجدہ کی رضامندی و ناراضگی کا جو تفاوت و امتیاز ہے وہ علیحدہ ہے.... ——— علیٰ ہذا القیاس ریشمی کپڑوں کو حرام کیا گیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ کیونکہ اس کے بدلے تو کتنے قسم قسم کے مرتب و مزین کپڑے اور لباس حلال کر دیے ہیں۔" (ایضاً مکتوب ۱۹۱، ص ۹-۸)

عہدِ اکبری میں مسلمان غیر اسلامی رنگ میں اس قدر رنگ گئے تھے کہ کفر و اسلام میں امتیاز مشکل تھا۔ مسلمانوں میں سیکڑوں مشرکانہ رسمیں رائج ہو گئی تھیں جن کا اثر عہدِ جہانگیری کم تھا۔ حضرت مجدد؟ نے پوری قوت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کی اور اس ماحول میں جہاں آوازۂ حق بلند کرنا اپنے سر کو تلوار پر رکھنے کے مترادف تھا، شیخ مجدد؟ نے پوری اسلامی حمیت و غیرت کے ساتھ بڑے جرأت مندانہ انداز میں اعلاءِ کلمۃ الحق کیا۔ شیخ فرید بخاری کے نام ایک مکتوب میں کمال وارفتگی اور شیفتگی کے ساتھ یوں تحریر فرماتے ہیں:-

"ذرا خیال تو کریں کہ معاملہ کہاں تک پہونچ چکا ہے۔ مسلمانی کی بو بھی باقی نہیں رہی، ایک دوست نے کہا ہے کہ تم لوگوں میں سے جب تک کوئی دیوانہ نہ ہوگا مسلمانی تک پہونچنا مشکل ہے۔ اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے اپنے نفع و نقصان کا بھی خیال نہ کرنا یہ ہے دیوانگی! اسلام رہے تو کچھ بھی ہو (کوئی پرواہ نہیں) اور اگر نہ رہے تو پھر کچھ بھی نہ رہے، اگر مسلمانی ہے تو پھر خدا کی رضا اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی بھی ہے، اور آقا کی رضا سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔" (ایضاً مکتوب ۱۶۳ ص ۴۵)

شیخ مجدد؟ کی تعلیم و تبلیغ نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا، اُمراء و وزرائے سلطنت پر بھی اس کا اثر ہوا، اور بالواسطہ جہانگیر بھی متاثر ہوا، چنانچہ تخت نشینی سے پہلے اس نے تحفظِ اسلام کا یقین دلایا۔

اکبر کی زندگی ہی میں خود جہانگیر کا بیٹا خسرو، اکبر کی جانشینی کے لیے کوشاں اور اپنے باپ سے باغی تھا۔ بیشتر اُمراء اس کے طرفدار تھے، مگر شیخ مجدد کے معتقد خاص اور جہانگیر کے معتمد خاص شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) نے اس شرط پر جہانگیر کی حمایت کا وعدہ کیا کہ وہ اپنی حکومت میں اسلام کا تحفظ کرے گا۔ ڈاکٹر ترپاٹھی (Tripathi) لکھتے ہیں:۔

"بہرکیف اکبر کے آخری دورِ حکومت میں چند شرفاء نے افواجِ آگرہ کے کمانڈر فرید بخاری کی قیادت میں سادات بارہہ کی مدد سے سلیم کی تخت نشینی کی حمایت کی۔ ان لوگوں نے اپنے سرگرم تعاون کا اس شرط پر یقین دلایا کہ تخت نشینی کے بعد سلیم اسلام کی محافظت کرے گا۔ غالباً اس سے ان کا یہ مقصد ہوگا کہ سلیم اہلسنت والجماعت کی حمایت کرے گا جو اکبر کی پالیسی سے بالکل متضاد چیز تھی، چنانچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد شیخ فرید بخاری منصبِ پنج ہزاری اور میر بخشی کے عہدوں پر فائز ہوگئے، فرید شیخ احمد کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتے تھے۔"

(Dr. Tripathi: Rise and Fall of the Mughal Empire. 1956-P355-6)

جہانگیر ۱۶۰۵ء کو نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا، اور بقول اڈورڈیز (Edwardes)

"تخت نشینی کے ساتھ ساتھ اسلام اور مذہب اہلسنت والجماعت کی حمایت و تحفظ کا یقین دلایا گیا۔" (S. Edwardes: Mughal Rule in India, London 1930-P.55)

تخت نشین ہونے کے بعد جہانگیر نے جو بارہ نکاتی فرمان جاری کیا تھا اس میں سے کچھ نکات یہ ہیں:۔

۱۔ ہر قسم کے منکرات و منشیات کی ممانعت۔

گو خود جہانگیر نے واقعات جہانگیری میں اپنی شراب نوشی کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ کوشش کر رہا ہوں کہ صرف اصلاح کی خاطر رات کو استعمال کیا کروں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آخر وقت تک اس کو نہ چھوڑ سکا۔

۲۔ مساجد سے متعلق زمینوں کی بحالی۔

۳۔ قیدیوں کی عام معافی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ خود دربار میں شراب کی دوکان کھولی گئی

تھی، امراء و وزراء تو شراب پیتے ہی تھے، بعض علماء بھی اس سے بچ نہ سکے۔ مسجدیں ویران ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ مناور اور اصطبل بنا دیے گئے تھے، اور جو شخص ان محرمات کے خلاف لب کشائی کرتا تھا اس کو بلا تامل قتل کر دیا جاتا، یا زنداں میں ڈال دیا جاتا تھا، جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ان سب کی اصلاح ہو گئی، یہ وہی باتیں تھیں جن کی طرف شیخ مجددؒ نے اُمرائے سلطنت کو اپنے مکاتیب کے ذریعہ بڑی دل سوزی کے ساتھ بار بار متوجہ کیا تھا۔

جہانگیر کے متعلق بعض مورخین کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح بے دین اور لامذہب تھا، چنانچہ ڈاکٹر گستاؤلی بان (G. Le Ban) لکھتا ہے:-

"جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) اگرچہ اپنے باپ کے برابر نہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت ہی نامور بادشاہ تھا، لامذہب ہونے کے سبب سے اس نے بھی اپنے باپ کا طریقہ جاری رکھا۔ اس نے ہندو اور مسلمان بی بیاں کیں اور دونوں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرتا رہا، جہانگیر نے نصرانیوں کو بھی پناہ دی اور اس کے دارالسلطنت میں تقریباً ساٹھ نصرانی تھے۔"

(ڈاکٹر گستاؤلی بان: تمدن ہند ترجمہ سید علی بلگرامی، مطبوعہ آگرہ ۱۹۱۴ء ص ۱۹۰)

اڈورڈیز (Edwardes) بھی جہانگیر کے مذہب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اس میں شک نہیں کہ اس اعلانِ عام نے اہل سنت والجماعت کو مطمئن کر دیا ہوگا، لیکن جہانگیر باوجود اس اقرار و اعلان کے کبھی بھی ایک پاکباز متقی مسلمان نہیں رہا۔ اپنے باپ کی طرح اس کے رجحانا بھی ملحدانہ تھے، علماء اور عیسائی پادریوں کے درمیان جو مباحث ہوتے تھے ان کو وہ خوشی خوشی سنتا تھا، فنونِ لطیفہ کو ہمیشہ پسند کرتا تھا۔ مذہبی قسم کی تصاویر اس کے چاروں طرف آویزاں رہتی تھیں، ان میں زیادہ تر تو عیسائی طرز کی ہوتی تھیں، جس سے اس کے بہت سے درباریوں کو چڑ تھی۔ وہ اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ عیسائی علامتی نقوش بھی اپنی مہر پر کندہ کرا لیے تھے۔"

(S. Edwardes: Mughal Rule in India 1930 P. 62)

لیکن یہ بیانات کہ جہانگیر، اکبر کی طرح لامذہب اور ملحد تھا صحیح نہیں معلوم ہوتے، اکبر کی زندگی ہی میں اس نے مولانا میرکلاں ہروی، مولانا قطب الدین اور عبدالرحیم خان خاناں سے استفادہ کیا تھا۔ خان خاناں، شیخ مجددؒ کے خاص معتقدین میں تھے، مکتوبات شریف میں ان کے نام بہت سے خطوط

ہیں، ان کے واسطے سے جہانگیر پر شیخ مجددؒ کے اثرات ضرور مرتب ہوں گے، اور آخر میں جب حضرت مجددؒ چند سال تک لشکر شاہی کے ہمراہ رہے تو یہ اثرات اور نمایاں ہوگئے، شیخ مجددؒ نے صرف جہانگیر کا مزاج نہیں بدلا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مزاج حکومت تبدیل کردیا۔

اس میں شک نہیں کہ جہانگیر ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں راجہ بہاری مل کی لڑکی کے بطن سے پیدا ہوا اور ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے اس کی شادی ہوئی، اس کے علاوہ اس نے اور بھی ہندو بیویاں کیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنز (William Hawkins) جیمز اول (James I) کا پیغام دربار جہانگیری میں لایا اور اس کے بعد ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں ولیم ایڈورڈیز (William Edwardes) ایک دوسرا پیغام لایا، اسی سال سر تھامس رو (Thomas Roe) بھی جہانگیر کے دربار میں آیا اور تین سال مقیم رہا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ان کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندو ذہنیت رکھتا تھا یا عیسائیوں کی طرف مائل تھا۔ جہانگیر اول و آخر مسلمان تھا، البتہ جیسا کہ شیخ مجددؒ کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں ایک متقی اور پرہیزگار مسلمان ہوگیا تھا صحیح نہیں ہے۔ جہانگیر ایک آزاد منش مسلمان تھا، اس نے آخر وقت تک شراب پی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اسلام کی حمایت کی ہے اور اس کے عہد میں اسلام کو فروغ ہوا اور اس کی یہ حمایت اس وقت اور بھی تیز ہوگئی جب شیخ مجددؒ آخر زمانے میں اکثر اس کی خصوصی مجلسوں میں شریک ہونے لگے اور تبلیغ و ارشاد سے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔

بہرحال جہانگیر نے شیخ مجددؒ کے اثرات کے تحت رفتہ رفتہ سلطنت کی اصلاح کی، چنانچہ شاہ جہان (م ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء) اور اورنگ زیب (م ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کے دور میں حالات بہتر ہوتے چلے گئے، مذہب اسلام کی ترویج و ترقی کے اعتبار سے ہم جہانگیر کے دور کو عبوری دور کہہ سکتے ہیں جس میں ان بہت سی خرابیوں کا قلع قمع کردیا گیا جن کی بنیاد اکبر نے رکھی تھی۔ اور اس کی تکمیل شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں ہوئی۔

مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی آپ نے اصلاح و تبلیغ کا کام تیز کردیا تھا۔ تخت نشینی سے پہلے شیخ فرید بخاری نے جہانگیر کو اسلام کی طرف بڑی حد تک راغب کرلیا تھا، اور تخت نشینی کے فوراً ہی بعد شیخ مجددؒ نے مختلف امراء کے نام خطوط ارسال فرمائے کہ وہ بادشاہ کو اتباع سنت و شریعت کی طرف راغب کریں، سید صدر جہاں کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اس وقت جبکہ حکومتوں میں انقلاب آگیا ہے اور دوسرے مذاہب کی دشمنی خاک میں مل چکی ہے، ائمہ وعلمائے اسلام پر لازم ہے کہ اپنی تمام تر توجہ ترویج شریعت غرّا کی طرف مبذول کردیں اور شریعت کے جو ستون منہدم ہوگئے ہیں اُن کو پھر کھڑا کریں۔" (درالمعرفت مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ، مکتوب ۱۹۵)

خان جہاں کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب کبھی آپ بادشاہ سے ملاقات کریں اور وہ آپ کی باتیں سننے کی طرف متوجہ ہوں تو کیا اچھا ہو کہ صراحۃً یا کنایۃً معتقدات اہلِ سنت والجماعت (خدا ان کی کوششوں کو قبول فرمائے!) کے مطابق کلمۂ حق یعنی کلمۂ اسلام ان کے کانوں تک پہونچائیں۔" (بحوالہ محمد منظور نعمانی تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۲۴۷)

شیخ فرید بخاری الملقب بہ مرتضیٰ خان کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آج جبکہ بادشاہ کی تخت نشینی کی خوشخبری خاص و عام کے کانوں تک پہونچ رہی ہے اور دولتِ اسلام کا زوال ختم ہو رہا ہے مسلمانوں نے اپنے لیے ضروری سمجھا کہ بادشاہ کے معین و مددگار اور شریعت کی ترویج اور ملّتِ اسلامیہ کی تقویت کے لیے کوشاں ہوں، یہ اعانت و تقویت خواہ زبانی ہو خواہ عملاً ــــ سب سے بڑھ کر دولت اور امداد تو یہ ہے کہ مسائلِ شرعیہ کو بیان کیا جائے تاکہ کوئی مبتدع اور گمراہ درمیان میں حائل نہ ہو اور راہ سے نہ بھٹکائے اور معاملہ ابتر نہ ہو جائے...... چونکہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کو قربِ شاہی پوری طرح عنایت فرمایا ہے اور ساتھ ہی استطاعت بھی بخشی ہے اس لیے آپ سے توقع ہے کہ بادشاہ سے جب ملنے جلنے کا موقع ملے تو شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج کی سعی کرتے رہیں، اور مسلمانوں کو وطن میں بے وطنی کی زندگی سے نجات دلائیں۔" (درالمعرفت مطبوعہ امرتسر ۱۳۲۳ھ مکتوب ۴۷)

تخت نشینی کے بعد بھی سلطنت میں کچھ سابقہ مشرکانہ رسمیں چلی آرہی تھیں، اور خود حرم شاہی میں ہندو لڑکیوں کی وجہ سے یہ رسمیں عام تھیں اس لیے شیخ مجددؒ نے اس کی اصلاح کے لیے بھی شیخ فرید بخاری کے ذریعہ سعی فرمائی، چنانچہ موصوف کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان رسومات کی قباحت سے بادشاہ کو آگاہ کریں اور ان کو دور کرنے کی کوشش کریں، شاید یہ اس وجہ سے اختیار کی گئی ہوں کہ بادشاہ ان کی برائی سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔" (ایضاً مکتوب ۱۹۲)

شیخ مجددؒ کی ان اصلاحی اور تبلیغی مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ آیا جبکہ خود جہانگیر نے شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ) کو حکم دیا کہ بادشاہ کو امور شرعیہ میں مشورہ دینے کے لیے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے، اکبری دور کی لادینی کو سامنے رکھ کر اس فروغِ اسلامی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لادینیت کے اندر دین کا آوازہ شیخ مجددؒ ہی نے بلند کیا تھا، اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا ان ہی کی مساعیِ جمیلہ کا ثمرِ شیریں تھا۔

شیخ مجددؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر نے شیخ فرید بخاری سے علمائے اسلام کی ایک مجلسِ مشاورت قائم کرنے کے لیے کہا ہے تو آپ نے گذشتہ تلخ تجربات کی روشنی میں شیخ فرید بخاری کو چند ضروری اور اہم ہدایات فرمائیں۔ ان کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"سنا گیا ہے کہ بادشاہِ اسلام (جہانگیر) نے اپنے اسلامی حسنِ باطن کی بنا پر آپ سے فرمایا ہے کہ آپ چار ایسے دیندار عالم مہیا کریں جو حاضر رہ کر مسائلِ شرعیہ بیان کیا کریں۔ تاکہ کوئی امر خلافِ شرع واقع نہ ہو، الحمد للہ سبحانہ علیٰ ذالک، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کیا بشارت اور ماتم زدگان کے لیے اس سے اچھی کیا خوشخبری ہو سکتی ہے، چونکہ فقیر اسی (دینی) غرض سے آپ کی طرف متوجہ رہتا ہے، اور بار بار اس امر کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے، اس لیے ضرورۃً (اب بھی) اس بارے میں کہنے اور لکھنے سے باز نہ رہوں گا۔ امید ہے کہ مجھے معذور قرار دیں گے۔ "صاحب الغرض مجنون" اس لیے گزارش ہے کہ ایسے علماء دیندار جو حُبِّ جاہ اور حُبِّ ریاست سے علیحدہ ہوں اور ترویجِ شریعت اور تائیدِ ملت کے علاوہ کوئی مقصد نہ رکھتے ہوں، تعداد میں بہت قلیل ہیں...... اگر ان میں حُبِّ جاہ ہوگی تو ہر ایک کوئی نہ کوئی ڈگر اختیار کر کے اپنی فضیلت کا اظہار کرے گا۔ اختلافی مسائل درمیان میں لائے گا اور اس کو بادشاہ کے تقرب کا ذریعہ بنائے گا، اس صورت میں لامحالہ دین کی مہم ابتر ہو جائے گی۔ زمانۂ گذشتہ (عہدِ اکبری) میں علمائے سوء کے اختلافات نے ہی دنیا کو

بلا میں ڈالا تھا...... اب بھی صحبتِ علمائے سوء کا اندیشہ درپیش ہے..... ایسی صورت میں ترویجِ دین کیا خاک ہوگی، بلکہ اُلٹی تخریبِ دین ہو جائے گی۔ میں علمائے سوء کے فتنے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں...... (میرے نزدیک) اگر صرف ایک عالم کو اس غرض کے لیے منتخب کیا جائے تو بہتر ہوگا، علمائے آخرت میں سے کوئی عالم میسر ہو تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔ اس کی صحبت کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے...... اگر وہ میسر نہ آئے تو خوب غور و فکر کے بعد علماء میں سے کسی بہتر و غنیمت عالم کا انتخاب کر لیا جائے۔ ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔
اس بارے میں سوائے اس کے اور کیا لکھوں کہ جس طرح خلائق کی رستگاری علماء کے وجود سے وابستہ ہے۔ اسی طرح دنیا کا زیاں بھی ان ہی پر منحصر ہے، بہترین علماء بہترین عالم ہیں۔ اور بدترین علماء بدترین خلائق، ہدایت اور گمراہی دونوں ان پر موقوف ہے، ایک شخص نے ابلیس کو دیکھا کہ وہ بیکار بیٹھا ہوا ہے، تو اس کا سبب پوچھا، تو اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ کے علماء میرا کام انجام دے رہے ہیں اور وہ دنیا کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند — او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اس لیے اس معاملہ میں پورے اخلاص سے غور و فکر کے بعد قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا، اس قسم کی باتیں زیرک اور ہوش مند آدمیوں کے سامنے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن اپنے لیے سعادت سمجھ کر عرض کیا گیا۔"

(مکتوبات حصہ اول، مکتوب بنام شیخ فرید)

(باقی)

زیارتِ حرمین

نقوش و تأثرات

(مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مسجدِ نبوی میں تبلیغی اجتماعات روزانہ مسجدِ نبوی میں بعد مغرب تبلیغی اجتماع ہوتا تھا اور عشاء کی اذان تک جاری رہتا تھا، فجر کی نماز کے بعد اشراق تک بھی کسی نہ کسی کی تقریر آدابِ زیارت و مناسکِ حج پر ہوتی تھی۔ چاشت کے وقت تعلیمی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر سعید صاحب مصری کچھ فاصلے پر مصریوں کے مجمع میں بعد نمازِ فجر تقریر کرتے تھے۔ ایک دن بعد نمازِ مغرب داؤد فیصل صاحب کی ایک تقریر انگریزی زبان میں تبلیغی کام کرنے والوں کے اہتمام سے ہوئی اُس کو علاوہ ہندوستان و پاکستان کے مصر او حجاز کے علماء و عوام نے سُنا۔ مولانا عبدالملک صاحب مراد آبادی نے انکی تقریر کے دو ترجمے کئے ایک عربی زبان میں ایک اُردو میں جس سے تمام حاضرین مستفیض ہوئے۔ درحقیقت دو ہرے ترجمہ کے فرائض کو انجام دینا خداداد لیاقت و استعداد کی بات تھی ہر ایک سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

غالباً جمعرات کے دن تبلیغی مرکز میں اجتماع ہوتا تھا جس کی تعمیر کچھ ہی عرصہ ہوا ہے پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے وہاں میرا جانا نہ ہو سکا ـــ زیادہ تر مفتی زین العابدین صاحب لائل پوری مغرب کے بعد تقریر فرماتے تھے اُن کی تقریر سے اُردو داں حجاج کو بہت فائدہ ہوتا تھا خیاط صاحب بھی جو کچھ عرصے مرکز دہلی میں رہ چکے ہیں عموماً بعد نمازِ فجر مناسکِ حج پر تقریر

فرماتے تھے۔

مدینہ منورہ کا موسم یہاں کا موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ ہمارے مختصر سے قیام کے زمانے میں دو مرتبہ بارش ہوئی اور ایک دن تو خوب ہی موسلا دھار بارش ہوئی۔ میں اس وقت مسجد نبوی میں تھا جس وقت کالی گھٹا اٹھی تو عجیب شان سے مسجد نبوی کے صحن پر ایک سیاہ شامیانہ تنا ہوا نظر آیا کسی شاعر نے کہا ہے۔

پیام لائی ہے باد صبا مدینے سے
کہ رحمتوں کی اٹھی ہے گھٹا مدینے سے

واقعی رحمتوں کی ہی گھٹا تھی جو فضائے مدینہ میں پیام فرحت و مسرت لائی تھی۔
مدینہ کی برسات تو کتنی بہار آگیں ہوتی ہوگی جس کی یاد میں زائر حرم حمید لکھنوی نے کہا ہے۔

سبب میرے رونے کا کیا پوچھتے ہو
مدینے کی برسات یاد آ رہی ہے

ہندوستان کے لحاظ سے یہ برسات کا موسم نہ تھا وہاں اس زمانے میں سخت لو چل رہی ہوگی مگر یہاں تو مئی کے مہینے میں ساون کا نظارہ تھا وہ سماں بھی تمام عمر نہ بھولونگا جب بارش زوروں سے ہو رہی تھی اور حرم نبوی کے چھت کے تمام پرنالے زور و شور کے ساتھ بہہ رہے سیکڑوں اشخاص پرنالوں کے نیچے کھڑے ہوئے اپنے سروں پر پانی لے رہے تھے اور اپنے دلوں کی حسرت نکال رہے تھے۔ بہت سے صراحیوں میں وہ پانی لے لے کر پی رہے تھے، میں نے اور ماسٹر علاء الدین صاحب نے بھی ایک صراحی میں پانی لیا اور خوب پیا۔ بارش کی وجہ سے سردی بھی کافی ہو گئی تھی رات کو مکان کے اندرونی حصے میں بھی موٹی چادر یا کمبل کی ضرورت پڑتی تھی، میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے سنا کہ ایک دن کسی وقت ہلکی سی اولے کی چھال بھی پڑی تھی۔

مدینہ منورہ کے روز و شب یہاں یوں تو رات دن رحمت الٰہی برستی ہوئی نظر آتی ہے مگر رات کو دلکشی کا عالم عجیب ہوتا ہے ظاہری روشنی سے بھی تمام مسجد نبوی بقعۂ نور بنی رہتی ہے اور باطنی انوار بھی ہر مومن کو بقدر ظرف محسوس ہوتے ہیں۔

درحقیقت یہ تمام رونقیں یہ تمام انوار یہ تمام تجلیات اس ذات اقدس کے صدقے میں ہیں جو گنبد خضرا میں محو آرام ہے۔ اس بدر کامل کے طفیل میں ہیں جو حجرہ عائشہ صدیقہؓ میں پنہاں ہے۔ اس کی روشنی مدینہ و مکہ ہی میں نہیں تمام اکناف و اطراف عالم میں پہونچ رہی ہے۔

حجرۂ عائشہ میں ہے مہ تاباں جو نہاں — بصد آداب نیاز اُس مہ تاباں کو سلام
جگمگا اٹھی فضائے رُخ کعبہ جس سے — اسی قندیل حرم شمع فروزاں کو سلام

(فریدی)

اس موقع پر حضرت اصغر گونڈویؒ کا ایک نعتیہ شعر پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میرے روح و قلب کی ترجمانی کر رہا ہے۔

تجلی ہو مہ و مہر ہو یا شمع حرم ہو
ہے سب کے جگر میں رُخ تابانِ محمدؐ

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر تلاوت قرآن مجید کے وقت بھی عجیب کیفیت ہوتی تھی جب کہ ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ جس ذات اقدس پر قرآن پاک نازل ہوا ہے وہ یہیں آرام فرما ہیں اُن کا روضہ نظر دل سے قریب ہے، جن صحابہ کے بارے میں آیات ہیں اُن میں سے شیخین معظمینؓ تو آنحضرت کے نزدیک ہی ہیں اور باقی جنت البقیع اور اُحد میں جنت کے مزے لے رہے ہیں۔ جو مسجد نبوی سے زیادہ دور نہیں، میدان بدر بھی یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ سرفروشان اسلام اسی مسجد میں آکر تہذیب اخلاق اور حکمت کے سبق لیتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مسجد میں اُن کو آیات قرآنی سب سے پہلے سناتے تھے، جبرئیل امین وحی لے کر اسی مسجد میں آتے تھے۔ ازواج مطہرات کے حجرے یہیں قریب میں بنے ہوئے تھے، سورۂ حجرات انھیں حجرات کی طرف اشارہ کر رہی ہے ان میں سے حجرہ عائشہ صدیقہؓ کے اندر خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دو محبوب ترین ساتھیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

چند مہاجرین مولانا یوسف علی صاحب بھوپالی سے دو مرتبہ اُن کے ذاتی مکان پر ملاقات ہوئی یہ حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی قدس سرہٗ کے مریدین میں تھے۔

اُن کی گفتگو بڑی رقت آمیز تھی۔

مولانا عبد العزیز بخاری سے بھی اُن کے مکان پر ملاقات ہوئی یہ بریلی میں بھی رہ چکے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ ابن استاذ نا حضرت مولانا احمد علی مفسر لاہوری مدظلہا عرصے سے مسجد نبوی میں درس دیتے ہیں تھوڑی دیر اُن کے درس میں بیٹھا بعد فراغت ملاقات ہوئی، فی سبیل اللہ درس دیتے ہیں اور توکل پر گذر اوقات ہے۔ اور بھی چند مہاجرین سے ملاقات ہوئی جن کے نام یاد نہیں رہے۔ ان مہاجرین سے مل کر قلب کی عجیب کیفیت ہوتی تھی سوچتا تھا کہ اپنا وطنِ مالوف چھوڑنا اور جائداد و املاک نیز عزیز و اقارب کو خیرباد کہنا بغیر کسی قوی محرک کے آسان نہیں ہے۔ یہ دفورِ جذبۂ ایمانی ہے جو اُن کو دیارِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں کھینچ لایا ہے وہ توکل و قناعت سے بسر کر رہے ہیں اور اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتے ان حضرات نے سوچ سمجھ کر آخری فیصلہ کیا ہے کہ ہم مدینے کی گلیوں میں رہیں گے اور مسجد نبوی کے انوار و برکات سے مستفیض ہوں گے اور یہیں کی خاک میں حشر تک سوئیں گے۔ ان مہاجرین میں سے بعض حضرات کی پُرتاثیر باتوں سے دل پر جو اثر ہوا وہ اب تک باقی ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

ایک دن مسجد نبوی میں حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی سے ملاقات ہوئی۔ نابینا ہیں مگر دل کی آنکھیں روشن ہیں، صاحب تاثیر اور ماہر فن بزرگ ہیں غالباً لاہور کے کسی مدرسے میں فن تجوید کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ مولانا عبد الرؤف خاں صاحب بھی امسال حج و زیارت کے لئے آئے تھے۔ مدینہ منوّرہ میں اُن سے ملاقات ہوئی اُن سے ملاقات ہو کر قیام بریلی کا زمانہ یاد آگیا جب کہ اُن سے دفتر الفرقان میں اور مدرسہ اشاعت العلوم میں ملاقاتیں رہا کرتی تھیں ___ مولانا ظل الرحمٰن نہٹوری صدر مدرس مدرسہ جامع مسجد نہٹور اور مولانا حبیب الرحمٰن میواتی سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حضرت مولانا اعظمی مدظلہ سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ مدرسہ علوم شرعیہ کے بالائی حصّے میں ایسے بغلی کمرے میں مقیم تھے کہ

اگر خود اس کمرے کی نشاندہی نہ فرماتے تو ملاقات مشکل سے ہوتی ـــ مجھے از راہ نوازش اپنی قیام گاہ کا پتہ بتا دیا تھا بعد کو ایک دوسرے کمرے میں طبیعت کے علیل ہوجانے کے باعث چلے گئے تھے حضرت مولانا سے میں کچھ نہ کچھ دریافت کرتا رہتا تھا اور وہ جوابات سے نوازتے رہتے تھے ایک دن میں نے دریافت کیا کہ القول الجلی فی ذکر الولی جو مولانا شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات میں لکھی ہے ـــ اس کا بھی اب کہیں وجود ہے ؟ مجھے تو باوجود تلاش بسیار اب تک کسی کتب خانے میں اس کا پتہ چلا نہیں ـــ فرمایا کہ کاکوری کی خانقاہ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کے بعض مضامین بھی اپنی یادداشت سے بیان فرمائے ـــ مجھے جہاں اس کتاب کا سراغ مل جانے سے مسرت ہوئی وہاں یہ افسوس بھی ہوا کہ ہمارے بزرگوں کی بہترین علمی وفنی کتابیں اور دستاویزیں اب نذر کرم خوردگی ہوتی جارہی ہیں اور وہ ایسے پرائیویٹ کتب خانوں میں ہیں جہاں تک پہونچنا بغیر کسی سفارش وسعی کے بہت ہی مشکل ہے۔ کاش یہ کتاب اور اس قسم کی دیگر نادر قلمی کتابیں طبع ہوجاتیں اور موجودہ اہل خانقاہ اپنے اسلاف کی یادگار کے طور پر ان کتابوں کو شائع کرتے۔ اس سے اس دور کے جدید تعلیمیافتہ طبقے کے قلوب پر بالخصوص خانقاہوں کی اہمیت وعظمت قائم ہوگی اور یہ واضح ہوگا کہ ہمارے بزرگ خانقاہ میں صرف تزکیۂ نفوس ہی کا کام انجام نہیں دیتے تھے بلکہ وہ علوم وفنون کے بھی ماہر وکامل تھے۔ ان کے علمی ذوق وشوق نے انکی خانقاہوں میں نادر کتابوں کے مخزن جمع کرادیئے تھے ـ

کھجوریں کھجوریں مدینہ منورہ کا خاص تحفہ اور تبرک ہیں۔ ہمارے قافلے والوں نے کھجوروں کی منڈی میں جاکر اس متبرک پھل کو خریدا میں بھی کئی مرتبہ منڈی میں گیا۔ آموں کے زمانے میں ہمارے علاقے میں آم بازار میں اتنی کثرت سے نہیں پائے جاتے جتنی کھجوریں بے موسم کے یہاں کی منڈی میں رکھی ہوئی ملتی ہیں۔ کھجوروں کے اقسام کثرت سے ہیں۔ خاص اہتمام سے سال دو سال تک کھجوروں کا ذخیرہ محفوظ کیا جاتا ہے اور زائرین کی آمد کے وقت اس کو بازار میں لایا جاتا ہے کھجوروں کے فروخت کرنے والے اُردو بھی بولتے اور سمجھ لیتے ہیں۔ ہم نے یہاں سے کھجوریں خریدیں وہ دوکاندار بڑا پرلطف اور خوش خلق تھا ایک عجیب انداز

کے ترنم آمیز عربی نغموں سے وہ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ رُطَب (تازہ کھجور) کا یہ زمانہ نہ تھا، مولانا سید غیاث الدین صاحب مہاجر نے فرمایا کہ حج کے بعد آخری جہاز سے جانے والوں کی آمد کے موقع پر شاید رطب چل پڑے۔ رطب کی خوش ذائقگی سے کان ضرور آشنا ہیں مگر کام و دہن کو اسکی لذت نصیب نہیں ہوئی۔ بڑے خوش نصیب ہیں وہ جو رطب کی طیاری کے وقت مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوں گے۔

۹ مئی کو منگل کے دن مدینہ منورہ سے بعد نماز عصر رخصت ہوا۔ روضۂ اقدس پر حاضری دی، جنت البقیع بھی حاضر ہوا اور چلتے وقت بھی گنبد خضرا کا نظارہ کیا۔ دل کھچا جاتا تھا۔ یا اللہ پھر اس روضۂ مقدسہ کا دیدار میسر ہوگا یا نہیں؟ کاش پھر میسر ہو ـــ اسی دن حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مدظلہ سے بھی ملنے گیا انھوں نے عرفات وغیرہ میں اپنے لئے دعا کو فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ الفرقان کی وجہ سے میرا ایک رشتہ آپ لوگوں سے ہوگیا دعا میں فراموش کرنا۔ آج مولانا نیاز محمد صاحب اور حضرت مولانا اعظمی سے بھی ملاقات کی حضرت مولانا اعظمی سے میں نے دریافت کیا کہ حرم مکہ میں آپ سے ملاقات کی کیا صورت رہا کرے گی فرمایا کہ میں شیخ عبداللہ زمزمی کے یہاں ملا کروں گا جو باب ابراہیم کے قریب ایک حجرے میں رہتے ہیں الغرض بعد عصر احرام باندھ کے بصد حسرت و یاس اس سرزمین مقدس کو الوداع کہا۔

یاد آرہے ہیں جب سے اس سرزمین مقدس کو چھوڑا ہے مسجد نبوی کے بام و در یاد آرہے ہیں، اس کے فرش فروش یاد آرہے ہیں رنگین تعویذات یاد آرہے ہیں، مدینہ منورہ کی گلیاں یاد آرہی ہیں۔ اذانیں یاد آرہی ہیں، امام کی قرأت جماعت کی صفیں، زائرین کا ہجوم، مہشتی سقوں کا پانی پلانا ـــ مسجد کے کبوتروں کا نغمہ سرائی کرنا، رقص کرنا، ہوا میں اُڑنا اور ان کا عجیب مستغنیانہ انداز میں دانہ چگنا یاد آرہا ہے، ہوٹل میں اور مدینہ منورہ کے مکان میں خوبصورت و خوش رنگ بلّیاں جو دلربائی کی خاص شان رکھتی تھیں وہ بھی یاد آرہی ہیں، غرضکہ مدینہ منورہ کا ذرہ ذرہ یاد آتا ہے کاش پھر مکہ و مدینہ کی حاضری نصیب ہو۔

ہندوستان آکر چند اشعار لکھے ہیں، اُن کو اس موقع پر ہی پیش کر دینا چاہتا ہوں ان میں

نامکمل طور پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

زہے خاکِ پاکِ طیبہ زہے اُسکی ضو فشانی　　وہ نزولِ رحمتِ حق وہ نشاط و کامرانی

وہ فضائے رُوح پرور وہ ظہورِ لطفِ رحمت　　وہ ہوائے کیف آور وہ وفورِ شادمانی

یہ جو سامنے ہے گنبد یہی روضۂ نبی ہے　　اسے دیکھنے کی خاطر تھی عزیز عمرِ فانی

اسی جا میں جلوہ آرا اسی جا ہیں محوِ راحت　　شہ دوسرا، کہ جن کی ہے دلوں پہ حکمرانی

یہی مرکزِ یقیں ہے، یہی مخزنِ سکوں ہے　　دل و جاں کے واسطے ہے یہ سرور و شادمانی

اسی جا ہے روحِ عالم، اسی جا ہے جانِ ایماں　　وہ نبیٔ لطف و رحمت وہ رسولِ جاودانی

وہ ہجوم عاشقوں کا جو شمار سے ہے افزوں　　وہ توجہ گرامی بکمالِ مہربانی

کوئی رو رہا ہے پیہم کوئی ہے مراقبے میں　　کسی جا پہ ہے تلاوت کہیں ہے درود خوانی

ہے قریبِ شاہِ بطحیٰ، ابوبکرِ صدق آرا　　وہ وفا شعار ہمدم وہ رفیقِ جاودانی

ابدی نشاط میں ہے، سرِ خود نہادہ بر در　　وہ عمر وہ عدل گستر وہ امیرِ دو جہانی

مرے دل نے جو بھی دیکھا ہے آنکھ اُس سے قاصر　　یہ زبان کیا کرے گی مرے دل کی ترجمانی

میں یہاں ہوں لے قریشی ہے وہاں پہ رُوح میری
مری روح کو وہیں پر ہے سرور و شادمانی

دینی تعلیمی تحریک اور مسائلِ حاضرہ

(از، جناب قاضی محمد عدیل عباسی)۔

[قاضی محمد عدیل صاحب عباسی نے جو رپورٹ دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بتاریخ ۹ر نومبر ۱۹۶۱ء میں پڑھی اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ عاملہ کے جلسہ نے اسکی عام اشاعت کا فیصلہ بھی کیا تھا۔

ادھر ان چار مہینوں کے اندر ہندوستان نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس اور قومی ایکتا اور جذباتی ہم آہنگی کانفرنس دو نہایت اہم کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں، ان کا پس منظر آسامی اور بنگالی اور پنجابی اور ہندی کے نزاعات ماسٹر تارا سنگھ کا فاقہ اور دکھن کا شمال سے تصادم ہے۔ ان معاملات سے ہمارا صرف اتنا تعلق ہے کہ اولاً کلچر کے معاملہ میں کثرت میں وحدت کی کوششوں کو اعلیٰ سطح پر رونما ہوتے دیکھ کر اسلام دشمن عناصر نے زیادہ زور باندھنا شروع کر دیا ہے اور جس میں آئندہ عام انتخابات کا قرب آگ پر پٹرول کا کام کر رہا ہے دوسرے تعلیم اور بالخصوص ابتدائی پرائمری تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کا خیال ہے جس سے ایک قومی نظریے کی اساس مستحکم ہو سکے ۱۹۶۵ء تک تمام ہندوستان میں جبری تعلیم عام ہو جائے گی فوراً ایک لاکھ پچاس ہزار پرائمری مدارس کھولے جا رہے ہیں یہ باتیں ہماری اسکیم پر گہرا اثر ڈالنے والی ہیں۔ اور اس لئے ہم کو ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے ہو سکتا ہے کہ بیسک پرائمری ریڈریں ان منصوبوں کے ماتحت بہت بہتر ہو جائیں اور بذریعہ اردو تعلیم دینے میں بھی رکاوٹ

باقی نہ رہے اُس وقت ہمیں دینی تعلیم کے لئے صباحی اور شبینہ مکاتب پر زیادہ زور دینا ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حالات بدتر صورت اختیار کریں، سو ہمیں اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے ہمارے صوبہ کی حکومت نے درسی کتابوں کی اصلاح کے لئے پالیوال کمیٹی بنائی ہے اور اُردو کے بارے میں احکام مجریہ پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لئے کرپلانی کمیٹی بنائی ہے یہ دونوں کمیٹیاں ابھی ابتدائی منزل میں ہیں ان کی رپورٹوں اور اُن پر حکومت کے عمل پر بہت کچھ انحصار ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان اپنے لئے ایک نئی دنیا اور اس میں بسنے کے لئے ایک نیا آدم تعمیر کر رہا ہے۔ دینی تعلیم خلا میں نہیں پرورش پا سکتی۔ اس کا دوسری زور دار طاقتوں پر جو تعمیر انسانیت کا پہلو لئے ہوئے ہیں عمل و ردّ عمل ہوگا جس سے ہم بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ براہ راست ہم ان سے متعلق نہ ہوں لیکن بالواسطہ ہمارا گہرا تعلق ان چیزوں سے ہے۔ ہم کو ان باتوں کا بلا کسی تعصب اور بلا کسی خود رائی کے عمیق مطالعہ کرنا ہوگا اور خذ ما صفا ودع ما کدر کو خضر راہ بنانا ہوگا۔ اسلام کا ایک عظیم مذہب ہونا مسلّم ہے اس نے زندگی کا ایک فلسفہ دیا ہے جو مکمل ہے کوئی شعبۂ حیات اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور تعلیم وہ مسالہ ہے جس سے باطن کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسلام کے ادب کا بحر زخار اور اسکی اخلاقی اور روحانی تعلیمات زمین کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں، بحر و بر کا کوئی حصّہ اس کے اذان کی آوازوں اور اس کی تکبیر کے نعروں سے خالی نہیں ہے ہندوستان میں ہم کو فراخ دلی اور کشادہ قلب ہو کر ہر اچھی نئی بات کو قبول کرنا ہے لیکن اپنا شعور ترک نہیں کرنا ہے۔ سے

زمانے با ارسطو آشنا باش　　دمے با ساز بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقام شاں گذر کن　　مشو گم اندریں منزل سفر کن

یہ کیسے ہو؟ ہمیں اس پر سوچنا ہے اور ہر وقت چاق و چوبند رہنا ہے نہ ہم کو کسی تنگ نظری کا شکار ہونا ہے اور نہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنا دہ ادبی و اخلاقی و روحانی ورثہ گم ہونے دینا ہے جو ایک عرصہ تک نجات دہندہ عالم رہا ہے اور جو قیامت تک

اپنی ابدی سچائیوں کی قوت کی بنا پر زندہ و پائندہ رہے گا اور یہی حیات ہے اور بقیہ مرگ دوام ؎

اس دہر میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اس لئے میں معزز ممبران مجلس عاملہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نصاب کمیٹی کے حدود کار کو وسیع تر کرکے اسکے اغراض میں یہ غرض بھی شامل کرلیں کہ وہ برابر حالات کا مطالعہ کرتی رہے اور جائزہ لیتی رہے اور وقتاً فوقتاً اپنی رپورٹ اور اپنے مشورے مجلس عاملہ اور کونسل کے سامنے پیش کرتی رہے اس کام کے لئے ہم کو ڈاکٹر فریدی صاحب کے الفاظ میں ایک پورا اسکریٹریٹ بنانا ہوگا اور صاحب فہم اور ارباب بصیرت یعنی دیدہ وران قوم کی مسلسل خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ قوم کی قدامت پرستانہ ذہنیت نئے انقلاب کے تقاضوں کو سمجھنے اور اُسے اپنانے سے قاصر ہے۔ امراء اور علماء دونوں کا ذوق مسجد عیدگاہ اور عربی مدارس کی تعمیر تک محدود ہے۔ یہ کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت کافی اور ضرورت بھر تھا۔ انگریز صرف پانچ فی صدی کو تعلیم دیتا تھا اور اتنے ہی عربی مدارس کے فضلاء تیار ہو جاتے تھے . . . . عوام اسی طرح خالی الذہن تھے۔ مگر اب عوامی حکومت اور عوامی تعلیم کے تقاضے مختلف ہیں، اب کوئی دماغ خالی نہیں رہے گا۔ لیکن ہم کو ابھی اس انقلاب کا صحیح ادراک نہیں ہوا اور اگر ہوا ہو تو عمل کی حد تک یقین کی منزل نہیں آئی ہے۔ حالانکہ حقیقت آفتاب درخشاں کی طرح چمک رہی ہے اور ہر معمولی سوچنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر ابتدائی تعلیم کی اصلاح نہ کی گئی تو اب ہم صرف عربی مدارس پر تکیہ کرکے ۔ اس روحانی تباہی سے نہیں بچ سکتے جس کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اگر حالات پر خدانخواستہ قابو نہ پایا گیا تو انجام بالکل صاف سامنے ہے کہ ایک دن وہ آئے گا جب خود مسلمان قوم کی جلسہ گاہیں مینارہ بابل بن جائیں گی۔ نہ علماء کی بات عوام سمجھیں گے اور

نہ عوام کی بولی علماء کی سمجھ میں آئے گی۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

کا مضمون ہوگا۔

مگر با ایں ہمہ آج منظر کیا ہے۔ روزمرہ لوگ دوڑے چلے آتے ہیں کہ فلاں جگہ مسجد یا عیدگاہ کی تعمیر ہو رہی ہے، سیمنٹ، لوہا، اینٹ، کوئلہ کے پرمٹ کی ضرورت ہے۔ مکاتب کی عمارتوں کے بنانے کا کوئی خیال نہیں ہے، میرے پاس تو جب اس طرح کا کوئی آدمی آتا ہے تو میرا دل فوراً بول اُٹھتا ہے کہ خدا رحمت نازل کرے ۱۸۵۷ء کے علماء پر جن کے روحانی تصرفات ابتک باقی ہیں اور میں فوراً کہتا ہوں کہ وہ (۱۸۵۷ء کے علماء کا رضاکار، آج کا انقلاب ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے کہیں زیادہ سخت گیر اور وسیع اثرات رکھنے والا ہے کیا کوئی وقت آئے گا جب اسی طرح ہمارے آج کے اکابرین کی تعلیمات بھی اپنا عملی اثر دکھائیں گی ممکن ہے کہ آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے آج کے اکابرین اپنی روحانی قوتوں میں کسی سے کم نہ ہوں مگر اسے گستاخی اور شکایت پر محمول نہ کیا جائے) واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے علماء کے سامنے روح اسلام کی بقا کا مسئلہ اصل مسئلہ تھا اور آج ہم ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر ایک کے پاس کوئی ایک چیز ایسی ہے جسے اولیت حاصل ہے ابتدائی دینی تعلیم ہر جگہ دوئم درجہ رکھتی ہے، اگر اصل کاموں سے فرصت ہوئی تو ادہر بھی کچھ توجہ کر دی، اگر کسی مدرسہ کا سالانہ جلسہ ہوا یا کسی جماعت کا عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا تو اُس میں دو تین گھنٹے دینی تعلیم پر بحث و گفتگو کے لئے بھی رکھ دیئے گئے اور یہ سوچ لیا جاتا ہے کہ بس جو کچھ کرنا تھا ہم کر چکے، یعنی ہم شاخوں اور پتوں کی آبیاری میں مصروف ہیں اور وہ جڑ کی پرورش پر اپنا کل وقت صرف کرتے تھے۔

نئے ہندوستان کے تعلیمی نقشے کے تقاضوں کو سمجھ لینے کے ساتھ ہمیں "ایک قوم اور ایک کلچر" کے معاملہ پر بھی اپنا ذہن صاف کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا ہماری تحریک سے براہ راست تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا مسئلہ "قوم" کا ہے۔ قوم کسے کہتے ہیں؟ یہ ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیئے اور نہ صرف اپنا ذہن اس موضوع پر صاف کر لینا چاہیئے بلکہ دوسروں کو بھی واضح طور پر بتلا دینا چاہیئے کہ

ہم دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کس طرح ایک قوم ہیں ــــــ اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے ظاہر اور باطن میں تضاد نہ ہو، منافقت اسلام نے کبھی روا نہیں رکھی، اور پھر صرف یہی نہ ہو بلکہ دوسرے بھی سمجھیں کہ ہمارا ظاہر و باطن یکساں ہے، چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قوم کی تعریف اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔

انگریز اپنے دوران حکومت میں ہندوستان کو ایک براعظم کہتے تھے اور قوم کی تعریف یہ کرتے تھے کہ جس کا رہن سہن، لباس، کھانا پینا، زبان، ہر چیز یکساں ہو۔ بنگالی، پنجابی مدراسی دھوتیاں، کیرالا کا تہ بند، یوپی کا پاجامہ، بھانت بھانت کی بولیاں وہ مختلف عقائد و خیالات کا بہانہ نکال کر اور اپنا شکنجہ مضبوط رکھنے کے لئے انگریز ہندوستانیوں کو ایک قوم تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا اس کے بعد آزادی کی لہر چلی اور مسلم لیگ نے دو قومی نظریے کا سوال اُٹھایا، ہندو اور مسلمان کا فرق واضح کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کی صراحت و وضاحت کی ہندو بائیں ہاتھ سے ہر کام شروع کرتے ہیں مسلمان داہنے ہاتھ سے، ہندو بائیں طرف شیروانی اور کوٹ کے بٹن لگاتا ہے اور مسلمان داہنی طرف۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے، ہندوستان کا بٹوارہ ہندو اور مسلم دو ریاستوں میں ہو جانا چاہئے جہاں دونوں اپنے ذہن و مزاج کے مطابق اپنی اپنی حکومتیں بنا کر اُن کے ذریعے اپنی خودی کو آشکارا کر سکیں۔

ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے اُس وقت قوم کی تعریف یہ کی کہ جس جغرافیائی حدود کے بسنے والے اپنے اندر اتنی یکسانیت پائیں کہ مل کر ایک حکومت کے ماتحت رہنے کو تیار ہوں خواہ اُن کی زبان، اُن کے کلچر اُن کے رہن سہن اُن کے عقائد و خیالات میں کتنا بھی اختلاف ہو وہ ایک قوم ہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان ایک ایسا باغ ہے جس میں مختلف قسم کے پھول ہیں، ہر پھول کا رنگ اور اُنکی خوشبو دوسرے سے جُدا ہے، پھر بھی باغ ایک ہے اور تنوع سے اُس کی ایکتا میں فرق نہیں آتا۔ دستور ہند نے اسی نظریے کو اپنایا ہے ایک قوم اور ایک کلچر کا نظریہ دستور سے پرے ہے ضرورت ہے کہ ہم اس نازک مرحلہ پر اپنا موقف واضح کر دیں اور جہاں یہ ظاہر کریں کہ ہم ہندوستانی

عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں وہاں یہ بھی بتلا دیں کہ ہم ایک قوم اور ایک کلچر کے نظریے کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم ایک ایسے عالمگیر تہذیبی سرمایے کے وارث ہیں جو اپنے اندر سب کچھ رکھتا ہے اور جو پروانہ کی صفت نہیں رکھتا جو روشنی کا جویا ہو بلکہ جگنو کی طرح ہے جو سراپا روشنی ہے۔ اس لیے ہم طوافِ شمع سے آزاد ہیں اور اپنی فطرت کے تجلی گاہ میں آباد رہنے کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ اس وضاحت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے، اس پر ہمارے رہناؤں کو غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور ہم کو بھی اس پر سوچنا ہے، کیونکہ اسی پر دینی تعلیمی تحریک کی بنیاد قائم ہے۔ دینی تعلیم تہذیبی سرمایے کو پس پشت ڈال کر وجود ہی میں نہیں آسکتی ہے۔ ایک ایسا مذہب جو عالمگیر اور زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تعلیمات کا ایک بحر ناپیدا کنار رکھتا ہو اور جس کے ٹھوس اصول ابتک اربوں دلوں پر حکمرانی کرتے ہوں اپنی ثقافت کو ترک کرکے ایک شجرِ بے برگ و بار رہ جائے گا۔ ہمیں بہر قیمت پر دینی اسلامی تہذیب کو وطن دوستی اور قوم پروری کی پوری پابندی کے ساتھ زندہ رکھنا ہو گا طوفان اتنا تیز اور لہریں اتنی سخت اور گرداب بلا کا اتنا زور ہے کہ اسکے مقابلہ کے لیے ہمیں بہت پختہ عزم اور نہایت استقلال پیدا کرنا ہوگا۔

مگر کیا یہ جو روئداد اوپر درج کی گئی ہے وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہم اس طرح کی ایک زندہ اور بیدار قوم ہیں جو اپنے کو اس سیلاب سے بچا سکتے ہیں؟ وہ غفلت اور لاپرواہی جو ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہے اس کو دیکھتا ہوں تو ... ہمارے ... تباہی کی نشاندہی کرتی ہے ایسا نہ ہو کہ آئندہ آنے والی نسلیں جب اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو وہ پکار اٹھیں کہ یہ وہ کم ہمت، کمزور دلے اور کور دیدہ تھے جنھوں نے وقت کی آواز کو نہیں پہچانا، اور اپنی پست ہمتی سے وہ سب کچھ کھو دیا جو محنت، قربانی، عقل اور تحمل سے بچایا جا سکتا تھا۔

فنا جس کی نظر ہے اور اپنے باب غیرت بھی
کٹے جاتا ہے ... ہم ... خواب غفلت بھی

[illegible] ... (الفرقان)

ہندوستانی یورپ اور مسلمان

(از شری سمپورنانند جی، سابق وزیر اعلیٰ یو، پی)

[چند ماہ ہوئے شری سمپورنانند جی نے اپنی بعض تقریروں میں ہندوستانی یورپ (اسلامت) کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے رویہ کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ نومبر کے الفرقان میں اس پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کے متعلق سمپورنانند جی نے مدیر الفرقان کو ایک خط تحریر فرمایا جو اڈیٹر کے جواب کے ساتھ دسمبر کے الفرقان میں شائع ہوا۔ اب اسی سلسلہ میں سمپورنانند جی کا ایک اور خط آیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے، الفرقان کی جانب سے ایک مختصر نوٹ بھی آخر میں ہے۔ اب گویا بحث ختم ——— ایڈیٹر]

جناب اڈیٹر صاحب الفرقان! تسلیم

میں ادھر اکثر اتر پردیش کے باہر رہا ہوں، اس لیے الفرقان کے دسمبر کے رسالہ میں جو مضمون چھپا تھا اس کی بابت کچھ عرض نہ کر سکا۔

میرا بھی یہ خیال ہے کہ واقعی اب بحث ختم ہو چکی ہے، مولوی ندوی صاحب نے اور آپ نے جو رائے ظاہر کی ہے، وہ میرے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے لفظوں میں ہم نے مسئلہ کے ایک پہلو پر زور دیا ہو اور آپ نے کسی دوسرے پہلو پر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا مقصد نسلی اور خاندانی بزرگوں سے ہی تھا۔ مگر اس بات سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ عام طور پر قوموں کے سلسلہ میں ملک کے بڑے لوگوں کو یاد کیا ہی جاتا ہے۔ نسلی مورث تو ہر قوم کے ہوتے ہیں، افریقہ کے حبشیوں کے بھی خاندانی بزرگ رہے ہی ہوں گے۔ مصر، عرب، یونان، روم، چین،

ایران میں کئی ایسے لوگ ہوئے ہیں جن کو آج دنیا جانتی ہے ان کے ناموں سے قوم کے نام میں چار چاند لگ جاتے ہیں، ہندستان میں بھی ایسی ہستیاں ہوئی ہیں میں اُن کی طرف ضرور دھیان دلانا چاہتا ہوں۔

رام اور کرشن کو جانے دیجیے، مگر یدھشٹر، ارجن، بھیم، چندرگپت، اشوک، سمندرگپت کی پوجا تو ہندو بھی نہیں کرتا، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ کرشن کچھ بھی رہے ہوں مگر آج دنیا کے ہر ملک میں ان کی بھگوت گیتا کی کیسی قدر ہے۔ شنکراچاریہ کے ادویت فلسفہ کو تعلیم یافتہ لوگ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ ہندستان کا مسلمان یہ سمجھے کہ یہ لوگ ہمارے ہیں ہندوؤں کی ان پر کوئی خاص ملکیت نہیں ہے، اور بہ نسبت نوشیرواں، رستم، افلاطون، ارسطو کے ہمارے قریب تر ہیں۔

غیر آرین بزرگوں کے نام نہ جاننا میری لاعلمی کا ثبوت ہے اور اس کے لیے میں شرمندہ ہوں، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے زمانہ کو کم سے کم ... ہ سال ہو گئے۔ اس لیے میری غلطی کچھ حد تک قابل معافی ہے۔

میں نے کسی وقت تھوڑی سی فارسی پڑھی تھی۔ لیکن کسی معنیٰ میں بھی اپنے کو فارسی داں نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا فردوسی کے شاہنامہ کی بابت آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو تسلیم کیے لیتا ہوں۔

آپ کو غالباً یہ غلط اطلاع ملی ہے کہ ہندو پر درج والی بات کو میں بار بار تحریک کی طرح دُہراتا ہوں۔ شاید دو ہی چار بار اس کا ذکر کیا ہوگا، مقصد اتنا ہی تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے زیادہ قریب آئیں۔ میرا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے ایشور ہی نیک جانتا ہے۔

نیازمند

سمپورنانند

الفرقان: ——— محترم سمپورنانند جی کا یہ خیال اور یہ دچار بلاشبہ نیک ہے کہ ہندستان کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئیں، یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ایک دیش کے رہنے والے ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ نہ مسلمان ہندو کو صحیح طور سے سمجھتا ہو اور نہ ہندو مسلمان کو۔ اس خلیج کو پیدا کرنے میں بہت بڑا دخل تو انگریزی ڈپلومیسی کو ہے، اگر ہم سب بجائے خود

بھی اس قصور کے ذمہ دار ہیں، اب جبکہ ہم انگریزوں سے نجات پا چکے ہیں اور ایک آزاد قومی حکومت قائم ہو چکی ہے، ہمارا بنیادی فرض ہے کہ اس خلیج کو پاٹنے کے ذرائع سوچیں اور تمام نیک ذرائع میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ یہ قومی خدمت کا ایک وسیع میدان ہے، اور قوم و وطن کا بڑا سچا خادم ہے وہ شخص جو اپنی صلاحیتیں اس میدان کی نذر کرے۔

رہا یہ خاص سوال کہ ہندوستان کے ہندو اسلاف سے ہندی نژاد مسلمان بھی کیوں بہت دور اور بے خبر ہیں، اور یہاں ایران کی سی بات کیوں نہیں ہے؟ تو اس سلسلہ میں اس واقعہ کو ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایران پورا کا پورا مسلمان ہو گیا تھا، جبکہ ہندوستان کی پرانی آبادی زیادہ تر اپنے قدیم مذہب پر رہی اور پھر اس میں تبدیلِ مذہب کر لینے والوں کو ملیچھ سمجھ کر ان سے چھوت چھات برتنے کا بھی ایک اصول تھا اس فضا میں قدرتی طور پر تبدیلِ مذہب کر لینے والوں اور ان کی اولاد میں پیدا ہونے والوں کے ہندو اجداد و اسلاف سے کٹ جانے پر بھی زور دیا گیا ہوگا۔ ان کے دلوں کے مذہبی اختلافات کو ابھارا گیا ہوگا، ایسی صورت میں آدمی خواہی نخواہی کٹ ہی جاتا ہے۔ اور بیگانگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ خصوصاً جبکہ سماجی طور پر بھی اس کو بالکل کاٹ دیا جائے۔ ایران میں پورے ایران کے جلد ہی مسلمان ہو جانے کی وجہ سے ان باتوں کی نوبت نہیں آئی۔ ہم جہاں تک سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے، اس معاملہ میں ہندوستان اور ایران کے فرق کی۔ باقی اللہ بہتر جانے۔

یہ بات اس بحث میں کسی اضافہ کے طور پر نہیں کہی جا رہی ہے، بحث تو دراصل سمپورنانند جی کے اس گرامی نامہ پر بہت معقولیت کے ساتھ ختم ہو چکی، یہ صرف موجودہ صورتِ حال کی اپنے خیال کے مطابق ایک توجیہہ ہے جس پر اصرار بھی نہیں۔ مقصد محض یہ ہے کہ اگر ہندی مسلمانوں کی یہ بات نامناسب ہی ہو کہ انھیں اپنے نسلی بزرگوں سے کوئی تعلق کیوں نہیں ہے تو اس طرف بھی دھیان ہونا چاہیے کہ اس بات کے پیدا ہونے میں خود ان کو کس حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ہم بلا کسی بحث کے خیال کے اس طرف اور توجہ دلانا چاہیں گے کہ صدیوں کی بے تعلقی کی وجہ سے اب یہ جاننا بھی ممکن نہیں رہا ہے کہ کس ہندوستانی مسلمان کا شجرۂ نسب کس ہندو پورروج سے ملتا ہے۔ اس لیے نسلی بنیاد کے جذباتی تعلق کا پیدا کرنا اب گویا بالکل ہی مردے کا زندہ کرنا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ اس بے سود کوشش پر اب وقت صرف نہ کیا جائے، مقصد تو ہندو مسلمانوں کا قریب

کرنا ہے، اس کے لیے اور ممکن راستے آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں: اور ہم سب کو اپنا قیمتی وقت اور دماغی صلاحیتیں انہی دوسرے ممکن اور مناسب راستوں کی تلاش میں صرف کرنی چاہئیں۔ اس طرح شاید جلد اچھے نتیجے نکل آئیں۔ خدا نے چاہا تو ہم قریب ہی میں ایسے راستوں کی کچھ نشاندہی کریں گے۔

تعارف و تبصرہ

[ابتک وصول شدہ کتابوں سے فراغت کے بعد یہ عنوان ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ براہ کرم الفرقان میں تبصرہ کے لئے اب کوئی کتاب نہ بھیجی جائے۔ اڈیٹر]

تذکرۂ سلیمانؒ | از جناب مولوی غلام محمد بی، اے عثمانیہ۔ شائع کردہ ادارہ مجلس علمی کراچی صفحات ۶۴۶۔ سائز درمیانی (۲۲×۱۸) مجلد، قیمت ۱۵/ روپے۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی گنی چنی اسلامی شخصیتوں میں تھے۔ انکی علمی عظمت کی دھوم ملک ہی میں نہیں بیرون ملک بھی تھی، مشرق ہی نہیں مغرب بھی اُن کے علم کا لوہا مانتا تھا، اور ان کا نام آج ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں ۱۳۷۳ھ (مطابق ۱۹۵۳ء) کراچی (پاکستان) میں وفات پائی سید صاحب علیہ الرحمہ کا جسم گو ارض پاکستان کے حصہ میں آیا لیکن علم و قلم کی یادگار نصیب ہند ہے۔ جسے دارالمصنفین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لئے سید صاحب کی سوانح حیات، کی تالیف و ترتیب اصلاً دارالمصنفین ہی کا حصہ تھی، لیکن سید صاحب کے فیض روحانی اور سرمایہ عرفانی کے ایک خوشہ چیں (آپ کے مرید و مسترشد) جناب غلام محمد صاحب اس معاملہ میں آپکے وارثان علمی پر سبقت لے گئے ——— شاید یہ علم و دانش کی نسبتوں کا فرق ہے۔

بہرحال غلام محمد صاحب کا مرتب کردہ یہ تذکرہ اور اُن کے جوش عقیدت کا مرقع ہمارے سامنے ہے۔ موصوف کا سید صاحبؒ کے ساتھ جس نوعیت کا تعلق تھا۔ اسی نوعیت کا یہ تذکرہ بھی ہے۔ یعنی اسکے ذریعہ اصلاً سید صاحب علیہ الرحمہ کے اس دور کو ...... بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو آستانہ تھانویؒ کی طرف آپ کے میلان سے شروع ہوتا ہے، اسکی تفصیلات (شیخ تھانویؒ سے مکاتبت، آمد و رفت اور تعلق و محبت

وغیرہ وغیرہ) بڑی روح نواز اور نفع بخش ہیں۔ کتاب کے اندر دو حصے ہیں پہلے حصہ میں مذکورہ بالا دور کی تفصیلات کے علاوہ سید صاحب کے سوانح حیات کے باقی ابواب، بعض خصوصی کمالات، مریدین کی تربیت کے اصول، عارفانہ دور کا کلام (اشعار) اور بعض تحریریں شامل ہیں۔ دوسرا حصہ جو پونے تین سو صفحات کا ہے، مرتب تذکرہ اور صاحب تذکرہ کے مابین، ایک طالب و سالک اور ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے' دس سالہ خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ جس سے سید صاحب کے طریق اصلاح و تربیت، روحانی بصیرت اور مقام حکمت و معرفت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ بڑے کام کی باتیں اور بڑے بڑے گہرے علمی و اصلاحی نکتے اس حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غلام محمد صاحب اس افادہ عام پر "یاران نکتہ دان" کے شکریے کے مستحق ہیں۔

لائق تذکرہ نگار نے بطور اعتذار لکھا ہے کہ "ممکن ہے حُبِ طبعی سے مغلوب اصحاب کو ..... کسی کسی مقام پر (شیخ کی شان میں) سوئے ادب یا حسن عقیدت کی کمی کا گمان گزرے"۔ ہمارے خیال میں یہ اندیشہ بیجا ہے، ہاں اس کے برعکس فرط عقیدت کا احساس ضرور ہوتا ہے جس کے ماتحت یہی نہیں کہ عبارت جابجا عقیدت آرائی سے بوجھل ہوگئی ہے بلکہ کہیں تحدی کی یہ صورت بھی پیدا ہوگئی ہے کہ

"کوئی اس ایثار و بےنفسی کی نظیر تو پیش کر دکھائے!" (صفحہ ۱)

[illegible] جوش عقیدت نے "ضیا بخش الہلال" کے عنوان کے ماتحت وہ چند غیر متوازن جملے تذکرہ نگار کے قلم سے نکلوا دیئے ہیں جن سے مولانا آزاد کے عقیدتمندوں کو کافی شکایت ہو سکتی ہے۔ اور کوئی بھی متوازن آدمی ان کے اس انداز بیان کو یقیناً پسند نہیں کر سکتا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس قدر فتنہ آرائی اس موازنہ آزاد و سلیمان میں ابھی پچھلے دنوں ہو چکی ہے پھر بھی غلام محمد صاحب جیسے سلیم اور ہوشمند آدمی اس قضیہ سے دامن بچا کر نہ گزر سکے! ـــــــ

بہت ہی صائب اور پُرحکمت تھا علامہ سید سلیمان رحمۃ اللہ کا یہ مشورہ اور ان کی یہ تاکید کہ

"واقعہ نگاری میں قلم کو غیر جانبدار ہونا چاہیے تاکہ بیان کی تاثیر اور صداقت مشتبہ نہ ہو اور وہ کسی انفرادی تاثر کے بجائے ایک ایسا مؤثر بیان بنے جس سے

ہر اثر پذیر طبیعت اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق اثر قبول کرے۔"

(تذکرۂ سلیمان صفحہ ۱۹)

کیا اچھا ہوتا کہ اُن کے تذکرہ نگار اسکو ملحوظ رکھ سکے ہوتے اور واقعہ نگاری میں انکے انفرادی تأثرات اس طرح کھل کر راہ نہ پاتے کہ ہمیں نظر بچانا مشکل ہو جاتا۔

تبصرہ نگار، کے اس ناخوشگوار فرض کی ادائیگی میں آخری بات جس کی طرف ہم تذکرہ نگار کو توجہ دلانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ بعض واقعات کے تذکرہ میں بعض اشخاص کا ذکر صاف طور پر توہین آمیز ہو گیا ہے، اور اشخاص بھی وہ جو سید صاحب سے تعلق اور محبت رکھنے والے رہیں۔ جس " قیل وقال" اور جس " اُچھل کود" کو سید صاحب نے ازراہِ محبت یا وسعتِ ظرف گوارا کیا اس پر غلام محمد صاحب کے بیان میں ناگواری نہ آتی تو کچھ حرج نہ تھا

وللناس فیما یعشقون مذاھب

ہندوستانی مسلمان از، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ نفیس کتابت وطباعت، اعلیٰ کاغذ ۲۳۴ صفحات مجلد قیمت ۵۰/۳

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی یہ تیسری کتاب (کتابچے اس شمار میں نہیں ہیں) بھی مجلس کے نہایت پاکیزہ اور دلکش اشاعتی معیار پر سامنے آئی ہے، اس کتاب کا ایک مقالہ، کئی چھپنے ہوئے ہم ہدیہ ناظرین الفرقان بھی کر چکے ہیں۔ اس کتاب کی اصل درحقیقت مولانا علی میاں کی چند ریڈیائی تقریریں ہیں جو ممالک عربیہ میں مسلمانانِ ہند کے تعارف کے لئے آل انڈیا ریڈیو دہلی نے مولانا موصوف سے عربی میں نشر کرائی تھیں، بعد میں مولانا نے ان تقریروں پر چند مضامین کا اضافہ فرما کر اس کو عربی میں ایک باقاعدہ کتاب کی شکل میں مرتب فرما دیا، اسی کتاب کا یہ ترجمہ ہے جو مولوی محمود الحسن صاحب ندوی نے مولانا کی نگرانی میں کیا ہے۔ اسکے مضامین کی اجمالی فہرست یہ ہے۔

ہندوستان کی تہذیب وتمدن پر مسلمانوں کے اثرات۔ علمائے ہند کے علمی کارنامے

ہندوستان کی باکمال اسلامی شخصیتیں، عربی کے اثرات ہندوستانی زبانوں پر ،

ہندوستانی اسلامی تہذیب ، ہندوستان کی قدیم علمی تحریک ، قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات مسلمانوں کے موجودہ علمی و ثقافتی مرکز ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل و مشکلات ۔

دنیائے عرب کے سامنے مسلمانانِ ہند کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ زندگی کی جھلکیاں پیش کرنے کے لئے یہ مضامین بہت موزوں نظر آتے ہیں ، خود مسلمانانِ ہند کے لئے بھی اس میں کافی افادیت ہے ، اور ترجمہ کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد ہے ، لیکن اس اردو ترجمہ کا جو خاص الخاص مقصد کتاب کے " حرفِ آغاز " سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی ہم وطن غیر مسلم اکثریت بھی مسلمانوں کو اور ان کے مزاج کو سمجھے ، ان کے ماضی کی عظمت اور ان کے شاندار علمی ، ادبی ، سیاسی اور سماجی کارنامے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اُن کے دور کی جاوداں یادگاریں نیز موجودہ دور میں ان کے مسائل و مشکلات ملک کی اکثریت کے علم میں آئیں ، اس مقصد کے لئے ، ہماری ناقص رائے میں ، کتاب کا انداز اور اس کا مواد کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے ، اگر یہ رائے صحیح سمجھی جائے تو ہم گزارش کریں گے کہ آئندہ اڈیشن میں مقاصد کی فہرست سے یہ آخری جزو نکال دینا مناسب ہوگا ۔ یوں بھی اردو زبان میں کچھ لکھ کر موجودہ دور میں اکثریت تک اس کے پہنچنے کی توقع نہیں کی جا سکتی ——— کتاب کا ایک مضمون ، " ہندوستانی اسلامی تہذیب " بے شک ایسا ہے جو اس مقصد سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے ، اور " بقامت کہتر و بقیمت بہتر " کا مصداق ہے ۔

" مسائل و مشکلات " والا مضمون اپنے انداز کے لحاظ سے باہر کے لوگوں کے کام کا زیادہ ہے ، اس کو ہمارے خیال میں صرف عربی اڈیشن ہی میں رہنا چاہیئے ، اردو اڈیشن میں اگر رہے تو اس میں مسائل و مشکلات کی فہرست کے بجائے حل کی طرف رہنمائی کی جانی چاہیئے ، ویسے موجودہ صورت بھی مسائل کے صحیح شعور کا فائدہ ضرور پہنچاتی ہے ۔

ہندوستان میں اپنے ماضی کے روشن اور قابلِ فخر پہلوؤں (خصوصاً دینی پہلوؤں) سے ایک حد تک واقفیت کیلئے کچھ پڑھے لکھے مسلمان اس کتاب سے کافی مستفید ہو سکتے ہیں ۔ حُبِّ وطن کے نقطۂ نظر سے ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی جانبازیوں اور کارناموں

کا بیان بہت ہی مؤثر اور جاندار ہے، البتہ اسکے بعد کی آزادی کی جد و جہد میں مسلمانوں کے حصہ کا بیان کچھ تشنہ و مضمحل نظر آتا ہے اور بہت کچھ سرسرے جن کی کیفیت ہے، اچھا ہو کہ مولانا کا قلم اسکو بھی اُبھار کر سامنے لائے اور اس عہد کی نامور اور جانباز ہستیوں کا شایان شان تذکرہ ہو ــــــ بعض دوسرے سلسلوں کی چند اہم شخصیتوں کے ذکر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔

درس قرآن (منزل دوم) | مرتب کردہ درس قرآن بورڈ۔ شائع کردہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور، پاکستان۔ صفحات ۶۲۰۔ مجلد۔ ہدیہ دس روپئے۔

ادارہ اصلاح و تبلیغ لاہور، ایک خاص دینی خدمت پندرہ روزہ رسالہ درس قرآن کی شکل میں انجام دے رہے ہیں اس رسالہ میں عوام کے لئے آسان اور مختصر انداز میں صرف قرآن پاک کی تفسیر کی جاتی ہے، یہ تفسیر با قاعدہ اسباق کی شکل میں ہوتی ہے، اور ہر سبق صرف ایک صفحہ کا ہوتا ہے، ایک دو آیتیں ہوا ایک عنوان کے تحت آجائیں، ایک کالم میں اُن کا تحت اللفظ ترجمہ ہوتا ہے۔ دوسرے کالم میں غیر لفظی سلیس ترجمہ۔ نیچے کم و بیش نصف صفحے میں الفاظ کی ضروری لغوی تشریح کے ساتھ ساتھ آیت کا مطلب اور اُس سے ملنے والا سبق اور حکم بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح جب پہلی منزل کے درس مکمل ہوگئے تو ادارہ نے درس قرآن (منزل اول) کے نام سے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھاپ دیا تھا، اب یہ دوسری منزل کے دروس پر مشتمل دوسری جلد بھی چھپ کر آگئی ہے۔ یعنی سورہ مائدہ سے سورۂ توبہ تک ــــــ قرآن سے عوام کی واقفیت کے لئے مفید سلسلہ ہے۔ مرتب کرنے والے تین حضرات کے بورڈ میں سے ایک، مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی بھی ہیں۔

بشریتِ انبیاء | از، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ صفحات ۲۲۴۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، قیمت ۲/۲۵، پتہ:۔ صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔

مولانا دریابادی زید مجدہم کا قلم ایک عرصہ سے خدمت قرآن کے لئے قریب قریب وقف ہو۔

یہ رسالہ بھی اسی خدمت کی ایک کڑی ہے، اسکے اندر قرآن مجید کے بیانات کی رو سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے مرتبۂ بشریت کی تحقیق و تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تیرہ ابواب پر یہ رسالہ منقسم ہے یہ گویا عنوانات ہیں اُن آیات کے مضامین کے جن سے بشریت انبیاء پر روشنی پڑتی ہے۔ ان عنوانات کے تحت آیات مع ترجمہ جمع کر دی گئی ہیں اور مختصر الفاظ سے ان کے مضمون کو کھول دیا گیا ہے ـــ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے بشریت انبیاء کے اثبات پر قرآنی دلائل کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ افسوس جو کج فہمی اور کم نظری انبیاء کے مخاطب منکرین کی تھی کہ ..... لوازم بشریت کا کوئی حامل رسول کیونکر ہو سکتا ہے، اور جس نے انبیاء سابقین کے ماننے والوں کو بھی ان کے بعد عدم بشریت کے اعتقاد میں گرفتار کر کے چھوڑا، وہی روگ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایک بڑے حصہ کو لگا ہوا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مافوق البشر سمجھنے سمجھانے کے چکر میں اچھے اچھے نیک نیت بھی پڑے ہوئے ہیں۔

اس خطرناک گمراہی کا ازالہ علمائے اسلام کے اولین فرائض میں سے ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ علماء کا ایک طبقہ برابر اس فرض کو ادا کرتا رہا ہے، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جو کسی گروہ کے آدمی نہیں سمجھے جاتے اور جن کی شخصیت دینی اختلافات کے باب میں نرم اور قدیم و جدید ہر دو میں کسی نہ کسی حد تک محترم سمجھی جاتی ہے اُن کا یہ رسالہ علماء کے اس طبقہ کو بڑی تقویت پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو عام مسلمانوں کے نفع کا ذریعہ بنائے!

مولانا دریابادی مدظلہ کی زبان و بیان کا تو کہنا ہی کیا، بس اتنی بات بتا دینے کی ہے کہ عوام بھی اُن کی اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

چند مقامات پر تبصرہ نگار کو جو کچھ تردد ہوا ہے اسے مولانا کی خدمت میں پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) چوتھے باب میں وہ آیات درج کی گئی ہیں جن سے انبیاء کے لئے "غضب"

کا اثبات ہوتا ہے۔ تبصرہ نگار کو یہ سمجھنے میں تردد ہے کہ ان آیات سے انبیاء کی بشریت پر کیونکر روشنی پڑ سکتی ہے، غضب تو کوئی خاصۂ بشری نہیں، ذاتِ حق کے لئے بھی ثابت ہے۔

(۲) آٹھویں باب کی تیرھویں آیت سے صفحہ ۹۵ پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ڈوبتے ہوئے فرزند کے بچائے جانے کی جو درخواست جناب الٰہی میں کی وہ اس بناء پر کی کہ آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ فرزند مسلکِ توحید پر نہیں بلکہ راہِ شرک پر تھا، لیکن صفحہ ۱۵ پر اس درخواست کو اجتہادی غلطی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے ہمارے خیال میں دوسری ہی بات صحیح ہے۔

اسی طرح اسی باب کے صفحہ ۹۹ پر " فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ" سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے باپ کے مشرک ہونے کا بھی علم نہ تھا۔ اسی لاعلمی کے ماتحت انھوں نے دعائے مغفرت کی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ایسی بات ہوتی قرآن مجید کو حضرت ابراہیم کی صفائی میں إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ کہنے کی ضرورت نہ تھی، باپ کے شرک سے لاعلمی بجائے خود بہت کافی عذر تھا۔

نویں باب میں صفحہ ۱۱۱ پر اللہ کے اُس خاص بندے کے فعل کی طرف جس کے علم سے مستفید ہونے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک سفر فرمایا تھا یعنی عرف عام میں حضرت خضر علیہ السلام کے فعل کی طرف "مُنکَر" کی علی الاطلاق نسبت کھٹکنے والی چیز ہے، "صورۃً" جیسی کوئی قید شاید یہاں مناسب رہتی۔

اس طرح اسی باب میں صفحہ ۱۱۹ پر " رفیقوں کی بھی بے تمیزیوں" کے الفاظ اس سے بھی زیادہ شاق گزرنے والے ہیں۔ شاید مولانا نے یہ دونوں لفظ خالص لغوی مفہوم میں بولے ہوں، مگر عرف میں تو ان کا مفہوم سخت ہی ہے۔

کتاب کا گیارہواں باب اپنی ناقص رائے میں مولانا کی بہت کچھ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔

مولانا کی اپنے اہم تصنیفی پروگراموں میں شدید مصروفیت کا نیازمندوں کو علم ہے، یہ بھی علم ہے کہ اس طرح کے رسائل وہ ضمنی خدمات کے طور پر تصنیف فرماتے رہتے ہیں، مگر اس پورے رسالہ کا موضوع تو اہم اور نازک ہی ہے، خاص طور پر " زلّات و قربِ زلّاتِ انبیاء

کا عنوان بڑا نازک ہے جو گیارہویں باب کا موضوع ہے۔ یہ عنوان کچھ خصوصی توجہ چاہتا تھا جو شاید نہیں مل سکی، مولانا نے اس باب کی تمہید میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"پیغمبر اس غرض نہیں پیدا ہوتے کہ اُن کی فطرت ہی سے معصیت کی صلاحیت سلب کر لی گئی ہو۔ اگر ایسا ہو تو انھیں بشر کہا بھی کیوں جائے۔"

پھر اسی سیاق میں ایک سطر آگے بڑھ کر،

"حضرات انبیاء یہی نہیں کہ بہت دفعہ لغزشوں کے قریب پہنچ گئے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو لغزشیں اُن سے سرزد ہو کر بھی رہی ہیں۔"

یہاں لغزشیں سرزد ہونے کی بات جس سیاق میں آئی ہے اُس سے ذہن لغزش بمعنی معصیت کی طرف جاتا ہے۔ حالانکہ مولانا کا مطلب یہ نہ ہوگا کیوں کہ جمہور کا یہ مسلک نہیں ہے ــــ مولانا نے جو بنیادی حقیقت اپنے قارئین کو سب سے پہلے نمبر پر نوٹ کرائی تھی، اُس سے مولانا کا منشا یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گرفت کی سختی دیکھ کر کسی قاری کو کہیں وہم نہ ہو جائے کہ لغزش کوئی بڑی سخت نوعیت کی تھی اور انبیاء بڑی بڑی سخت لغزشیں کھا بیٹھتے ہیں۔ لیکن تمہید کا دوسرا پیرا جس کا اقتباس اوپر دیا گیا، مولانا کے اس منشاء کو سخت خطرے میں ڈال دیتا ہے اور خود اُنہی کے الفاظ سے آدمی کو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ انبیاء سے معصیت تک ہو سکتی ہے۔ پھر یہ قصہ اِنہی الفاظ پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ تیسرے پیرے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"انبیاء کی زندگی کے دو دور کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ پہلا دور ہر نبی کی زندگی کا قبل نبوت کا ہوتا ہے۔ دوسرا دور، جب وہ منصب نبوت پر سرفراز ہو چکا ہوتا ہے۔ پہلے دور میں گو اُس میں بہترین صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، اور اپنے عام اخلاق و اطوار میں وہ اپنے ہم چشموں میں علانیہ ممتاز ہوتا ہے، پھر بھی لغزشوں کا نہ صرف اسکے لئے امکان رہتا ہے بلکہ واقعۃً ان کا صدور بھی اس سے ہو چکا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد دو مثالیں دیکر مولانا "دورِ نبوت" کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:۔

"لیکن خود نبوت مل جانے کے بعد بھی یہ نہیں ہوتا کہ نبی سے بشریت ہی سلب کر لی جائے اسکی فطرت ایسی بنا دی جائے کہ شیطانی تحریک سے اثر پذیری کی

صلاحیت ہی اُس میں باقی نہ رہ جائے اور پیغمبری دعوت میں خلطِ شیطانی کی سرے
سے گنجائش ہی نہ رہنے پائے۔"

پھر اپنے بیان کی تائید قرآن سے اس طرح فرماتے ہیں کہ

"حضورؐ کو مخاطب کر کے ایک عام قاعدہ سارے انبیاء کے لیے سنا دیا گیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور نبی
مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا	ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ پیش نہ آیا ہو کہ جب
إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ	اس نے کچھ پڑھا تو شیطان نے اُس کے
فِيْ أُمْنِيَّتِهٖ (الحج۔ع ۷)	پڑھنے میں شبہ نہ ڈالا ہو۔

اور اس اجمالی بیان کے علاوہ تین پیمبروں کا تو نام لے کر اُن کی لغزشوں کی صراحت
فرمائی گئی ہے۔ ایک اُن میں حضرت سلیمانؑ ہیں۔..........
دوسرا ذکر آپ ہی کے والد ماجد حضرت داؤدؑ کا ہے..........
تیسرا نام اس سلسلہ میں حضرت یونسؑ کا آتا ہے۔..........."

مولانا کا مدعا تو جو بھی کچھ رہا ہو، مگر اس پورے سلسلۂ بیان سے (جس کے
اقتباسات بیان دیئے گئے) ایک عام قاری کے ذہن پر اثر بظاہر یہی پڑے گا کہ نبوت
سے سرفراز کئے جانے کے بعد بھی، دورِ نبوت سے قبل کے مقابلہ میں کوئی خاص
عصمت انبیاء کو حاصل نہیں ہوتی، بلکہ حد یہ ہے کہ دعوتِ نبوت میں بھی شیطانی وسوسہ
اندازیوں سے متاثر ہوئے بغیر وہ نہیں رہ پاتے —— پھر یہ وضاحت بھی آگے پیچھے
کہیں نہیں کہ خلطِ شیطانی کا اثر زائل بھی کیا جاتا ہے یا نہیں!

اس بنیادی الجھن کے علاوہ بیان دو ضمنی اشکالات اور پیدا ہوتے ہیں۔
(۱) یہ کہ کیا قبلِ نبوت کے دور میں تمام انبیاء سے لغزشوں کا صدور کچھ ضروری ہے، جیسا
کہ اس سلسلۂ کلام کے پہلے اقتباس کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو زیرِ خط کر دیے گئے ہیں؟
اور (۲) یہ کہ کیا سورۂ حج کی مذکورۂ بالا آیت کا مطلب مولانا یہ لیتے ہیں کہ شیطانی
اثر اندازی کے نتیجے میں خود انبیاء ہی سے اپنی دعوت کے سلسلہ میں لغزشیں صادر

ہو جاتی ہیں؟ ——— یہ آیت جس سیاق میں پیش کی گئی ہے اور جو جملہ اس کے بعد مولانا کے قلم سے نکلا ہے وہ یہی بتاتا ہے؛ حالانکہ اب تک جو کچھ معلوم تھا وہ یہ تھا کہ اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ کا تحقیقی مطلب انبیاء سے تلاوت دعوت میں لغزش کرا دینا نہیں ہے۔ بلکہ شیطان کا اُن کے سامعین کو اشتباہ میں ڈال دینا یا سامعین کے کانوں میں نبی کے الفاظ کے ساتھ کچھ اور ڈال دینا مراد ہے۔ ——— عجیب بات ہے کہ آیت کے ترجمہ میں مولانا نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے خود یہی مترشح ہوتا ہے۔ مگر پھر آیت مفید مطلب نہیں رہتی ——— پہلے تو کبھی ذہن نہیں گیا تھا، نہ کہیں نظر سے گزرا ہی تھا۔ اسی مولانا ہی کی کتاب میں سورۂ انعام رکوع ۱۴ کی آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ (الآیۃ) دیکھ کر ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ یہ آیت کہیں اس سورۂ حج والی آیت کی تفسیر تو نہیں کرتی؛ تفسیری نقطۂ نظر سے یہ خیال کس حیثیت کا ہے اس کو مولانا ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

دو صفحے آگے چل کر خاص خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ

"حضورؐ کی حفاظت کا خصوصی انتظام اگر غیب سے نہ کر دیا گیا ہوتا، تو دشمنانِ حق و دشمنانِ دین خدا معلوم آپ سے کیا کیا کرا کے رہتے" (صفحہ ۱۵۱)

بیشک ع "اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں!" ——— مگر جب وہ ارشاد الٰہی جسے خصوصی بنیاد بنا کر مولانا نے یہ بات فرمائی ہے خود یوں ہے ـــ کہ وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا۔ (اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ اُن (کفار کی خواہشات) کی طرف جھکنے کے قریب پہنچ گئے ہوتے) تو اس حقیقت کی تعبیر میں ایک سہ استی کے الفاظ تو اور بھی زیادہ محتاط ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ قرآنی بیان سے بھی متجاوز ہو کر یوں کہا جائے کہ خدا معلوم دشمنانِ دین آپ سے کیا کیا کرا کے رہتے۔

صفحہ ۱۵۳ پر لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ کی تنبیہ کو بھی اُن آیات کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی لغزش کا پہلو نکلتا ہو۔

حالانکہ اسکو کسی لغزش پر تنبیہ کے بجائے محض ایک تعلیمی ہدایت کہنا چاہیے! — دراصل کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں آکر مولانا اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں جتنی بھی آیات پیش کی گئی ہیں وہ یا تو کسی محتمل لغزش سے قبل از وقوع روک تھام کے مضمون کی ہیں۔ یا محض تعلیمی ضرورت کے تحت کسی ہدایت کی، یا آپکے خاص منصب کے مطابق محض صورت لغزش (نہ کہ حقیقۃً لغزش) پر تنبیہ کی۔ ایسی ایک آیت بھی نہیں ہے جس سے حقیقی معنیٰ میں حضور کی کوئی "بشری لغزش" ظاہر ہوتی ہو۔ ان آیات سے ہمارے خیال میں حضور کی عبدیت تو ضرور ثابت ہوتی ہے مگر بشریت کا اثبات یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا کہیں ہوتا ہے تو بہت دقیق اور خفی انداز میں۔

تیرھویں باب میں انسانوں کی طرف سے انبیاء کی تکذیب و تضحیک، اور مخالفت و ایذا کے مضمون کی آیات پیش کی گئی ہیں، لامحالہ مقصود یہی ہوگا کہ بشریت کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑے، مگر ایذا کے مضمون کو چھوڑ کر تکذیب و تضحیک اور مخالفت والے مضامین کی آیات کے متعلق یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے اثبات بشریت کیونکر ہو سکتا ہے؟ تکذیب و تضحیک اور مخالفت کا معاملہ تو بہت سے بدنصیب خود ذات حق کے ساتھ بھی کرتے ہیں!

آخر میں کتاب کے سب سے پہلے باب کے متعلق یہ عرض کرتا ہے کہ اس میں بہت انتشار محسوس ہوتا ہے۔ ایک بات جو ایک جگہ آچکی، تھوڑی دیر بعد کسی دوسری آیت کے ساتھ بالکل اسی انداز میں پھر سے سامنے آجاتی ہے۔ صفحہ ۱۴ پر ازواج مطہرات کی خصوصی مسئولیت کا بیان فرمایا گیا ہے، بظاہر اس کا کوئی تعلق موضوع باب یا موضوع کتاب سے نظر نہیں آتا۔

یہ اچھی خاصی ایک طویل فہرست گزارشات کی ہو گئی، دراصل اس کتاب سے تبصرہ نگار کو خصوصی دلچسپی اس وقت سے ہو گئی تھی جب اسکے ابواب مولانا کے ہفتہ وار صدق جدید میں شائع ہو رہے تھے، بعض بعض قسطوں پر نظر پڑتی رہی، بڑا مفید سلسلہ محسوس ہوا۔ کتاب تیار ہو کر آگئی تو بعض موقعوں پر اسکے مطالعہ کی ترغیب بھی لوگوں کو دی۔ کتب خانہ الفرقان کی فہرست میں بھی پرزور تعارف کے ساتھ اس کا نام شامل کرایا۔ اب تبصرہ کی غرض سے مکمل مطالعہ کا موقع ہوا، تو ضروری معلوم ہوا کہ جو جو باتیں نظر ثانی کے قابل نظر آئیں وہ مولانا کی

کتب خانۂ الفرقان کی مطبوعات

تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

شیخ احمد سرہندیؒ کا وہ خاص کارنامہ جس کی وجہ سے آپ کو "مجدد الف ثانی" کا عظیم لقب امت سے ملا، اس کارنامہ کو پورے تین سو سال کے بعد الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ نے طشت از بام کیا تھا — یہ نمبر لوگوں کو آجتک یاد ہے، اسی کے اہم مضامین "تذکرۂ مجدد الف ثانی" کے نام سے از سر نو شائع کئے گئے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں شیخ احمد سرہندیؒ کے حالات کا مطالعہ بڑی گرانقدر روشنی بخشتا ہے، اور معلوم ہوتا ہو کہ شیخ مجدد کا دور تجدید شاید ابتک جاری ہو۔ قیمت ۲/-

مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ

حضرت مجدد کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپکے بعد جس ہستی نے سنبھالا اور سلطنت مغلیہ میں حضرت مجدد کے ڈالے ہوئے دینی رنگ کو تکمیل تک پہنچایا وہ ہیں آپکے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ آپکے مکتوبات بھی آپکے والد ماجد کے شہرۂ آفاق مکتوبات کی طرح عظیم مصلحانہ کاوشوں اور عرفانی علوم و حقائق کے آئینہ دار اور فصاحت و بلاغت کا بحر زخار ہیں۔ اصل زبان فارسی ہے۔ فارسی کے اس خزانے کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص انتخاب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی آب و تاب کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔

قیمت

صرف چار روپئے

ہندوستان کا سب سے پہلا

سفر نامۂ حجاز

مکتبہ الفرقان حجاج کی ضرورت کے لئے دو بہترین کتابیں پیش کر چکا ہو جن کا تعارف اس نمبر میں دوسری جگہ موجود ہو۔ یہ سفر نامہ اس سلسلہ کی تیسری پیش کش ہے۔

آج سے تقریباً اسی برس پہلے، حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب مرادآبادی نے حرمین شریفین کا سفر بڑے ہی ٹھاٹ باٹ سے کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روداد قلم بند کرکے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفرنامہ کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہند و حجاز کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اس کے اندر آگئے ہیں۔ اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو عجیب و غریب ہی مرقع ہو۔ مولانا نسیم احمد فریدی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس چھپے ہوئے علمی و دینی خزانہ کو فارسی سے اردو میں منتقل کرکے اسکو طبع ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔

۱/۱۲

حضرت مولانا

محمد الیاسؒ

اور انکی دینی دعوت

"تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی"

اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ انکی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی اصلاحی تحریک ہو —— شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مبسوط مقدمہ ہے۔ قیمت ۲/۵۰ مجلد ۳/-

ملفوظات حضرت مولانا

محمد الیاسؒ

مرتبہ: مولانا محمد منظور نعمانی

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور انکی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعہ ملفوظات کا مطالعہ کرلے جو دین کے حقائق اور معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا۔ قیمت ... ۱/۵۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

اور اہل بدعت کے الزامات

ان الزامات کا نہایت تشفی بخش جواب مولانا نعمانی کے معرکہ آرا قلم سے۔ قیمت صرف ۵۰/-

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا فیصلہ کن جواب مولانا نعمانی کے قلم سے۔ (زیر طبع)

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی
از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔ مجلد -/۱۲

تاریخ ملت } شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ عہد رسالت سے سلاطین ہند تک۔ قیمت مکمل سٹ (گیارہ حصوں میں) غیر مجلد ۳۰/- مجلد ۴۴/-

تاریخ دعوت و عزیمت } مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی مشہور کتاب جو مجددین و مصلحین امت کے تذکروں پر مشتمل ہے جلد اول پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک، جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہؒ نیز انکے تلامذہ کی خدمات و حالات کے بیان میں
قیمت علی الترتیب -/۶ ، ۶/۸

نقش حیات } حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح عمری۔ جلد اول -/5 دوم -/5

مقدمہ ابن خلدون } فلسفۂ تاریخ کے موسس علامہ ابن خلدون کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو زبان میں متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین۔
قیمت صرف -/۱۵

بستان المحدثین اردو
کتب حدیث کا تعارف اور محدثین کرام کا تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے قلم سے۔ قیمت مجلد -/۵

تاریخ مشائخ چشت } از پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی۔ غیر مجلد -/۱۲ مجلد -/۱۳

تذکرۂ شیخ محمد طاہر پٹنی } ہندستان کے جلیل القدر محدث کا تذکرہ۔ مجلد -/۱

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی
(ایضاً از پروفیسر نظامی) مجلد -/۷

تذکرۃ الرشید } عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حالات زندگی اور فضائل و کمالات کا تذکرہ۔ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ قیمت -/۸

سوانح قاسمی } یعنی بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سوانح حیات۔ مولانا گیلانیؒ کے قلم سے تین جلدوں میں۔ قیمت کامل -/۱۵

حیات انور } یعنی حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ کی حیات مبارکہ پران کے مایۂ ناز تلامذہ کے گرانقدر مقالات کا مجموعہ -/۴

تاریخ دیوبند } قصبۂ دیوبند اور دار العلوم دیوبند کی تاریخ از سید محبوب رضوی۔ مجلد -/۱

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات
ایک مفید تاریخی مطالعہ از خلیق احمد نظامی۔ غیر مجلد -/۸ مجلد -/۹

سفرنامہ ابن بطوطہ } آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان سیاح شیخ ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامہ کا مکمل اردو ترجمہ۔ مجلد ۸/-

طوفان سے ساحل تک
مشہور جرمن نومسلم محمد اسد کی کتاب روڈ ٹو مکہ کا مکمل ترجمہ، جس میں مصنف کی سوانح عمری اور قبول اسلام کی داستان ہے۔ مجلد -/۵

دہلی اور اس کے اطراف } مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء کا ایک دلچسپ اور پُر مغز سفرنامہ

مختلف موضوعات پر
قابل مطالعہ کتابیں

حجۃ اللہ البالغہ مترجم } شاہ ولی اللہؒ کی وہ لاثانی تصنیف جو اسلام کے پورے نظام کی گہری حکمتوں سے باخبر کرتی ہو۔ عربی متن مع ترجمہ دو جلدیں۔ قیمت مجلد -/۲۰

فلسفہ کیا ہے؟ } از ڈاکٹر میر ولی الدین سابق پروفیسر فلسفہ -/۱ مجلد -/۲

تحفۂ اثنا عشریہ } شیعہ مذہب پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی لاجواب کتاب مجلد -/۱۲

مقالات احسانی } تصوف اور مشائخ تصوف سے متعلق مولانا گیلانیؒ کے قابل دید مقالات و مضامین کا مجموعہ مجلد -/۶

مکتوبات شیخ الاسلام } یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کے گرانقدر مکتوبات۔ جلد اول -/۶ دوم -/۶ سوم ۴/۸

اسلام کا نظام حکومت } اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور دستور قوانین بطرز حکومت پیش کیا گیا ہو جو طرز تحریر زمانہ حال کی قانونی زبان سے بالکل مطابق -/۶ مجلد -/۷

ارشادات } یعنی حضرت مولانا مدنی کے مضامین و خطبات اور تقریروں کا مجموعہ۔ مجلد ۳/۸

مسلمانوں کا نظم مملکت — یہ دوسرا ایک مصری فاضل کی کتاب "النظم الاسلامیۃ" کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت -/۶

اسلام کا زرعی نظام — اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ غیر مجلد ۴/۸ مجلد -/۵

اسلام کا نظام عفت و عصمت
اسلام نے پاک دامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قیمت -/۴

اسلام کا نظام مساجد — اسلام کے نظام میں مساجد کا کیا مقام ہے اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں
قیمت ۸/۳

غلامان اسلام — از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ اسلامی تعلیمات کی بدولت مسلمان معاشرہ میں غلاموں کو کیا مرتبہ حاصل ہوا۔ سچا سوانح طیبہ شاہوں کا مجموعہ۔ مجلد -/۷

اعیان الحجاج — یعنی تاریخ اسلام کے بلند پایہ حجاج اور راہ خدا میں ان کے احوال کا تذکرہ۔ از مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی۔ قیمت ۸/۲ مجلد ۸/۳

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات
از جناب مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب
موضوع نام سے ظاہر۔ دو جلدیں
قیمت (مکمل) ۱۲/۵

امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی
اپنے موضوع پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا قابل دید مقالہ -/۱۰/-

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ
مسلمانوں میں نام نہاد سینکڑوں فرقوں کے وجود کی محققانہ تردید اور اس افسانہ تراشی کے اسباب۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ قیمت ۸/۱ مجلد

تاریخ علم فقہ — از مفتی عمیم الاحسان صاحب (ڈھاکہ یونیورسٹی) قیمت ۸/۱ مجلد

بدعت کیا ہے؟ — چند نہایت مفید مقالات کا مجموعہ۔ قیمت -/۳

رکعات تراویح — تراویح کے عدد کی بحث میں ایک محققانہ رسالہ۔ از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
قیمت -/۱

اخلاق اور فلسفہ اخلاق — از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ غیر مجلد ۸/۹ مجلد ۸/۷

مسلمانوں کا عروج و زوال — از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ۸/۵ غیر مجلد ۴/

اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ اپنے موضوع پر قابل دید کتاب ہے ۵/۴

اسلام اینڈ دی ورلڈ — اسی کتاب کا انگریزی ایڈیشن۔ قیمت -/۴

عروج و زوال کا الٰہی نظام — عروج و زوال کے ٹھوس فطری اصولوں کی وضاحت

پرمغز کتاب —
از مولانا محمد تقی امینی
قیمت۔ مجلد -/۳

متفرق کتابیں

مصباح اللغات
(عربی اردو ڈکشنری) -/-/۱۶
بیان اللسان مجلد -/-/۱۰
اردو عربی ڈکشنری -/-/۴
آئینہ نماز -/۸/-
صلوٰۃ النساء -/۶/-
نصیحۃ المسلمین -/۵/-

کتاب الصلوٰۃ (از امام احمد بن حنبل)
قیمت مجلد ۸/۱
علامات قیامت مجلد -/۶/-
تعلیم الاسلام عکسی مکمل
(از مفتی کفایت اللہ) ۶/۱
حسن معاشرت (لڑکیوں کے لیے) ۱۰
فضائل دعا ۱۲

حضرت تھانوی کی چند تالیفات

التکشف عن مہمات التصوف
تصوف و سلوک کے موضوع پر حضرت تھانوی کے افادات کا مجموعہ۔ قیمت ۸/۱۰
تعلیم الدین ۔۔۔۔۔۔ ۱۲/۱
بہشتی زیور مکمل مدلل اختری ۸/۱۳
اصلاح الرسوم مع صفائی معاملات ۱۲/۱
حیات المسلمین ۔۔۔۔۔۔ ۱۲/۱

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا ذریعہ ہے لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ و عہد ہے اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔ جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی اصول [illegible] زندگی کو [illegible] دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم [illegible] عہد کرتے ہیں [illegible] کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

8/4/62

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سمجھ سکے، بیان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ــ ـ /۶/۰

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان، اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح، اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات، اور ان کی روحانی تاثرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت /۱۲/۰

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ کلمۂ طیبہ کی حقیقت کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت .... /۱۲/

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے۔

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ و عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری، قسم اول کاغذ ...... مجلد .... قسم دوم کاغذ ...... غیر مجلد ......

ہندی ایڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد۔ قیمت تین روپے ......

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ .... قیمت مجلد .... /۰/۲

آسان حج

یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے۔ ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت معیاری .... قیمت .... صرف /۸/۰

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ .... /۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت /۴/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت /۰/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید منصور حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے پیدا ہو رہی ہے اس کی اصلاح کے ارادہ سے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے .... قیمت /۱۰/۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت /۶/۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت /۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت /۰/۱

(فی کاپی ۶۰ نئے پیسے)

جلد ۲۹	بابتہ ماہ شعبان ۱۳۸۱ھ مطابق فروری ۱۹۶۲ء	شمارہ ۸

نہایت ضروری

۱۔ الفرقان بابتہ ماہ رجب بر مطابق دسمبر ۱۹۶۱ء چھپ گیا ہو۔ اسکی تصحیح کر لیجیے کہ جنوری ۱۹۶۲ء کا رسالہ تھا۔
۲۔ جنوری ۱۹۶۲ء سے سالانہ چندہ چھ روپئے ہے۔ جن حضرات نے پانچ روپئے بھیجے ہیں ان کی مدت خریداری صرف دس مہینے ہوگی، ورنہ ایک روپیہ اور ارسال فرمائیں۔

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحات

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اسکا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ فروری تک دفتر میں ضرور آجانی چاہئیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائیگا۔

پاکستان کے خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۱۰ تاریخ کے اندر آنی چاہئیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شایع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ایک قوم کے لئے حالات ناسازگار ہوں، اور ساتھ ہی اسکے افراد قومی مصلحت کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر خود غرضی [illegible] ہوں، اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے وہ کام کرتے ہوں جو قوم کے لئے ستم [illegible] ہوں، وہ روش اختیار کرتے ہوں جس سے قوم کے لئے اور بُرے حالات پیدا ہو سکتے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس قوم کے مستقبل کو دنیا کی کوئی طاقت حال سے بھی بدتر ہو جانے سے نہیں بچا سکتی۔

یا اگر بات خود غرضی کی نہ ہو بلکہ اپنے حالات و مسائل اور مستقبل کے بارے میں قوم کے اندر سنجیدگی کی اس قدر کمی ہو کہ اکثر افراد دن رات رونا تو اپنے حالات کا روتے ہوں مگر کسی معاملہ میں قدم اٹھاتے وقت سنجیدگی سے کبھی یہ سوچتے ہی نہوں کہ اس معاملہ کا ہمارے حال اور مستقبل سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ہمارا قدم اس معاملہ میں اپنی بھلائی کی راہ پر پڑ رہا ہے یا خدانخواستہ جو راہ ہم اپنا رہے ہیں وہ اور زیادہ بُرے حال میں ہم کو پہنچا دے گی؟ —— تب بھی نتیجے میں کوئی فرق ہرگز نہیں پیدا ہوگا۔ جو بُرے نتائج پہلی صورت میں نکلیں گے، وہی قطعی طور پر اس دوسری صورت میں بھی نکلیں گے کہ قوم کی اکثریت بے سوچے سمجھے جو جی میں آئے کر گزرنے کی عادی ہو

---

۴۴ برس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات جو خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں

اور مستقبل میں بہتری کی صورتیں پیدا نہیں ہو رہی ہیں، اگر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے گا کہ تو محسوس ہوگا کہ اس میں بہت بڑا دخل اس بات کو بھی ہے کہ بدقسمتی سے یہ دونوں ہی بیماریاں ہمارے اندر موجود ہیں، ذاتی مفاد پرستی کے ماتحت ایسے کام کرنے والے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جو قومی مصالح کے لئے سم قاتل ہیں۔ اور قوم میں سنجیدگی کے ساتھ فکرمندی کی بھی اس قدر کمی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت بہت دور رس معاملات میں بھی قومی نفع وضرر سے بے نیاز ہو کر جو دل چاہتا ہے وہ کر گزرتی ہے۔

الیکشن ہی کی مثال لے لیجئے جو بالکل سر پر ہے۔ دو عام الیکشن اس سے پہلے ہو چکے ہیں۔ الیکشن ایک جمہوری نظام میں کتنی اہم چیز ہے۔ ملک کی سیاست اور نظم ونسق کا رُخ ہی اس سے متعین ہوتا ہے، لیکن جائزہ لیجئے کہ ہم نے پچھلے دو الیکشنوں میں ووٹ کی طاقت اور امیدواری کے حق کا استعمال کس حد تک سوچ سمجھ کر اور ملی مفاد کے نقطۂ نظر سے کیا اور کس حد تک بے سوچے سمجھے اور ذاتی مفاد پرستی کے ماتحت کیا؟ اس طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو کچھ خوش کن صورتِ واقعہ ہمارے سامنے نہیں آئے گی ——— دراصل ہمارے عوام کا ایک طبقہ تو وہ ہے جو الیکشن کو محض ایک کھیل اور تفریح سمجھ کر اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو محض کسی ذی اثر کے کہنے سے کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔ اور تیسرا بہت بڑا طبقہ وہ ہے جو اپنی رائے سے کسی کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اس رائے میں یا تو صرف ذاتی تعلق یا کسی اختلاف کو دخل ہوتا ہے۔ یا مقامی گروہ بندی کو، یا ذاتی یا بہت محدود نوعیت کی کسی مصلحت کو، یا کسی مقامی مسئلہ کے ماتحت جذبات کو، یا مذہبی جذبہ کے ماتحت کسی خام خیالی کو، مسلمانوں کی مصلحت کا کھلا ہوا تقاضا تو یہ ہے، جسے ہر شخص تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے کہ

(۱) مسلم دشمن جماعتوں کی طاقت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بڑھنے نہ پائے۔

(۲) برسرِ اقتدار جماعت کے ایسے افراد شکست کھائیں جن سے مسلم دشمن جماعتوں کو تقویت پہنچتی ہے۔

(۳) ایسے غیر مسلم امیدوار کامیاب ہو سکیں جن میں انصاف پسندی ہو اور جن کا دامن مسلم دشمنی سے ملوث نہیں ہے۔

(۴) ایسے مسلمان امیدوار پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہنچ سکیں جن کے دلوں میں مسلمانوں کا سچا درد ہو اور جرأت کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل پر بول سکیں۔

یہ موجودہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی مصلحت کے بہت کھلے ہوئے اور صاف تقاضے ہیں جن سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ مگر وائے ناسمجھی وکم نظری کہ ہم میں بہت شاذ و نادر ہوتے ہیں جو اِن تقاضوں کو پورا کرنے کے وقت پر (یعنی الیکشن میں) اِن کا خیال رکھتے ہوں، ہم کسی ذاتی تعلق والے کو، کسی گروہی تعلق والے کو، کسی مذہبی رشتہ والے کو کھڑا ہوا دیکھتے ہیں تو یہ سوالات گویا ہمارے سامنے بالکل آتے ہی نہیں کہ یہ اگر ہماری کوششوں سے کامیاب ہو گیا تو اسکی کامیابی قومی نقطۂ نظر سے کس حد تک مفید ہو گی؟ یا اس کے حق میں کوشش سے اگر ایسا مسلمان امیدوار ناکام ہو گیا جو جرأت سے مسلمانوں کے مسائل پر بول سکتا ہے، اگرچہ آپ کو اُس سے کوئی اختلاف ہی کیوں نہ ہو، —— یا کسی مسلم دشمن کی کامیابی کا میدان صاف ہو گیا اور ایک اچھا غیر مسلم امیدوار اُن دونوں کے نہ ملنے سے شکست کھا گیا جو آپ نے اپنے اس ذاتی، گروہی یا مذہبی رشتہ رکھنے والے امیدوار کو دلا دیئے تو یہ قومی نقطۂ نظر سے کتنے نقصان کی بات ہو گی؟

ہم نے دیکھا ہے کہ بعد میں لوگوں کو کافی پچھتاوا ہوتا ہے۔ مگر بعد کے پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں جذبات اور تعلقات کو بالکل ایک طرف رکھ کر محض قومی نقطۂ نظر سے الیکشن میں کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ اس معاملہ میں فیصلہ مقامی واقفیت کی بنیاد پر زیادہ صحیح ہو سکتا ہے۔ تجربہ ہے الیکشن کے لئے اس طرح کے فیصلوں کا [illegible] ہے۔ ہر جگہ کے دردمند مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ یکجہتی کے ساتھ اس طرح کے فیصلے کرانے کی کوشش کریں، اور آئندہ کے لئے اس کو مہم بنائیں کہ مسلمانوں میں قومی نقطۂ نظر سے ووٹ کے استعمال کا شعور پیدا ہو،

الیکشن کی بات تو مثال کے طور پر آ گئی ورنہ مسئلہ اس سے بہت وسیع ہے، مسلمانوں کو ملک کے موجودہ حالات سے اگر کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہے تو انھیں ہر ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا، اور ہر معاملہ میں قومی نقطۂ نظر ہی سے فیصلہ کرنا ہو گا، ورنہ اہلِ سیاست کے داؤں پیچ اور اپنوں میں مفاد پرستوں کا وجود اُن کے حالات کو اور زیادہ خراب کرے گا۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

نماز کس طرح پڑھی جائے؟

(۱۰۴) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ فِیْ نَاحِيَةِ الْمَسْجِدِ فَصَلّٰى ثُمَّ
جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَقَالَ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ
تُصَلِّ فَرَجَعَ فَصَلّٰى ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ فَقَالَ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ اِرْجِعْ
فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَقَالَ فِی الثَّالِثَةِ اَوْ فِی الَّتِیْ بَعْدَهَا عَلِّمْنِیْ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاَسْبِغِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ
اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَاْ بِمَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْاٰنِ
ثُمَّ ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَسْتَوِیَ قَائِمًا
ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا
ثُمَّ اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا
(وَفِیْ رِوَايَةٍ ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَسْتَوِیَ قَائِمًا) ثُمَّ افْعَلْ ذٰلِكَ
فِیْ صَلَوٰتِكَ كُلِّهَا (رواه البخاری ومسلم)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مسجد میں ایک جانب تشریف فرما تھے کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور اس نے نماز پڑھی، اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ پھر جا کر نماز پڑھو، تم نے ٹھیک نماز نہیں پڑھی۔ وہ واپس گیا اور اس نے پھر نماز پڑھی اور پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا، آپ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پھر فرمایا کہ تم جا کے پھر نماز پڑھو تم نے ٹھیک نماز نہیں پڑھی، اس آدمی نے تیسری دفعہ میں یا اس کے بعد والی دفعہ میں عرض کیا کہ حضرت مجھے بتا دیجئے اور سکھا دیجئے (کہ میں کس طرح نماز پڑھوں جیسی مجھے پڑھنی آتی ہے وہ تو میں کئی دفعہ پڑھ چکا) — آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو پہلے خوب اچھی طرح وضو کرو، پھر قبلہ کی طرف اپنا رُخ کرو، پھر تکبیر تحریمہ کہہ کے نماز شروع کرو، اس کے بعد جب قرأت کا موقع آجائے تو) جو قرآن تمہیں یاد ہو اور تمہیں پڑھنا آسان ہو وہ پڑھو۔ (اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے سوا جو چاہو پڑھو) پھر قرأت کے بعد رکوع کرو، یہاں تک کہ مطمئن اور ساکن ہو جاؤ رکوع میں، پھر رکوع سے اٹھو یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ مطمئن اور ساکن ہو جاؤ سجدہ میں، پھر اٹھو یہاں تک کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ (اور ایک راوی نے اس آخری خط کشیدہ جملہ کے بجائے کہا ہے" پھر اٹھو یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ) پھر اپنی پوری نماز میں یہی کرو (یعنی ہر رکعت میں، رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ اور تمام ارکان اچھی طرح اطمینان و سکون سے اور ٹھہر ٹھہر کے ادا کرو۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ صاحب جن کا واقعہ اس حدیث میں مذکور ہوا ہے مشہور صحابی رفاعہ بن رافع کے بھائی خلاد بن رافع تھے، اور سنن نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مسجد نبویؐ میں آکر دو رکعت نماز پڑھی تھی، بعض شارحین نے لکھا ہے کہ غالباً یہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں تھیں لیکن انھوں نے ان رکعتوں میں بہت جلد بازی سے کام لیا اور رکوع، سجدہ وغیرہ جس طرح تعدیل و اطمینان کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کے کرنا چاہیے نہیں کیا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم نے نماز ٹھیک نہیں پڑھی" اور دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا۔ ٭

٭ اس کے بعد حصہ کا مضمون پڑھیئے اور پھر اس کے بعد حصہ کا — ان دو ٹکڑوں کی ترتیب غلط ہوگئی ہے۔ (المرتب)

نماز ناقابل اعتبار اور واجب الاعادہ ہوگی۔

(۱۰۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَفْتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالْقِرَاءَةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَكَانَ اِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهٗ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَائِمًا وَكَانَ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ جَالِسًا وَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ وَكَانَ يَفْتَرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ وَيَنْهٰى اَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ اِفْتِرَاشَ السَّبُعِ وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلٰوةَ بِالتَّسْلِيْمِ —————— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ سے نماز شروع فرماتے تھے اور قرأت کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے۔ اور جب آپ رکوع میں جاتے تو سر مبارک کو نہ تو اوپر کی جانب اٹھاتے اور نہ نیچے کی جانب جھکاتے بلکہ درمیانی حالت میں رکھتے تھے (یعنی بالکل کمر کے متوازی) اور جب سجدہ سے سر مبارک اٹھاتے تو جب تک بالکل سیدھے نہ بیٹھ جاتے دوسرا سجدہ نہیں فرماتے تھے اور ہر دو رکعت پر التحیات پڑھتے تھے۔ اور اس وقت اپنے بائیں پاؤں کو نیچے بچھا لیتے اور داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے تھے اور "عقبۃ الشیطان" (یعنی شیطان کی طرح بیٹھنے) سے منع فرماتے تھے۔ اور اس بات سے بھی منع فرماتے تھے کہ آدمی (سجدہ میں) اپنی بانہیں (یعنی کلائیاں کہنیوں تک) زمین پر رکھے، جس طرح کہ درندے اپنی کلائیاں زمین پر بچھا کے بیٹھتے ہیں۔ اور آپ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کے نماز ختم فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) نماز عبادت بلکہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اس لیے اس کے لیے قیام، قعود، رکوع و سجود کی وہ شکلیں اور ہیئتیں مقرر کی گئی ہیں جو عبادت اور بندگی کی بہترین اور مکمل ترین تصویر ہیں۔ اور اُن نامناسب ہیئتوں سے خصوصیت کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے

آپ نے پہلی دفعہ میں صاف صاف ان کو یہ نہیں بتلا دیا کہ تم سے نماز میں یہ غلطی ہوئی ہے اور تم کو نماز اس طرح پڑھنا چاہیے، بلکہ تیسری یا چوتھی دفعہ میں ان کے دریافت کرنے پر بتلایا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے یہی بہترین طریقہ ہو سکتا تھا، آدمی کو جو سبق اس طرح دیا جائے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو اس موقع پر دیا، وہ کبھی زندگی بھر نہیں بھولتا اور دوسرے لوگوں میں بھی اس کا چرچا خوب ہوتا ہے۔

آپ نے اس موقع پر نماز کے متعلق تمام ضروری باتیں نہیں بتلائیں، مثلاً یہ نہیں بتلایا کہ رکوع میں، قومہ میں، سجدہ میں کیا پڑھا جائے، یہاں تک کہ قعدہ اخیرہ اور تشہد اور سلام کا بھی ذکر نہیں فرمایا، ایسا آپ نے اس لیے کیا کہ ان سب باتوں سے وہ صاحب واقف تھے، ان کی خاص غلطی جس کی اصلاح ضروری تھی یہ تھی کہ وہ رکوع، سجدہ وغیرہ تعدیل کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر ادا نہیں کرتے تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اسی غلطی کی خصوصیت کے ساتھ نشاندہی فرمائی اور اس کی اصلاح فرما دی۔

حدیث کے آخری جملہ کے بارے میں راویوں کے بیان میں ذرا سا اختلاف ہے، بعض راویوں کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے سجدہ سے اٹھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا "ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِساً" (پھر تم اٹھو یہاں تک کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ) اور بعض دوسرے راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا تھا "ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَسْتَوِيَ قَائِماً" (پھر تم اٹھو یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ) یہ دونوں روایتیں امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ذکر فرمائی ہیں۔

— جن ائمہ و علماء کی تحقیق یہ ہے کہ پہلی اور تیسری رکعت میں بھی دوسرے سجدہ کے بعد کھڑے ہونے سے پہلے ذرا بیٹھ جانا چاہیے (جس کو جلسۂ استراحت کہا جاتا ہے) ان کے نزدیک پہلی روایت راجح ہے۔ اور دوسرے حضرات دوسری روایت کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں —

اس حدیث کی خاص ہدایت یہی ہے کہ پوری نماز ٹھہر ٹھہر کے اور اطمینان سے پڑھی جائے۔ اور اگر کسی نے بہت جلدی جلدی اس طرح نماز پڑھی کہ اس کے ارکان پوری طرح ادا نہ ہو سکے مثلاً رکوع و سجدہ میں بس جانا آنا ہوا اور جتنا توقف ضروری ہے وہ بھی نہیں ہوا، تو ایسی

جن میں استکبار، یا بے پروائی یا بدمنظری کی شان ہو یا کسی بدفطرت مخلوق کی ہیئت سے مشابہت ہو۔ اس اصول کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ سجدہ میں آدمی کلائیاں زمین پر اس طرح بچھائے جس طرح کتے اور بھیڑیے وغیرہ درندے بچھا کر بیٹھتے ہیں اور اسی اصول کے تحت آپ نے اس طرح بیٹھنے سے بھی منع فرمایا جس کو اس حدیث میں "عُقْبَۃُ الشَّیْطَانِ" اور ایک دوسری حدیث میں "اقعاء الکلب" فرمایا گیا ہے۔ شارحین اور فقہاء نے اس کی تشریح دو طرح کی ہے ۔۔۔ اس عاجز کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس سے مراد دونوں پاؤں پنجوں کے بل کھڑے کر کے ان کی ایڑیوں پر بیٹھنا ہے[1]۔ اور چونکہ اس طریقہ میں کچھ استکبار اور عجلہ بازی کی شان ہے اور اس شکل میں صرف گھٹنے اور پنجے ہی زمین سے لگتے ہیں، نیز کتے، بھیڑیے وغیرہ درندے بھی اس طرح ایڑیوں پر بیٹھا کرتے ہیں، اس لیے نماز میں اس طرح بیٹھنے سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ منع فرمایا ۔۔۔ واضح رہے کہ یہ ممانعت صرف اس صورت میں ہے جبکہ بغیر کسی مجبوری کے آدمی ایسا کرے، اگر بالفرض کسی کو کوئی خاص مجبوری ہو تو وہ معذور ہے اور اس کے حق میں بلا کراہت جائز ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ بطریق مسنون قعدہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ کبھی اس طرح بھی بیٹھ جاتے تھے ۔۔۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم وغیرہ میں جو مروی ہے کہ انھوں نے اس طرح بیٹھنے کو "سنۃ نبیکم" فرمایا تو اس کا مطلب بھی بظاہر یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی معذوری کی وجہ سے اس طرح بھی بیٹھے ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اگر کوئی معذور ہو تو وہ اس طرح بھی بیٹھ سکتا ہے ورنہ عام حالات میں اور بلا عذر نماز میں اس طرح بیٹھنے کی ممانعت ہے۔

(۱۰۶) عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ السَّاعِدِیِّ قَالَ فِیْ نَفَرٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَحْفَظُکُمْ لِصَلٰوۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

---

[1] "عقبۃ الشیطان" اور "اقعاء" کا جو دوسرا مطلب بیان کیا گیا ہو، اگرچہ لغت کے لحاظ سے وہ بھی صحیح ہو لیکن چونکہ کسی جاہل سے جاہل نمازی کے متعلق بھی یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس طرح نماز میں بیٹھے گا، اس لیے اس ناچیز کے نزدیک اس کو مراد لینا بہت بعید ہے۔ واللہ اعلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُهُ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ وَإِذَا رَكَعَ
أَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ اسْتَوَى
حَتَّى يَعُوْدَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ
وَلَا قَابِضِهِمَا وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ فَإِذَا جَلَسَ فِي
الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلَى رِجْلِهِ الْيُسْرَى وَنَصَبَ الْيُمْنَى فَإِذَا جَلَسَ فِي
الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ الْيُسْرَى وَنَصَبَ الْأُخْرَى وَقَعَدَ عَلَى
مَقْعَدَتِهِ ــــــــــ رواہ البخاری

(ترجمہ) حضرت ابو حُمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے صحابۂ کرام کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز (یعنی اس کی تفصیلات آپ سب لوگوں سے زیادہ یاد ہیں۔ (اس کے بعد فرمایا کہ) میں نے آپ کو دیکھا ہے کہ نماز شروع کرتے ہوئے جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مونڈھوں تک لے جاتے، اور جب رکوع میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے، پھر اپنی کمر کو پوری طرح موڑ دیتے (اور بالکل سیدھی برابر کر دیتے) پھر جب رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو بالکل سیدھے اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ ریڑھ کی ہڈی کا ہر منکا (یعنی ہر جوڑ) ٹھیک اپنی جگہ پر آجاتا (جہاں سیدھے کھڑے ہونے کی حالت میں وہ رہتا ہی ہے) پھر جب آپ سجدہ میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر اس طرح رکھ دیتے کہ نہ تو ان کو زمین پر بچھا دیتے اور نہ ان کو سکیڑ لیتے (مطلب یہ ہے کہ آپ سجدہ کی حالت میں ہاتھوں کو سکیڑ نہیں لیتے تھے بلکہ آگے بڑھا کے اپنے چہرے کے مقابلے میں دائیں بائیں رکھ لیتے تھے، لیکن کلائیاں اور کہنیاں زمین سے الگ اور اٹھی رہتی تھیں) اور پاؤں کی انگلیوں کا رُخ سجدہ میں قبلہ کی جانب ہوتا تھا۔ پھر جب دو رکعت پڑھ کے آپ (التحیات کے لیے) بیٹھتے تو داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جاتے، پھر جب آخری رکعت پڑھ کے آپ قعدہ اخیرہ کرتے تو اس طرح بیٹھتے کہ داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے اور بائیں پاؤں کو (اس کے نیچے سے) آگے کی جانب نکال دیتے اور اپنی سرینوں پر بیٹھ جاتے (جس کو تورّک

کہتے ہیں) ——————— (صحیح بخاری)

(تشریح) ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں تکبیر تحریمہ کے وقت مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں دوسرے ایک صحابی مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "حَتّٰى يُحَاذِيَ بِهِمَا أُذُنَيْهِ" جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے۔ لیکن ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ جب ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ انگلیاں کانوں تک پہونچ جائیں تو ہاتھوں کا نیچے والا حصہ مونڈھوں کے مقابلہ میں ہوگا۔ اور اس صورت کو کانوں تک ہاتھ اٹھانے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور مونڈھوں تک اٹھانے سے بھی ——— ایک اور صحابی وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ یہی بات کہی ہے۔ سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں اُن کے الفاظ یہ ہیں۔

رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى كَانَتَا بِحِيَالِ مَنْكِبَيْهِ وَحَاذٰى بِإِبْهَامَيْهِ أُذُنَيْهِ	آپ تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے کہ وہ مونڈھوں کے برابر ہو جاتے اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کے محاذات میں آجاتے۔

حضرت ابو حمید ساعدی کی اس حدیث میں ایک خاص بات یہ بھی بیان فرمائی گئی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قعدہ اخیرہ میں اس طریقہ پر بیٹھتے تھے جس کو تورّک کہتے ہیں، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث ابھی اوپر گزر چکی ہو اس سے معلوم ہوتا ہو کہ قعدہ میں آپ کے بیٹھنے کا عام طریقہ وہی تھا جو حضرت ابو حمید ساعدی نے قعدہ اولیٰ کا بیان کیا ہو اور جسکو اصطلاح میں افتراش کہتے ہیں ——— بعض ائمہ اور شارحین حدیث کا خیال اس بارہ میں یہ ہو کہ قعدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کا عام طریقہ تو وہی تھا جو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے معلوم ہو چکا لیکن کبھی کبھی سہولت کے لیے یا یہ ظاہر کرنے اور بتلانے کے واسطے کہ اس طرح بھی بیٹھا جا سکتا ہو، آپ نے تورّک بھی کیا ہو ——— دوسری رائے مسئلے بالکل برعکس بھی ہو ـ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہو کہ دونوں ہی طریقے مشروع ہیں ——— وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشِقُونَ مَذَاهِبُ۔

شیخ مجدّد کے اصلاحی کارنامے

از، جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے حیدرآباد سندھ

(۶)
واقعۂ اسیری

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست   ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

پچھلی قسط میں جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) پر شیخ مجدّد (م ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) کے بالواسطہ اثرات کا جائزہ لیا گیا تھا، پیش نظر قسط میں بلا واسطہ اثرات کا جائزہ لیا جائے گا، اس سے پہلے کہ ان اثرات کو بیان کیا جائے، اس اہم واقعہ کا تفصیلی ذکر ضروری ہے جس نے ان اثرات کے لئے راہ ہموار کی،

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء تک جہانگیر سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، البتہ دونوں میں مراسلت ضرور تھی۔ چنانچہ دفتر سوم میں یہ مکتوب ملتا ہے:۔

" بادشاہ کی فتح و نصرت کی دعا کی جاتی ہے، کیونکہ اجرائے احکام شریعت سلطنت کی تائید اور تقویت پر منحصر ہے، فتح و نصرت کی دو قسمیں ہیں، ایک اسباب وغیرہ، یہ فتح و نصرت کی ظاہری صورت ہے، دوسری قسم فتح و نصرت کی حقیقت ہے، وہ مسبب الاسباب کی طرف سے ہے، وما النصر الا من عند اللّٰہ۔ اس حقیقتِ فتح و نصرت کا تعلق خاصان خدا کی دعاؤں سے ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، لا یرد القضاء الا الدعاء۔ خدا کے حکم کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی، لیکن دعا۔ تلوار اور جہاد میں یہ قوت نہیں کہ

وہ قضائے الہیٰ کو ٹال دے، لیکن دعا میں خدا نے یہ طاقت رکھی ہے، اس لئے لشکر کی قوت سے دعائی قوت زیادہ قوی اور مؤثر ہے، نیز قوت لشکر مثل جسم کے ہے، اور قوت دعا مثل روح کے، بغیر روح جسم کارآمد نہیں، اس لئے فقرا کی دعاؤں کا فوجوں کے ساتھ ہونا ضروری اور لابدی ہے، اسی واسطے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاد کے وقت فوجی قوت کے باوجود فقرا، مہاجرین کے وسیلہ سے فتح و نصرت کی دعا کرتے تھے .... حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن علماء کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزن دار ہوگی، اگرچہ فقیر اپنے کو اس لائق نہیں پاتا کہ لشکر شاہی کے دعاگویوں میں شامل کرے، لیکن فقر و درویشی کے صرف نام و نسبت اور بارگاہ رب کریم سے اجابت کی امید کی بنا پر دعا سے فارغ نہیں رہتا، بلکہ برابر دعا میں مشغول و مصروف رہتا ہے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ؛

(ملخصاً و مختصراً از مکتوب ۴۷ دفتر سوم مکتوبات امام ربانی ص۱۱۰ طبع امرتسر)

چونکہ مکتوبات کی وجہ سے شیخ مجدد (م ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی تھی۔ اس لئے بعض تذکرہ نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ جہانگیر کے وزیر اعظم آصف جاہ نے جو مذہباً شیعہ تھا، شیخ مجددؒ کی اس عام مقبولیت کو دیکھ کر جہانگیر کو آپ کے خلاف بھڑکایا، اور شیخ مجددؒ کو ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء یعنی جلوس کے چودھویں سال کے تیسرے مہینے میں دربار میں طلب کر کے قید کر دیا، ڈاکٹر برہان الدین فاروقی لکھتے ہیں :۔

"جہانگیر کے وزیر اعظم آصف جاہ نے جہانگیر کو مشورہ دیا کہ شیخ احمد کے باب میں احتیاط سے کام لیا جائے، کیونکہ ان کا اثر ہندوستان، ایران، توران اور بدخشاں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ فوج کے سپاہیوں کو شیخ احمد کے مریدین کے پاس آنے جانے اور عہد کرنے سے روکا جائے اور شیخ احمد کو نظر بند کر دیا جائے۔"

(برہان الدین فاروقی۔ مجدد الف ثانی کا نظریۂ توحید، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۰ء ص۲۶)

مگر یہ واقعہ محض قیاس پر مبنی معلوم ہوتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ جہانگر کے دربار میں شیعوں کا کافی اثر و رسوخ تھا، اور وہ شیخ مجدد سے خوش نہ تھے، مگر یہ کہنا کہ آصف جاہ یا شیعوں کے

بھڑکانے سے شیخ مجدد کی گرفتاری عمل میں آئی، تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں معلوم ہوتا، خود جہانگیر نے تزک میں شیخ مجدد کی گرفتاری کا سبب یہ بتایا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مکتوب میں خود کو خلفاء اربعہ سے افضل بتایا ہے، ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات یہ بات کیسے سمجھا سکتے تھے؟

ڈاکٹر عنایت اللہ نے بھی لکھا ہے کہ شیخ مجدد کی گرفتاری شیعوں کی معاندانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ہوئی، مگر اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر کر دیا ہے جو گرفتاری کا اصل سبب ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

> "شیعوں کا جہانگیر کے دربار میں کافی اثر و رسوخ تھا، شیخ مجدد نے جس شد و مد کے ساتھ ان کے نظریات کی تردید کی اس سے آپ کی شخصیت ان کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگی، چنانچہ انھوں نے (بادشاہ) کو یہ سمجھایا کہ حضرت مجدد کی سرگرمیاں سلطنت کے لئے خطرناک ہیں۔
>
> چنانچہ آپ کی ایک مکاشفانہ تحریر کی بنیاد پر آپ کو ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں دربار میں طلب کیا گیا، دربار میں داخلہ کے وقت آپ کے بے نیازانہ طرز عمل کو دیکھ کر بادشاہ ناخوش ہو گیا اور قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دے دیا۔"

(Dr Inaya tulah: The Encyclopaedia of Islam new Edition Vol I Feascioulus 5 P. 297-8

جس مکتوب پر جہانگیر نے گرفت کی تھی وہ مکتوبات شیخ مجدد کی جلد اول موسوم بہ دُرّ المعرفت کا گیارہواں مکتوب ہے، اس جلد کو شیخ مجدد کے خلیفہ خواجہ یار محمد جدید بدخشی طالقانی علیہ الرحمہ نے ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۱ء میں مرتب کیا تھا، یہ مکتوب کافی طویل ہے، یہاں صرف اس حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس پر مواخذہ کیا گیا تھا، اس میں شیخ مجدد اپنے شیخ طریقت خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کو تحریر فرماتے ہیں:-

> "دوسری یہ عرض ہے کہ اس مقام کے ملاحظہ کے دوران یکے بعد دیگرے دوسرے مقامات عالیہ بھی ظاہر ہوتے گئے، نیاز و شکستگی کی جانب توجہ کے بعد جب اس سابق مقام سے دوسرے مقام پر پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام، مقام ذوالنورین ہے، دوسرے خلفاء نے بھی اس مقام کو عبور کیا ہے، اور یہ مقام بھی، مقام تکمیل و ارشاد ہے۔

اسی طرح دوسرے مقامات عالیہ پر پہنچایا گیا ہے جن کا ذکر ابھی آتا ہے، اس مقام کے اوپر ایک دوسرا مقام آیا، جب اس مقام پر پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام فاروق ہے، دوسرے خلفا بھی اس مقام سے گزرے ہیں، اس مقام کے اوپر مقام صدیق اکبر نظر آیا، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اس مقام پر بھی پہنچایا گیا"

(شیخ مجدد۔ مکتوب، جلد اول مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۱ھ، مکتوب ۱۱ ص ۲۳-۲۲)

تزک جہانگیر میں خود جہانگیر نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:-

"انہی دنوں (چودھواں جلوس شاہی) مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک جعل ساز نے سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانس رکھا ہو اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں اپنا ایک ایک خلیفہ مقرر کیا ہے، جو لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دوکانداری کرنے میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں اور معتقدین کے نام وقتاً فوقتاً جو خرافات خطوط لکھے ہیں انھیں مکتوبات کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے، اس دفتر بے معنی میں اس نے بہت سی ایسی لغو باتیں تحریر کی ہیں، جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، ایک مکتوب میں اس نے لکھا ہے کہ مقامات سلوک طے کرتے ہوئے وہ مقام ذوالنورین میں پہنچا، جو نہایت عالی شان اور پاکیزہ تھا۔ وہاں سے گزر کر مقام فاروق اور مقام فاروق سے گزر کر مقام صدیق میں پہنچا، پھر وہاں سے گزر کر مقام محبوبیت میں پہنچا جو نہایت منور و دلکش تھا، اس مقام پر اس پر مختلف الالوان روشنیوں کے پرتو پڑتے رہے، گویا استغفر اللہ بزعم خویش وہ خلفاء کے مرتبے سے بھی بڑھ گیا، اور ان سے عالی تر مقام پر فائز ہوا، اس نے اسی طرح کی اور بھی گستاخانہ باتیں، خلفاء کی شان میں لکھی ہیں، جن کو تحریر کرنا طوالت اور خلفاء کی شان میں بے ادبی کا باعث ہوگا۔

ان وجوہ کی بنا پر میں نے اسے دربار میں طلب کیا تھا، حسب الطلب وہ حاضر خدمت ہوا، تو میں نے اس سے جتنے سوالات کئے، ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکا، بے عقل اور کم فہم ہونے کے علاوہ مغرور

خود پسند بھی ہے ۔ اس لئے میں نے اس کے حالات کی اصلاح کے لئے یہی موزوں سمجھا کہ اسے کچھ دنوں کے لئے قید رکھا جائے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی جاتی رہے ، اور عوام میں جو شورش پھیلی ہوئی ہے وہ تھم جائے ، چنانچہ اسے انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا کہ اسے قلعہ گوالیار میں قید رکھے ۔"

(جہانگیر: تزک جہانگیری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۷۴-۵۷۳)

شاہجہاں نے (م ۱۰۷۶ھ/۱۶۵۵ء) جو اس وقت شہزادہ خرم کے نام سے مشہور تھا، جب سنا کہ جہانگیر نے شیخ مجددؒ کو دربار میں طلب کیا ہے تو اس کو بڑی فکر دامن گیر ہوئی کیونکہ وہ آپ سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتا تھا، اس کو اس کا بھی کھٹکا تھا کہ شیخ مجددؒ دربار شاہی میں سجدۂ تعظیمی نہ کریں گے، جس سے سنگین نتائج نکلنے کا امکان ہے ، چنانچہ اس خطرے کے پیش نظر شاہ جہاں نے افضل خاں اور خواجہ مفتی عبدالرحمٰن کو چند کتابیں دے کر شیخ مجددؒ کے پاس بھیجا ، اس کی تفصیل مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی زبانی سنیے ، وہ لکھتے ہیں :-

"سلطان شاہ جہاں بن سلطان جہانگیر جناب شیخ سے اخلاص رکھتا تھا، چنانچہ اس سے قبل کہ آپ دربار شاہی میں تشریف لے جائیں ، وہ پیامبروں یعنی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو چند فقہ کی کتابیں دے کر شیخ کے پاس بھیجا ، اور یہ کہلا بھیجا کہ علماء نے سلاطین کے لئے سجدۂ تعظیمی جائز قرار دیا ہے ، اگر آپ بادشاہ کو سجدہ کرلیں گے تو میں اس بات کی ضمانت کرتا ہوں کہ آپ کو بادشاہ سے کوئی گزند نہ پہنچے گا ، لیکن شیخ نے اس کو منظور نہ کیا ، اور فرمایا کہ یہ تو رخصت ہے ، عزیمت یہ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے ۔"

(غلام علی آزاد بلگرامی ۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ، مولفہ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء ، مطبوعہ ۱۳۰۳ھ ص ۴۹)

شیخ مجددؒ نے عزیمت کو رخصت پر ترجیح دے کر تاریخ ہند کو یکسر بدل دیا ، اگر آپ رخصت پر عمل کر لیتے تو تاریخ ہند کا کچھ اور ہی نقشہ ہوتا ، شاہی دربار میں حاضری کے بعد جو معاملہ پیش آیا اس کی تفصیل یہ ہے :-

"سلطان (جہانگیر) نے شیخ مجددؒ سے کہا " میں نے سنا ہے کہ تم نے لکھا ہو کہ

تھا را مرتبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مرتبہ سے بھی بلند ہے؟ شیخ نے اس کا اقرار کیا اور جواب میں فرمایا کہ "اگر آپ اپنے ایک ادنیٰ خادم کو اپنے پاس طلب فرمائیں تو یقیناً وہ خادم امراء کے مقامات و مدارج کو طے کر کے آپ تک پہنچے گا، مگر اس کے بعد پھر اپنی جگہ پر واپس چلا جائے گا، اس سے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اس ادنیٰ خادم کا مرتبہ امراء کے مرتبہ سے بڑھ گیا"۔ اس جواب پر بادشاہ خاموش ہو گیا، اور عتاب سے درگزر کیا، اسی اثنا میں حاضرین میں سے ایک شخص نے سلطان سے عرض کیا کہ "آپ نے اس شیخ کے تکبر کو ملاحظہ نہیں فرمایا؟ اس نے آپ کو سجدہ تک نہیں کیا، حالانکہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں، بلکہ معمولی تواضع سے بھی کام نہیں لیا جو لوگ باہمی ملاقاتوں میں ظاہر کرتے ہیں"۔ یہ سنکر بادشاہ غضبناک ہو گیا اور آپ کو گوالیار میں قید کر دیا گیا"۔ (دکیل احمد: الکلام المنجی برد ایرادات البرزنجی، ص ۲ - ۱۰۱ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۲ھ)

شیخ مجددؒ کی جہانگیر سے ملاقات کو اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے :-

"آپ نے دیکھا کہ بادشاہ مستی کی حالت میں ہے اور حقائق و دقائق کو نہیں سمجھ سکتا، تو نیچے اتر کر عامیانہ اور قریب الفہم جواب دیا، اور فرمایا کہ میں تو اپنے کو کتے سے بھی افضل نہیں سمجھتا چہ جائیکہ حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل کہوں؟ لیکن چونکہ یہ حال اور عروج واقعہ ہوا تھا اس لیے میں نے اپنے شیخ کو اس لیے مخفی طور پر لکھا تھا کہ وہ اسکی صحت وسقم کا پتہ لگائیں، دشمنوں نے اس کو ناسمجھی سے آپکے سامنے پیش کر دیا، اسکے بہت سے جواب ہیں، آسان تر جواب یہ ہے کہ شاہ نے مجھ کو پچاس سال کے بعد آج یاد فرمایا ہے، اور اپنے حضور میں طلب کیا ہے، اور میں امیروں اور شاہزادوں کے مقامات سے گزر کر آپکے سامنے کھڑا ہوں، کیا اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانچ ہزاری اور دس ہزاری امراء سے افضل ہو گیا ہوں؟ حالانکہ میرا وہی بوسیدہ گھر ہے جو سہرند میں مشہور و معروف ہے، ایک مدت کے بعد مجھ کو شاہ کے دربار میں پہنچایا گیا، امراء کے مقامات سے بالاتر

کیا گیا اور آپکے قریب کر دیا گیا، مگر تھوڑی دیر بعد اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا اور ساری عمر اپنے اسی اصل مسکن میں رہوں گا اور آپکے وزراء ہمیشہ آپکے قریب رہیں گے، ہم جیسے تو اپنی ضرورت کے لئے ساری عمر میں ایک مرتبہ آپکے پاس آئیں گے اور پھر واپس جائیں گے، اس طرح اصحاب کرام بھی ہمیشہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کے قریب ہیں اور ہم غرض مندوں کی طرح عمر میں ایک بار انکے حضور میں پہنچے اور حاجت روائی کے بعد واپس آ گئے، اور اپنے اصل مقام پر قائم ہیں اور زندہ ہیں۔"

(وکیل احمد: انوار احمدیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۱۱-۱۲)

مندرجہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجددؒ کی گرفتاری کا اصل سبب آپ کی خودی اور عزیمت پسندی تھی۔ ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

نواب صدیق حسن خاں نے بھی یہی لکھا ہے:-

"سلطان جہانگیر نے سجدۂ تعظیمی نہ کرنے کی وجہ سے آپ کو قلعۂ گوالیار میں محبوس کیا۔"

آزاد نے اپنی غزل میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:-

لقد برع الاقران فی الهند سابع وحید دفن العشق یا للمفرد

فلا عجب ان صاده متقنص المبرّی الاسلاف قید المجدد

(نواب صدیق حسن خاں: ابجد العلوم مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۵ھ ج ۳-۹۹۳ھ)

مکتوب کے سلسلے میں شیخ مجددؒ پر جو الزام لگایا گیا تھا، داراشکوہ نے (م ۱۰۶۹ھ-۱۶۵۹ء) اس کی پرزور تردید کی ہے، وہ لکھتا ہے:-

"آخر سال میں شیخ پر بعض اشخاص نے یہ اعتراض کیا بلکہ تہمت لگائی کہ آپ اپنے کو خلفائے راشدین سے بھی افضل مانتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ محض بہتان تھا جو مخالفین نے آپ پر لگایا تھا۔" (داراشکوہ: سفینۃ الاولیار

ترجمہ محمد وارث کامل مرحوم مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۳)

شیخ مجددؒ کے حبس بے جا کو مغربی فضلاء نے بھی مذموم قرار دیا ہے، چنانچہ ٹی، ڈبلیو آرنلڈ لکھتے ہیں:-

"سترھویں صدی عیسوی میں، ہندوستان میں شیخ احمد مجدد نامی ایک عالم تھے، جن کو غیر منصفانہ طریقہ پر قید کیا گیا تھا، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے قید خانہ میں کئی سو غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا" (T.W. Arnold: The Encyclopaedia of Religions and Ethics. By James Hasting. 1956 P.748

پریچنگ آف اسلام میں بھی قدرے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے، اس میں لکھا ہے:-

"جہانگیر کے دور حکومت (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۸ء) میں شیخ احمد مجدد نامی ایک سنی عالم تھے، انھوں نے شیعہ نظریات کی جس شد و مد کے ساتھ تردید کی اس نے ان کو خاص طور پر ممتاز کر دیا تھا، اس لئے وہ ان پر چند جھوٹے الزامات لگا کر قید کروانے میں کامیاب ہو گئے، جن دو سالوں میں وہ قید خانہ میں رہے، انھوں نے اپنے کئی سو ہندو ساتھی قیدیوں کو مشرف بہ اسلام کیا"

(T.W. Arnold. The Preaching of Islam. P. 412-1956)

سی، اے، اسٹوری نے بھی شیخ مجددؒ کی نامناسب قید کی مذمت کی ہے، اس نے لکھا ہے:-

"۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) میں جہانگیر نے آپ کے مکتوبات کے بظاہر متکبرانہ جملوں کی آڑ لیکر گوالیار میں محبوس کر دیا" C.A. Storey. The Persian Literature vl. I Part II London 1953. P. 888)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) نے قلعۂ گوالیار میں قید و بند کے دوران میں بھی بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں مشرکین کو حلقہ بگوش اسلام کیا

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز

مفتی غلام سرور لاہوری، شیخ مجددؒ کی قید پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جب آپ قید خانے میں پہنچے تو چند ہزار کفار کو جو زندان شاہی میں محبوس تھے، مشرف بہ اسلام کیا، سیکڑوں لوگوں کو اپنی ارادت سے سرفراز فرما کر ولایت کے درجے تک پہنچا دیا، حضرت شیخ نے قید خانہ میں کبھی بھی بادشاہ کے لئے بد دعا نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر بادشاہ مجھ کو قید نہ کرتے تو یہ چند ہزار لوگ جو دینی فوائد سے مستفید ہوئے ہیں، محروم رہتے، اور جو ترقیات اور مقامات مجھ کو حاصل ہوئے .....

..... اور جن کا حصول نزول بلا ہی پر منحصر تھا، ہرگز حاصل نہ ہوتے۔"

(مفتی غلام سرور لاہوری۔ خزینۃ الاصفیا، مطبوعہ، لکھنؤ ۱۸۷۳ء)

شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) کی گرفتاری کی خبر آناً فاناً ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی، پیر سید احمد علیہ الرحمہ کا بیان ہے :۔

"جس زمانہ میں سلطان نے حضرت کو تکلیف پہنچائی میں ملک دکن میں تھا، ناگاہ میں نے سنا کہ سلطان زماں نے آپ کو سختی کے ساتھ طلب کر کے شہید کر دیا، میں اس وحشتناک خبر سے بیقرار ہو گیا اور بازار میں نکل آیا تاکہ کسی قاصد سے کوئی فرحت اثر خبر سننے میں آئے۔" (شیخ بدر الدین : حضرات القدس، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۱ھ ص ۷۶)

چونکہ امرائے سلطنت حضرت شیخ مجددؒ سے عقیدت رکھتے تھے، اس لئے اس سانحہ سے ان میں بد دلی پیدا ہو گئی، بلکہ بعض تذکرہ نگار اور مورخوں کا بیان ہے کہ ان میں بغاوت پھیل گئی، لیکن صاحب زبدۃ المقامات اور صاحب حضرات القدس نے جو شیخ مجددؒ کے خلفاء میں سے تھے، اس بغاوت کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ صاحب روضۃ القیومیہ، کمال الدین محمد احسان کا بیان ہے کہ "امرائے ہند خان خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں اسلام خاں، مہابت خاں، مرتضیٰ خاں، قاسم خاں، تربیت خاں، خان جہاں لودھی،

سکندر لودھی، حیات خاں، اور دریا خاں وغیرہ نے جب شیخ مجددؒ کی گرفتاری کی خبر سنی تو وہ سرکشی پر آمادہ ہوگئے، اور یہ طے پایا کہ مہابت خاں حاکم کابل کو سردار مقرر کیا جائے اور باقی فوج خزانے سے اس کی اعانت کرے، اور بدخشاں، خراسان اور توران کے حاکوں نے جو شیخ مجددؒ کے مرید تھے مہابت خاں کی مدد کی، جب اس کے پاس فوج وخزانہ کافی ہوگیا تو اس نے شاہی اطاعت سے سر پھیر لیا، دریائے جہلم پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، اسی اثنا میں خان خاناں اور دیگر امرا کی طرف سے مہابت خاں کو یہ پیغام بھیجا،

"فتنہ وفساد کو فرو کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو کیونکہ آنحضرت نے ایسا ہی فرمایا ہے"

(کمال الدین محمد احسان۔ روضۃ القیومیہ مطبوعہ لاہور، ص ۱۸۹)

ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے بھی مہابت خاں کی بغاوت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"لیکن اس قید نے گورنر کابل مہابت خاں کو بہت ہی چراغ پا کر دیا، اس نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی اور حسن اتفاق سے جہلم کے مقام پر جہانگیر کو قید کر لیا، پھر شیخ کے حکم پر رہا کر دیا، اس لئے جہانگیر نے جلد ہی شیخ کو رہا کر دیا، جو بعد میں بادشاہ کے مشیر خصوصی ہوگئے" (Dr. Abdul Wahid. Iqbal His art and thought.) 1948—P. 106

لیکن مورخین نے مہابت خاں (م ۱۶۳۴ء) کی بغاوت کو نور جہاں سے ذاتی مخاصمت کا سبب قرار دیا ہے، چنانچہ آلف کیرو لکھتا ہے:۔

"یہ وہی مہابت خاں (م ۱۶۳۴ء) ہے جو بعد میں ملکہ نور جہاں کے خلاف ہوگیا تھا اور دریائے جہلم کے کنارے پر خود بادشاہ کو قید کرنے کی فکر میں تھا"

(Olaf Carae: The Pathans, 1958, P.226 New york & S.R. Sharma: Mughal Empire in India Part II 1947.A.D

جہانگیر نے تزک میں چودھویں سال جشن نوروز کے ذیل میں شیخ مجددؒ کی گرفتاری کا ذکر کیا ہے پھر اکیسویں سال جشن نوروز کے ذیل میں مرزا ہادی بیگ تکملہ نگار تزک نے مہابت خاں

کی بغاوت کا ذکر کیا ہے، اس طرح شیخ مجددؒ کی گرفتاری اور مہابت خاں کی بغاوت کے درمیان تقریباً سات سال کا فرق ہے، اس لئے شیخ مجددؒ کی گرفتاری کو مہابت خاں کی بغاوت کا سبب بتانا تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے، مرزا ہادی بیگ نے بغاوت کا اصل سبب یہ بتایا ہے کہ آصف خاں کو مہابت خاں سے پرخاش تھی، وہ نامعقول الزامات تراش کر مہابت خاں کو ذلیل کرنا چاہتا تھا، اس لئے مہابت خاں نے مجبوراً یہ جرارت مندانہ قدم اٹھایا، مرزا ہادی بیگ لکھتا ہے:۔

"گزشتہ اوراق میں، یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شہنشاہ نے عرب دست غیب کو مہابت خاں کے پاس روانہ کر کے اس سے ان ہاتھیوں کو طلب کیا تھا، جن پر وہ بنگال میں شاہ جہاں کی شورش کے زمانہ میں قابض ہو گیا تھا، اور یہ بھی تحریر کیا جا چکا ہے کہ اسے دربار میں حاضر ہونے کا بھی اشارۃً حکم دیا گیا تھا، انہی دنوں میں وہ مذکورہ احکامات کے مطابق دریائے جہلم کے کنارے شاہی لشکر کے پاس پہنچ گیا حقیقت میں اسے آصف خاں کی تجویز پر طلب کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اسے طرح طرح سے ذلیل وخوار کر کے اس کی عزت وناموس اور جان ومال پر ہاتھ ڈالے۔"

(مرزا ہادی بیگ، تزک جہانگیری (تکملہ) مطبوعہ لاہور، ص ۱۰، ۱۹۶۰ء)

لیکن یہ واضح رہے کہ مہابت خاں، شیخ مجددؒ کے خاص معتقدین میں تھا، ڈاکٹر ترپاٹھی لکھتے ہیں:۔

"خان خانان، سید صدر جہاں، خان جہاں، اور مہابت خاں آپ کے مداحین بیان کئے جاتے ہیں۔"

(Dr. R. P. Tripathy: Rise and Fall of The Mughal Empire – 1956. P. 355

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہابت خاں نے شیخ مجددؒ کی گرفتاری کی وجہ سے بغاوت نہیں کی تھی، ایسا کہنا تاریخی حقایق کے سراسر خلاف ہے، بغاوت کا واقعہ شیخ مجددؒ کے واقعۂ اسیری کے سات برس بعد پیش آیا، البتہ یہ قیاس صحیح ہو سکتا ہے کہ شیخ مجددؒ کی گرفتاری

سے ارکان دولت میں شورش کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہوگا، مکاتیب شیخ مجددؒ میں اس کی طرف اشارہ ہے (دیکھو دفتر سوم، مکتوب نمبر ۱۵)

زمانہ اسیری کی مراسلت | شیخ مجددؒ قلعہ گوالیار میں تقریباً ایک سال قید رہے (۱۰۲۸ھ تا ۱۰۲۹ھ) اس عرصہ میں جو مکتوبات احباب و اقربا کے نام ارسال فرمائے ہیں، وہ بڑے سبق آموز ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی عظیم شخصیت کے اصلی جوہر واقعۂ اسیری کے بعد ہی کھلے ہیں۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

یہاں چند مکاتیب کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کو تحریر فرماتے ہیں:-

"مخدوم و مکرم! مصیبتوں کے آنے پر ہر چند کہ تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انعام و اکرام کی امید بھی لگی رہتی ہے، حزن و اندوہ میں یہ بڑا ہی اچھا سرمایہ اور خوان الم و مصیبت کی من بھاتی نعمت ہے، ان شکر پاروں کے اوپر کڑوی دوا کا ہلکا سا غلاف چڑھا دیا گیا ہے، اور اس بہانے سے بظاہر مصیبت دکھائی گئی ہے، مگر نیک بخت تو مٹھاس پر نظر رکھتے ہوئے تلخی کو مٹھاس کی طرح کھا جاتے ہیں، اور صفراوی مریض کے برعکس کڑواہٹ کو شیریں محسوس کرتے ہیں اور شیریں کیوں نہ پائیں کیونکہ محبوب کے افعال تو سب ہی میٹھے ہیں، جو ماسوا اللہ کی محبت میں گرفتار ہو اس کو کڑوے لگتے ہیں، دولت مند تو محبوب کی دی ہوئی مصیبت میں اس قدر لذت و حلاوت پاتے ہیں کہ انعام میں بھی متصور نہیں، ہر چند کہ دونوں محبوب ہی کی جانب سے ہیں، لیکن مصیبت میں محب کے نفس کو دخل نہیں اور انعام میں نفس کی خواہش کا حصول ہے۔

ع هنيئاً لارباب النعيم نعيمها

اللهم لا تحرمنا اجرهم ولا تفتنا بعدهم، آپ کا وجود شریف اسلام کی اس غربت میں مسلمانوں کے لئے مغتنم ہے، سلمکم اللہ سبحانہ و ابقاکم" والسلام۔

(مکتوبات امام ربانی۔ مکتوب ۲۹ دفتر دوم طبع امرتسر ص۶۲)

فرزندانِ گرامی و خواجہ محمد معصومؒ اور خواجہ محمد سعید کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" فرزندان گرامی! مصیبت کا وقت اگرچہ تلخ و بے مزہ ہے لیکن اس میں فرصت میسر آجائے تو غنیمت ہے، اس وقت چونکہ تم کو فرصت میسر ہے، خدا کا شکر بجا لاکر اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ، اور ایک لمحہ بھی فارغ نہ بیٹھو، تین باتوں میں سے ایک بات کی پابندی ضرور رہنی چاہیئے، تلاوتِ قرآن پاک، طولِ قرات کے ساتھ نماز اور کلمہ لا الہ الا اللہ کی تکرار۔

کلمہ " لا " کے ساتھ نفس کے خود ساختہ خداؤں کی نفی کریں، اپنی مرادوں اور مقصدوں کی بھی نفی کریں، اپنی مرادیں چاہنا خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، اس لئے چاہیئے کہ سینہ میں کسی مراد کی گنجائش ہی نہ رہے، اور ہوس کا خیال تک نہ آنے پائے، تاکہ حقیقت حیات متحقق ہو......... ہوائے نفسانیہ کو جو جھوٹے خدا ہیں " لا " کے تحت لائیں تاکہ ان سب کی نفی ہو جائے، اور تمھارے سینہ میں کوئی مراد اور مقصد باقی نہ رہے، حتیٰ کہ میری رہائی کی آرزو بھی جو اس وقت تمھاری سب سے اہم آرزوؤں میں ہے، نہ ہونی چاہیئے تقدیر اور اس تعالیٰ کے فعل ومشیت پر راضی رہیں........ جہاں بیٹھے ہوئے ہیں اسی کو اپنا وطن سمجھیں، یہ چند روزہ زندگی جہاں کہیں گزرے اللہ کی یاد میں گزرنی چاہیئے "

(شیخ احمد مجدد: مکتوبات شریف دفتر سوم حصہ ہشتم، مکتوب نمبر ۵ مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ)

ایک مکتوب میں اپنے خلیفہ شیخ بدیع الدین کو تحریر فرماتے ہیں:۔

" برسوں تربیت جمالی کے ذریعہ منزلیں طے کرائی جا رہی تھیں، اب تربیت جلالی کے ذریعہ مراحل طے کرائے جا رہے ہیں، اس لیے مقام صبر، بلکہ مقام رضا پر قائم رہیں۔ اور جمال وجلال کو ایک ہی جانیں، تم نے لکھا تھا کہ " ظہورِ فتنہ کے وقت سے ذوق وحال جاتا رہا " ذوق وحال کو تو اس وقت المضاعف

ہونا چاہیئے، کیونکہ جفائے محبوب اس کی وفا سے زیادہ لذت بخش ہوتی ہے، یہ کیا مصیبت آئی کہ تم بھی عام لوگوں کی طرح باتیں کرنے لگے، اور محبت ذاتیہ سے دور نکل گئے؟

(شیخ مجدد، مکتوبات شریف، دفتر سوم، حصہ ششم مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ مکتوب ۱۲ ص ۱۲)

ایک اور مکتوب میں مرزا مظفر خاں کو تحریر فرماتے ہیں:-

"حقیقت تو یہ ہے کہ جو چیز بھی محبوب حقیقی کی طرف سے پہنچے اس کو کشادہ پیشانی اور فراخ حوصلگی سے احسان مندی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے، بلکہ اس سے لطف اٹھانا چاہیئے رسوائی اور بے ننگی جو مراد محبوب ہے، محبوب کے نزدیک نام و ننگ سے بہتر ہے، یہ اسکے دل کی خواہش ہے، اگر یہ بات محب میں پیدا نہ ہو تو اسکی محبت ناقص ہے، بلکہ وہ دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے

گر طمع خواہد زمن سلطان دین   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(شیخ مجدد، دفتر دوم، مکتوبات شریف، حصہ ہفتم، مکتوب ۵۰ مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۳ھ)

اپنے ایک دوسرے خلیفہ خواجہ میر محمد نعمان (م ۱۰۵۸ھ) کے نام تحریر فرماتے ہیں:-

"عاشق جس طرح محبوب کے انعام میں مزہ پاتا ہے، اسی طرح اس کے ایلام میں بھی اس کو لطف آتا ہے، بلکہ ایلام میں اور زیادہ مزہ آتا ہے، کیونکہ اس میں خط نفس کا شائبہ نہیں ہوتا اور اسکی آرزو کو بھی دخل نہیں ہوتا، جب حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ، جو جمیل مطلق ہے، اس شخص کو آزار پہنچانا چاہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بھی اس شخص کی نظر میں جمیل ہے، بلکہ اس میں اس کو لطف آتا ہے، چونکہ اس جماعت (اعداء و مخالفین) کی مراد اللہ تعالیٰ کی مراد کے عین مطابق ہے، اور یہ مراد اس مراد کے ظاہر ہونے کا دریچہ ہے، اس لئے یقیناً انکی مراد بھی نظر کو بھلی اور اچھی معلوم ہوتی ہے، اور اس میں لطف آتا ہے اور اس شخص کا عمل جو محبوب کے عمل کا آئینہ دار ہو، محبوب کے عمل کی طرح پیارا لگتا ہے، اور کام کرنے والا اسی نظر کے وجہ سے عاشق کی نظر میں محبوب ہے، عجیب بات ہے کہ اس شخص کی جانب سے جتنی جفائیں ہوتی ہیں، عاشق کی نظر میں وہ اتنا ہی زیادہ

پسندیدہ ہوتا جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ غضب محبوب کی پوری پوری نمایندگی کر رہا ہے، اس راہ کے دیوانوں کا معاملہ نرالا ہے، پس اس شخص کی برائی چاہنا اور اس سے بددل ہوتا، محبوب کی محبت کے منافی ہے، کیونکہ وہ شخص تو فعل محبوب کے آئینہ کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لئے جو لوگ آزار پہنچانے کے درپے ہیں وہ دوسری مخلوق سے زیادہ نگاہوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے دوستوں سے کہدیں کہ وہ تنگیٔ دل کو دور کریں اور جو لوگ یا جماعت آزار کے درپے ہے اس سے برا سلوک نہ کریں، بلکہ ان کے فعل سے لطف اٹھائیں۔"

(شیخ مجددؒ۔ مکتوب شریف، دفتر سوم، حصہ ہشتم، مکتوب ۱۵، مطبوعہ امرتسر ۱۳۳۲ھ)

ان مکاتیب مقدسہ کے آئینہ میں شیخ مجددؒ کے کردار کی تابناکی کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، خود باختگی اور خود سپردگی کا یہ عالم ہے کہ جفاؤں میں بھی لذت حاصل ہوتی ہے۔

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

ذرا "عشق خانۂ ویراں ساز" کی بلند ہمتی تو دیکھئے کہ دشمن کی خنجر آزمائی کے بعد بھی اس کے دست دراز کو دعائیں دے رہے ہیں۔

آں کشتۂ تیغ حق محبت ادا نہ کرد کز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نہ کرد

(باقی)

رویتِ ہلال

اور

سائنسی آلات کا استعمال

(از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی)

(مفتی صاحب مدظلہ کا یہ مضمون گزشتہ عید الفطر کے بعد پاکستان کے ایک اخبار میں نظر سے گزرا تھا۔ اس کی افادیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے خیال ہوا تھا کہ آئندہ اس کی صحیح وقت پر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔ اسی خیال کے تحت اس وقت یہ مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

کئی سال سے یہ مسئلہ پاکستان اور خصوصاً کراچی کے اخبارات میں زیر بحث آکر عجیب قسم کے اختلاف اور اختلال کا سبب بنتا رہا۔ اخباری بحثوں میں یہ دیکھ کر کہ دونوں طرف کوئی کسی کے نقطۂ نظر کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سننے سوچنے کے لیے تیار نہیں خاموشی بہتر نظر آئی۔

لیکن اس سال عید کے موقعہ پر کراچی میں اس مسئلے نے ایک بڑی پیچیدگی اختیار کرلی اور عام مسلمانوں میں سخت اضطراب اور بے چینی پیدا کردی۔ اس لیے اس وقت سطور ذیل لکھنے پر مجبور ہوا۔

میں اس وقت اس بات کو غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ انتشار و اضطراب کس کی غلطی سے پیدا ہوا۔ ضروری یہ ہے کہ آئندہ کے لیے اس کے انسداد کی راہ تلاش کی جائے۔ اس لیے میں ملک کے عام مسلمانوں سے اسلام اور پاکستان کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ اس جزوی مسئلے کو باہمی نزاع و جدال کا ذریعہ نہ بنائیں۔ بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ایک دوسرے کے نظریے اور موقف کو سمجھنے کی کوشش کریں اور باہمی مفاہمت سے رویتِ ہلال کا کوئی ایسا نظم قائم کریں جو شرعی اصول کے مطابق اور مسلمانوں کے ہر طبقے کے لیے قابلِ قبول ہو۔

سائنس کی مفید ایجادات نعماے خداوندی ہیں ان کو شکر گزاری کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے

قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تمھارے لیے پیدا کیا۔ سائنس جدید ہو یا قدیم دونوں کا دائرۂ عمل اتنا ہی ہے کہ خدائے تعالےٰ کے پیدا کیے ہوئے خزائن و دفائن کو سمجھ بوجھ کے ساتھ صحیح استعمال کرے اور انسانی ضروریات ان سے پوری کرے۔

سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا استعمال سکھاتی ہے۔ سائنس کی ترقی کا حاصل یہی ہے کہ اُن چیزوں سے زیادہ کام لے لے۔ اس معاملے میں عقل مند اور بے وقوف کا فرق اتنا ہے کہ بے وقوف قدرتی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں جانتا۔ عقل مند ان سے طرح طرح کے فائدے اٹھا لیتا ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی عادت یہ بھی ہے کہ جیسی جیسی کسی چیز کی ضرورت دُنیا میں پیدا ہوتی جاتی ہے اُسی کے مناسب اُس زمانے کے لوگوں کو بہ مقدارِ ضرورت نئی نئی ترکیبیں استعمالِ اشیاء کی سکھا دیتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں جب مواصلات کی ایسی ضرورتیں نہ تھیں ہر ملک ہر خطہ اپنی ضروریات کے لیے خود کفیل تھا۔ خاندان کے افراد دوسرے ملکوں میں پھیلے ہوئے نہ تھے تو تیز رفتار سواریوں اور ریڈیو، لاسلکی ٹیلیفون، ٹیلی گراف کے ذریعے باہمی رابطے پیدا کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ پٹرول کی نہریں اس وقت بھی زمین کے نیچے بہہ رہی تھیں اور جہاں سطحِ زمین پر بھی موجود تھیں تو اُس سے صرف اتنا کام لیا جاتا تھا کہ اونٹوں میں خارش کا مرض پھیلے تو اُن کے بدن پر پٹرول مل دیں۔

لیکن جب ایک ملک کی ضروریات دوسرے ملکوں سے وابستہ ہوئیں اور ایک خاندان کے افراد

مختلف ملکوں میں پھیلے تو باہمی روابط کی ضرورت پیش آئی، مواصلات کے مسائل سامنے آئے۔ قدرت نے اس وقت کے لوگوں کے دل و دماغ اس کام کے پیچھے لگا دیے اور اُن کو اسی پٹرول کے ذریعے موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ چلانے کے طریقے سمجھا دیے جس کی پیش گوئی قرآن کریم نے پہلے سے کر رکھی تھی کہ بہت سی مروجہ انسانی سواریوں، گھوڑا، اونٹ، خچر وغیرہ کا ذکر کر کے فرمایا وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ یعنی آئندہ زمانے میں اللہ تعالیٰ ایسی سواریاں پیدا فرمائیں گے جن کو تم نہیں جانتے۔ اس وقت اگر موٹر اور ریل کے نام اس جگہ لکھ دیے جاتے تو اس وقت کی مخلوق ان کو نہ سمجھتی، پریشانی میں پڑ جاتی۔ اس لیے نام لینے کے بجائے اتنا بتلا دیا کہ اور بھی طرح طرح کی سواریاں پیدا ہوں گی۔ اب چاند تک پہنچانے والی سواریاں نئی ایجاد ہو جائیں تو وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

جیسی جیسی ضرورت پیدا ہوتی گئی ویسی ہی ایجادات کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دماغ تیار کر دیے اور اُن کو طریقے سمجھا دیے۔ اس میں نہ پچھلے لوگوں کی بیوقوفی کا کوئی ثبوت ہے نہ آج کے لوگوں کی بڑی دانش مندی کا، بلکہ ضرورت کے تابع حق تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔

جس طرح پچھلی صنعتوں سے پیدا ہونے والی اشیاء بضرورت اللہ تعالیٰ کے انعامات تھے اسی طرح آج کی سائنس کے ذریعے پیدا ہونے والے نئے نئے آلات اس کی ہی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ ان سے وحشت کرنا یا ان کو بُرا سمجھنا کوئی دین کی بات نہیں بلکہ دین کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔

البتہ دینِ الٰہی ان سب کے ساتھ یہ پابندی لگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں استعمال نہ کرو۔ یا ایسے طریقوں سے استعمال نہ کرو جس سے اصولِ دین مجروح ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ بندوق، توپ، ٹینک اور طرح طرح کے بم ایجاد ہوئے کبھی کسی عالم یا غیر عالم کے دل یہ وسوسہ بھی نہ آیا کہ موجودہ جنگوں میں ان کا استعمال کرنا کوئی گناہ ہے۔

ہوائی جہاز چلے تو بغیر کسی رکاوٹ کے مسلمانوں نے اُن کو نہ صرف اپنے دنیوی کاموں میں بلکہ دینی امور میں بھی استعمال کیا۔ اسی طرح لاسلکی پیغام، ٹیلی فون، ٹیلی گرام، ریڈیو، آلہ مکبر الصوت ایجاد ہوئے تو بغیر کسی مزاحمت کے دینی اور دنیوی کاموں میں مسلمانوں نے علماء کی ہدایات اور فتوے کے موافق استعمال کیا۔ البتہ ان چیزوں میں علماء نے اس کا لحاظ ہر قدم پر رکھا کہ ان چیزوں کا استعمال

اسی حد تک رہی جہاں تک قرآن اور سنت کے تبلائے ہوئے اصول مجروح نہ ہوں۔ مکبر الصوت پر اذان، خطبہ، تقریر، وعظ کو کسی عالم نے نہیں روکا صرف نماز کے معاملے میں ایک اصول پر زد پڑنے کا امکان تھا اس کے ماتحت سائنس داں ہی کے مختلف اقوال کی بنا پر علماء کی رائیں مختلف ہوئیں۔ کیوں کہ سائنسدانوں میں بعض نے اس کی آواز کو متکلم کی اصلی آواز بتلایا بعض نے نقلی قرار دیا۔ اور یہ اختلاف آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ اس میں جدید چیزوں سے ناواقفیت یا نفرت و محبت کا کوئی دخل نہیں۔ اصول کی موافقت یا مخالفت کا معاملہ ہے۔ خبر رسانی کے تمام جدید آلات کی خبروں کو خبر کی حد تک بلا اختلاف سب علماء نے قبول کیا، مگر جہاں ضرورت شہادت کی اور شاہد کی سامنے آکر بیان دینے کی تھی اس میں نہ دنیا کی کسی عدالت نے ان کو کافی سمجھا نہ علماء نے اس پر شہادت دینے کی اجازت دی۔

اس لیے صحیح حالات کا جائزہ لیے بغیر علماء کی طرف یہ منسوب کر دینا بالکل خلاف انصاف اور خلافِ واقعہ ہے کہ وہ جدید چیزوں کو اپنی ناواقفیت کی وجہ سے رد کر دیتے ہیں اور پھر جب وہ حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں تو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بہت ممکن ہے کہ کسی جدید ایجاد کی پوری حقیقت سامنے آنے سے پہلے اس کے متعلق کچھ شبہات ہوں اور اس کے واضح ہو جانے کے بعد رفع ہو جائیں، اور یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اصولِ دین سے متصادم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ابتدائی دور میں توقف کرنا اور پھر اجازت دینا کوئی قصور و الزام کی چیز نہیں کہ اس سے ان کو بے وقوف بنایا جائے بلکہ علماء کی حقیقت شناسی اور اتباعِ حق اور حق پرستی کا کھلا ثبوت ہے۔ مسئلہ ہلال میں بھی اگر نئی ایجادات سے اس حد تک کوئی مدد لی جائے جہاں تک اسلامی اصول مجروح نہ ہوں اس کا کس کو انکار ہے۔ اس لیے اس معاملے میں کوئی گفتگو کرنے سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اسلامی اصول کو بالکل خالی الذہن ہو کر دیکھا اور سمجھا جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ رویت کے مسئلے میں آلاتِ جدیدہ کا استعمال ان اصولوں کو مجروح کرتا ہے یا نہیں۔ اب ذرا اس کی تفصیل سنیے۔

عید یا بقرہ عید ہمارے تہوار نہیں عبادات ہیں

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا ہے کہ ہمارا روزہ ہو یا عید یا کوئی دوسری اسلامی تقریب، یہ عام دنیا کے تہواروں کی طرح تہوار نہیں، بلکہ سب کی سب عبادات ہیں اور عبادت کا حاصل اطاعت و

فرماں برداری ہے کہ جو حکم ملا اُس کی تعمیل کی جائے۔ اس میں کسی کی عقل و رائے پر مدار نہیں۔ عبادات میں جس قدر قیود و شرائط ہوتے ہیں وہ سب اسی تعمیل حکم کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز پانچ کیوں ہوں کم و بیش میں کیا حرج ہے، نماز کے اوقات وہی کیوں ہوں جن میں از روئے شرع ان کو رکھا گیا ہے، دوسرے اوقات میں کوئی نماز کے ارکان تلاوت، تسبیح، رکوع، سجود پورے خشوع سے ادا کرے تو اُس کا اعتبار کیوں نہ ہو۔ نماز فجر کی دو اور ظہر کی چار مغرب کی تین رکعتیں کیوں ہوں، پانچ اور چھ رکعات کوئی پڑھ لے تو کیا گناہ ہے؟

ان سب سوالوں کا جواب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسی طرح ہے۔ اس کی تعمیل ہی کا نام عبادت ہے۔ اپنی رائے سے اس میں کمی بیشی یا اوقات کا تغیر کوئی معقول بات نہیں۔ ٹھیک اسی طرح روزہ ہے۔ صبح صادق سے غروب تک کیوں ہو، عشا تک کوئی رکھے تو کیا گناہ ہے۔ ۲۹ یا ۳۰ دن کے بجائے کوئی اکتیس ۳۱ دن رکھے تو کیا حرج ہے۔ رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں روزے رکھ لیا کریں تو کیوں صحیح نہیں۔ انتیس ۲۹ کو چاند ہو یا نہ ہو ہم تیس روزے پورے کریں تو کیوں گناہ ہے یا چاند کا انتظار کیے بغیر انتیس ۲۹ ہی کو ختم کر دیں تو کیا حرج ہے؛ ان سوالوں کا جواب بھی اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی ہی سے کوئی عبادت عبادت کہلانے کی مستحق ہے اُس میں انسانی رایوں کا دخل ہوا تو پھر وہ عبادت نہیں۔ اسی طرح اب اسے غور کیجیے کہ انتیس ۲۹ تاریخ کو چاند ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ سامنے آئے اور آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی محض انسانوں کی رایوں یا دوٹوں سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا طریقۂ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات میں تلاش کرنا ہے کیونکہ چاند سورج کے کرات یا اُن کا طلوع و غروب درحقیقت ہماری عبادت کا محور نہیں بلکہ عبادت کا مدار صرف حکم الٰہی کے اتباع پر ہے ورنہ اگر محض عقلی طور پر دیکھا جائے تو صبح صادق ہو جانے کے پانچ منٹ بعد سحری کھانے کا اسی طرح غروب آفتاب سے پانچ منٹ پہلے افطار کر دینے کا روزے کے مجاہدہ اور محنت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جس کی بنیاد پر اُس کی دن بھر کی محنت کو کالعدم قرار دیا جا سکے۔

ہاں غروب آفتاب سے پانچ منٹ پہلے افطار کرنے والا اس جرم عظیم کا مرتکب ہوا کہ اُس نے

حکم کی خلاف ورزی کی۔ اسی جرم کی پاداش میں اس کے روزے کو کالعدم کہا جا سکتا ہے۔

"مسئلہ چاند کے وجود کا نہیں بلکہ رویت و شہود کا ہے"

اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلے میں رائے زنی کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جن معاملات کا مدار چاند ہونے پر رکھا ہے اُن میں چاند کا وجود فوق الافق کافی ہے یا اُس کا قابلِ رویت ہونا اور عام آنکھوں سے دیکھا جانا ضروری ہے؟ شرعی حیثیت سے اس کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ایک بات کو تو ہر پڑھا لکھا انسان جانتا ہے کہ چاند کسی وقت اور کسی دن بھی معدوم تو ہوتا نہیں اپنے دائرے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ اس کے لیے نہ انتیس[۲۹] تاریخ شرط ہے نہ تیس[۳۰]، وہ ۱۸/۱ تاریخ کو اور اس سے پہلے بھی فضا کے کسی بلند افق سے ایسی دوربینوں کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے جو آفتاب کی شعاعوں کو انسانی نگاہوں کے سامنے حائل نہ ہونے دیں۔ مسئلہ اگر صرف وجود کا ہوتا تو ۲۹، ۳۰ کی بحث ہی ختم تھی۔ اس سے بدیہی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ ان تمام معاملات میں جس چیز کا اعتبار شرعاً کیا گیا ہے وہ چاند کا افق کے اوپر موجود ہونا نہیں بلکہ اس کا قابل رویت ہونا اور عام آنکھوں سے دیکھا جانا ہے اور اس پر صرف رمضان و عید ہی کا مدار نہیں شریعت اسلام کے ہزاروں معاملات اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ نکاح، طلاق، عدت وغیرہ کے مسائل پر اس کا بڑا اثر پڑتا ہے اور قدیم اسلامی دور کی طرح اگر ملک میں اسلامی تاریخیں رائج ہوں جیسا کہ سعودی عرب میں اب بھی رائج ہیں تو یہ مسئلہ ایک تاریخ بدلنے کا مسئلہ بن جاتا ہے جس سے ملک بھر کے سارے معاملات اور مقدمات اور وفا ترسب ہی متاثر ہوتے ہیں اس کو سرسری تقریب یا تہوار سمجھ کر کسی دن بھی منا لینا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ انتیس[۲۹] تاریخ کو چاند ہونے یا نہ ہونے اور اس کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ کسی تہوار یا قومی تقریب کا وقت متعین کرنے کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک عبادت کے ختم اور دوسری کے شروع ہونے کا مسئلہ ہے مثلاً رمضان کی انتیس[۲۹] کو چاند ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ روزے اور رمضان کی عبادت ختم ہو گئی اور اسی وقت سے عید کی متعلقہ عبادات کے احکام شروع ہو گئے۔ نیز اُسی وقت سے حج کے مہینے شروع ہو گئے جس کا بہت سے احکام پر اثر پڑتا ہے۔ اس لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند ہونا کس کو قرار دیا

اور نہ ہونا کس کو کہیں۔ آیا چاند کا افق پر وجود اس کے ہونے کے لیے شرعی احکام میں تسلیم کیا جائے گا یا عام انسانی آنکھوں سے دیکھنے پر اُس کے ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یعنی رمضان یا عید کرنے کے لیے چاند کا صرف وجود کافی ہے یا شہود اور رویت ضروری ہے؟

اس کے فیصلے کے لیے دیکھیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کیا ہیں۔

حدیث کی سب سے بڑی مستند کتاب جو اعتماد میں قرآن کے بعد دوسرا درجہ رکھتی ہے یعنی صحیح بخاری میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا تصوموا حتى تروه ولا تفطروا حتى تروه فان غم عليكم فاقدروا له۔	روزہ اس وقت تک نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو۔ اور افطار اس وقت تک نہ کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو۔ اور اگر چاند تم پر مستور ہو جائے تو حساب لگا لو (یعنی حساب سے تیس دن پورے کر لو)

اسی کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

الشهر تسع وعشرون ليلة فلا تصوموا حتى تروه فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين۔ (صحیح بخاری جلد ا ص۲۵۶)	مہینہ (یقینی) انتیس رات کا ہے اس لیے روزہ اس وقت تک نہ رکھو جب تک رمضان کا چاند دیکھ نہ لو پھر اگر تم پر چاند مستور ہو جائے تو شعبان کی تعداد تیس دن پورے کر کے رمضان سمجھو۔

یہ دونوں حدیثیں حدیث کی دوسری سب مستند کتابوں میں بھی موجود ہیں جن پر کسی محدث نے کلام نہیں کیا اور دونوں میں روزہ رکھنے اور عید کرنے کا مدار چاند کی رویت پر رکھا ہے۔ لفظ رویت عربی زبان کا مشہور لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو آنکھوں سے دیکھنے کے ہیں اس لیے حاصل اس ارشادِ نبوی کا یہ ہوا کہ تمام احکام شرعیہ جو چاند کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہیں اُن میں چاند کا ہونا یہ ہے کہ وہ عام آنکھوں سے دیکھا جاسکے اور نہ ہونا یہ ہے کہ عام آنکھوں سے نظر نہ آئے۔

معلوم ہوا کہ مدارِ احکام چاند کا افق پر وجود نہیں بلکہ رویت ہے۔ اگر چاند افق پر موجود ہو مگر کسی وجہ سے قابلِ رویت نہ ہو تو احکام شرعیہ میں اس وجود کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

حدیث کے اس مفہوم کو اسی حدیث کے آخری جملے نے اور زیادہ واضح کر دیا جس میں ارشاد ہے کہ اگر چاند تم سے مستور اور چھپا ہوا رہے یعنی تمہاری آنکھیں اس کو نہ دیکھ سکیں تو پھر تم اس کے مکلف نہیں کہ ریاضی کے حسابات سے چاند کا وجود اور پیدائش معلوم کرو اور اس پر عمل کرو یا آلات رصدیہ اور دوربینوں کے ذریعے اس کا وجود دیکھو بلکہ فرمایا فان غمّ علیکم فاکملوا العدة ثلاثین۔ یعنی اگر چاند تم پر مستور ہو جائے تو تیس دن پورے کر کے مہینہ ختم سمجھو اس میں لفظ غمّ خاص طور سے قابل نظر ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی عربی محاورے کے اعتبار سے بحوالہ قاموس و شرح قاموس یہ ہیں:

غمّ الهلال على الناس	لفظ غمّ الهلال على الناس
غمّاً اذا حال دونه الهلال غيم	اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ ہلال کے
رقيق او غيره فلم يُر۔	درمیان کوئی بادل یا دوسری چیز
(تاج العروس شرح قاموس)	حائل ہو جائے اور چاند دیکھا نہ جا سکے

جس سے معلوم ہوا کہ چاند کا وجود خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کر کے یہ فرمایا کیونکہ مستور ہو جانے کے لیے موجود ہونا لازمی ہے جو چیز موجود ہی نہیں اس کو معدوم کہا جاتا ہے۔ محاورات میں اس کو مستور نہیں بولتے۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چاند کے مستور ہو جانے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں اس میں سے کوئی بھی سبب پیش آئے۔ بہرحال جب چاند عام نگاہوں سے مستور ہو گیا ہو اور دیکھا نہ جا سکا تو حکم شرعی یہ ہے کہ روزہ و عید وغیرہ میں اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ کچھ صحابہ کرام عمرہ کے لیے نکلے راستے میں چاند پر نظر پڑی تو چاند کا سائز بڑا اور روشن دیکھ کر آپس میں گفتگو ئیں ہوئیں۔ بعض نے کہا یہ دو رات کا چاند ہے بعض نے کہا تین رات کا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم نے اس کو اول کس رات میں دیکھا؟ بتلایا گیا کہ فلاں شب میں رویت ہوئی تھی

ابن عباس نے فرمایا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امدہ للرویۃ فھو للیلۃ رأیتموہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رویت کی طرف منسوب فرمایا ہے اس لیے یہ اُسی رات کا چاند سمجھا جائے گا جس میں اس کی رویت ہوئی (صحیح مسلم جلد اول)

چاند کے اُفق پر موجود ہونے کے باوجود آنکھوں سے مستور رہ جانے کا جیسا عام سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ بادل یا دھواں یا بخارات وغیرہ فضا پر چھا جائیں، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چاند کا فاصلہ آفتاب سے اتنا کم ہو کہ وہ آفتاب کی شعاعوں میں مستور ہو۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہاں مسئلہ چاند کے وجود کا نہیں بلکہ اُس کے عام نگاہوں کے لیے قابل رویت ہونے کا ہے اور اگر دُوربین کے ذریعے شمسی شعاعوں سے مستور چاند کو دیکھ لینا یا بذریعہ ہوائی جہاز پرواز کر کے بادلوں سے اوپر جا کر چاند کو دیکھ لینا عام رویت کہلانے کا مستحق نہیں اور کسی چیز کا قابل رویت ہونا یا دیکھا جانا مسئلہ سائنس کا ہے نہ محکمہ موسمیات اور فلکیات سے اس کا کوئی علاقہ ہے۔ یہ عام واقعاتی معاملہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایک معین وقت اور معین جگہ میں کسی واقعے کے دیکھنے کا مدعی ہے اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت وہاں موجود تھے ہم نے یہ واقعہ نہیں دیکھا تو اس کا فیصلہ نہ محکمہ موسمیات کے پاس جانے کی چیز ہے، نہ محکمہ فلکیات و ریاضیات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ اس کا فیصلہ اسلامی عدالتوں میں قاضی شرعی اور عام حکومتوں میں کوئی جج ہی کر سکتا ہے جو شاہدوں کے حالات اور بیانات کو پرکھ کر معتبر یا غیر معتبر شہادت کو پہچانے گا۔

ہاں اگر مسئلہ چاند کے وجود کا ہوتا تو بے شک وہ قاضی شرعی یا جج کے دیکھنے کی چیز نہیں، وہ ماہرین فلکیات ہی بتا سکتے ہیں کوئی قاضی یا جج بھی اس مسئلے کا فیصلہ کرتا تو ماہرین فلکیات کے بیان ہی پر کرتا۔

عام اسلامی ممالک میں رویت ہلال

حال میں بعض ذمہ دار حضرات نے اپنے بیان میں کہا کہ تمام اسلامی ممالک میں محکمۂ موسمیات کے فیصلوں پر رویت ہلال کا فیصلہ اور روزے اور عید وغیرہ ہوتے ہیں۔

یہ بات اگر صحیح بھی ہوتی تو کسی شرعی حکم میں اس کو سند جواز بنا لینا کوئی معقول بات نہیں بلکہ آج کے مسلم ممالک کے اعمال کا جائزہ لیا جائے اور اُن کے عمل کو سندِ جواز قرار دیا جائے تو شاید اسلام

میں کوئی حرام چیز حرام نہ رہے اور شریعت اسلام ایک کھلونا بن جائے۔

مگر اس معاملے میں تو قدرت نے اس کا ایک اتفاقی جواب اس طرح دے دیا کہ جس روز یہ بیان اخباروں میں آیا اسی روز مصر (قاہرہ) جیسی تجدد پسند اسلامی حکومت کا یہ واقعہ بھی اخباروں میں شائع ہوا کہ وہاں محکمۂ موسمیات نے جس تاریخ کے لیے ہلال کا فیصلہ کیا تھا اس تاریخ پر چاند نظر نہ آنے کے سبب علماء کے فتوے کے مطابق ہلال تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہاں ملک شام میں رویت ہو گئی تو رویت کے مطابق احکام جاری ہوئے۔

سعودی عرب، کابل وغیرہ کا حال ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ وہاں باقاعدہ قاضی شرع کے فیصلے پر رویت ہلال کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ محکمۂ موسمیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک اور شبہے کا جواب اس جگہ یہ شبہہ کیا جاتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے معاملے میں جو اصول رویت کا قرار دیا ہے وجود کا اعتبار نہیں کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بغیر آنکھوں سے دیکھنے کے چاند کے وجود کا پتہ چلانے کے طریقے رائج نہ تھے، ایسے آلات موجود نہ تھے جن سے چاند کا افق پر موجود ہونا مشاہدے میں آسکے۔

لیکن دنیا کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ ریاضی کے یہ فنون آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے بہت پہلے دنیا میں رائج تھے اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مصر و شام اور ہندوستان میں رصد گاہیں قائم تھیں ان چیزوں کے معاملے میں نہایت صحیح پیمانے پر پیشین گوئیاں کی جا سکتی تھیں۔

اور خلافت راشدہ کے دوسرے دور یعنی حضرت فاروق اعظم کی خلافت کے زمانے میں تو مصر و شام اسلام کے زیر نگیں آچکے تھے۔ ہر فن کے ماہرین موجود تھے۔ اگر بالفرض عہد رسالت میں ایسے آلات کی کم یابی اس حکم کا سبب ہوتی تو فاروق اعظم جیسا دانش مند امام کب اس کو گوارا کرتا کہ مجبوری اور نایابی کے سبب جو حکم دیا گیا تھا اس کو آج بھی باقی رکھے مگر تاریخ اسلام شاہد ہے کہ پوری خلافت راشدہ اور اس کے مابعد تمام عالم اسلامی میں یہی اصول مانا گیا اور اسی پر امت کا عمل پیہم رہا۔

اگر ذرا انصاف سے غور کیا جائے تو رویت کے اصول کو اختیار کرنے کا سبب "عصمت بی بی

از بیچارگی" نہیں بلکہ قوم و ملت کی بہبود و فلاح پر گہری نظر ہے کیونکہ اسلام وطنی اور لسانی یا جغرافیائی قومیتوں کا تو قائل نہیں اُس کے نزدیک مشرق و مغرب کے مسلمان ایک قوم ہیں اس کا حکم صرف دنیا کے محدود سے چند شہروں کے لئے نہیں بلکہ پورے عالم کے بسنے والے انسانوں کے لئے عام ہے جس میں شہروں سے کہیں زیادہ قصبات اور ایسے دیہات اور پہاڑی مقامات اور جزیرے ہیں جہاں سائنس کی اس ترقی کے دور میں بھی ان علوم و فنون کی اور آلات رصد یہ وغیرہ کی رسائی نہیں

اگر رحمۃ للعالمین کی نظر صرف لکھے پڑھے معدودے چند شہریوں پر مرکوز ہو کر مسلمانوں پر یہ لازم کر دیتی کہ جب چاند نظر نہ آئے تو تم پر لازم ہے کہ دوسرے ذرائع یعنی ریاضی کے حسابات یا آلات رصدیہ کے ذریعہ چاند کا وجود معلوم کرو یا کسی طرح فضا میں اُڑ کر بادلوں سے اوپر پہنچو اور چاند دیکھو، تو انصاف کیجئے کہ اس حکم سے امت کس قدر مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ پچھلے چودہ سو برس کو چھوڑئیے آج بیسویں صدی کی نئی روشنی ہی میں دیکھ لیجئے کہ یہ حکم تمام عالم اسلام کے لئے کس قدر مشکلات میں مبتلا کر دینے والا ہوتا۔ اور اگر اس کو واجب نہیں مستحسن اور افضل ہی قرار دیا جاتا تو یہ افضلیت صرف سرمایہ دار لوگ ہی حاصل کر سکتے۔ جن کے پاس دوربینیں آلات رصدیہ اور ہوائی جہاز ہیں۔ غریب مسلمان نماز روزہ میں بھی افضلیت حاصل کرنے سے مجبور ہو جاتا اور ظاہر ہے کہ غریب و امیر کا یہ تفرقہ اسلامی روح کے بالکل منافی ہے۔

احکام شرعیہ کو چاند سورج کی حقیقی گردشوں اور باریکیوں کے تابع نہ بنانے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان چاند سورج کی پرستش نہیں کرتے، چاند سورج کے کسی حال کا ان کی عبادات میں براہ راست کوئی دخل نہیں، صرف اطاعت احکام الٰہیہ پیش نظر ہے۔

استقبال قبلہ کے بارے میں حق تعالیٰ نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کے بجائے بیت المقدس کو بنا دیا جو تمام صحابہ کرام اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے خلاف تھا اور پھر سولہ سترہ مہینہ اس پر عمل کرانے کے بعد دوبارہ بیت اللہ ہی کو قبلہ قرار دیدیا اور خود قرآن کریم نے اس کی یہ حکمت بتلائی۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ	ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ اب تک
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ	تھے (یعنی بیت المقدس کو) صرف اس لئے

مَنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ قبلہ بنایا تھا کہ ہم یہ امتحان کرلیں کہ کون ہمارے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔

معلوم ہوا کہ تحویل قبلہ میں حکمت یہ مستور تھی کہ دنیا سمجھ لے کہ مسلمان کسی گھر اور دیوار کے پوجاری نہیں قبلہ کی طرف رُخ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کو اس کا حکم ملا ہے اور اسی لئے جب یہ حکم بدل جاتا ہے تو عبادت میں ان کا رخ بھی بدل جاتا ہے ۔ اور شاید یہی حکمت ہے اس میں کہ قرآن کریم نے مکہ سے باہر کی دنیا کو خاص کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا مکلف نہیں بنایا بلکہ حکم یہ دیا کہ

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ یعنی پھیر دیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی سمت ۔

اس میں اول تو بجائے کعبہ یا بیت اللہ کے لفظ مسجد حرام کا لایا گیا جو بیت اللہ سے بہت زیادہ وسیع رقبہ ہے پھر اس کی طرف رخ پھیرنے کے لئے لفظ الی کے بجائے لفظ شطر استعمال کیا گیا جس کے معنی سمت اور جانب کے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ خاص بیت اللہ کی طرف رخ ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کی سمت اور جانب کی طرف رخ کر لینا کافی ہے ۔ ان سب چیزوں میں ایک مصلحت تو یہی عقیدہ کی اصلاح ہے کہ لوگ بیت اللہ کے در و دیوار کو عبادت کی چیز نہ سمجھ لیں دوسرے وہ ہی شریعت کی سہولت پسندی بھی پیش نظر ہے کہ نماز جیسی ضروری چیز میں دیہات اور جنگل میں بسنے والوں کو مشکلات پیش نہ آئیں ۔

ورنہ ریاضی کے حسابات اور آلات اصطرلاب وغیرہ کے ذریعہ ٹھیک بیت اللہ کا رخ بھی متعین کیا جا سکتا تھا ۔ مگر حکیم الحکما ، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند نظری کا تقاضا یہی ہوا کہ ان چیزوں کے درپے نہ ہوں کیونکہ اول تو ان چیزوں کے حقائق اور ان کی باریکیوں پر احکام کا مدار رکھنے سے کسی کو یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اسلامی عبادات میں یہ چیزیں خود مقصود ہیں دوسرے ان کے حقائق کی تلاش آلات و حسابات پر موقوف ہے پوری دنیا کے مسلمانوں کو جن میں کثرت دیہات ۔ اور جنگل ۔ پہاڑ ۔ جزیروں کے بسنے والوں کی ہے ان سب کو اس کا مکلف بنانے میں

پوری امت کو ایک مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے اور کم سے کم یہ کہ غریب آدمی نماز روزہ میں بھی مالداروں سے پیچھے رہ جائے، یہی حال رویت ہلال کا ہے کہ اول تو چاند کے اصلی وجود اور پیدائش کی باریکیوں کا اعتبار کرنا بجائے مفید ہونے کے مضر ہونے کا احتمال رکھتا ہے کہ کوئی شخص خود چاند کو مقصود سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہو جائے۔ دوسرے شریعت اسلام کی سہولت پسندی جو اس کا خاص امتیازی نشان ہے یہ اس کے خلاف ہے۔

اسلام میں شمسی کے بجائے قمری حساب اختیار کرنے کی حکمت

اور شاید یہی وجہ ہے کہ احکام اسلامیہ، رمضان، عید، حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور تاریخوں کو اختیار کیا گیا۔ شمسی مہینوں اور تاریخوں کو نظر انداز کیا گیا۔ کیونکہ شمسی مہینے اور تاریخیں بغیر امداد آلات رصدیہ عام لوگ معلوم نہیں کر سکتے کہ جنوری کب ختم ہوا اور فروری کب شروع ہوا اور یہ کہ جنوری کے اکتیس دن ہوں گے اور فروری کے کبھی اٹھائیس کبھی اس سے زائد۔ یہ سب چیزیں آج بہت عام ہو جانے کی وجہ سے شہروں سے گزر کر قصبات تک پھیل گئی ہیں اس لئے اس کی دشواری کا احساس نہ رہا۔ جنگل اور پہاڑوں اور جزائر کے رہنے والوں سے پوچھو تو انھیں آج بھی یہ حساب رکھنا مشکل نظر آئے گا۔

شریعت اسلام کی سہولت اور یکسانیت پسندی کا مقتضا یہی تھا کہ حساب وہ رکھا جائے جو ہر جگہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ وہ ظاہر ہے کہ چاند کا حساب ہے جو ہر مہینے گھٹتا بڑھتا، اور بالآخر ایک دو روز غائب رہ کر پھر طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔

اوقاتِ نماز اور سحر و افطار کیلئے جنتریوں کے استعمال اور رویتِ ہلال کیلئے آلاتِ رصدیہ کے استعمال میں فرق

کہا جاتا ہے کہ جس طرح نماز کے اوقات میں اصل مدار آفتاب کے طلوع، غروب یا سایہ کی پیمائش پر تھا اسی طرح سحری و افطاری میں روشنی صبح اور غروب آفتاب پر۔ مگر فنی ترقیات اور گھڑیوں کے ایجاد ہونے پر سب علماء و عوام جنتریوں اور گھڑیوں کے حساب سے نماز روزہ کرنے لگے۔ اسی طرح اس سائنس کی ترقی کے زمانہ میں جبکہ حسابات اور آلات کے ذریعہ چاند کا فوق الافق وجود معلوم کیا جا سکتا ہے تو ان پر اعتماد کیوں نہ کیا جائے لیکن ذرا غور کیا جائے تو ان دونوں میں زمین آسمان کا

فرق نظر آئے گا۔ کیونکہ طلوع و غروب وغیرہ میں جنتریوں اور گھڑیوں پر اعتماد کرنے سے کوئی اصول نہیں بدلتا صرف ایک سہولت حاصل ہو جاتی ہے اور چاند کے معاملہ میں ایسا کرنے سے شرعی اصول بدل جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طلوع و غروب اور صبح صادق کا نمود آنکھوں سے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ ہر وقت ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔

اس میں گھڑیوں اور جنتریوں پر اعتماد اس لئے روا رکھا گیا کہ اس میں ذرا بھی شبہ ہو تو ہر شخص ہر جگہ بغیر امداد کسی آلہ کے اس کی تصدیق یا تکذیب کرنے پر قادر ہے اور سارے عالم پر کسی نے یہ پابندی بھی عائد نہیں کی کہ نماز کے اوقات گھڑیوں سے دیکھا کرے۔ آج بھی لاکھوں دیہات اور جنگلات کے بسنے والے انسان اسی قدیم طرز پر اوقات کو معلوم کر کے نماز روزہ ادا کرتے ہیں۔ اس لئے اس معاملہ میں گھڑیوں وغیرہ کے استعمال کے بعد بھی اوقات معلوم کرنے کا اصول وہی محفوظ ہے کہ عام آنکھوں سے طلوع و غروب دیکھنے پر مدار کار ہے۔

بخلاف چاند کے معاملہ کے اس میں اگر عام رویت کو چھوڑ کر دوربینوں یا آلات رصدیہ کے اعتماد پر یہ کام کیا گیا تو مدار کار چاند کے فوق الافق وجود پر ہو گیا رویت پر نہ رہا اور اس وجود کے معلوم کرنے کے لئے نہ عام مسلمانوں کے پاس اس کی تصدیق یا تکذیب کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ ہر شخص ہر جگہ اس دریافت پر قادر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گھڑیوں اور جنتریوں نے اصول کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے استعمال میں سہولت پیدا کی اس لئے قبول کر لیا گیا۔ اور آلات رصدیہ حسابات ریاضیہ اصول رویت میں کوئی سہولت پیدا کرنے کے بجائے سرے سے اصول رویت ہی کو ترک کر کے چاند کے وجود فوق الافق کو اصول بنانا چاہتے ہیں جو اصول شرعیہ کے خلاف ہے۔

ریاضی کے حسابات اور آلات رصدیہ کے نتائج بھی یقینی نہیں

یہاں تک تو کلام اس پر تھا کہ ریاضی کے حسابات کے نتائج اور آلات رصدیہ سے حاصل شدہ معلومات کو بالکل یقینی سمجھا جائے جب بھی احکام شرعیہ میں ان کی مداخلت بجائے مفید ہونے کے مضر اور مسلمانوں کے لئے سخت مشکلات پیدا کرنے والی ہے۔

اس کے بعد خود ان فنی معلومات کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ حساب بحیثیت حساب کے قطعی ہو کہ دو اور دو چار ہی ہو سکتے ہیں تین یا پانچ نہیں ہو سکتے لیکن ان دو کا دو ہونا

یہ ہماری نظر اور اندازے تخمینہ ہی کا حکم ہو سکتا ہے۔ کتنے ہی باریک سے باریک پیمانوں سے تولا اور پرکھا جائے یہ احتمال ختم کرنا ہماری قدرت میں نہیں کہ ہم نے جس کو دو سمجھا ہے وہ دو سے کسی قدر کم یا زیادہ ہو۔ خواہ یہ کمی زیادتی ایک بال کے ہزارویں حصہ کی برابر ہو۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زمین کے فرش پر کسی زاویہ میں ایک بال کے ہزارویں حصہ کی کمی یا زیادتی اگرچہ بالکل غیر محسوس زیادتی ہے مگر اوپر کی فضا اور سیاروں تک جب اس زاویہ کے خطوط ملائے جائیں گے تو میلوں کا فرق ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ کیمرہ کی طرح ترقی یافتہ آلات جھوٹ نہیں بولتے مگر ان آلات کو واقعات پر منطبق کرنا تو بہر حال انسانی نظر اور انسانی عمل ہے اس میں غیر محسوس فرق ہو جانا کسی دقت طلبی مستبعد نہیں بلکہ واقع ہے جس کا مشاہدہ ہمیشہ اہل فن کے باہمی اختلافات سے ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی قدیم و جدید تقویمیں اور جنتریاں اور کیلنڈر وجود میں آئے ہیں ان میں سے صرف ان کو دیکھا جائے جو مسلم ماہرین فن نے تیار کئے ہیں تو ان میں بھی باہمی اختلاف نظر آتا ہے۔

اگر ان حسابات اور آلات کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے تو ماہرین فن کے اختلاف رائے کا کوئی احتمال نہ رہتا۔ سائنس کی نئی ترقیات اور فن ریاضی و فلکیات کی جدید تحقیقات کا آج کل دنیا میں بڑا ہنگامہ ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی نئی تحقیقات نے پرانے فلسفہ اور ریاضی کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس کے خلاف مشاہدہ کرا دیا لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج ایک محقق ماہر نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرف آخر ہے اس کی تغلیط آیندہ کوئی نہیں کر سکے گا۔ آیندہ کو چھوڑ کر اسی موجودہ دور میں اسی درجہ کے دوسرے ماہرین اس سے مختلف رائیں رکھتے ہیں۔

اسی عید کے ہنگامہ میں جو کراچی اور پاکستان میں پیش آیا ہماری اس بات کی تصدیق اسی فن کے ماہرین کی طرف سے ہو گئی۔

کراچی میں محکمہ موسمیات ایک ہفتہ پہلے سے یہ اعلان کر رہا تھا کہ ۲۹ رمضان جمعہ کے روز شام کو غروب آفتاب کے بعد چاند تقریباً اکیس منٹ افق کے اوپر رہے گا اور دیکھا جا سکے گا جو تمام کراچی کے اخبارات میں شائع ہوا۔

دوسری طرف پنجاب یونیورسٹی کے رصدگاہ کے ذمہ دار افسر اور ماہر فن بھٹی صاحب کا

مندرجہ ذیل اعلان ۲۹ تاریخ کی شام کو کراچی کے اخبار ایوننگ اسٹار میں شائع ہوا جس کا متن یہ ہے۔

"گزشتہ شام کو مسٹر بھٹی نے پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ پیشین گوئی (یعنی محکمہ موسمیات کراچی کی پیشین گوئی) غلط ہے اور مزید کہا کہ جمعہ کے ہلال عید نظر آنے کے غالباً بہت کم امکانات ہیں۔ مسٹر بھٹی نے اپنے دعویٰ کی تائید میں دو دلیلیں پیش کیں۔ اول یہ کہ ہلال کا سائز اور اس کی روشنی اس قدر کم ہوگی کہ معمولی نگاہیں دیکھ نہ سکیں گی۔

یونیورسٹی پنجاب کے ماہرین نجوم نے دوسری بات یہ بتلائی کہ غروب آفتاب کے بعد دو گھنٹہ کے اندر ہی ہلال غروب ہو جائے گا اور آسمان پر اس قدر تاریکی نہیں تھا سکتی جس میں مخفی اور باریک چاند نظر آ سکے۔

مسٹر بھٹی نے یہ بھی کہا کہ محکمہ موسمیات کی رویت ہلال کی پیشین گوئی سے بڑا گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے اور عید الفطر کے انتظامات کرنے والوں کے لئے بڑی دشواری کا باعث ہوگا۔"

(ایوننگ اسٹار جمعہ ۲۹ رمضان ۱۳۸۰ھ ۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء)

پھر ۱۳ مارچ کو پی پی اے کے نمایندہ سے انٹرویو دیتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ رصدگاہ کے حکام نے کہا کہ عید کے چاند کے مسئلہ پر جو خلفشار پیدا ہوا ہے اس سلسلہ میں محکمہ موسمیات اور دوسرے افراد کے بیانات سے متعلق لوگ مسلسل طور پر یہ پوچھ رہے ہیں کہ ان بیانات میں کہاں تک صداقت ہے ان حکام نے کہا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی رصدگاہ نے اس سلسلہ میں پہلے ہی ایک واضح موقف اختیار کیا تھا کہ جمعہ کی شام کو عام حالات میں دوربین کی مدد کے بغیر چاند نظر آنے کا امکان نہیں۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ان حکام نے کہا کہ چاند دکھائی دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی مدت ایک دن یا اس سے زیادہ ہو جب کہ محکمہ موسمیات نے جو مدت بتائی وہ اعشاریہ سات یا آٹھ دن تھی۔ مزید براں کراچی میں چاند نظر آنے کا جو وقفہ بتایا گیا ہے وہ اٹھارہ منٹ ہے اس وقفہ میں چاند کا ارتفاع ۲۵ء۳ ڈگری تھا۔ ان حکام نے کہا کہ اس ارتفاع پر تو معمولی حالات میں پورا چاند بھی نظر نہیں آسکتا کیونکہ اس وقت ہلال کی روشنی چاند کی روشنی کا ہزارواں حصہ تھی۔　　　(جنگ ۱۳ مارچ ۱۹۶۱ء)

محکمہ موسمیات کراچی اور رصدگاہ پنجاب کے ان دو مختلف بیانوں میں، بہ ظاہر یہ کہ ایک

صحیح اور دوسرا غلط ہے۔ میں نے اگرچہ اس فن کو قدیم اصول کے تحت پڑھا اور پڑھایا ہے۔ مگر اس فن میں میرا اشتغال نہیں رہا اور میں اس کا ماہر نہیں۔ اس لئے اس کا فیصلہ تو ماہرین ہی کے سپرد ہے کہ ان میں کونسا صحیح اور کون غلط ہے لیکن اتنی بات اس اختلاف ہی سے سب کے لئے واضح ہوگئی کہ ان قواعد و آلات سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی و یقینی کہنا محض خوش گمانی ہے صحیح یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہر نجوم و فلکیات ابوریحان بیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدت دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے۔ اور ان فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے۔ اس نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اس کی امامت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ روسی ماہرین نے ان کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے۔

ان کی مشہور کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیپزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس میں آلات رصدیہ کے ان نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرین فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان علماء الهيئة مجمعون	علماء ریاضی و ہیئت اس پر متفق ہیں
على ان مقادير الافق وضعه	کہ رویت ہلال کے عمل میں آنے کے لئے
في اواخر احتمال رؤية الهلال	جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ سب ایسی
هي ابعاد لم يوقف عليها الا	مقادیر ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم
بالتجربة وللمناظر احوال	کیا جاسکتا ہے اور مناظر کے احوال مختلف
عند سنة يتفاوت لاجلها	ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے
المحسوس بالبصر في العظم	نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے
والصغر وفي الاحوال	ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، اور احوال فلکیہ
الفلكية ما اذا تأملها	میں ایسے احوال بھی ہیں کہ اگر کوئی غور
متأمل منصف لم يستطع	کرنے والا انصاف کے ساتھ غور کرے تو
بت الحكم على وجوب	رویت ہلال کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی

ودريقة الهلال او اهمنا يه ... قطعی ویقینی پیشین گوئی نہیں کرسکتا ۔
(آثار باقیہ صفحہ ۱۹۰ طبع لیپزگ ۱۹۲۳ء)

اور کشف الظنون میں، بحوالہ شیخ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ بھی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے ۔

(کشف الظنون صفحہ ۹۹۹ جلد ۲)

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ رصدگاہوں اور آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رویت ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کرسکتی بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے تو اس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اور بھی تائید ہوگئی جو رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اختیار فرمایا کہ ان کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو الجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رویت ہونے یا نہ ہونے پر احکام شرعیہ کا مدار رکھ دیا ۔ جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کرسکے ۔

ملک میں عید کی وحدت کا مسئلہ

رویت ہلال کے مسئلہ پر بہت سے لوگوں کی توجہ صرف اس لئے ہے کہ انھوں نے اپنے نزدیک یہ طے کر رکھا ہے کہ پورے ملک میں عید کا ایک ہی دن ہونا ضروری ہے اسی کی وحدت کے لئے وہ چاہتے ہیں کہ قواعد ریاضی اور محکمۂ موسمیات سے مدد لے کر چاند رات پہلے سے متعین کرلی جائے اور پورا ملک اس کے تابع ایک ہی دن عید منایا کرے لیکن یہ بات جیسی دیکھنے اور سننے میں خوشگوار معلوم ہوتی ہے اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی ۔

وحدت عید کا مسئلہ اصل میں اس بنیاد سے پیدا ہوتا ہے کہ عید کو ایک تہوار یا ملکی تقریب قرار دیا جائے ۔ مگر میں اسی تحریر کے شروع میں واضح کرچکا ہوں کہ ہماری عیدیں اور رمضان ومحرم کوئی تہوار نہیں بلکہ سب کی سب عبادات ہیں جن کے اوقات کا ہر ایک ہر خطہ میں وہاں کے افق کے اعتبار سے مختلف ہونا لازمی ہے ۔ ہم کراچی میں جس وقت عصر کی نماز پڑھتے ہوتے ہیں بعض موسموں میں اس وقت مشرقی پاکستان میں عشاء کا وقت ہوتا ہے اور مغرب تو ہمیشہ ہی ہوتی ہے ۔ اسی طرح جس وقت مشرقی پاکستان میں عید ہوتی ہے کراچی میں اس وقت رات ہوسکتی ہے ۔ اگر ایک ہی تاریخ کسی طرح متعین بھی کرلیں جب بھی یکسانیت پیدا ہونا ممکن نہیں خصوصاً جب اس پر نظر

کی جائے کہ اسلامی قلمرو جیسا پہلے زمانہ میں مشرق سے مغرب تک رہ چکی ہے۔ اگر آج بھی اللہ تعالیٰ وہ وسعت پھر عطا فرما دیں تو لازمی طور پر ایک، دن کا فرق پڑ جائے گا غرض ہمارا رمضان اور عید کوئی تہوار یا تقریب نہیں جس کی یکسانیت کی فکر کی جائے۔ اور اگر بالفرض ان کو کوئی تقریب بھی کہا جائے تو وہ صرف ملکی تقریب نہیں بلکہ مسلمانوں کی ایک عالمی تقریب ہے جس میں وطنی، جغرافیائی اور لسانی فاصلے حائل نہیں۔ اگر عید کا ایک ہی دن منانا کوئی امر مستحسن ہے تو پھر سارے عالم کے مسلمانوں کو ایک ہی دن عید منانی چاہیئے۔

مگر ہر ایک لکھا پڑھا آدمی جانتا ہے کہ مشرق و مغرب کے فاصلوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ پہلے زمانہ میں، تو بعید ملکوں کا حال دوسروں سے مخفی رہتا تھا اس لئے پتہ نہیں چلتا تھا۔ اب تو تیز رفتار ہوائی جہازوں نے ساری دنیا کو ایک طشت کی طرح ہتھیلی پر رکھ دیا ہے جس کو دیکھ کر ایک ہی وقت میں انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس وقت ایک میں جمعہ ہو رہا ہے دوسرے میں ابھی جمعرات ہے اور تیسرے میں ہفتہ کا دن شروع ہو چکا ہے اور معاملات میں کسی موقت عبادت میں پوری دنیا کی یکسانیت کا تصور بھی کیسے کیا جا سکتا اور اگر کوئی ایک حکومت وسیع ہو تو اس کے دو مختلف حصوں میں بھی یہ یکسانیت اور وحدت ناممکن ہے۔ اس معاملہ میں حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ عید کی وحدت و یکسانیت کی فکر کرنے سے پہلے اس پر غور کیا جائے کہ یہ وحدت کیوں مقصود ہے۔ اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں کچھ زیادہ فضیلت اور ثواب ہے تو یہ کسی کی رائے کی چیز نہیں جب تک اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر نہ دیں مگر قرآن و سنت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں بلکہ تعامل عہد نبوی اور خلافت راشدہ اور مابعد کے تمام مسلمانوں کا ہمیشہ اس سے مختلف رہا ہے کبھی اس کا کبھی اہتمام نہیں کیا گیا کہ مکہ اور مدینہ میں ایک ہی دن عید ہو اور ایسے واقعات تو بہت ہیں کہ ملک شام میں کسی دن رمضان اور عید ہوئی اور مدینہ طیبہ میں کسی اور دن۔ حالانکہ مدینہ طیبہ سے ملک شام کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔

مدینہ اور ملک شام میں اختلاف کا واقعہ ایک تو صحیح مسلم میں بروایت کریبؓ بسند صحیح مذکور ہے کہ ملک شام میں جمعہ کی شام کو چاند دیکھا گیا اور مدینہ طیبہ میں اس روز چاند نظر نہیں آیا۔ امیر شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تمام اہل شام نے ہفتہ کے روز روزہ رکھا اور امیر مدینہ حضرت عبداللہ

بن عباسؓ نے اتوار سے رمضان شروع کیا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اگرچہ رمضان ختم ہونے سے پہلے ہی حضرت کریبؒ کی شہادت سے اس کا علم ہوگیا تھا کہ ملک شام میں جمعہ کو چاند دیکھا گیا ہے۔ مگر صرف ایک گواہ کی شہادت موجود تھی لیکن اگر عید ورمضان کی وحدت اور یکسانیت کوئی شرعی پسندیدہ چیز ہوتی تو یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ملک شام سے دوسری شہادت طلب کرکے یہ وحدت قائم کرلی جاتی مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت کریبؒ کے اصرار کے باوجود اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

(صحیح مسلم صفحہ ۱۱ جلد ۱)

اسلام کی سلطنت وحکومت دنیا کے کسی حصہ میں آج ہو یا نہیں ہوئی ایک ہزار سال تو اسلام نے دنیا کے بہت بڑے حصہ پر حکومت کی ہے مگر عید کی وحدت ویکسانیت کا سوال کبھی کسی حکومت یا امت کے ذہن پر سوار نہیں تھا۔ اپنی اپنی رویت کے مطابق ہر جگہ عید منائی جاتی تھی نہ کوئی اختلاف نہ جھگڑا۔ نہ دوسری جگہ کی شہادتیں حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ، کتنا بے معنی یا بے سود طریقہ ہے جس کو محض ایک خیالی اور موہوم وحدت کے خیال سے چھوڑ کر طرح طرح کے فتنوں، جھگڑوں اور دشواریوں کو دعوت دی جارہی ہے۔ اگر کہا جائے کہ ایک ملک میں ایک ہی دن عید وغیرہ منانے میں گو ثواب زیادہ نہ ہو مگر ملک کے باشندوں کی سہولت پیش نظر ہے کہ عید کی تعطیل سب جگہ ایک دن ہو۔ ایک شہر کا باشندہ جو کسی دوسرے شہر میں بسلسلہ ملازمت رہتا ہے وہ اگر اپنے اہل وعیال میں جاکر عید منائے تو اس کو دشواری پیش نہ آئے تو یہ صحیح ہے مگر اس کا ایک بہت آسان علاج ہے وہ یہ کہ عید الاضحی کے چاند کا مسئلہ تو عید سے دس دن پہلے سامنے آچکا ہوتا ہے اور سب مقامات کے چاند کی اطلاعات اور اگر ضرورت ہو تو شہادات بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لئے دس دن کی مدت ہوتی ہے اس درمیان میں اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح محرم کے عاشورا کا معاملہ ہے کہ وہ چاند دیکھنے سے دس روز بعد ہوتا ہے اور رمضان کی عموماً سرکاری حلقوں اور کاروباری فرموں میں تعطیل ہی نہیں ہوتی کہ اس کا سوال پیدا ہو صرف ایک موقع عید الفطر کا ہے جس میں یہ جھگڑا سامنے آتا ہے۔ اس کا سیدھا صاف علاج یہ ہے کہ تعطیل دو دن کی کردی جائے۔ ایک وہ دن جو تیس رمضان یا یکم شوال ہونے کا احتمال رکھتا ہے اور ایک اس کے بعد کا دن۔

اور ایک اسلامی مملکت کے لئے شایان شان بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی خوشی و مسرت کی عید عید الفطر ہوتی ہے۔ اس کی تعطیل دو دن ہو جائے۔ اگر تعطیل زیادہ کرنے میں ضروری کاموں کے حرج کا شبہ کیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملک کی تعطیلات پر غور کر کے کوئی ایک دن جو زیادہ اہم نہ ہو اس کی تعطیل ختم کر دی جائے۔

اور بغیر کسی خاص ضرورت کے عید میں وحدت اور یکسانیت کرنا ہی طے کر لیا جائے تو اس کے لئے بھی پاکستان کے موجودہ رقبہ میں صورت بن سکتی ہے مگر اس میں شرعی حیثیت سے جن اصولوں کی حفاظت ضروری ہے اس کے لئے بڑے اہتمام و انتظام کی ضرورت ہوگی جس پر قابو پانا آسان نہیں اور بلا وجہ ملک کو اس الجھن میں مبتلا کرنا کوئی کار ثواب نہیں اس لئے اس وقت اس کو نظر انداز کرتا ہوں۔ واللہ الموفق والمعین

(بشکریہ فروغ اسلام لاہور)

زیارتِ حرمین

نقوش و تاثرات

(مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکہ معظمہ کو واپسی ۲۲ ذیقعدہ۔ بروز سہ شنبہ بعد عصر مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر مغرب کی نماز ذوالحلیفہ (بیر علی) میں پڑھی، وہیں احرام کی نیت کی، راستے میں ایک مقام پر عشاء کی نماز پڑھی۔ صبح کی نماز بھی اطمینان کے ساتھ ادا کی۔ راستے میں سردی بہت زیادہ تھی سردی کی وجہ سے لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے احرام کی وجہ سے سر ڈھک نہیں سکتے تھے البتہ جن حاجیوں نے تولیہ کا احرام باندھا تھا وہ قدرے آرام سے تھے۔ ظہر کی نماز جدّے کی ایک مسجد میں پڑھی۔ ڈرائیور نے قصداً دیر لگائی ورنہ ہم ظہر سے پہلے مکہ معظمہ پہونچ سکتے تھے۔۔ چہار شنبہ کو عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے۔ [illegible] حج قریب آجانے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں اب بڑا ہجوم ہو گیا ہے۔ عجیب چہل پہل ہے، ہر ایک گلی کوچے میں بڑی رونق ہے۔ اکثر و بیشتر حجاج اطرافِ عالم سے مکہ معظمہ میں آچکے ہیں، کچھ جہاز باقی رہ گئے ہیں وہ بھی سطح سمندر پر تیرتے ہوئے اور فضائے آسمانی پر اُڑتے ہوئے تیزی سے آرہے ہیں۔ حاجیوں کے استقبال و انتظام میں معلموں کے کارندے اور ملازمین دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ ہر معلّم کا دفتر اور کرایہ کے مکانات اور ان کے قریب کی گلیاں اور سڑکیں حاجیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ موسم بہار اور فصل گل کا سماں ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو رہے ہیں، گلیوں میں کرسیاں قطار در قطار بچھی ہوئی ہیں، تمام بازار خوب آراستہ ہو رہے ہیں، مسجد الحرام میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے، مطاف بھرا ہوا ہے، اوقاتِ نماز کے علاوہ رات دن شمع توحید کے پروانے اسکے

گرد گھوم رہے ہیں۔ ملتزم سے چمٹ چمٹ کر اور غلافِ کعبہ کو پکڑ پکڑ کر اہل دل رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں۔ زور زور سے یا رب البیت کے نعرے لگا رہے ہیں، اب سنگِ اسود تک پہونچنا اور اس کو بوسہ دینا بڑے ہی باہمت اور طاقت ور کا کام ہے۔ بلکہ بہت سے واقفِ دین طاقت ور بھی اس خیال سے کہ ضعیفوں کو اذیت نہ پہونچے دور ہی سے سنگ اسود کی طرف ہاتھوں کے اشارے دیتے اور ان کو چومنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ چاہ زمزم کے قریب اور مقام ابراہیم پر بھی کثیر اژدہام ہے۔ اذان سے بہت پہلے نہ آیا جائے تو دروازوں میں بھی جگہ ملنا مشکل ہے وہ نظارہ بھی دیدنی ہے جب کہ کعبۃ اللہ کے چاروں طرف ایک امام کی اقتداء میں صفیں باندھ کر لاکھوں کی تعداد میں فرزندانِ توحید، خداوند قدوس کی عبادت کے لئے کھڑے ہوتے اور اس کے حضور میں رکوع و سجود ادا کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا مکتوب گرامی

میں نے دعا کے لئے جہاں اپنے دیگر اکابر کی خدمت میں عریضے لکھے تھے، حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پور کی خدمت اقدس میں بھی مسافر خانہ بمبئی سے ایک عریضہ روانہ کیا تھا۔ حضرت والا نے اس کا جواب مدرسہ صولتیہ کے پتے پر عنایت فرمایا۔ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ پہونچا تو دفتر صولتیہ میں یہ مکتوب گرامی مجھے ملا۔ بڑی مسرت ہوئی، اور اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ حضرت والا مدظلہ جواب خطوط کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرا عریضہ جواب طلب نہیں تھا اور نہ یہ امید تھی کہ اس کا جواب آئے گا مگر اپنی کریمانہ عادت کے مطابق حضرت گرامی قدر نے مجھے شاد کام کرنے کے لئے چند سطور ارقام فرمادیں۔ میں اس مکتوب گرامی کو بھی بطور تبرک اپنے ان نقوش میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔

مکرمی الحاج .... دامت مکارمکم ـــ بعد سلام مسنون، کئی دن ہوئے گرامی نامہ مرسلہ از مسافر خانہ بمبئی موصول ہوکر موجب مسرت ہوا جس میں حجازِ مقدس تشریف بری کی اطلاع سے بہت مسرت ہوئی یہ ناکارہ دعا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل و کرم سے اس مبارک سفر کو نہایت راحت و آرام کے ساتھ پورا فرماکر حج و زیارت کو قبول فرمائیں اور دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائیں۔ اس ناکارہ کو بھی اپنی مبارک دعاؤں میں شامل فرمالیں

اور بشرط سہولت زیادہ، مدینہ پاک میں روضۂ اقدس کی حاضری کے وقت اس سیہ کار کی طرف سے بھی بحضور سید البشر علیہ افضل الصلوات والسلام و بحضور حضرۃ الشیخین رضی اللہ عنہما سلام عرض کر دیں ـــــ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اگر کچھ وقت جماعت تبلیغ کے ساتھ بالخصوص مولانا عبید اللہ صاحب اور مولانا سعید خاں صاحب کے ساتھ گزارا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ دینی حیثیت سے زیادہ مفید ہوگا ـــــ حضرتِ اقدس رائے پوری دام مجدہم کی طبیعت بحمد اللہ اچھی ہے کوئی خاص بات زیادتی کی نہیں ہے ۔ (مولانا) علی میاں کا خط بندے کے پاس آیا تھا، آخر اپریل یا شروع مئی میں یہاں سہارنپور اور رائے پور شریف بری کا ارادہ لکھا تھا، مولانا (محمد) منظور صاحب آج کل ایک تبلیغی اجتماع میں (دبستی) نظام الدین کی جماعت کے ساتھ آسنسول گئے ہوئے ہیں۔ والسلام زکریا۔ مظاہر علوم ۲ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ

شیخ عبد اللہ زمزمی

بعد عصر اکثر شیخ عبد اللہ زمزمی کی خدمت میں تھوڑی دیر کے لئے جاتا رہتا تھا۔ ان کے والد شیخ غلام محمد مرحوم لاہور کے رہنے والے تھے۔ یہ غالباً مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ فضلاء مکہ سے تعلیمِ دین کی تکمیل کی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے بھی نسبت تلمذ حاصل ہے، علمِ ادب، علمِ تاریخ، سیرت النبیؐ، سیرت صحابہؓ، حالات عرب خصوصاً تاریخ مکہ پر بڑا عبور ہے، مناسک پر بھی ایک کتاب تالیف فرما رہے ہیں۔ اُردو بھی بڑے دل آویز عربی لہجے میں بولتے ہیں، کبھی کبھی دورانِ گفتگو میں ان پر جذب و کیف کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں ـــ بڑے قانع اور متوکل ہیں ـــ عقیدت مند لوگ جو کچھ مالی خدمت کرتے ہیں وہ غریبوں اور اپنے ملنے والوں پر خرچ کر دیتے ہیں، پانچوں وقت کی نمازیں اہتمام کے ساتھ مسجد الحرام میں ادا کرتے ہیں۔ رات کو بعد عشا مضافات مکہ کی کسی نہ کسی وادی میں چلے جاتے ہیں ـــ بعد نمازِ فجر اپنے حجرے میں موجود رہتے ہیں جہاں ملنے والے ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں مدرسۂ عزیزیہ میں مدرس تھے، کبھی کتب خانہ مسجد الحرام کے ناظم بھی رہے ہیں ـــ اب کہیں ملازم نہیں۔ مجھے ایک معتبر شخص نے بتایا کہ ان کو حکومتِ سعودیہ کی طرف سے ہزار ریال ماہانہ کی ایک ملازمت مل رہی تھی مگر انھوں نے قبول نہیں فرمایا ـــ اگر کسی اہلِ خیر کو مستحقین مکہ کو امداد پہونچانی ہوتی ہے تو یہ امداد رسانی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں،

خود غریبوں کے گھروں پر پہونچ کر روپئے، کپڑے وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔ ان کو مکہ معظمہ کے محلّوں، وادیوں، پہاڑوں، اور اس کے تمام آثار قدیمہ سے بڑی واقفیت ہے، اپنی مجلس میں جب تاریخ مکہ کے جزئیات تک کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مکہ کو کسی دوربین کے ذریعے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آب زمزم، ملتزم اور شب مزدلفہ کے فضائل و خصائص اس طریقے سے بیان فرماتے ہیں کہ یقین تازہ ہو جائے۔ ایک دن فرمایا کہ شب مزدلفہ (۹ ذی الحجہ گزار کر آنے والی رات) تو اب اگلے برس آئے گی البتہ زمزم و ملتزم اس وقت بھی میسر ہیں، ان سے فیوض و فوائد حاصل کر لئے جائیں۔

ملتزم کے متعلق تو اپنے اوپر گزرا ہوا واقعہ ایک دن سنایا کہ میں ایک مرتبہ اپنے ایک مقصد کے حصول کے لئے دعا کرنے کے لئے پورے یقین کے ساتھ ملتزم کے پاس پہونچا ہوں کہ آثار قبولیت نمایاں ہو گئے ۔۔۔ علاوہ ہندوستان و پاکستان کے جاوہ اور افریقہ کے لوگ اُن سے بہت تعلق رکھتے ہیں ایک دن امریکہ کے ایک مبلغ اُن کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا اختر شاہ خاں صاحب سنبھلی اور اُن کے رفیق حاجی امام الدین مالیگانوی بھی اکثر و بیشتر شریک مجلس زمزمی ہوتے تھے ۔۔ حاجی امام الدین نے تلخیص سفرنامہ حاجی رفیع الدین مرادآبادیؒ اور ترجمہ مکتوبات خواجہ معصومؒ کو اپنے پاس سے شیخ زمزمی کی خدمت میں ہدیۃً پیش کر دیا تھا۔ ترجمہ مکتوبات کو اُنھوں نے اپنے ایک افریقی دوست کو دیدیا اور مجھ سے فرمایا شیخ! میں نے اس ترجمہ کو بہت دور پہونچا دیا ہے ۔۔۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے مجھے شریک طعام کیا اور "معمول" تو سب اہل مجلس کے ساتھ کئی مرتبہ کھلائے "معمول" غالباً میدے کے سموسے ہوتے ہیں جن میں اندر کھجوریں بھری ہوئی ہوتی ہیں ۔۔۔ فرماتے تھے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ اس قسم کا پکوان منیٰ میں اپنے ساتھ بطور توشہ لے جاتے تھے اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

عربی اشعار کافی بہت یاد ہیں۔ ایک دن چند شعر اپنے مخصوص لہجے میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھے جن کو میں نے لکھ لیا تھا جب حضرت مولانا اعظمی مدظلہٗ اُن کی مجلس میں بیٹھے ہوتے اُس وقت اُن کی مسرت اور جوش کا عالم نہ پوچھئے حضرت

مولانا سے کبھی عربی میں گفتگو کر رہے ہیں کبھی اُردو میں ـــــ حافظہ بڑا زبردست ہے کتابوں کی عبارتیں کی عبارتیں حفظ ہیں۔ حضرت مولانا سندھیؒ کی علمیت اور روحانیت کا بار بار تذکرہ فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا اعظمی مدظلہ سے بھی بہت متاثر ہیں ایک مرتبہ اُن کی عدم موجودگی میں دیر تک اُن کا تذکرہ اور تعریف فرماتے رہے ـــــ اور فرمایا کہ مولانا اعظمی اس دور میں سید العلماء اور تاج العلماء کے لقب سے یاد کئے جانے کے لائق ہیں ـــــ

ذی الحجہ کے شروع میں دارالعلوم ندوہ کے معلم قرآن حافظ اقبال صاحب حج کے لئے آئے ہیں اپنے ہمراہ میرے لئے حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کا گرامی نامہ اور اُن کا ایک گراں قدر ہدیہ لائے ہیں۔ ڈاکٹر زین العابدین ندوی کے مطب میں اُن کا قیام ہے ـــــ ڈاکٹر ندوی صاحب سے بھی دو ایک مرتبہ سرسری ملاقات ہوئی ـــــ

حافظ اقبال صاحب نے وقتِ ملاقات غم انگیز لہجے میں فرمایا کہ حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے انتقال کی خبر میں نے جدے میں سُنی ہے۔ چونکہ حافظ صاحب نے وثوق کے ساتھ اس خبر کو بیان نہیں کیا تھا اس لئے لکھنؤ کو تعزیت نامہ بھیجنا احتیاط کے خلاف سمجھا بعد کو معتبر ذرائع سے اس خبر کی تصدیق ہو گئی ـــــ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کیا بلحاظ علم و عمل اور کیا بلحاظ اخلاق و عادات حسنہ ایک عظیم اور بلند پایہ شخصیت تھی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین) علاوہ بہت سے صدقات جاریہ کے اُن کے خیرِ جاری میں اُن کی اولاد خصوصاً ولدِ صالح مولانا محمد میاں زید مجدہم تو ہیں ہی اُن کے برادرِ خرد مولانا علی میاں مدظلہ بھی ہیں ـ اُن کی تربیت جس انداز اور جس ترتیب سے ڈاکٹر صاحب نے فرمائی ہے وہ مستقل ایک زبردست دینی و مذہبی شاہکار ہے ـ

ڈاکٹر صاحب مغفور سے میری سرسری ملاقات تو کئی مرتبہ ہوئی لیکن وفات سے تقریباً ایک سال بیشتر ایک ملاقات میں جو تفصیلی بھی تھی اور آخری بھی ـــــ ڈاکٹر صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اُس وقت بھی وہ علیل تھے اُن کی پُرخلوص تواضع، اُن کی علمی گفتگو اُن کا محبت آمیز بزرگانہ اخلاق آج تک میرے قلب پر مرتسم ہے ـ اب ایسے صاحبِ نظر اور دیدہ ور کہاں پیدا ہوتے ہیں ـ

ہمارے مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے مہتمم مولانا اعجاز حسنین صاحب امروہی بھی مکہ معظمہ آگئے ہیں۔ حضرت شاہ بہاء الدین نقشبندی امروہیؒ کے صاحبزادے حکیم اعزاز الدین صاحب کے مکان پر مقیم ہیں اُن کے ہمراہ منشی فرید الدین صاحب سنبھلی، منشی نبی عباس صاحب امروہی اور سنبھل کے ایک بیرجی بھی ہیں ـــــ ان بیرجی کے اندر خدمت رفقاء کا قابل تعریف جذبہ ہے۔

۸ ذی الحجہ کو بس میں بیٹھ کر منیٰ گئے، وہاں سے عرفات پہونچے۔ مولانا حکیم محمد احسن صاحب ان دنوں علیل تھے منیٰ کے لئے روانہ ہونے سے پہلے کچھ وصیت آمیز کلمات بھی مجھ سے فرمانے لگے ایام حج کے بعد علالت۔ نے بہت شدت اختیار کر لی تھی اور یہ شدید علالت مکہ سے روانگی تک رہی۔ تبلیغی جماعت کے رفقاء خصوصاً مولانا عبید اللہ صاحب مدظلہٗ اُن کے پاس عیادت کے لئے آتے رہے۔ یونانی اور ڈاکٹری علاج ہوتا رہا۔ اُن کی طرف سے بڑی تشویش ہوگئی تھی مگر اُن کے چہرے پر تمام ایام علالت میں آثارِ اطمینان نمایاں رہے بڑے صبر و شکر کے ساتھ اس دور کو گزارا روانگی سے چند روز پہلے بحمد اللہ اُن کی صحت بحال ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ مع متعلقین اُن کو صحت و عافیت سے رکھے ـــــ باوجود نقاہت کے حکیم صاحب عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منیٰ پھر منیٰ سے مکہ معظمہ پیدل چل کر پہونچے ـــــ میں بھی اپنے قافلے کے چند افراد کے ساتھ پیدل ہی واپس ہوا تھا ـــ ۱۱ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ آکر طواف زیارت کیا اور کرایے کی ٹیکسی میں بیٹھ کر آنا اور جانا ہوا ـــ ۱۲ تاریخ کو رفقاء کے ساتھ رمی جمار کرنے گیا۔ کثرتِ ہجوم کے باعث ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور بڑی مشکل سے اور بہت دیر میں تینوں جمرات کی رمی سے فراغت ہوئی ـــ ماسٹر علاء الدین صاحب اُس محشر نما مجمعِ عظیم میں، مجھے ڈھونڈھتے رہے بالآخر وہ خیمے میں چلے گئے میں راستہ بھول گیا اور کئی گھنٹے کی بعد سنبھل کے ایک صاحب کی رہنمائی میں جو پاکستان سے حج کرنے آئے تھے اور مجھ سے بالکل واقف نہیں تھے مولانا عبید الرحمٰن معلّم کے خیموں تک پہونچا اُس وقت خیمے اُکھڑ رہے تھے اور ساتھی میرا شدید انتظار کر رہے تھے۔

ـــــ ایام حج میں عرفات و منیٰ کے اندر ہندوستان و پاکستان کے سفارت خانوں کی طرف سے ڈاکٹروں کے کیمپ تھے۔ پاکستان کی طرف سے جگہ جگہ برف کے پانی کی سبیلیں لگی ہوئی تھیں بلکہ بس میں برف کا ذخیرہ رکھ کر حاجیوں میں برف بھی تقسیم کیا گیا جدے میں بھی آتے جاتے

وہاں کی ٹھنڈے پانی کی سبیلیں دیکھیں اور اُن سے سیراب ہونے کا موقع ملا ۔۔۔ منیٰ میں ہندوستانی سفارت خانے کے ذمہ دار افیسر گشت لگا لگا کر حاجیوں کے حالات معلوم کرتے تھے ہمارے خیمے کے قریب بھی رات کو چند حضرات خبر گیری کے لئے آئے اور کہا کہ اگر کوئی بیمار ہو اور شفاخانے تک پیدل نہ پہونچ سکتا ہو تو اس کے لئے ہماری طرف سے موٹر کا انتظام کر دیا جائے گا ۔۔۔ ایام حج میں عرفات و منیٰ میں گرمی تھی ضرور مگر معلوم ہوا کہ سال گزشتہ کے مقابلے میں کم ہے ۔ بعد کو سُنا گیا کہ ہندوستان کے اخبارات میں گرمی کا بڑا چرچا ہوا ۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مئی جون کے مہینوں میں جس قدر گرمی سے دوچار ہونا پڑتا ہے حجاز میں وہ بات محسوس نہ ہوئی پندرہ سولہ دن مدینہ منورہ میں نہایت ٹھنڈے اور خوشگوار ملے مکہ معظمہ میں گرمی کے اوقات مسجد الحرام کے دالانوں اور نئی سعودی عمارت میں گزارتے رہے ۔۔۔ البتہ دوپہر کو دھوپ بہت تیز ہوتی تھی اور لُو بھی خوب چلتی تھی ۔۔۔ مگر دھوپ کی شدت اور لُو کے تھپیڑوں سے بہت کم واسطہ پڑا ۔ شدت گرما کے زمانے میں بھی رات بڑی خنک ہوتی تھی ۔ ایک دن رات کو لُو کا جھونکا ضرور آیا تھا ۔ لیکن لُو کے زمانے میں تو ہندوستان میں کئی دن تک راتوں کو لُو کا مزہ چکھنا پڑتا ہے ۔

(باقی آئندہ)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال پر جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

چندہ
ہند و پاک سے
سالانہ ...... چھ روپے
ششماہی ...... تین روپے
فی کاپی ...... ۶۰ نئے پیسے

چندہ
دیگر ممالک سے
سالانہ ...... ۱۲ شلنگ
اعزازی چندہ
سالانہ ...... پندرہ روپے

جلد ۲۹ | بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق مارچ ۱۹۶۲ء | شمارہ ۹

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۳ مارچ تک دفتر میں ضرور آجانا چاہیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار } اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

نمبر خریداری } براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت } الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک اندر آجانی چاہئیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

ناظر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان کی جمہوریت کے اور جو بھی نقائص بیان کئے جائیں۔ لیکن اس میں آزادیٔ تحریر وتقریر اور انفرادی واجتماعی سرگرمیوں کی آزادی، ایک ایسا پہلو ہے جس کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ دور اور قریب کے بہت سے دوسرے ملکوں کو دیکھتے ہوئے یہ ہندوستان کے سیاسی نظام کا ایک بہت ہی قابل لحاظ اور قابل قدر پہلو ہے ــــــ ملک کے فلاں عنصر کے ساتھ حکومت کے دائرہ میں ناانصافی ہو رہی ہے، فلاں عنصر کے ساتھ اپنائیت کا معاملہ ہے اور فلاں کے ساتھ غیریت کا، فلاں عنصر کے مذہب وتہذیب کی سرپرستی کی جا رہی ہے اور فلاں کے مذہب وتہذیب کی جڑیں کاٹی جا رہی ہیں، فلاں عنصر کو آزادی ہے کہ وہ ایک دوسرے عنصر کے خلاف جارحیت کرتا رہے اور دوسرا جائز دفاع پر بھی مجرم بنا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی تمام شکایات برحق ہیں، خصوصاً ہم مسلمانوں کے لئے یہ وہ حقائق ہیں جن کا سلسلہ چودہ سال سے سامنا ہے ــــــ لیکن جو ان تلخ حقائق کے درمیان زندہ رہنے اور اسی تاریکی میں روشن مستقبل کی راہیں نکالنے کا عزم رکھتا ہے۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ماحول کے اُن حقائق پر بھی نظر رکھے جن کے سہارے، اس کے عزم کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔

اب ہندوستان میں وہ مسلمان رہ گئے ہیں جن کے سامنے اپنے اس وطن کو چھوڑ جانے

کا کوئی سوال نہیں ہے ــــــ اور اسی طرح بحمد اللہ ان کے سامنے اس بات کا بھی سوال نہیں ہے کہ وہ حکومت اور اسکے عمال کی ناانصافیوں سے نجات پانے اور ملک کے مسلمان دشمن عناصر کی چیرہ دستیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنے مذہب اور اپنی ملی تہذیب سے دستبردار ہو جائیں ــــ گویا ہندوستان کے مسلمانوں کا فیصلہ ہے کہ وہ یہاں رہیں گے اور اپنی اُن خصوصیات کے ساتھ رہیں گے جن کی انھیں بہت سخت قیمت مسلسل چودہ سال سے ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

اس فیصلہ کا قطعی تقاضا، جیسا کہ ہم نے کہا، یہ ہے کہ ہم مخالف حالات کو سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ ان موافق حالات کو بھی ذہن میں رکھیں جو بہتر مستقبل کی جدوجہد میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ آبرومندانہ زندگی کا عزم رکھنے والی قومیں سراسر ناموافق حالات میں بھی اپنی جدوجہد کی راہیں نکالتی ہیں، خواہ وہ آگ اور خون کے دریاؤں ہی میں سے ہو کر کیوں نہ نکلیں۔ لیکن جو قومیں موافق حالات کو بھی کام میں لانے کا سلیقہ نہ رکھتی ہوں انھیں کوئی حق نہیں کہ وہ عزت و آبرو اور آزادی و حریت کا نام لیں۔ اُن کا حق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ شب و روز صف ماتم بچھایا کریں اور اپنی آبرو کے مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھا دیا کریں۔ اس حق سے اُن کو دنیا میں کوئی نہیں روکتا ــــ لیکن اس حق کے استعمال سے، یاد رکھنا چاہئیے کہ دنیا میں کوئی کام نہیں بنتا۔ کام بنتا ہے، فکر و شعور کو بیدار رکھنے سے، اور قوت عمل کو کام میں لانے سے!

ہندوستان کے مسلمان اگر سنجیدگی سے اپنے حالات کو بہتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں، اور اس کے لئے جدوجہد اور عمل کی راہ پر گامزن ہونے کا بھی کچھ جذبہ رکھتے ہیں، تو انھیں ایک بات بھولنی نہیں چاہئیے کہ عمل اور جدوجہد کی جو گنجائش اس وقت کے ہندوستان میں ہے وہ ضائع کرنے کی چیز نہیں ہے۔ اور آج اگر ہم نے اس موقع کو ضائع کر دیا تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ زیادہ سے زیادہ دس سال کے بعد تو عملی سرگرمیوں کی

یہ گنجائش بھی یکسر ختم ہو کر رہ جائے۔ اور ہماری آج کی مصیبتوں میں اس سے بڑی مصیبت کا اضافہ ہو جائے کہ ہمیں حالات پر لکھنے اور بولنے اور مستقبل کی بہتری کے لئے جد و جہد کرنے کی آزادی بھی نہ رہے۔

تیسرا عام الکشن جس کے نتائج کا اعلان اب قریب قریب مکمل ہو چکا ہے، اس میں موجودہ حکمراں پارٹی کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلسل چھ ہفتے تک ملک بھر کا دورہ کیا، یہ ایک غیر معمولی تگ و دو تھی، اسکی کامیابی اور نتیجہ خیزی کے لئے پنڈت جی نے کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی اپنی شخصیت کے پورے وزن اور پورے اثر کو استعمال کیا، اس دورہ میں ان کا خاص ہدف جن سنگھ اور سونتنتر پارٹی رہی لیکن جہاں جہاں اِن دونوں پارٹیوں کے کچھ امکانات اور اثرات تھے وہاں یہ پنڈت جی کے سارا زور لگا دینے کے باوجود اچھی خاصی حیثیت میں کامیاب ہوئی ہیں۔ یہ کامیابی اگرچہ ان پارٹیوں کی توقعات اور دوسروں کے خطرات کے مطابق نہیں ہوئی، تاہم اس درجہ میں ہوئی ہے کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ مسٹر سی، بی، گپتا نے خاص یوپی میں جن سنگھ کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک تشویشناک علامت قرار دیا ہے۔ جن سنگھ کے متعلق تو کچھ کہنے کی بات ہی نہیں، لیکن سونتنتر پارٹی کے متعلق بھی اسکے عناصر ترکیبی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ پارٹی فرد کی آزادی کے کیسے ہی مطلق نعرے کے ساتھ اٹھی سہی لیکن مسلمانوں کے حق میں اسکا جن سنگھ سے کچھ زیادہ مختلف ہونا مشکل ہے۔ تفصیل کا تو یہ موقع نہیں، لیکن جو شخص بھی سونتنتر پارٹی کے عناصر ترکیبی پر غور کرے گا امید ہے کہ وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا ——— اِن دو پارٹیوں کے علاوہ تیسری قابل ذکر پارٹی اس الکشن میں کمیونسٹ پارٹی رہی ہے۔ اس میں فرقہ وارانہ انداز کی مسلم دشمنی نہ سہی لیکن اس کے اقتدار میں مسلم مذہب اور تہذیب کی بقا کی جد و جہد کے لئے آزادی کا تصور تو ٹھیک اسی طرح محال ہے جس طرح جن سنگھ کے اقتدار میں!۔

اس تازہ الکشن نے ملک کے سیاسی مستقبل کے بارے میں جو اشارے دئیے ہیں ہم ابھی کی طرف توجہ دلا کر مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ آج کے وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں ورنہ بہت قوی امکان ہے کہ کل انھیں آئینی اور قانونی آزادی کے ساتھ کسی جد و جہد کا موقع نہ رہے۔

معارف الحدیث

مسلسل

نماز کس طرح پڑھی جائے؟

(۲)

خاص اذکار اور دعائیں:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے مختلف اجزاء یعنی قیام اور رکوع وسجود وغیرہ میں جن کلمات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس اور حمد وثنا کرتے تھے اور جن سے جو دعائیں اور التجائیں کرتے تھے (جن میں سے چند انشاء اللہ آگے درج ہونے والی حدیثوں سے ناظرین کو معلوم ہوں گی) ان اذکار و دعوات سے دل کی جس کیفیت کی ترجمانی ہوتی ہے (وہی) دراصل نماز کی حقیقت [illegible] ان حدیثوں کو پڑھیے اور ان کیفیات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کیجئے. یہی دولت عظمیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص الخاص ورثہ ہے.

(۱۰۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْكُتُ بَيْنَ التَّكْبِيْرِ وَبَيْنَ الْقِرَاْءَةِ اِسْكَاتَةً فَقُلْتُ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِسْكَاتَكَ بَيْنَ التَّكْبِيْرِ وَبَيْنَ الْقِرَاْءَةِ مَا تَقُوْلُ؟ قَالَ اَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا

بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ۔

——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان کچھ دیر سکوت فرماتے تھے (یعنی آواز سے کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ لیکن محسوس ہوتا تھا کہ آپ خاموشی سے کچھ پڑھتے ہیں) تو میں نے ایک دفعہ عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے بتا دیجئے کہ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان کی خاموشی میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ الخ کہ اے اللہ میرے، اور میری خطاؤں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ کر دے جتنا طویل فاصلہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان کر دیا ہے، اور اے اللہ مجھے خطاؤں سے ایسا پاک و صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور اے اللہ میری خطاؤں کو پانی سے اور برف سے اور اولے سے دھو ڈال۔

——— (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ عام معاصی اور منکرات سے معصوم اور محفوظ تھے۔ لیکن "قریباں را بیش بود حیرانی" کے فطری اصول پر آپ ان لغزشوں سے سخت لرزاں و ترساں رہتے تھے جو بربنائے بشریت آپ سے سرزد ہو سکتی تھیں اور معصیت نہ ہونے کے باوجود آپ کی شان عالی اور مقام قرب کے لحاظ سے قابل گرفت ہو سکتی تھیں۔ ع ——— جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قسم کی دعاؤں میں "خطایا" یا "ذنوب" جیسے الفاظ جہاں جہاں آتے ہیں وہاں اُن سے اسی قسم کی لغزشیں مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث میں جو دعا مذکور ہوئی ہے اس کا حاصل بس یہ ہے کہ اے میرے اللہ! اولاً تو مجھے ہر قسم کی خطاؤں اور غلطیوں سے اس قدر دور رکھ جس قدر کہ تو نے مشرق کو مغرب سے اور مغرب کو مشرق سے دور رکھا ہے، اور بربنائے بشریت جب کوئی خطا مجھ سے سرزد ہو جائے تو اس کو معاف

فرما کر اس کے داغ دھبہ سے بھی مجھے ایسا پاک صاف کر دے جیسا کہ میل کچیل دور کر کے سفید کپڑا بالکل پاک صاف کر دیا جاتا ہے اور اپنی رحمت کے نہایت ٹھنڈے پانی سے میرے باطن کو غسل دے کر خطا تصور سے پیدا ہونے والی اپنے غضب کی آگ اور اس کی سوزش و جلن کو بالکل ٹھنڈا کر دے اور اس کے بجائے اپنی رضا کی ٹھنڈک اور سکینت میرے باطن کو نصیب فرما دے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے بعد اور قرأت سے پہلے کبھی کبھی یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔

(۱۰۸) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ قَالَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ ——— رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو پہلے اللہ کی تسبیح اور حمد اس طرح کرتے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ...... الخ۔ اے اللہ تیری ذات پاک اور منزہ ہے اور میں تیری تقدیس بیان کرتا ہوں، اور سارے کمالات اور خوبیاں تجھ میں ہیں میں تیری حمد کرتا ہوں۔ اور تیرا نام پاک بڑا بابرکت ہے۔ اور تیری شان بہت اعلیٰ ہے، اور تو ہی معبود برحق ہے، تیرے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں۔

——— (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) حافظ مجد الدین ابن تیمیہ نے منتقیٰ میں سنن سعید بن منصور کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق اور صحیح مسلم کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق دارقطنی کے حوالے سے حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ نقل کرنے کے بعد کہ یہ حضرات تکبیر تحریمہ کے بعد نماز کا افتتاح سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ...... الخ سے کرتے تھے، لکھا ہے کہ ان سب حضرات کے اس طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے بعد عموماً اور اکثر و بیشتر یہی سُبْحَانَكَ

اَللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ "الخ پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے احادیث میں وارد شدہ افتتاح نماز کی دوسری دُعاؤں کے مقابلہ میں یہی راجح و افضل ہے۔ اگرچہ دوسری ثابت شدہ دعاؤں کا پڑھنا بھی بالکل صحیح ہے، مثلاً وہ دعا جو حضرت ابوہریرہ کی مندرجہ بالا روایت میں ابھی اوپر مذکور ہو چکی ہے یعنی اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ ...... الخ اور اسی طرح وہ دُعا جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اگلی حدیث میں آ رہی ہے۔

(۱۰۹) عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلٰوةِ كَبَّرَ ثُمَّ قَالَ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا إِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ وَاهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ وَإِذَا رَكَعَ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِيْ وَبَصَرِيْ وَمُخِّيْ وَعَظْمِيْ وَعَصَبِيْ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ قَالَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، وَإِذَا سَجَدَ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مِنْ اٰخِرِ مَا يَقُوْلُ بَيْنَ التَّشَهُّدِ وَالتَّسْلِيْمِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ

اَعْلَمُ بِهِ مِنِّي اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ۔

رواہ مسلم

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کے بعد یہ دعا پڑھتے۔ "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي ... اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوبُ اِلَيْكَ" تک۔ (یعنی میں نے اپنا رخ ہر طرف سے یکسو ہوکر اس اللہ کی طرف کر دیا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ان میں سے نہیں ہوں جو اس کے تعلق میں کسی اور کو شریک کرتے ہیں، میری عبادت اور میرا ہر دینی عمل اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو رب العلمین ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداری کرنے والوں میں سے ہوں، اے اللہ تو ہی بادشاہ اور مالک ہے، تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے، تو میرا مالک و رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنے کو تباہ کیا ہے، اور مجھے اپنی خطاؤں کا اقرار ہے، پس اے میرے مالک میری ساری خطائیں معاف کر دے، گناہوں کا بخشنے والا تیرے سوا کوئی نہیں، اور مجھے اچھے اخلاق کی رہنمائی فرما، اچھے اخلاق کی ہدایت دینے والا تیرے سوا کوئی نہیں، اور برے اخلاق میری طرف سے ہٹا دے، اور دور کر دے، ایسا کرنے والا بھی تیرے سوا کوئی نہیں، تیرے حضور میں اور تیری خدمت و نصرت کے لیے حاضر ہوں، حاضر ہوں، مولا! ہر قسم کی خیر اور بھلائی تیرے ہی ہاتھوں میں ہے، اور برائی کا تیری طرف گزر نہیں، مجھے تیرا ہی سہارا ہے، اور تیری ہی طرف میرا رخ ہے، تو برکت والا اور رفعت والا ہے۔ میں تجھ سے مغفرت اور بخشش کا سائل ہوں اور تیرے حضور میں توبہ کرتا ہوں"۔ (یہ دعا تو آپ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت شروع کرنے سے پہلے پڑھتے) پھر جب (قرأت سے فارغ ہوکر) آپ رکوع میں جاتے تو کہتے "اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ ..... وَعَظْمِي وَعَصَبِي" تک (یعنی اے اللہ میں تیرے حضور میں جھکا ہوا ہوں اور میں تجھ پر ایمان لایا ہوں، اور میں نے اپنے کو تیرے سپرد کر دیا ہے، میرے کان اور میری آنکھیں اور میرا مغز و استخوان اور میرے

رگ پٹھے سب تیرے حضور میں جھکے ہوئے ہیں) ..... پھر جب آپ رکوع سے سر اٹھاتے تو (سیدھے کھڑے ہو کر) اللہ کے حضور میں عرض کرتے "اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ".

(یعنی اے اللہ تیرے ہی لیے حمد ہے، ایسی وسیع اور بے انتہا حمد جس سے آسمان و زمین کی ساری وسعتیں بھر جائیں اور ان کے درمیان کا سارا خلا پُر ہو جائے ... اور جب آپ سجدہ میں جاتے تو (اللہ کے حضور میں زمین پر اپنی پیشانی رکھ کے) عرض کرتے "اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ .... اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" تک (یعنی اے اللہ میں تیرے لیے اور تیرے حضور میں سجدہ کر رہا ہوں اور میں تجھ پر ایمان لایا ہوں اور میں نے اپنے کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ میرا چہرہ اپنے اس خالق کے سامنے سجدہ کر رہا ہے جس نے اس کی تخلیق کی اور اس کی یہ صورت بنائی اور اس کی کان اور اس کی آنکھیں بنائیں مبارک ہے ہمارا بہترین خالق) پھر تشہد یعنی التحیات اور سلام کے درمیان سب آخر میں آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ .... لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ" تک (یعنی اے اللہ جو خطائیں میں نے پہلے کیں یا پیچھے کیں اور چھپا کر کیں یا علانیہ کیں اور جو بھی میں نے زیادتی کی اور جن کا تجھے مجھ سے زیادہ علم ہے اس سب کو معاف فرما دے اور مجھے بخش دے۔ تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے ڈال دینے والا ہے، یعنی تو جسے چاہے آگے بڑھائے اور جسے چاہے پیچھے ہٹائے، تیرے سوا کوئی معبود و مالک نہیں) (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے دفاتر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے متعلق روایات کا جو ذخیرہ ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی جو تفصیل اور رکوع و سجود اور قومہ وغیرہ کی جو دعائیں ذکر کی ہیں یہ روزمرہ کی فرض نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام اور دائمی معمول نہیں تھا، غالباً کبھی کبھی آپ ایسا بھی کرتے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ آپ تہجد کی نماز اس طرح پڑھتے ہوں، امام مسلمؒ نے اس حدیث کو تہجد ہی کی احادیث کے سلسلہ میں

روایت کیا ہے ۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دُعائیں منقول ہوئی ہیں اُن سے کچھ سمجھا جا سکتا ہے کہ نماز کی حالت میں حضور کے قلب مبارک کی کیفیت کیا ہوتی تھی اور آپ نماز کس ذوق سے ادا کرتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ اس کا کوئی ذرہ ہم کو نصیب فرمائے ۔

نماز میں اور خاص کر تہجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور بھی بہت سی دعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے ، جو انشاء اللہ آئندہ اپنے موقع پر ذکر کی جائیں گی ، ان سب دعاؤں میں ایک خاص روح ہے ، اگر اس کا اطمینان ہو کہ مقتدیوں کو تکلیف اور گرانی نہ ہوگی تو فرض نمازوں میں بھی امام ان دعاؤں میں سے پڑھ سکتا ہے ۔ اور نوافل میں تو اس دولت عظمیٰ سے حصہ لینا ہی چاہیے ۔ ——— وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون

انسانی دنیا میں عربوں کا مقام

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مولانا علی میاں مدظلہ نے مصر کا سفر فرمایا تو " اسمعی یا مصر" ہمارے لئے اس سفر کی سوغات تھی پھر شام و سوریا تشریف لے جانا ہوا تو اس سفر سے " اسمعی یا سوریا " کا تحفہ ہمارے حصے میں آیا۔ اب اسی مہینے مولانا کویت کے تازہ سفر سے واپس آئے ہیں اور ہمارے لئے " اسمعی یا زہرۃ الصحراء" اس مبارک سفر کی یادگار لائے ہیں۔ کویت سے یہ خطاب وہاں کویت ریڈیو پر نشر ہوا تھا اب آپ اسے اردو میں پڑھیئے۔ ترجمہ میں عنوان ہم نے بدل دیا ہے (ادارہ)

اب سے پہلے کوئی کہتا کہ اس نے تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی پھول اور کلیاں کھلی دیکھی ہیں تو کوئی ماننے والا نہ ہوتا لیکن جس نے کویت کا یہ پر بہار اور زرنگار شہر دیکھا ہے، جو نرم ریت کے ٹیلوں اور لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ ابھی تھوڑی ہی مدت کے اندر اس خاموشی کے ساتھ نمودار ہو گیا ہے کہ ادھر اُدھر کی دنیا کو خبر تک نہ ہوئی اور رات کو اپنی رنگ برنگ روشنیوں اور دن کو اپنی عجیب عجیب عمارتوں سے صحرا میں کھلے ہوئے ایک پھول کا منظر پیش کرتا ہے ــــ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ علم و ہنر، بیابان کو باغ میں اور جنگل کو شہر میں تبدیل کر دینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں اور ایسے خزانے اور ایسی توانائیاں بھی صحرا کے سینے میں دفن ہیں جنھیں اگر چھیڑ دیا جائے اور پھر اُن سے انسانیت کے مفاد اور تمدن کی ترقی میں کام لیا جائے تو ایسے عجائبات رونما ہوں اور وہ کام بنیں کہ عقل حیران رہ جائے۔

اے صحرا کے پھول! اے شہر کویت! اگرچہ واقعہ میں تو ایک نیا شہر اور نوعمر پایۂ تخت ہے لیکن تجھ میں سنجیدگی اور پختگی کی وہ شان نظر آتی ہے جس میں کم سنی کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی، تو

جس تیزی اور حوصلہ مندی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا کہ تیرا شمار عرب کے عظیم ترین شہروں میں کیا جائے گا اور اپنی برادری میں خوردسالی کے باوجود تیرا مقام کسی سے کم نہیں رہے گا۔

بہت سے لوگ تیری اس صنعتی اور تجارتی ترقی اور تہذیبی پیش رفت کا سہرا اس پٹرول کے سر باندھتے ہیں جس کا خزانہ تو نا معلوم زمانوں سے اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ البتہ جب اللہ کو منظور ہوا تو وہ منظر عام پر آیا اور تجھ پر خیر و برکت اور رفاہیت و ثروت کا سیلاب بہا گیا۔ لیکن یہ سارا فیض اسی تیل کا نہیں کہا جا سکتا۔ اور اسے تیری ترقی اور رونق و بہار کا تنہا راز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر چستی اور ذہانت نہ ہوتی، محنت اور ارادہ نہ ہوتا تو یہ زرِ سیاہ (پٹرول) کسی کام نہ آتا۔ یا بے قیمت کاموں میں ضائع ہو کر رہ جاتا۔

اے صحرا کے پھول! تو جدید تمدن سے بہت کچھ بہرہ یاب ہو چکا ہے اور تہذیب و تعمیر کے ظاہری پہلوؤں سے ایک حسین موتی کی طرح چمک رہا ہے۔ لیکن میں اس زیبائش و آرائش کو سچے خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہوں کہ تیرا نصب العین اس سے بہت بلند ہونا چاہیے کہ تو مشرق کے حسین تر شہروں میں سے ایک شہر بن جائے۔ یہ تو کوئی ایسا امتیاز نہیں ہے جو تیرے لئے باعثِ عزت ہو۔ اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کی دنیا تجھ سے طلب گار ہو اور شدید حاجت کے ساتھ طلب گار ہو ـــــ تو ایک تاریخ کا وارث ہے، تو اس جزیرۂ عرب کا ٹکڑا ہے جس نے اپنی پہلی اٹھان کے دور میں ذرا دیر کے لئے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ چھٹی صدی عیسوی کے شاندار شہروں کی گنتی میں ایک نئے شاندار شہر کا اضافہ کر دیا جائے ـــ کیوں؟ اس لئے کہ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہ ہوتا جسے تاریخ زندہ رکھتی اور دنیا اس پر شکرگزار ہوتی۔ اس جزیرۂ عرب نے اس وقت کی ستم رسیدہ انسانیت کو ایک نئے شہر کے بجائے ایک نئی تہذیب (مدینۃ کے بجائے مدنیۃ) عطا کی ایسی تہذیب جس کی بنیاد عقیدہ پر تھی، روح پر تھی، اخلاق پر تھی۔ اس تہذیب میں انسانیت نے وہ صحیح علم وہ قوی ایمان اور وہ نیک بلند جذبہ پھر سے پایا جو مدتوں سے گم تھا؛ اور جس کی گم گشتگی نے نوعِ انسانی کو اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ کچھ بھیڑوں اور بکریوں کے گلّے تھے اور کچھ بھیڑیوں اور شیروں کے گروہ۔ اس جزیرۂ عرب نے جس کا تو ایک ٹکڑا ہے ـــ انسانیت کو ایک نیا آسمانی پیغام پہنچایا

اور شر و رذالت کی تحریکات کے مقابلہ کی وہ قوت بخشی جو صدیوں سے عنقا رہی تھی۔ انسانیت کو وہ صالح، قوی اور امین فرد عطا کیا جس سے ایک اچھی سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ اور جو زندگی اور معاشرہ کے ہر خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جزیرۂ عرب کے اس تحفے میں مظلوم انسانیت کی فریاد رسی تھی، کراہتے ہوئے معاشرہ کی حاجت روائی تھی، اور مختصراً کہیئے تو انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا، یہ تحفہ جو جزیرۂ عرب نے عالم انسانی کو بخشا ہر اس تحفہ سے برتر اور افضل تھا جو کبھی کسی ملک اور قوم نے دنیا کو دیا ہوگا۔

اس جزیرہ نے انسانیت کی اس وقت مدد کی، اس وقت اس کی طرف احسان اور کرم کا ہاتھ بڑھایا جب گویا دم اکھڑ چکا تھا اور موت قریب تھی، جب گویا تہذیب کا سفینہ، اپنے سارے سرمایہ کے ساتھ — اپنے علوم، اپنی قیمتی وراثت اور اپنے تحائف کے ساتھ — ڈوبنے کے قریب تھا، موجیں ایک طوفان اٹھائے ہوئے تھیں، رات کی تاریکی الگ بھیانک ہوئی جا رہی تھی، راہ کی تاریکیاں الاماں، پھر اس پر راہبر مفقود اور رہزنوں کا ہجوم، غرض وہ نازک وقت تھا کہ ملاح کے حواس گم، اور راکبوں کے طوطے اُڑے ہوئے تھے۔

یہ جزیرہ ایک نیا دین لے کر دنیا کے سامنے آیا جو زندگی ہی زندگی تھا۔ ایک نئی نسل اٹھا کر لایا جس کی رگ رگ میں زندگی دوڑ رہی اور جوشِ عمل مچل رہا تھا، جو شجاعت اور قوت عمل سے بھرپور تھی، دل میں کشادگی، طبیعت میں بڑائی، نظر بلند، اور ہمتیں عالی، روح قوی، ایمان قوی اور جسم میں توانائی، زندگی میں سادگی تو ہر سے بے رغبتی، نمائش سے نفرت اور کام کی چیزوں سے مطلب، نوعِ انسانی کے خیال میں ایسی محو اور اس کے درد و فکر میں ایسی غرق کہ اہل دولت و سلطنت کے عیش و عشرت پر رشک و حسد کی اُسے فرصت نہیں، پھر اپنی آخرت کا مسئلہ اُسکے سامنے الگ جس نے کبھی اس کی نوبت نہیں آنے دی کہ وہ کھانے پینے میں چٹخارے ڈھونڈتی اور لباس اور مکان میں تکلفات کا مظاہرہ کرتی — انسانی تاریخ میں یہ کس قدر حیرت انگیز نسل انسانی تھی جس نے ایک عظیم سلطنت اور عالمگیر فتوحات کے ساتھ زندگی میں سادگی اور زہد و قناعت کو برت کر دکھایا۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

دنیا کی زاہدانیوں اور رومی و ایرانی تہذیب کے مرکزوں میں جو شان و شوکت کے مظاہرے پائے جاتے تھے حقیقتاً وہ ایسے تھے کہ متمدن دنیا سے کٹے ہوئے ایک عرب باشندے کا دل انھیں دیکھ کر للچا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹھاٹھ باٹھ اس درجہ کے تھے جنھیں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا کرتا ہے اور جن کی بدولت امراء و اغنیاء سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جب عرب اپنے جزیرے سے اسلام پھیلاتے ملکوں کو فتح کرتے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلاتے ہوئے نکلے تو پہلے پہل رومیوں اور ایرانیوں نے کچھ اسی نظر سے ان کو دیکھا۔ انھوں نے سمجھا کہ عربوں پر اپنے قدرتی جزیرے میں زندگی تنگ ہو گئی ہے، مفلسی اور فاقہ مستی نے انھیں پریشان کر دیا ہے اور اب متمدن دنیا کی خوشحالی کی لالچ میں انھوں نے متمدن ملکوں کا رخ کیا ہے۔ مگر عربوں نے انھیں بتایا کہ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہم صحرا کی کھلی فضاؤں کے عادی، سادہ و بے تکلف زندگی کی لذتوں کے خوگر اور پھر اس پر ایمان کا عطا کیا ہوا اطمینان قلب اور سینہ کی وسعت، اس زندگی میں ہمارے لئے تنگی کا کیا سوال۔ درحقیقت تنگی میں تم ہو، اے روم و ایران کے رہنے والو! تمہاری یہ مصنوعی زندگی، تکلفات میں جکڑی ہوئی تہذیب، گرانبار تمدن، سخت عادتیں، بے تاب خواہشیں، ظالمانہ رسم و رواج، فرضی قاعدے اور خود ساختہ آداب، یہ کوئی تمہاری زندگی کیا ہے؟ ایک زریں قفس ہے جس کے ہر طرف سے دروازے بھی بند ہیں اور روشنی اور ہوا کی آمد بھی اتنی کم کر دی گئی ہے کہ زیادہ دن اس قفس میں زندہ رہ سکو۔ ہمیں تنگی نے نہیں، تمہاری اس مصنوعی زندگی پر ترس نے اپنے مساکن سے نہیں نکالا ہے۔ ہمیں اقوام عالم اور سلاطین عالم کی موجودہ قابل رحم زندگی پر رحم اور غمخواری کے جذبہ نے اپنے گھروں سے نکالا ہے۔ ہم اس رنج [illegible] اپنے گھروں سے نکلے ہیں کہ جس [illegible] سے ہم نجات پا چکے ہیں اس میں تم گرفتار ہو [illegible] ہم اس کو بندوں کی بندگی سے اٹھا کر اللہ کی عبادت کی بلندی پر پہنچائیں۔ دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں لے جائیں اور مذاہب کے ظلموں سے نکال کر اسلام کے سایۂ عدل میں پناہ دلوائیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں رومی اور ایرانی تہذیبوں کی رنگینیاں اور ان ملکوں کی زندگی کی دلفریبیاں، تہذیبی اعتبار سے پسماندہ قوموں کو دعوت دے رہی تھیں کہ وہ ان کے نقش قدم

پر چلیں، عرب بھی انہی پسماندہ اقوام میں تھے اور یہ دونوں سلطنتیں مع اپنے تمام ذرائع و وسائل کے ان کے قبضہ میں آگئی تھیں۔ اُن کیلئے موقع تھا کہ بڑی سہولت کے ساتھ اس پوری کی پوری تہذیب کو اپنے دیار میں منتقل کرلیں لیکن وہ باز رہے۔ اس لئے کہ ان کا اعتقاد تھا کہ انکا منصب امامت و سیادت کا منصب ہے اُن کی شان رہنمائی اور رہبری ہے نہ کہ تقلید اور نقالی علیٰ ہذا وہ یقین رکھتے تھے کہ روم و ایران بیمار قومیں ہیں۔ یہ دق کی مریض ہیں اور ان کی دق یہ عیاشانہ تمدن اور پر تکلف زندگی ہے۔ یہ عظیم قومیں کل تک جن کے پرچم متمدن دنیا کے آدھے حصوں پر لہرا رہے تھے اسی بیماری کی بدولت انھوں نے ہمارے مقابلہ میں شکست پر شکست کھائی ہے اور پوری سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں الغرض انھوں نے ان قوموں کے عادات و تکلفات سے دامن بچایا اور اپنی سپاہیانہ روایات اور جفاکشانہ اندازِ حیات کو برقرار رکھا۔ ہاں جو کام کی اور مفید چیزیں تھیں وہ انھوں نے دل کھول کر روم سے بھی قبول کیں اور ایران و ہندوستان سے بھی سیکھیں اس لئے کہ "کام کی بات جہاں ملے وہ مومن کا گمشدہ مال ہے اور وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے" ان عربوں نے ان ملکوں سے تجارت و صناعت میں فائدہ اٹھایا۔ علوم حکمت و طب سیکھے، فنون حرب میں استفادہ کیا اور رفاہ عام کے کاموں میں بہت کچھ سیکھا لیکن اس تمدن کے خوشنما چھلکوں پر جہانتک ہوسکا وہ نہیں گرے اور ان کے رہنما و علما، تو اس عجمی تمدن کی تقلید سے کلیتہً ہی دور رہے،

اس عرب نسل نے اس بات کو اچھی طرح سمجھا تھا کہ تہذیب کے میدان میں ان کو جربے نہیں آتارنے تخلیق کرنی ہے: نئی طرحیں ڈالنی ہیں، نئی نئی صورتیں ڈھالنی ہیں، اور قوموں کی اتالیقی کا کام انجام دینا ہے۔ چنانچہ ایک طویل عرصہ تک ان عربوں کا یہی رول رہا، مگر پھر اُن کی، بلکہ انسانیت کی بدقسمتی سے وہ وقت آگیا کہ انسانیت کے یہ قائد قیادت کے مقام سے تقلید کے مقام پر آگئے، خود اعتمادی اور خود کفالتی کے بجائے دوسروں کے سہارے ڈھونڈنے اور دوسروں کا منہ دیکھنے لگے، برآمد کرنے کے بجائے درآمد کی ضرورت پڑنے لگی، پہلے انھیں ساری دنیا کی فکر ہوتی تھی سارے عالم کیلئے ان کے سینے میں درد اٹھتا تھا اب صرف اپنی ہی فکر رہ گئی، جنھوں نے کبھی قوموں کو نسل و وطن

اور زبان و ثقافت کی پرانی حدبندیوں سے نجات دلائی تھی وہ خود اپنے آپ کو ان مصنوعی دیواروں میں محصور کرنے لگے۔ پھر ناپید اکنار کی وسعتوں میں تیرنے والے حوض اور نہروں کی تنگنائیاں پسند کرنے لگے،

اے جزیرۂ مقدس! یہ کیا ہوا؟ کیا تجھے اپنے اصل مقام میں کوئی رغبت نہیں رہی؟ پلٹ اپنے منصب قیادت کی طرف، امامت و سیادت کی طرف، پوری انسانیت کے غم اور اس کی فکر کی طرف! ــــ لوٹ! اور انسانیت کے ٹوٹے ہوئے کنبے کو جوڑ، اسکی منتشر ٹکڑیوں کی خبر لے اور اسلام کے اس عالمی پیغام سے نوع انسانی کی ہدایت کا سامان کر جو تجھی سے ظہور میں آیا تھا اور تو ہی اس کا مرجع ہے،

تو نے دنیا کو پٹرول کی نعمت سے نوازا، یہ تیری عربی سخاوت اور حوصلہ مندی کا تقاضہ تھا اور اس کیلئے دنیا تیری احسانمند ہے، کوئی شک نہیں کہ پٹرول کا خزانہ اللہ کا ہے۔ تو نے صنعت و حرفت کے اس زبردست محل کی تعمیر میں بیش قیمت حصہ لیا ہے جس پر آج کی دنیا کو فخر ہے، زمین سے لیکر آسمان تک ہر طرف تیرے دیئے ہوئے تیل کی کارفرمائیاں ہیں اور دوڑتی ہوئی موٹریں اور اڑتے ہوئے جہاز، بزبان حال سے اس کے گواہ ہیں۔ اس عطا و سخا اور بخشش بے بہا کا شکریہ ادا کرنا ان قوموں کی طرف سے جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں،

لیکن اے مقدس جزیرے! تیرے سینے میں ایک اور دولت بھی تو ہے جو اس سیاہ سونے سے زیادہ قیمتی، تمدن کیلئے زیادہ نفع بخش اور انسانیت کیلئے کہیں زیادہ باعث خیر و برکت ہے، وہ ایمان کی دولت ہے۔ جس کا چشمہ مدتوں رکا رہنے کے بعد پہلی مرتبہ تیری ہی زمین سے پھوٹا تھا، یہ تیرا پٹرول اگر ایک زمین کا تحفہ ہے دوسری زمینوں کو، تو وہ ایمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے آسمان کا تحفہ تھا پوری زمین کو اور گویا وہ تیری ہی مبارک سرزمین تھی جس پر آسمان زمین سے ہم آغوش ہوا۔ لیکن آسمان و زمین کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، جسم کا روح اور دل سے علاقہ کٹ چکا ہے، تمدن اور اسکی ترقیاں سوختہ ہوا ایمان، و اخلاق سے بیگانہ ہیں۔ کیسی مبارک بات ہو کہ جزیرہ عرب اور

وحیٔ محمدی کے ذریعہ سے یہ ٹوٹے ہوئے رشتے پھر سے قائم ہوں، آسمان پھر زمین سے ہم آغوش ہو، جسم کو پھر روح سے آشنائی ہو اور تمدن اور اسکی ترقیاں پھر ایمان و اخلاق سے قریب آئیں، یہ اس وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے، اتنی بڑی ضرورت کہ جسم اور روح تمدن اور ایمان کی اس منحوس دوئی اور بیگانگی نے عالم انسانیت کو عین جہنم کے کنارے پر پہنچادیا ہے اور کوئی گھڑی جاتی ہے کہ وہ اس میں جا پڑے،

اے جزیرۂ مقدس! تیرے کتنے محبتین ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں کہ علم اور فن کے ہر میدان میں، صنعت اور تمدن کے ہر شعبے میں، تعلیم اور تربیت کے ہر دائرے میں تیری ایک مستقل اپنی ہستی ہو، جدید دور کے یہ تمام لوازم تیری ہستی کے اندر عربیت اور اسلامیت کے اس حسین سانچے میں ڈھلے ہوئے پائے جائیں جو تیری جبقری شخصیت اور اسلامیت کا آئینہ دار ہو، جس سے زندگی کے بارے میں تیرے خاص نقطۂ نظر، اجتماعیات میں تیرے خاص طرز فکر اور انسانیت کے حق میں تیرے مخلصانہ مقاصد کا اظہار ہوتا ہو، یہ انقلابی قدم جس دن بھی تو اٹھائے گا تمام مشرق تجھے تقلید کرتا ہوا نظر آئے گا، اور مغرب کا سر تعظیم کیلئے جھک جائے گا، اس دنیا کی ریت یہی ہے کہ انفرادیت اور خوداعتمادی کے آگے اس کا سر جھکتا ہے اور ندرت کی تعظیم پر مجبور رہتی ہے۔ ذرائع اور مواقع کم ہوں جب بھی یہی ہوتا ہے اور اگر حسن اتفاق سے کسی کے پاس وسائل کی فراوانی ہو اور مواقع وسیع ہوں تب تو کیا ہی کہنا! ۔۔۔ تو ایک صاحب دین اور صاحب دعوت ملک ہے، ضروری ہے کہ تیری زندگی کا ہر شعبہ اور ہر ادارہ ان ملکوں کی تنظیمات سے ایک الگ رنگ اور الگ مزاج رکھتا ہو جن کے پاس کوئی دین اور دینی دعوت نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ تیرا خون تیری اپنی ہی رگوں میں گردش کرے اور درآمد (Import) کا تناسب برآمد (Export) سے زیادہ نہ ہو۔ اس لئے کہ کوئی تمدن اور کوئی حکومت اس کے بغیر مضبوط نہیں رہ سکتی ہے،

میں نے حقیقت سے اور بہت صفائی سے اس کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ آج دنیا میں جزیرۃ العرب کا جو مقام ہے وہ سارا کا سارا اُس ربانی اور روحانی حرکت کا نتیجہ ہے جو اس خطۂ ارض میں رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیدا ہوئی، یہ سب کا سب طفیل ہے

آپؐ کی دعوت اور آپؐ کے اصحاب کی مجاہدانہ کاوشوں کا، یہ بعثت محمدی ہی تھی جس نے اس جزیرہ کو جمود اور گمنامی سے نکال کر عالمی سطح پر سرگرمی کا ذوق اور اس کے نتیجہ میں دائمی عزت اور روحانی سیادت کا مقام بخشا، یہی بعثت تھی جس نے اس سرزمین کی وہ محبت دلوں میں بھر دی کہ دیوانے مشرق و مغرب کے کناروں سے سر کے بل چل کے آتے ہیں، اسی بعثت کے صدقے عرب کو وہ لافانی صحیفہ عطا ہوا جس نے عربی کو زندہ جاوید کر دیا اور کتنے نئے نئے علوم اور وسیع کتب خانہ اس کی بدولت وجود میں آیا جس سے عربی ثقافت کا سر بلند ہے
اسی بعثت نے عربی کو جزیرۂ عرب سے نکال کر ایک بین الاقوامی زبان کے درجہ پر پہنچا دیا، قرآن دنیا کے ہر حصہ کی کتاب بنا اور اسکو سمجھنے کیلئے ناگزیر ہوا کہ جتنی زیادہ ہو سکے اتنی قدر عربی کی تحصیل کریں۔ اسی بعثت محمدی کا احسان ہے کہ اسلام دنیا کے جن حصوں میں داخل ہوا عربی ثقافت دنیا کے ایک وسیع حصے کیلئے ایک مقدس، محترم اور محبوب ثقافت بن گئی ہے اور یہ شرف بھی بعثت محمدی کا عطا کردہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی ایمانی تحریک اور روحانی بیداری کی جد و جہد ہو اس کا سرچشمہ وہی ہدایت آسمانی ہے جو زمین عرب پر نازل ہوئی۔

کیا جس پر احسانات کی یہ بارش ہوئی اور جو احسان شناسی کا خوگر بھی ہے اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان سب حقائق سے آنکھیں بند کر لے گا؟

اے دیار کویت! میں نے ایک بار عالم انسانی کی زبان سے جزیرۃ العرب کو خطاب کیا تھا، انسانیت کے غم و آلام کا شکوہ کیا جزیرہ کی کوتاہیوں کی طرف اشارے کئے اور اس کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، پھر جزیرہ کا جواب بھی عالم انسانی کو پہنچایا، یہ مکالمہ بہت سے کانوں نے سنا اور سننے والے کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے پھر ایسا موقع آیا تو میں نے مصر کو خطاب کیا "اسمعی یا مصر" (اے مصر سن!) الحمد للہ کہ یہ صدا بھی "صدا بصحرا" نہیں ثابت ہوئی، پھر موقع ملا تو میں نے شام کے آگے بھی اپنا دل کھول کے رکھا اور "اسمعی یا سوریا" (اے شام سن!) کہہ کر جو کچھ کہنا تھا وہ کہا، میں شکر گزار ہوں کہ وہاں بھی میری آواز کا استقبال ہوا، آج موقع ہوا ہے، اے صحراء کے پھول! کہ تجھ سے بھی اپنا درد دل کہوں، بس تو نے سن لیا جو کچھ مجھے کہنا تھا، اور یہ غلط نہ ہوگا اگر میں یہ توقع کروں کہ

کبھی میری یہ صدا لائق التفات اور حوصلہ افزائی کے قابل سمجھی جائے گی ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

شیخ مجددؒ کے اصلاحی کارنامے

(از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ)

(۷)

نظربندی اور رہائی

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"جب شیخ مجدد قدس سرہٗ کو قید کیا گیا تو آپ تین برس قید خانہ میں رہے۔ اس کے بعد سلطان نے دو شرطوں پر رہا کیا۔ ایک شرط تو یہ تھی کہ آپ لشکر کے ساتھ رہیں اور دوسری شرط یہ تھی کہ جہاں بادشاہ جائے وہاں اسکے ساتھ ساتھ رہیں۔ چنانچہ شیخ قدس سرہٗ نے لشکر میں قیام فرمایا۔" (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان [illegible] ص ۴۸ مطبوعہ [illegible])

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھی یہی فرماتے ہیں :-

"جب آپ کو قید کیا گیا تو آپ تین سال قید خانہ میں رہے، پھر رہا ہوئے اور لشکر کے ساتھ رہنے اور اسی کے ساتھ پھرتے رہے۔" (ابجد العلوم مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۵ھ ص ۸۹۹)

مولانا رحمٰن علی تحریر فرماتے ہیں:-

"الغرض شیخ تین سال تک قید میں رہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس شرط پر آپ کو رہا کیا کہ آپ لشکر شاہی کے ساتھ رہ کر گشت کریں گے۔ چنانچہ شیخ چند سال تک لشکر سلطانی

ہیں رہے۔" (تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲)

لیکن جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجددؒ صرف ایک سال قید میں رہے، پندرھویں جلوس شاہی کے حالات کے ذیل میں جہانگیر لکھتا ہے:-

"میں نے شیخ احمد سرہندی کو جو خود فروشی اور بیہودہ گوئی کے سبب کچھ عرصہ سے قید کاٹ رہا تھا طلب کیا اور حاضر ہونے پر اُسے خلعت اور ہزار روپیہ عنایت کر کے آزاد کر دیا۔ یہ بھی اختیار دے دیا کہ چاہے سرہند واپس چلا جائے چاہے میرے حضور میں رہے۔ اس نے یہ منصفانہ بات کہی کہ یہ سزا حقیقت میں ایک طرح کی ہدایت تھی جو اللہ کی طرف سے ملی اور وہ واقعی عذر سے رہنے میں بڑی ہی کمال کی دکھاتا ہے۔"

(تزک جہانگیری، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء)

جہانگیر نے شیخ مجدد کی قید کا واقعہ چودھویں سال جلوس شاہی (۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء) کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے اور پندرھویں سال جلوس شاہی (۱۰۲۹ھ / ۱۶۲۰ء) کے ذیل میں رہائی کا واقعہ لکھا ہے، اس لیے جہانگیر کے بیان کے مطابق شیخ مجدد صرف ایک سال قید رہے۔ اس لیے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، نواب صدیق حسن خاں، اور مولانا رحمان علی کا خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

سی۔ اے۔ اسٹوری نے صحیح لکھا ہے:-

"۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں جہانگیر کے حکم سے گوالیار میں قید کر دیا گیا — لیکن دوسرے ہی سال ان کو معاف کر کے ایک خلعت اور دس ہزار روپیہ عنایت کیے اور رہا کر دیا گیا۔"

(C.A. Storey: The Persian Literature, Vol I Part II London 1953, P.90)

ڈاکٹر عنایت اللہ نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شیخ مجددؒ کے حالات کے ذیل میں زمانۂ اسیری کی تحدید نہیں کی اس لیے صحیح یہی ہے کہ آپ ایک سال قید رہے۔

ابوالفیض کمال الدین محمد احسان، محمد احسان اللہ عباسی، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ جب جہانگیر نے شیخ مجددؒ کو دربار میں طلب کیا تو آپ نے یہ شرائط پیش کیں:-

(۱) سجدۂ تعظیمی موقوف کیا جائے۔ (۲) مسجدیں جو ویران ہو چکی ہیں اُن کو آباد کیا جائے۔

(۳) گاؤکشی کی ممانعت کے احکام منسوخ کیے جائیں (۴) قاضی و محتسب مقرر کیے جائیں (۵) ذمیوں سے جزیہ لیا جائے (۶) احکام شریعت کی ترویج اور بدعات کا انسداد کیا جائے۔ (۷) تمام سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا جائے۔

اور مسٹر جان نے لکھا ہے:-

"شیخ احمد تین سال تک قید خانہ میں رہے، اس کے بعد جہانگیر کو آپ کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کو رہا کیا بلکہ آپ کی صوفیانہ زندگی سے متاثر ہوا اور حقیقت میں آپ کا مرید ہو گیا۔ اور بادشاہ نے اپنے شیخ طریقت کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے اور سلطنت میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔" (John A. Subhan, Sufism its saints and shrines Lucknow 1938, P. 282)

نہ معلوم ان لوگوں کا ماخذ کیا ہے، یہ باتیں نہ تو تزک جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں اور نہ شیخ مجددؒ کے خلفاء شیخ محمد ہاشم کشمی اور شیخ بدر الدین نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ خواجہ محمد ہاشم کشمی کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رہائی کے بعد شیخ کو لشکر شاہی میں نظر بندی کی حالت میں رکھا گیا، اور اس کا نام آزادی رکھ دیا گیا، چنانچہ زبدۃ المقامات (۱۰۳۷ھ) میں تحریر فرماتے ہیں:-

"بادشاہ کی مزاحمت کی وجہ سے وہ تین سال تک لشکر کے ساتھ مختلف شہروں میں آنا جانا ہوا، اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں، وہ یہ کہ شہر والے کبھی آپ کی صحبت سے مستفیض اور نظر کرم سے بہرہ ور ہوں گے۔" (محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات طبع عربی [illegible] ص ۱۵۴)

شیخ مجددؒ (م ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) نے جو مکتوب لشکر شاہی سے فرزندان گرامی خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۸ء) اور خواجہ محمد سعید (م [illegible]) کو بھیجا تھا اس سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ لشکر شاہی میں آپ "نظر بند تھے" چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:-

"فرزندان گرامی! مطمئن رہیں، یہاں لوگ ہماری تکلیف کو خیال رکھتے ہیں، اور تنگی سے نجات کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ امدادی ... اور ناکامی میں کس بلا کا حسن و جمال ہے، اس نعمت کے برابر کوئی نعمت نہیں کہ اس شخص کو اپنے

اختیار سے بے اختیار کرکے، اپنے اختیار سے اس کو زندگی بخشیں، اور اس کے اختیاری امور کو اس بے اختیاری کے تابع کرکے اس کو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر لے آئیں اور ایسا کردیں جس طرح مردہ بدست زندہ ہوتا ہے، قید کے زمانے میں جب کبھی میں اپنی ناکامی اور بے اختیاری کا مطالعہ کرتا تھا تو بڑا لطف آتا تھا اور اس سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا، ہاں ہاں مطمئن لوگ مصیبت زدوں کے ذوق کو کیا جانیں؟ اور اس کی مصیبت میں جو حسن و جمال ہے اس کو کیا سمجھیں؟ بچوں کو مٹھائی میں مزہ آتا ہے۔ لیکن جس کو تلخی میں مٹھائی کا مزہ آتا ہو وہ تو مٹھائی کو ایک جَو کے بدلے بھی نہیں خریدے، ع

مرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

(شیخ مجددؒ: مکتوبات شریف، دفتر سوم، حصہ نہم مکتوب ۸۲ مطبوعہ امرتسر ؁۱۳۳۳ھ)

اسی طرح خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے ؁۱۰۳۲ھ کا (یعنی جس زمانہ میں شیخ مجددؒ اجمیر شریف میں لشکر شاہی کے ساتھ مقیم تھے) ایک واقعہ لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن شیخ مجددؒ، خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ (م ؁۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) کے دربار میں تشریف لے گئے اور دیر تک مراقب رہے، اس سے فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا:

"مارا فرمودند در خلاصی خود از عسکر سعی نہ کن، و برضائے او تعالیٰ واگزارید"۔

(زبدۃ المقامات، ص ۲۸۳)

مذکورہ بالا حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ مجددؒ ؁۱۰۲۸ھ سے ؁۱۰۲۹ھ تک قلعۂ گوالیار میں قید رہے، ؁۱۰۲۹ھ میں رہا ہوئے، لیکن حقیقت میں ؁۱۰۳۲ھ تک لشکر شاہی میں نظر بندوں کی طرح زندگی گذاری مگر با ایں ہمہ جہانگیر آپ کی قدر کرتا تھا اور گاہے گاہے عنایات خسروانہ سے نوازتا رہتا تھا، رہائی کے وقت ؁۱۰۲۹ھ میں تو اس نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت پیش کی تھی، پھر ؁۱۰۳۲ھ میں دو ہزار روپے عنایت کیے، اس کا ذکر سی۔ اے، اسٹوری نے بھی کیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"؁۱۰۳۲ھ میں جہانگیر کی طرف سے آپ کو ۲۰۰۰ روپے پیش کیے گئے۔"

(C. A. Storey: The Persian Literature Vol I Part II London 1953, P-988

خود جہانگیر نے بھی اپنی سال گرہ کے ذیل میں اس کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے:۔

"بدستور ہر سال خود را بہ طلاء اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم ازاں جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔"

(شیخ محمد اکرم: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء ص ۲۲۹، بحوالہ تزک جہانگیری)

رہائی کے بعد جب شیخ مجددؒ جہانگیر کی صحبت میں رہے تو آپ کو ان کی تبلیغ و ارشاد کا موقع ملا مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس حکمت و موعظت کے ساتھ آپ نے جہانگیر کو اسلام کی طرف راغب کیا اور ان اثرات کو زائل کرنے کی پوری کوشش کی جو اکبر کی ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہو گئے تھے، چنانچہ جو مکتوب آپ نے فرزندانِ گرامی خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۰ء) اور خواجہ محمد سعید (م ۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء) کے نام بھیجا تھا اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہاں کے حالات بہت اچھے اور شکر کے قابل ہیں، عجیب و غریب صحبتیں ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان ساری گفتگوؤں میں دینی امور اور اسلامی اصول کے متعلق بال برابر کسی قسم کی نرمی یا سستی کا اظہار نہیں ہوا، وہی باتیں جو خاص مجلسوں اور خلوت میں بیان کی جاتی تھیں، ان معرکوں میں بھی حق تعالیٰ کی توفیق سے بیان ہو رہی ہیں، اگر میں ایک مجلس کا بھی حال لکھوں تو اس کے لیے ایک دفتر چاہیے، خصوصاً آج کی رات جو رمضان کی ۱۷ تاریخ ہے پیغمبروں (علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات) کی بعثت، عقل کی بے مائیگی، آخرت، عذاب و ثواب پر ایمان لانے، حق تعالیٰ کے دیدار اور خاتم الرسل (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ختم نبوت، اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین کی پیروی (رضی اللہ عنہم) اور تراویح کے مسنون ہونے، تناسخ کے باطل ہونے، جن اور جنوں کے ذکر، ان کے عذاب و ثواب کے مسئلہ، اور اسی قسم کی بہت سی باتوں کا ذکر رہا (بادشاہ) نے پوری توجہ سے ان کو سنا، اسی سلسلہ میں اقطاب و ابدال و اوتاد اور ان کی خصوصیتوں کا بھی ذکر آیا۔ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ بادشاہ ایک حال پر قائم ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر (یعنی جو برہمی پر دلالت کرے) ظاہر نہیں ہوا، شاید ان واقعات اور ملاقاتوں میں حق تعالیٰ کی مصلحتیں اور اسرار پوشیدہ ہوں، شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی، ہم اس راہ کو نہیں

پا سکتے اگر حق تعالیٰ راہ نہ دکھاتے، بلاشبہ ہمارے رب کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے۔"

(مکتوبات شریف، جلد سوم، مکتوب ۴۳)

جہانگیر کے ساتھ شیخ مجددؒ کی اکثر صحبتیں رہا کرتی تھیں، ایک اور مکتوب میں اس صحبت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"فرزندان گرامی کا صحیفہ شریفہ موصول ہوا، خدا کا شکر ہے کہ صحت وعافیت ہے، آج جو نئی بات رونما ہوئی اس کو لکھتا ہوں، غور سے سنیں، آج رات جو جمعہ کی رات تھی، مجلس شاہی میں گیا تھا، ایک پہر رات گزرنے کے بعد وہاں سے واپس آیا اور حافظ سے تین پارے سنے، دو پہر رات گزرنے کے بعد سویا۔

(مکتوبات شریف، جلد سوم، مکتوب ۱۰۶، قلمی)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجددؒ مجلس شاہی میں رات گئے تک تشریف رکھا کرتے تھے، اور پہلے مکتوب سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے انہی مسائل کی طرف توجہ دی جن سے غفلت دور اکبری میں گمراہی اور تباہی کا باعث ہوئی تھی، جہانگیر پر ان صحبتوں کا کافی اثر ہوا، اس کی بھی اصلاح ہوئی اور اعیان مملکت بھی سدھرتے گئے، چنانچہ جس سال آپ رہا ہوئے ہیں اسی سال خان جہاں کے بیٹے نے شراب ترک کر دی۔ خان جہاں شیخ مجددؒ کے معتقدین میں تھا، جہانگیر نے حیرت واستعجاب کے ساتھ اس ترک مے نوشی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"انہی دنوں (۱۰۲۹ھ / ۱۶۲۰ء) خان جہاں کے بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے شراب نوشی ترک کرنے کی حیرت انگیز توفیق دی۔ وہ کثرت میخواری کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس مردافگن نشے کی کثرت نے اس کا یہ حال کر دیا تھا کہ اس کی زندگی ختم ہونے کے قریب آگئی تھی، لیکن اس نے توفیق الٰہی سے یک دم اپنے کو سنبھال لیا اور عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی نہیں پیے گا۔ اگرچہ میں نے اسے بہت نصیحت کی کہ ایکا ایکی چھوڑ دینا مناسب نہیں، طبی نقطۂ نگاہ سے رفتہ رفتہ ترک کرنا چاہیے، لیکن وہ نہ مانا اور مردانہ وار اس مرحلے سے گزر گیا۔"

(تزک جہانگیری ص ۶۳۶)

اگرچہ جہانگیر نے یہ نہیں بتایا کہ اس عالی حوصلہ فرزند نے کن اثرات کے تحت مے نوشی

ترک کی اور وہ بھی اس طرح کہ بادشاہ کی نصیحت کے باوجود شراب سے قطعاً بے تعلق ہوگیا، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ یہ انقلاب شیخ مجددؒ کی صحبت کیمیا اثر کا نتیجہ نہ سمجھا جائے، جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس زمانہ میں شیخ مجددؒ دربار میں موجود تھے۔

فتح کانگڑا کے موقع پر جو کچھ ہوا اُس سے بھی جہانگیر پر شیخ مجددؒ کے اثرات کا پتہ چلتا ہے، سب سے پہلے کانگڑا کی مہم پر شیخ فرید بخاری (م ۱۰۲۵ھ ۱۶۱۶ء) کو بھیجا گیا تھا، وہ شیخ مجددؒ کے خاص معتقدوں میں تھے۔ اور اکبر و جہانگیر کے دربار میں ان کا بڑا وقیع منصب تھا، دونوں بادشاہ دہلی میں ان کے مکان پر قیام کیا کرتے تھے، مگر یہ مہم سر نہ ہوئی کہ ان کا انتقال ہوگیا، ان کے بعد جوہرمل کو یہ خدمت سپرد ہوئی، اس نے سرکشی اختیار کی، بالآخر شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو اس مہم پر روانہ کیا گیا، اس نے ۱۶ر شوال المکرم ۱۰۲۹ھ کو قلعہ کانگڑا کا محاصرہ کیا اور یوم چہار شنبہ یکم محرم الحرام کو ۱۰۳۰ھ میں قلعہ فتح ہوگیا۔ یہ اتنا مضبوط قلعہ تھا کہ بقول جہانگیر "کوئی مسلمان بادشاہ یا حاکم اسے فتح نہیں کرسکا۔" اس لیے اس فتح پر جہانگیر فخر و مباہات کے ساتھ لکھتا ہے :-

"اس طرح سے جمعرات یکم محرم الحرام ۱۰۳۰ھ کو یہ فتح حاصل ہوئی جو کسی سطوت و شوکت رکھنے والے بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی تھی اور سبے ظاہری اسباب پر نظر رکھنے والے کم فہم لوگ بہت مشکل سمجھتے تھے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم ہے جو مجھ پر ہوا۔" (تزک جہانگیری ص ۶۵۶)

اس اقتباس کے اسلوب نگارش سے بھی جہانگیر کی اسلامی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے، فتح کے بعد نقشبندی سلسلہ کے عبدالعزیز نامی ایک شخص کو قلعہ کانگڑا کے نواحی علاقوں کا فوجدار مقرر کیا گیا، جو غالباً شیخ مجددؒ سے بیعت تھے۔

جہانگیر نے جلوس شاہی کے سولہویں سال ۱۰۳۱ھ میں قلعہ کانگڑا کا معائنہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ مجددؒ جہانگیر کے ہم رکاب رہتے تھے۔ شیخ مجددؒ کے علاوہ اور علماء و فضلاء بھی بادشاہ کے ساتھ تھے، جہانگیر قلعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"۲۴ ماہ آبان کو قلعہ کی سیر کی طرف متوجہ ہوتے وقت قاضی اور میر عدل کو جو میرے

ہمرکاب تھے، حکم دیا کہ قلعے میں داخل ہونے پر جن اسلامی اور شرعی امور کو بجالانا ضروری سمجھیں بجالائیں۔ قلعے تک پہونچنے کے لیے ایک کوس پہاڑ کی چڑھائی طے کرنے کے بعد جب اندر داخل ہوا تو توفیق ایزدی اذان دلوا کر نماز اور خطبہ پڑھوایا اور اپنے سامنے گائے ذبح کروائی، ان امور میں سے کسی ایک پر بھی آج تک اس قلعے میں عمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس توفیق ایزدی کے لیے جو کسی بھی بادشاہ کو اس سے قبل نصیب نہیں ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا بجالا کر اس قلعہ کے اندر ایک عالیشان مسجد تعمیر کیے جانے کا حکم دیا" (تزک جہانگیری، ص ۶۹۶)

بے بدل خاں نے تعمیر مسجد اور قلعہ کی فتح پر قطعات تاریخ کہے، مسجد کے رنگ بنیاد کا مادۂ تاریخ یہ ہے:-

ہاتف از غیب بگفت از پے تاریخ بناش
مسجد شاہ جہاں گیر بود نورانی

فتح کانگڑا کا مادۂ تاریخ یہ ہے:-

بہ شمشیر غزا ایں قلعہ را بکشود تاریخش
خرد گفتا کشود ایں قلعہ اقبال جہانگیری

قلعہ کی فتح میں جو تقریبات ہوئیں ان میں شیخ مجددؒ کے اثرات صاف جھلک رہے ہیں اکبر کے دور میں گائے ذبح کرنے پر سختی کے ساتھ پابندی تھی، جہانگیر نے گائے ذبح کرائی، اکبر کے عہد میں مسجدیں ویران ہو رہی تھیں، جہانگیر نے عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔

قلعہ کانگڑا کی سیر سے فارغ ہو کر جہانگیر، درگا مندر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس مندر پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے بھی جہانگیر کی اسلامی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"قلعے کی سیر سے فارغ ہو کر درگا مندر کی سیر کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بھون کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایک دنیا کو گمراہی کے بیابان میں سرپٹکتے دیکھا، ہندوؤں سے قطع نظر کیونکہ بت پرستی ان کا مذہب ہے مسلمان بھی گروہ در گروہ دور دراز کی مسافت طے کر کے یہاں آتے ہیں، اور نذرانے چڑھا کر کالے پتھر کی پرستش کرتے ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں شاید گندھک کی کان ہے

جس میں حرارت کی وجہ سے آگ کا شعلہ نکلتا رہتا ہے، جسے یہ لوگ جوالا مکھی کہتے ہیں، اور اس کو بت کے معجزات میں شمار کرتے ہیں، ہندو اس نظریہ پر فی الواقع یقین رکھتے ہوئے عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔" (تزک جہانگیری ص ۷۹۰)

ایک وہ زمانہ بھی تھا جبکہ اکبری دور میں شیخ مجددؒ بادلِ پرسوز فرما رہے تھے:۔

"کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں، چنانچہ تھانیسر میں حوض کر کھیت کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا، اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے۔" (شیخ محمد اکرم: رود کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ص ۲۶۹ بحوالہ مکتوبات شیخ مجدد الف ثانیؒ)

ان واقعات سے جہانگیر کی ذہنی تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے، غرض شیخ مجددؒ کی کیمیا اثر صحبت نے جہانگیر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اور پھر اس انقلاب نے تاریخ ہند میں دوسرا انقلاب پیدا کر دیا۔ ع

یہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل

جہانگیر اور شیخ مجددؒ کے تعلقات پر جدید سوانح نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بعض باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں، جنکی اصلاح ضروری ہے، مثلاً مولانا محمد میاں نے تحریر کیا ہے:۔

"بہر حال ان مجالس خصوصی اور توجہات کی برکت تھی کہ بادشاہ نے آپ کے دست حق پرست پر توبہ کی، اور شراب و کباب اور دوسری منہیات سے ایسی کامل بے تعلقی اختیار کی کہ باید و شاید۔" (علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ اول مطبوعہ دہلی ۱۳۸۰ھ ص ۲۸۰-۱۱۸)

تزک جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر آخر وقت تک شراب پیتا رہا، آخر زمانہ میں جب وہ کشمیر میں بستر علالت پر دراز تھا، اس کے بارہ میں مرزا ہادی بیگ لکھتا ہے:۔

"ان کی بھوک جاتی رہی اور طبیعت افیون سے بھی متنفر ہو گئی، جب کہ وہ چالیس سال سے عادی تھے، شراب انگوری کے چند پیالوں کے سوا کھانے پینے کی تمام چیزیں چھوٹ گئیں۔" (مرزا ہادی بیگ: تکملہ تزک جہانگیری (تکملہ) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۸۵۲)

اکثر سوانح نگاروں نے اسی قسم کی غلطیاں کی ہیں اور غایت خوش عقیدگی میں واقعات کو توڑ مروڑ

کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی قسم کا یہ بیان بھی ہے :-

"میں نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے نجات کی امید ہو۔ صرف میرے پاس ایک دستاویز ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کردوں گا، وہ دستاویز یہ ہے کہ مجھ سے ایک روز شیخ احمد سرہندی نے فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص ۱۸۱)

مگر خواجہ محمد ہاشم کشمی اور شیخ بدرالدین نے اس کا مطلق ذکر نہیں کیا ہو، معلوم نہیں فاضل مصنف کا ماخذ کیا ہے، اسی طرح صاحب روضۃ القیومیہ نے بھی بہت سی بے سر و پا باتوں کا ذکر کیا ہے، موجودہ تذکرہ نگاروں نے زیادہ تر انہی سے اخذ کیا ہے۔

شیخ مجددؒ اس منزل پر تھے جہاں داد و تحسین کی ضرورت ہی نہیں، وہ ذات وحدہٗ لاشریک کے علاوہ سارے عالم سے بے نیاز تھے، تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مجددؒ کی جیسی جلیل القدر ہستیوں کی عظمت کے لیے کسی بادشاہ کے وسیلہ کی ضرورت نہیں، بلکہ بادشاہوں اور دنیاوی طاقتوں نے تو ان کو گرانے کی کوشش کی ہے، ان کی عظمت کا راز ان کے کارنامے ہیں، ان کی تکمیل سنت یوسفی اور سنت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ ہوتی ہے، اور عظمتوں کا اظہار تو گرنے کے بعد ہی ہوتا ہے، یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنی مرضیات کو محبوب کی مرضیات میں گم کر دیا تھا، اس لیے درحقیقت اللہ تعالیٰ ان کا درجہ بلند کرتا ہے،

یہ عشق و محبت کے اس مقام پر سرفراز ہیں، جہاں محبوب کی جفائیں بھی وفا اور اس کی آزمائش بھی انعام نظر آتی ہیں، اور اس کی ایذاؤں میں لذت ملتی ہے، اور انہی کے لیے یہ نوید آسمانی ہے:-

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔

اور تاریخ ہند شاہد ہے کہ کچھ ہی عرصہ بعد حضرت مجددؒ ہدایت کی مسند عالی پر بیٹھ کر اعلان کر رہے تھے کہ

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

زیارت حرمین

نقوش و تاثرات

از مولینا نسیم احمد فریدی امروہی

آخری قسط

مسجد صولتیہ میں تبلیغی اجتماعات حج سے فارغ ہو کر تبلیغی کام کرنے والوں کے غیر معمولی اجتماع مکہ معظمہ میں ہوتے رہے۔

مسجد صولتیہ میں ایک بڑا عمومی اجتماع ہوا اس کے چند روز بعد ایک خصوصی اجتماع ہوا ان دونوں اجتماعوں میں شرکت ہوئی۔ خصوصی اجتماع میں ہندوستان و پاکستان، مصر و شام، حلب و سوڈان نیز حجاز کے علماء اور خواص شریک ہوئے۔ حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب بھوپالی مدظلہ سے بھی ایک اجتماع میں ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالجبار صاحب سے بھی (جو پاکستان ریڈیو پر تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے ہیں) ایک اجتماع میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ حج سے پہلے بھی ایک عظیم اجتماع سید مرزوقی صاحب معلم کے مکان پر ہوا تھا۔ اس میں بہت سے مصر کے علماء تشریف لائے اور شریک ہوئے۔ مرزوقی صاحب حکومت سعودیہ کی طرف سے کاتب عدل (رجسٹرار) ہیں۔ تبلیغی کام سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی موثر تبلیغی گشتوں کے لئے وقف ہے۔ ان کے

نوجوان صاحبزادے کو بھی تبلیغی کام سے بہت شغف ہے۔ دفتر صولتیہ میں تبلیغی کاموں کی شرکت کے لئے برابر آمد و رفت رکھتے ہیں۔

مولانا یحییٰ امان حنفی بعد ایام حج تبلیغی رفقاء شہر کے علماء و فضلاء سے خصوصی ملاقاتیں کرنے کے لئے روزانہ بعد عصر جاتے تھے، میں کہیں نہ جا سکا البتہ مولانا یحییٰ امان حنفی کو مدرسہ صولتیہ میں خصوصی دعوت پر ایک مختصر سے اجتماع میں ایک دن مدعو کیا تھا وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ حنفی مسلک کے بلند پایہ صاحب تصنیف عالم ہیں ان سے مل کر اور ان کی بلند معیار علمی گفتگو سن کر طبیعت کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔

مزار حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دو مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے مزار پرانوار کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مقام فخ میں آپ کا مزار ہے اس کے قریب ہی شہداء کی مسجد ہے جو تبلیغی کام کرنے والوں کا مرکز ہے۔

شہداء میں ہفتہ واری اجتماع شہداء کی مسجد میں جو غالباً وادیٔ فخ ہی میں ہے ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب ہفتہ واری اجتماع بڑا روح پرور اور قابل دید ہوتا ہے رات کو بھی وہیں قیام ہوتا ہے دوسرے دن بعد نماز اشراق واپسی ہوتی ہے۔ مولینا عبید اللہ صاحب، مولانا سعید خان صاحب، حاجی غلام رسول مالیگانوی، حاجی فضل عظیم مرادآبادی اور مکہ معظمہ کے ایک بہترین مقرر و عالم شیخ سعید تبا اس مجمع کی خاص طور پر نگرانی رکھتے تھے، ایک طرف عرب کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور انگریزی خواں طبقے کا اجتماع ہوتا تھا اس کی تنظیم مولانا افتخار فریدی ہندوستان کے انگریزی خواں حضرات کے ذریعے کرتے تھے، دراصل انگریزی خواں مبلغین کے ذریعہ بھی بڑا کام انجام پاتا ہے۔

عرب میں کام کی ضرورت عرب جدید تقاضوں خصوصاً افراط زر کے باعث مادیت کی تعلیم کی طرف مائل ہے ابھی وہ اس ... میں نو گرفتار ہے اس کی مضرتوں کو اسے اندازہ نہیں ہے۔ مگر مادی ترقی کی اس

دوڑ میں جدید تعلیم پانا بھی لابد ہے۔ عقاید کے لحاظ سے عرب کا بچہ بچہ توحید پرست اور موحد ہے۔ وہ پابندی سنت کا بھی عمل کے لحاظ سے اگرچہ کم لیکن زبان و قلم سے بہت زیادہ خیال کرتے ہیں۔ شرک و بدعت اور کمیونزم کا اندیشہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے البتہ نصاریٰ و یہود کی سیاسی ریشہ دوانیاں، چالاکیاں اور در پردہ ملت اسلامیہ کے خلاف سازشیں عالم اسلامی میں بالعموم اور حجاز میں بالخصوص نہایت ہوشیاری کے ساتھ تعلیم و تمدن کے راستے سے بالواسطہ ہو رہی ہیں۔ تہذیب مصر کی آمیزش سے بعض عرب لڑکیوں میں پھلتے پھولتے جو مغربیت کی جھلک نظر آئی اس سے دل کو جو صدمہ پہنچا اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔

سعودی حکومت کے تمام محکمے دیانت دار ہیں۔ خوب کام کرنے والے اور فرائض منصبی کو انجام دینے والے ہیں مگر معلوم نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا محکمہ تہذیب اسلامی اور معاشرت ملی کے بارے میں اپنی بیدار مغزی اور احساس دینی کا کما حقہ عملی ثبوت کیوں نہیں دے رہا ہے۔ میں اپنی دعاؤں میں حجاز کے باشندوں کو خاص طور پر یاد رکھتا تھا اور ان کے دینی و ملی احساس کیلئے دعا کرتا تھا۔ یہ جگہ تمام مسلمانان عالم کے لئے نمونہ ہے اور ان کا مقام ایک معلم و استاذ کا مقام ہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کا کوئی گوشہ اسلامی رنگ سے اگر خالی ہو گا تو اس کا تمام عالم کے مسلمانوں پر اثر پڑے گا۔ خصوصاً عرب نوجوان بچے جو اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اب آگے چل کر یورپ اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم پانے کیلئے بھی جائیں [illegible] کے مقام [illegible] جب [illegible] نوجوان [illegible] یورپ [illegible] توحید کا [illegible] سے متاثر ہو کر دوسروں کو متاثر کرے گا۔ میں نے دیکھا کہ یہ عرب [illegible] انگریزی خواں طبقے کی بات زیادہ غور سے سنتے تھے اور چونکہ خود بھی انگریزی زبان کے میدان میں گھٹنوں چل رہے ہیں اس لئے مشتاق انگریزی خواں مذہبی اشخاص سے متاثر ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں کتنے بڑے ثواب کا کام ہے کہ انگریزی کی اچھی مشق رکھنے والے ان نوجوانوں میں دینی شعور و احساس پیدا کرانے کی کوشش کریں اور ان کو ملت بیضا کے فروغ کے لئے آمادہ کریں۔ بحمد اللہ اس سال یہ کام بہت سلیقے سے ہوا مگر ضرورت ہے کہ زیادہ

سے زیادہ علوم جدیدہ وقدیمہ کے جامع، اچھی انگریزی بولنے والے اور دینی تڑپ رکھنے والے حضرات وہاں کچھ عرصے رہ کر کام کریں

حکیم عین الحسن کاندھلوی مرحوم

ذی الحجہ کی ۲۸ تاریخ کو اتوار کے دن حکیم عین الحسن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم صاحب کاندھلے کے مشہور و معروف مذہبی احساس والے خاندان کے ایک فرد اور حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مدظلہ کے برادر زادہ تھے۔ بڑے خوش طبع، ہنس مکھ اور متواضع انسان تھے۔ بڑے خوش قسمت تھے کہ لاکھوں فرزندان توحید نے ان کی نماز جنازہ مسجد الحرام میں پڑھی اور جنت المعلیٰ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہؒ کے قریب دفن ہوئے۔

شیخ عبدالوہاب دہلوی

مولانا ابرار حسین فاروقی گوپاموی نے علی گڑھ میں شیخ عبدالوہاب کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیا تھا اس کو دینے کیلئے ان کے مکان پر بعد حج گیا۔ ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور بیمار بھی رہتے ہیں، مسلک کے لحاظ سے وہ اہل حدیث ہیں مگر بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر بزرگ ہیں۔ علمی ذوق وشوق ان کی رگ رگ میں پیوستہ ہے، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ ہے، جس کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ سے اپنی ملاقاتوں کا بڑا تفصیلی ذکر فرمایا۔ یہ بھی ذکر کیا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسارت مالٹا سے کچھ پہلے مکہ معظمہ میں جب بخاری کی ثلاثیات کا درس دیا تو میں بھی اس درس میں شریک تھا اور تقریر بخاری کو میں نے قلمبند کر لیا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے اس کے دیکھنے کا بھی اتفاق نہ ہو سکا۔

شیخ اسمٰعیل دہلوی سے بھی وہیں ایک دن ملاقات ہو گئی وہ بھی بڑی مہربانی اور تواضع سے پیش آئے ایک دن ناشتہ بھی ان کے مکان پر کیا۔

چند کتابیں

یہاں میں ان میں سے بعض کتابوں کا ذکر بھی کر دوں گا جو مجھے ہدیۃً یا قیمتاً مکہ معظمہ میں حاصل ہوئیں۔

دروس من ماضی التعلیم وحاضرہ بالمسجد الحرام یہ کتاب استاذ عمر عبد الجبار کی تالیف ہے ۱۳۷۹ھ میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں تیس چالیس سال پیشتر تک کے مدرسین مسجد الحرام کے تعلیمی و تدریسی حالات ہیں بڑی دلچسپ اور اہم کتاب ہے شیخ محمد سلیم مدظلہٗ مدیر مدرسہ صولتیہ نے اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے ہدیۃً مرحمت فرمایا اسمیں حضرت مولانا رحمت اللہ کرانویؒ کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہے اور مدرسین حرم میں سے جن حضرات نے مدرسہ صولتیہ میں تعلیم پائی ہے یا حضرت مولانا کیرانویؒ سے تعلیمی فیض اٹھایا ہے ان کا بھی جگہ جگہ کثرت سے ذکر ہے۔

ایک مقام پر اس کتاب میں مدرسہ صولتیہ کے متعلق لکھا ہے:۔

"مدرسہ صولتیہ کے فارغ التحصیل علما کی سب سے پہلی جماعت جب نکلی تو مسجد حرام میں حلقہ ہائے درس کی کثرت ہوگئی، ان فیض یافتگان صولتیہ نے ہر حصورہ اور ہر رواق میں اپنے تدریسی حلقے قائم کر لئے، اور دیگر علما مسجد الحرام کے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کیلئے کوئی جگہ باقی نہیں چھوڑی" (صلا)

قرۃ العین بفتاویٰ علماء الحرمین اس ضخیم کتاب میں شیخ عبد الحفیظ بن درویش العجمی حنفی مفتی مکہ (متوفی ۱۲۴۶ھ) اور شیخ محمد طاہر سنبل المکی (م ۱۲۱۸ھ) کے فتاویٰ درج ہیں۔ شیخ عبد اللہ زمزمی نے اپنی ایک مجلس میں اس کتاب کی بڑی تعریف فرمائی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ جب یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی ہے تو ارباب علم کے لئے عید ہوگئی تھی۔ مجھے اس کتاب کا اشتیاق پیدا ہوا اور تلاش کرکے باب العمرہ کے قریب ایک تاجر کتب سے آٹھ ریال میں خریدی۔

القریٰ لقاصد اُم القریٰ یہ کتاب حافظ ابو العباس احمد الطبری ثم المکی (م ۶۹۴ھ) کی تالیف ہے۔ شیخ عبد الشکور فدا کی دوکان سے اس کو دس ریال میں خریدا۔ جہاز میں اس کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مناسک حج میں بہترین کتاب ہے۔ جگہ جگہ تاریخی اور لغوی تحقیقات بھی ضمناً آگئی ہیں۔ اس کتاب کا تعارف بھی سب سے پہلے شیخ زمزمی نے بڑے اونچے الفاظ میں کرایا تھا۔

الدین والحج | الحاج عباس کرارہ نے اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ہر ہر رکن پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اسی سلسلے کی یہ کتاب بھی ایک مختصر اور جامع کتاب ہے،

جن کو اللہ تعالیٰ نے وسعت دی تھی اور علم کا ذوق بھی رکھتے تھے ان کو مکہ و مدینہ میں کثرت سے کتابیں خریدتے ہوئے دیکھا۔ مصر و شام کی مطبوعہ نادر و کمیاب بہترین اور بلند معیا کتابیں ہر علم و فن کی یہاں ملتی ہیں۔

توسیع حرمین اور حجاز کی تعمیری ترقیات | جلالۃ الملک شاہ سعود کے عہد میں تعمیرات کا کام بلند پیمانے پر ہوا ہے، اور اب بھی برابر ہو رہا ہے، مسجد نبوی کی توسیع کا کام تو بوجہ احسن پورا ہو گیا اب مسجد الحرام کی توسیع ہو رہی ہے اس میں اربوں روپیہ لگے گا۔ اور حاجیوں کے لئے بہت آرام ہو جائے گا۔ دراصل حرمین میں ذوق تعمیر کا یہ مظاہرہ شاہ کے خلوص اور تعلق حرمین کی زندہ و پائندہ دلیل ہے۔ کاش اس کے ساتھ ساتھ روحانی ترقیات کے ذرائع بھی قرون سابقہ کی طرح حکومت وقت کے پیش نظر رہیں۔ حرم کے قریب بازاروں، مکانوں اور ہوٹلوں میں جو دن رات ریڈیو کے گانے سنائی دیتے ہیں اس سے قلب کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ تصویر کشی کا عام رواج ہو چلا ہے، پوری داڑھی کے مسئلے کو چھیڑنا وہاں کے اچھے خاصے دینداروں کو دعوت غصہ دینا ہے۔

جلالۃ الملک مسجد الحرام میں | میرے سامنے دو مرتبہ شاہ سعود مسجد الحرام حاضر ہوئے ایک مرتبہ مغرب کی نماز خود سعود ذیبن نے پڑھائی۔ پہلی مرتبہ قبل ایام حج آئے تھے اس وقت بڑا ہجوم تھا شاہ کو اس ہجوم میں نہ دیکھ سکا دوسری مرتبہ بعد حج آئے اس وقت دور سے شاہ کو دیکھ سکا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ سب سے طویل القامت جو انسان ہے وہ شاہ ہے۔ باب ابراہیم سے نہایت تواضع اور انکساری کے ساتھ اپنی لانبی گردن کو جھکائے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور طواف خانۂ کعبہ عام حاجیوں کے ساتھ کیا۔ شاہ کا انتظام حکومت بہت اچھا ہے ان کی رعایا پروری، عدل گستری کے بہت سے واقعات سنے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بعافیت رکھے اور ان کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو زیادہ سے زیادہ فروغ عطا فرمائے۔

مادے کی چہل پہل | ہر ملک سے ہر قسم کی اشیاء یہاں کے بازاروں میں آتی ہیں چونکہ

یہاں باہر سے آئی ہوئی اشیاء پر کسٹم نہیں اس لئے چیز قدرے سستی ملتی ہے۔ موٹروں، بسوں کی کثرت ہے۔ اعلیٰ درجے کے موٹر قطار در قطار دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک دن سوچتا تھا کہ یہ لوہے اور معدنی دھات سے مرکب بے روح ڈھانچے اور سانچے جن کو تیار کہا جارہا ہے، امریکہ وغیرہ کے کارخانوں سے بن بن کر یہاں آتے ہیں اور ان کے جسم کو یہاں کی زمین سے روح (پٹرول) ملتی ہے تب یہ کارآمد ہوتے ہیں کاش یہاں آنے والے انسان بھی اپنے لئے یہاں سے روح اسلامی کو طلب کریں۔ یہاں کی فضاؤں، یہاں کے آثار اور مقدس مقامات کی برکات کو سچے دل سے اخذ کرکے اپنے جمود کو حرکت سے اور غفلت کو دینی شعور سے تبدیل کر دیں۔

تنعیم و جعرانہ | بعد حج اپنے گزرے ہوئے رشتے داروں اور بعض احباب کے رشتہ داروں کی طرف سے چار عمرے کئے جن میں سے تین کا احرام تنعیم سے اور ایک عمرے کا جعرانہ سے باندھا۔ جعرانہ پہنچ کر طبیعت کو بڑی فرحت حاصل ہوئی وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا وہاں فضاؤں میں بڑی دل آویزی تھی۔

خانہ کعبہ کا دیدار | مجھ سے کثرت ہجوم کے باعث نفلی طواف تو بہت کم ہوئے زیادہ تر اس کے دیدار سے اپنی نگاہوں کو سیراب کرتا رہا۔ خانہ کعبہ میں عجب دلکشی محسوس ہوتی تھی، اگر پہلے سے قلب کو اس سے پوری پوری مناسبت ہوتی تو اس کے فیوض باسانی اخذ کئے جا سکتے تھے۔ مگر اخذ فیوض کا مجھے کیا حوصلہ ہوتا جب کہ میں نے اس کے ظاہر حقوق کو بھی کما حقہ ادا نہیں کیا۔ مجھ بے عمل کے لئے یہی احسان خداوندی کیا کم ہے کہ اپنے جیتے جی اس مقدس مکان کا دیدار کرلیا یہ گھر ایک جلیل القدر نبیؑ نے تعمیر کیا تھا۔ یہ مرکز اسلام ہے یہیں سے ہدایت وارشاد کے چشمے جاری ہوئے ہیں ؎

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیلؑ ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا — کہ اس گھر سے ابلے گا چشمہ ہدیٰ کا

خانہ کعبہ کو دیکھتے دیکھتے کبھی یہ شعر بھی میری زبان پر آجاتا تھا۔

اس پردے میں پوشیدہ لیلائے دو عالم ہے — بے وجہ نہیں ہمدم کعبے کی سیہ پوشی

کبھی کبھی یہ تصور غالب آ جاتا تھا کہ اس گھر کا طواف انبیاءؑ نے خصوصاً سرور انبیاء علیہم الصلوات والسلام نے کیا ہے، صحابہ کرامؓ نے جو سرفروشان اسلام اور مجاہدین ملت تھے اس گھر کے چکر لگائے ہیں۔ بڑے بڑے اولیاءؒ اور اکابر امت اس کے گرد پروانہ وار گھومے ہیں، یہ عشاق کے جذبۂ عشق کو فروغ دینے کا ایک مجسم ذریعہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھ گنہگار کو بھی اس کی زیارت نصیب ہوگئی اور جس مطاف میں مقدس ترین حضرات اور عشاق کے قدم پڑے ہیں وہاں تک مجھے بھی باریاب ہونے کا موقع مل گیا کعبۃ اللہ کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات دلنشیں ہوتے تھے۔ انھوں نے ہی تو اس گھر کی طرف رہنمائی کی ہے انھیں کے صدقے میں توجہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعض اوقات مولانا جامیؒ کا یہ نعتیہ شعر میری زبان پر جاری رہتا تھا ؎

بہ کعبہ رفتم ازانجا ہوائے کوئے تو کردم جمالِ کعبہ تماشا بیاد روئے تو کردم

ذرا سالِ رفتہ کو آواز دینا اب حج کے ایام جتنے قریب آرہے ہیں مجھے سالِ رفتہ یاد آرہا ہے اللہ اللہ یہ میری عمر کا کتنا زریں کتنا عنبریں اور بہار آگیں سال تھا۔ اب حرمین کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ مکہ معظمہ، مسجد الحرام، خانۂ کعبہ یاد آرہے ہیں، دفتر صولتیہ میں روزانہ تبلیغی مجلسوں کا منعقد ہونا، حرم کے تعلیمی حلقے، نئے پرانے تبلیغی کارکنوں کی گشتیں، تقریریں بالخصوص مولانا عبید اللہ اور مولانا سعید خاں کی فصیح و بلیغ عربی تقریریں یاد آرہی ہیں۔ عالم اسلامی کا نمائندہ مجمع صحن حرم اور مسجد الحرام کے دروازوں پر آنے جانے والوں کا وہ کثیر ازدحام کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا شب و روز طواف کعبہ کا دل افروز منظر، آب زمزم کی افراط، مقام ابراہیم، ملتزم، سنگ اسود، اور حطیم میں عاشقوں کا ہجوم، شیخ زمزمی کی محفل، شیخ محمد سلیم کی محبت آمیز باتیں، حرم کے حلقہ ہائے درس خدام مسجد الحرام حتیٰ کہ کبوتران حرم جو مڑ مڑ کے خاص انداز سے دیکھتے تھے کبھی فضائے حرم میں پرواز کرتے تھے اور کبھی صحن حرم میں ٹہلتے تھے اور کبھی بام و در مسجد پر گونجتے تھے، یاد آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر اس مقدس مکان کو دکھائے اور پھر قلب و روح کی تسکین کا سامان مہیا فرمائے، (آمین)

مکہ معظمہ سے واپسی شیخ زمزمی، حکیم محمد یامین اور حضرات مبلغین سے رخصت ہوکر اور باب ابراہیم میں کھڑے ہوکر خانہ کعبہ کا نظارہ کرکے بادلِ پرحسرت و یاس ۷ر جون کو مکہ معظمہ سے جدہ روانہ ہوئے۔ وہاں مدینۃ الحجاج میں قیام ہوا۔ مظفری جہاز سے جانا ہے جو ۲۰ر جون کو جائے گا۔ مولٰنا سعید خاں صاحب مع رفقا مصری جماعت کو روانہ کرنے کیلئے جدہ آئے ہوئے تھے۔ ہماری روانگی سے غالباً ایک دن پیشتر مسافر خانے کی مسجد میں مظفری جہاز پر تبلیغی کام کا نظام قائم کرنے کیلئے انھوں نے ایک مشاورتی اجتماع کیا۔ مولٰنا نے اس جہاز کے لئے امیر جماعت مجھے تجویز کیا۔ ہرچند میں نے اس ذمہ داری سے سبکدوش رہنا چاہا مگر انھوں نے حکماً میرے سپرد یہ کام کیا اور میری معذوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سی سہولتیں بھی مجھے دیدیں۔ مولٰنا سعید خانصاحب نے جدے کی مسجد میں حضرت مولٰنا نعمانی مدظلہٗ کو سلام پہنچانے کیلئے فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپ میرا ذکر اپنی کسی تحریر میں شائع نہ کریں۔ ان کے حکم کے برخلاف عمومی فائدے کی غرض سے میں نے انکا اس روداد سفر میں کہیں کہیں تذکرہ کردیا ہے، ان کے کارناموں اور ان کی اور ان کے رفقا کی دن رات کی تبلیغی جد و جہد کو تو میں نے تفصیل سے بیان ہی نہیں کیا۔ دراصل حجاز میں تبلیغی کام کو فروغ دینا تمام دنیا میں اس کو جاری کرنے کے مرادف ہے مگر یہ کام اس علاقے میں خصوصاً حج کے مہینوں میں بہت ہی جد و جہد کو چاہتا ہے، اس کام کو چلانے کیلئے للہیت و تقویٰ کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر کامل عبور رکھنا، قبائل و طبقات اور مختلف ممالک کے باشندوں کی طبائع سے واقفیت اور اچھے طریقے سے اس مقصد عظیم کو پیش کرنے کی صلاحیت بہت ہی ضروری ہے اور بحمداللہ یہ سب خوبیاں حجاز میں کام کرنے والے حضرات کے اندر موجود ہیں۔ زبان پر بھی کافی عبور ہے۔ خود مسلک امام ابوحنیفہؒ پر قائم رہتے ہوئے دیگر ائمہ کے مقلدین کو فروعی مسائل میں کبھی نہیں الجھتے، ہر مسلک کا اہل سنت و جماعت ان کے قریب آتا ہے تو ان سے مانوس ہوکر کام کی اہمیت محسوس کرتا ہے نجدی علماء بھی جماعت کے پرانے کارکنوں کا اعزاز و اکرام کرتے ہیں۔

۲۰ر جون کو مظفری جہاز جدے کے ساحل سے روانہ ہوا۔ جہاز کے بالائی حصے میں،

(۹) نماز باجماعت پڑھنے کا انتظام کیا گیا نیچے کے حصوں میں سامان کی کثرت کی وجہ سے نماز کے لئے
چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا اہتمام نہ ہو سکا تبلیغی رفقاء بالخصوص سید نورالدین صاحب بی۔اے
تمام جہاز میں گشت کرتے تھے اور بہت سے غفلت آب حاجیوں کو نماز باجماعت پڑھنے کی
ترغیب دیتے تھے۔ برسات کی وجہ سے امواج سمندر میں سخت تلاطم تھا جہاز ہچکولے کھاتا
ہوا چل رہا تھا مگر الحمدللہ نماز باجماعت پانچوں وقت صحیح اوقات میں ہوتی رہی۔ حاجی
عبدالقدیر صاحب چاندپوری، حاجی محمد احسان امروہوی اور حاجی ارشاد احمد امروہوی
تینوں نوجوان، اذان، اقامت، درستگی صفوف اور تشکیل جماعت کو بڑی خوش اسلوبی
سے انجام دیتے رہے، حاجی علاءالدین صاحب بہاری اور دیگر رفقاء نے بھی تبلیغی کاموں
میں بہت حصہ لیا۔ شروع میں قاری جلال الدین صاحب بہاری امام رہے لیکن سخت تلاطم
کی وجہ سے وہ اپنی قیام گاہ سے اوپر تک نہ آسکتے تھے ان کی طبیعت بھی ناساز ہو گئی تھی
اس لئے مولانا محمد ابراہیم صاحب مدراسی نے پوری مدت سفر جہاز میں امامت کے فرائض
انجام دیئے۔ مولانا مدراسی نے پانچوں وقت کی نماز سخت سے سخت ہچکولوں میں بھی کسی نہ
کسی طرح بڑی چھوٹی سورتوں سے کھڑے ہو کر پڑھائی۔ ان کی وجہ سے تمام مقتدیوں
کو ہمت ہوتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھتے ... بعد ظہر سفر بھر
تک کسی نہ کسی عالم کا وعظ بھی جماعت کی طرف سے ہوتا رہا ایک دن مولانا حکیم محمد حسن
صاحب نے بھی ایک تقریر فرمائی یہ تقریر بے ثباتی دنیا اور توجہ آخرت کی بابت تھی یہ بھی
دل سے نکلی ہوئی آواز دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مجمع اس تقریر سے بہت متاثر ہوا۔ مولانا
مظاہری نے بھی تقریر فرمائی جس سے حاضرین کو بہت فائدہ ہوا۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب
مدراسی بھی اپنے مواعظ حسنہ سے نوازتے رہے، پرگنہ سنتھال (بہار) کے دو عالم بھی اس
جہاز سے سفر کر رہے تھے جن میں سے ایک کا اسم مبارک مولانا علیم اللہ یاد رہ گیا ہے ان
دونوں بزرگوں نے بھی تقاریر فرمائیں۔ مدراس کے ایک بزرگ جو غالباً قریشی صاحب کہلاتے
تھے ان کی تقریر بھی ہوئی۔ آخری دن میں نے بھی کچھ عرض کیا۔ احباب کے اصرار سے ایک
دن دفتر امیر الحجاج میں جاکر لاؤڈ اسپیکر پر بھی تقریر کی۔ مگر تجربے نے یہ بتایا کہ جہاز میں

لاؤڈ اسپیکر کی تقریر کا اثر نہیں ہوتا۔ مجمع سامنے ہوتا نہیں۔ لوگ بے توجہی سے سنتے ہیں۔ بہت سے بالکل سنتے ہی نہیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ گشت کر کے حاجیوں کو کسی نماز میں جمع کیا جائے اور اس کے بعد دینی باتیں پیش کی جائیں۔ اس جہاز میں رامپور کے ایک بزرگ بھی جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد ہیں اور مولانا ارشاد حسینؒ رامپوری کے نواسے ہیں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ تبلیغی کام سے بہت متاثر ہیں اور مکہ معظمہ کو جاتے وقت ایک جہاز میں انھوں نے تبلیغی کام کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر ایک تقریر بھی فرمائی تھی۔ چند رفقاء ان سے ملنے کیلئے گئے بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اور تواضع سے پیش آئے اور تقریر کی درخواست پر اپنی ناسازیٔ مزاج کا عذر فرمایا۔ تمام رفقاء نے عموماً اور سید نورالدین صاحب نے خصوصاً آٹھ دن بڑی جدوجہد سے کام کیا اور میرا کام صرف اتنا تھا کہ نماز کے علاوہ اوقات میں آرام سے بالائی حصے میں بیٹھا ہوا اس سلسلے میں کوئی مشورہ دیدیتا تھا۔ سید نورالدین صاحب نے شاید جہاز ہی میں مدینہ منورہ میں اپنے قیام کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبدالغفور صاحب مجددی مدظلہٗ کی مجلسوں میں شرکت کا بھی ذکر کیا اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ میں قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

۲۸؍جون کو تقریباً ۹ بجے جہاز بمبئی پہنچا اس وقت سے ۳ ½ بجے تک کسٹم خانے میں کھڑا رہنا پڑا۔ پورے سفر میں کسٹم خانے کی یہ مشقت ناقابلِ برداشت تھی آخری وقت میں مشکل تمام ظہر کی نماز مسافر خانے میں جاکر پڑھی اور بعض اشخاص جن کے پاس ریڈیو تھے وہ تو عشاء کے وقت مسافر خانے میں پہنچ سکے۔ مسافر خانے میں حاجی عبدالواحد خان صاحب اور دوسرے ملاقات کیلئے آگئے تھے بعد مغرب دفتر البلاغ میں پہنچ کر قاضی اطہر صاحب اور منیری صاحب سے ملاقات کی، منصوری صاحب اور بھائی محمد یعقوب صاحب بھی آکر ملے۔ مجھے آتے جاتے جہاز میں چکر بالکل نہیں آیا مگر جہاز سے اترتے ہی چکر نے استقبال کیا۔ عشاء کی نماز کے وقت مسافر خانے کی مسجد جھنڈولے کی طرح جھولتی ہوئی محسوس ہوئی خیال تھا کہ دو ایک دن بمبئی میں آرام کر کے ریل کا سفر کریں گے مگر ساتھیوں کے اصرا

سے ۲۹ جون کی صبح کو روانگی ہوگئی پہلوان محمد صاحب امروہوی نے ہمارے قافلے کی سیٹیں بہت جلد ریزرو کرادیں حکیم صاحب کے قافلے کیلئے منصوری صاحب نے جہاز آنے سے پہلے ہی سیٹوں کا انتظام کردیا تھا حکیم صاحب ہم سے بعد کو سنبھل کیلئے روانہ ہوئے۔ ۳۰ جون بروز جمعہ ہمارا قافلہ دہلی پہنچا۔ چند رفقاء کے علاوہ باقی سب رات کی گاڑی سے امروہہ پہنچے میں باقی ماندہ رفیقوں کے ساتھ یکم جولائی کی صبح کو چل کر ۹ ½ بجے امروہہ پہنچا۔ اسٹیشن پر تمام ارباب مدرسہ و طلباء مدرسہ، رفقاء تبلیغ، احباب و اعزاء اور معززین شہر ملاقات کیلئے آئے تھے سب کیلئے دعا کی بفضلہ تعالیٰ سب عزیزوں کو بخیر و عافیت پایا۔

اب میں ہوں اور حرمین شریفین کی یاد ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر حج و زیارت کا موقع اپنے فضل و کرم سے عنایت فرمائے (آمین)

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھا رہوں تصور جاناں کئے ہوئے

حج کے سلسلہ کی چند ضروری باتیں

اب میں اپنے ناقص تجربے کی رو سے اور اپنے پیشرو اہل علم حضرات کے بعض تجربوں کو پیش نظر رکھ کر چند ضروری باتیں مختصر طریقے سے حجاج کی خدمت میں پیش کرکے اپنے ان ناتمام نقوش و تاثرات کو ختم کرتا ہوں:۔

(۱) حج سے پہلے عازمین حج کو اپنی نیت اور اپنا نصب العین صحیح کرلینا بہت ضروری ہے، حج کا مقصد کیا ہے اور علاوہ ادائیگی فریضہ، حج سے کیا کیا فوائد روحانی و اجتماعی حاصل کئے جا سکتے ہیں، اس کو خوب ملحوظ رکھنا چاہئے۔

(۲) حج کو جانے سے پہلے کم از کم ایک کتاب مناسک حج سے متعلق اتنے غور و خوض اور توجہ کے ساتھ دیکھنا چاہئے جس طرح کسی امتحان کا امیدوار امتحانی کتابوں کو اچھے نمبر لانے کیلئے غور و خوض سے دیکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں "زبدۃ المناسک" مولفہ حضرت محدث گنگوہی قدس سرہٗ بہت ہی جامع مختصر اور مفید کتاب ہے اس کی شرح مولانا شیر محمد صاحب سندھی نے (جن سے مدینہ منورہ میں میری سرسری ملاقات ہوئی ہے)

عمدۃ المناسک لکھی ہے مگر اس کی زبان سلیس نہیں ہے جگہ جگہ عبارت میں اغلاق اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اور بعض مسائل میں اختلافی بحث کرکے پڑھنے والے کو ذہنی انتشار کا موقع دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ زبدۃ المناسک کی شرح آسان زبان اور سلجھے ہوئے انداز میں ہو اور اس میں حتی الامکان ایسے مسائل سے گریز کیا جائے جو الجھاؤ میں ڈال دیتے ہیں۔ اختلاف ائمہ کی صورت میں عموماً حنفی کا ہی تو لحاظ رکھا جا سکتا ہے اور کسی دوسرے امام کی ضرورت شدید کے وقت پیروی کی جاسکتی ہے۔

علاوہ مناسک حج کے ایک دو سفرنامے بھی قدیم و جدید طرز کے دیکھ لیے جائیں ان سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ ایسی کتابیں بھی دیکھ لی جائیں جن کو پڑھ کر ذوقِ عشق میں ترقی ہو یہ سفر مقدس شوق و وارفتگی کا طالب ہے۔ جس قدر ذوق و شوق ہوگا اسی قدر کامیابی ہوگی فضائل حج مولفہ حضرت شیخ الحدیث مظاہر العلوم مدظلہ کا مطالعہ اس مقصد کے لیے بہت مفید ہوگا۔

(۳) اس سفر میں یہ تہیہ کر لیا جائے کہ ہم کسی ساتھی یا کسی ہم سفر سے لڑائی نہ کریں گے، تلخ کلامی نہ کریں گے خوش خلقی سے پیش آئیں گے، ایثار و تواضع کا مظاہرہ کریں گے۔

مزاج میں تیزی اور کج خلقی بہت سے لوگوں میں درازیٔ سفر کے باعث اور مالوفات سے دوری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعدِ وطن بیوی بچوں کی جدائی، پان حقہ، سگریٹ اور چائے کی طلب اور بروقت حسب دلخواہ ان چیزوں کا نہ ملنا غصّے کا سبب بنتا ہے۔ حج سے پہلے ان تمام چیزوں سے تعلق کم کرنے یا کبھی کبھی ان کو ترک کر دینے کی مشق ہو جانی چاہیے۔ اور بہتر یہ ہوگا کہ حج سے پہلے کم از کم چالیس دن کسی جماعت کے ساتھ تبلیغی گشت کر لی جائے اتنے عرصہ میں اعتماد علی اللہ صبر و قناعت، ایثار و تواضع، احکام شرعیہ کا احترام اور اطاعت امیر کا کچھ نہ کچھ جذبہ پیدا ہو سکے گا۔ جو اس سفر میں بہت کام آئے گا ورنہ بجائے خود اپنی نخوت اور مزاج کی بے قیدی نے ہم کو بالکل نکما کر دیا ہے ہمارے لیے ہر معاملہ میں اپنا دل مار کر ایثار و مروت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

(۴) اس سفر میں کسی شخص سے کسی قسم کی توقع نہ رکھی جائے۔ نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے۔

اگر ساتھیوں میں سے کوئی راحت پہونچا دے تو اس کا شکریہ ورنہ کوئی شکایت نہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اس سفر میں زیادہ تر ناچاقیاں توقعات پیدا کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ——— البتہ اپنی طرف سے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جتنا ہو سکے ہم دوسرے کو راحت پہونچا دوں ...... لوگ معلّم کی شکایت بھی انہیں غلط توقعات کے قائم کرنے اور ان کے پورا نہ ہونے کے باعث کیا کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ قانونی اور رسمی معلّم ہمارے تمام کام انجام دے، اور تمام مطالبات کو پورا کرے ——— جہاں تک ہو سکے کھانے میں اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والے لوگوں کے علاوہ کسی کے ساتھ شرکت نہ کیجائے اس اشتراکِ طعام سے بھی صحیح اسلامی زندگی کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بڑی شکایات پیدا ہو کر سوہانِ روح کا باعث ہو جاتی ہیں۔

(۵) نماز کی پابندی کا بھی حج کی روانگی سے پہلے عہد کر لینا چاہیئے۔ حج صحیح طریقے پر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو نماز جیسا اہم فریضہ کبھی نہ چھوٹے۔ دیکھا گیا ہے کہ ریل کے سفر میں مسافر خانے کے ایام میں، جہاز کے اندر چکّر کا عذر پیش کر کے اور ویسے بھی خواہ مخواہ بہت سے حاجی نمازیں چھوڑتے ہیں۔ حج سے واپس ہوتے وقت خاص طور پر سامان کی زیادتی کی وجہ سے جہاز میں جگہ کم رہ جانے کو عذر بنا کر نمازوں کو ضائع کیا جاتا ہے ——— اور بہت سے شوقین تو اپنے ساتھ لائے ہوئے ریڈیو جہاز میں کھول لیتے ہیں اور دن رات اس سے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں، نمازوں کا ان کو مطلق فکر نہیں ہوتا۔

(۶) حرمین شریفین کے بازاروں میں جا کر ضروری اشیاء اس نیت سے خریدی جائیں کہ یہاں کے دوکانداروں کو نفع ہوگا۔ مہاجرین کو بھی حسب استطاعت کچھ دیا جائے۔ یہاں کے غریبوں اور مسکینوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ یہاں کے مدارس اور طلباء کی بھی امداد کی جائے۔

بہت سے لوگ بے ضرورت اور لہو و لعب کی چیزیں اور وہ چیزیں جن کا اپنے ساتھ لے جانا حاجیوں کو کسی طرح زیبا نہیں خریدتے ہیں۔ مثلاً تصویر کے کیمرے، گانا

سننے کے لیے ریڈیو، صورتار، کھلونے وغیرہ۔ دیکھا گیا کہ جمعہ کا دن ہے حرم میں نماز جمعہ بالکل تیار ہے اور ایک مالدار صاحبزادے اعلیٰ درجہ کا ریڈیو خرید کر لائے ہیں اور دفتر معلم میں اسکی سوئیاں گھما رہے ہیں۔ یقیناً وہ نماز جمعہ اس دلچسپ مشغلے کی وجہ سے نہ پڑھ سکے ہوں گے ــــ افسوس مادیت اور رغوبیت کا غلبہ (ان دو حاذی مرکزوں میں بھی ہمارے اوپر طاری رہتا ہے ــــ لوگ سستی چیزیں دیکھتے ہیں تو ان کو بلا ضرورت بھی محض سستی ہونے کی وجہ سے خریدتے ہیں۔ مولانا زین العابدین صاحب لائلپوری نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے بڑی اچھی بات فرمائی تھی کہ سستی چیز کو بلا ضرورت خرید لینا اور بازاروں میں اپنا وقت یہاں ضائع کرنا عقلمندی کی بات نہیں ہے ــــ۔

(۷) ہر علاقے کے علما کرام بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے شہر و دیہات سے حج کو جانے والوں کو کسی ایک جگہ جمع کرکے ان کے سامنے مناسک حج رکھیں اور [illegible] ضروری باتیں ان کو بتائیں ــــ سید مرزوقی معلم کے مکان پر ایک تبلیغی اجتماع میں ایک مصری عالم نے فرمایا تھا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جن جن علاقوں سے حاجی روانہ ہوں وہیں ان پر محنت کی جائے یہاں پر ان کے ساتھ محنت کرنے میں اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا چلنے سے پہلے محنت کرنے سے ہوگا ــــ

(۸) حج سے پہلے چند ضروری عربی جملے اور رفتار سیکھ لئے جائیں جو حجاز کے سفر میں روزانہ قلیوں، موٹر چلانے والوں اور ضروری معاملات سے متعلق ہوں۔ اس غرض سے اگر کوئی ذہین آدمی تھوڑی محنت کرکے کچھ عربی سیکھ لے تو کیا مشکل ہے؟ فارغ التحصیل حضرات کو بھی حج میں آنے سے پہلے عربی زبان میں اپنا فی الضمیر ادا کرنے کی مشق کر لینا چاہیے۔

(۹) تمام عالم سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے جس قدر بھی اخلاقی سلوک نیک ان کے ساتھ ہو سکے اس سے گریز نہ کیا جائے۔ حرم کے اندر ہمارے بعض ہندوستانی شہری و دیہاتی زیادہ سے زیادہ جگہ گھیر کر بیٹھتے ہیں دوسرا قوی الجثہ ان کے درمیان یا ان کے قریب آجائے تو ناراض ہوتے ہیں۔ اور بعض زبان سے بھی زور زور سے مصر کے دیو پیکر انسانوں کو جن میں سے کچھ لوگ ان کی جگہ میں زبردستی آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ برا بھلا کہتے ہیں۔

غنیمت ہے کہ فریقین ایک دوسری کی زبان سے واقف نہیں ورنہ حرم میں روزانہ خوب لڑائیاں ہوا کریں۔

(۱۰) حجاز میں معدنیات کی فراوانی اور افراط زر کی وجہ سے مادی ترقیات کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے مگر اہل عرب میں اب بھی یقین اور توکل علی اللہ کی دولت موجود ہے ہمیں ان سے یقین سیکھنا چاہیئے اور کہیں کہیں یقین کا رخ بدلا ہوا نظر آئے تو اس کو صحیح کرنے کی بھی کوشش کرنا چاہیئے تمام عالم اسلامی سے آئے ہوئے حاجیوں کی اچھی باتوں پر نظر کرنا چاہیئے ان میں جو خوبیاں ہیں ان کو اخذ کرنا اور اپنے طرز عمل سے اور اخلاق و تواضع سے ان سے دینی رابطہ پیدا کرنا چاہیئے اپنے اندر کی خامیوں کو دور کرنے کی زیادہ فکر ہو ــــ بہت سے لوگ اہل عرب کی برائیاں خوب بیان کرتے ہیں اور ان کی خوبیاں نظر انداز کر دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی برائیوں کو اپنے عمل کی دلیل بناتے ہیں یہ دونوں باتیں غلط ہیں خلاصہ یہ ہے کہ اس سفر مقدس میں نیت کے خلوص کے ساتھ ساتھ ایثار و مروت اور حسن خلق و تواضع کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اور زیادہ وقت علاوہ مناسک حج کے تلاوت قرآن، ذکر اللہ نیز تبلیغی، دینی اور تعلیمی حلقوں میں گزارا جائے۔ تب ہی ہمارا حج صحیح رخ پر آ سکے گا ورنہ آج کے دور میں جہاں بہت سی خرابیاں ہمارے اعمال میں رونما ہو رہی ہیں وہاں اس سفر کے اندر بھی بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ آج یہ بھی بے روح ہو کر رہ گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ ایمان کا جذبہ ہی اس سفرِ خیر کا محرک ہوتا ہے مگر فریضے کی ادائیگی کے دوران جو کوتاہیاں ہوتی ہیں اور واپسی کے بعد جو غفلتیں نمودار ہو جاتی ہیں ان سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ میری اپنی خود کی کیفیت تو عراقی کے اس شعر کی مصداق ہے۔

؎ بطوافِ کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند　　کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

اور حج کرنے کے بعد تو یہ شعر میرے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے۔

یہ حسرت رہ گئی دل میں کہ حج کرنا نہ سیکھا تھا
کفن بر دوش آ پہونچا مگر مرنا نہ سیکھا تھا

(صوفی)

(ختم شد)

ہندو مسلم تاریخ کے چند حقایق

(از جناب تیج بہادر سہنا ایڈیٹر روہیلکھنڈ اخبار بریلی)

(ایک طویل مضمون کا اقتباس)

آزادی اور قیام پاکستان کے بعد کس طرح ہمارے عوام کے ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کے خلاف انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کیا۔ اس سے ہماری حکومتوں پر یہ فرض عائد ہو جاتا تھا کہ حکومت کی ساری طاقت لگا کر ان اسباب کو تلاش کیا جاتا جن سے ہمارے عوام کی ذہنیت میں یہ گندگی چھا گئی اور انہیں دور کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی۔ سب سے بڑی ضرورت ہماری تاریخ پر نظر ثانی کرنے کی تھی۔ جس طرف میں بار بار اشارہ کر چکا ہوں۔ خوش قسمتی سے ملک کو ایک ایسا وزیر اعظم نصیب ہوا جسے خود ایک تاریخ کی کتاب مرتب کرنے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن تاریخ دانی کے اعتبار سے پنڈت نہرو کی DYNAMIC PERSONALITY (ہمہ گیر شخصیت) میں مارکسی نظریات نے جمود پیدا کر دیا اور وہ ہندوستان کی تاریخ میں مذہب کے صداقت اور روحانی رول کو نظر انداز کر گئے۔ کیونکہ ہمارے عوام کے دو اہم طبقوں میں بگاڑ کا اصلی سبب ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے کردار کے متعلق شدید غلط فہمیاں [illegible] حقائق کی روشنی میں پرکھنا اشد ضروری تھا۔ یہ حقائق میں بار بار پیش کر رہا ہوں۔ صرف چند موٹی موٹی باتیں دہرا دینا ضروری ہے۔

(۱) مسلم حکمراں حملہ آور نہیں تھے۔ وہ اسی ملک کی تہذیب اور تمدن کی پیداوار تھے۔

(۲) عہد قدیم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں کشیدگی نہیں تھی۔ بلکہ ایک دوسرے کے لیے جذبہ احترام تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئے۔

(۳) مسلمان حکمرانوں نے ہندو دھرم کے اہم گرنتھ برہمنوں کے واحد اختیار سے باہر نکال کر فارسی ترجموں کے ذریعہ ہمارے عوام تک پہونچائے۔

(۴) ہندو دھرم کے اہم اصول عوام تک پہونچ جانے سے خدا پرستی کی ایک نئی تہذیب جسے بھگتی بھاؤنا کا پرچار کہا جاتا ہے۔ دور اسلام میں پیدا ہوئی۔ بھگت سور داس نے بھگوان کرشن اور بھگت تلسی داس جی نے بھگوان رام کو ہمارے عوام میں مقبول بنا دیا۔

(۵) بھگوان رام اور بھگوان کرشن کے بے شمار مندر عہد اسلام میں تعمیر ہوئے۔

(۶) مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں ہولی۔ دیوالی اور بسنت کے ہندو تیوہاروں نے قومی تیوہاروں کی حیثیت حاصل کرلی۔ اور ان تیوہاروں کی شان و شوکت میں بھاری اضافہ ہوا۔

(۷) ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مذہب کی حفاظت اور ملک کی آزادی کے لیے ۱۸۵۷ء میں اتحاد کی طاقت سے انگریز حملہ آوروں کو ملک بدر کرنے کا ملک گیر منصوبہ بنایا۔ جسے ملک کے غدار طبقہ نے ناکامیاب بنا دیا۔

(۸) مسلمان حکمرانوں نے تلوار کی طاقت رکھتے ہوئے ہندوؤں کے ہر مذہبی احساس حتیٰ کہ توہمات کا احترام کیا ستی جیسی انسانیت سوز رسم جاری رہنے دی۔ کھانے پینے کے امتیازات خندہ پیشانی سے برداشت کیے اور ہندوؤں کے مقابلہ میں اچھوت بنا رہنا گوارا کرلیا۔

ایسے جانے کتنے حقائق دریافت کیے جا سکتے ہیں جو اس نفرت کی خونی لہر کا مقابلہ کرنے کے لیے جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی بہت مؤثر ثابت ہو سکتے تھے لیکن یہ کچھ نہیں کیا گیا۔ اس کا جہاں ہندوؤں میں احساس برتری کی ترقی ہوئی مسلمانوں میں خوف و ہراس کا جذبہ کار فرما ہوگیا۔ جس سے حکمران طبقہ کو اپنی گدیوں سے چپٹے رہنے میں بہت مدد ملی۔ ہر الیکشن سے پہلے نمونے کے طور پر ۱۹۴۷ء کی خونی داستان دہرائی جاتی ہے اور ہر الیکشن میں مسلم اقلیت کو گھبراہٹ کے عالم میں صرف ایک ہی راستہ دکھائی پڑتا ہے۔

ساعتے بااولیا

(۱)

ربعی بن حراش کوفہ کے ایک جلیل القدر تابعی ہیں زمانہ تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی پایا لیکن حیات نبوی میں اسلام کی دولت اور زیارت نبوی کی سعادت میسر نہیں ہوئی، اس لئے شرف صحبت حاصل نہ ہو سکا، اکابر صحابہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں، ان کے متعلق کتب رجال اور شروح حدیث میں نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ مرنے کے بعد میرا ٹھکانا جنت اور حق تعالیٰ کا جوار رحمت ہے اس وقت تک ہنسوں گا نہیں، چنانچہ اس کے بعد ساری عمر ہنسی نہیں آئی اور کسی نے ان کو ہنستا ہوا کبھی نہیں دیکھا لیکن جب ۱۰۱ھ میں (اور بقول بعض ۱۰۴ھ میں) ان کا وصال ہوا اور غسل کے لئے تختہ پر ان کو رکھا گیا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں ان کو ہنستا دیکھا اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آغوش لحد میں پہنچنے تک وہ اسی طرح ہنستے رہے، ان کے ایک دوسرے حقیقی بھائی ربیع بن حراش کے متعلق بھی قریب قریب ایسا ہی بیان کیا گیا ہے، (نووی شرح مسلم۔ وتعقیب التقریب وغیرہ)

(۲)

معاذہ عدویہ بصرہ کی ایک تابعیہ ہیں، حضرت علی و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے بھی حدیثیں روایت کرتی ہیں، بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، ابن الجوزی کے بیان کے مطابق ۸۳ھ ان کا سنہ وفات ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتی تھیں ایک لمحہ کیلئے نہیں سوتی تھیں اور فرماتی تھیں مجھے اس آنکھ پر بڑا تعجب ہے جو یہ جاننے کے بعد بھی کہ مرنے کے بعد قبر میں قیامت تک سونا ہی سونا ہے، یہاں بھی سوتی ہے" (عجبت لعین تنام وقد علمت طول الرقاد فی القبور) (خلاصۃ تہذیب الکمال)

انتخاب

سیلاب برہنگی | اے۔پی۔اے کی خبر پاکستانی روزناموں میں:۔

"برطانیہ میں برہنہ فلمیں خوب ہی روپیہ پیدا کر رہی ہیں، چنانچہ ایک نئی برہنہ لندنی فلم نے ملک کے آٹھ بڑے شہروں میں اپنا تماشہ دکھا کر آمدنی کا ریکارڈ قائم کر دیا اور پچھلے منافع کو مات دے رہی ہے، خاص لندن کے چھ چھ سینماؤں میں یہ برہنہ فلم بہ یک وقت چل رہی ہے برطانیہ کے علاوہ امریکا، بلجیم، سوئزرلینڈ، سویڈن، نیوزی لینڈ اور دوسرے ملکوں میں بھی برہنہ فلمیں خوب ہی کامیاب ہو رہی ہیں۔"

اور انتظار کی بہت دیر تک ضرورت نہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب عریانی کے انھیں قدرداں ملکوں کی فہرست میں آپ کے ہندوستان اور پاکستان اور دوسرے مشرقی و اسلامی ملکوں کے بھی نام درج ہوں! ترقی، اور فلمی ترقی کا قدم ذرا اور آگے بڑھنے دیجئے۔ ہماری ہی بہنیں اور بیٹیاں سب مادرزاد برہنہ ہو ہو کر فلم میں ناچیں گی۔ باپ اور بھائی سب ان نظاروں سے لذت اندوز ہوں گے اور اگر کچھ بچے کھچے ناقدرے اس پر زبان کھولیں گے تو دشمن تہذیب و دشمن ترقی قرار پا کر اُلٹے خود ہی نکو بن کر رہیں گے!

تھرکا دینے والا انیکہ کلام | "فیروز پور ۲۴ر جنوری۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نے کل یہاں ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر پر تبصرہ کیا اور کہا کہ ہندوستان پاکستان سے جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور نہ اس پر حملہ کرے گا، لیکن اگر پاکستان نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی جسارت کی تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔"

کاش کوئی صاحب ذرا سی "ریسرچ" کی محنت گوارا کر کے گن کر بتا دیتے کہ دہلی اور

راولپنڈی (یا کراچی) سے کے سوبار بعینہ یہی فقرے دہرائے جا چکے ہیں! ہر بڑا آدمی کتنی بار سکو دہرا نہیں چکا ہے کہ ہمارا ملک لڑنا ہرگز نہیں چاہتا، ہم تو عین صلح و آشتی کے خواہاں بلکہ اس کے لئے اپنے امکان بھر کوشاں ہیں لیکن اگر دوسرے ملک نے حملہ کر دیا تو ہم دشمن کے چھکے چھڑا دیں گے! ــــ تکرار کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے بعض فقرے تکیہ کلام سہی لیکن ایسی بھی کیا تکرار کہ سننے والے بور ہو جائیں، درد سر میں مبتلا ہو جائیں، اور جی یہ چاہنے لگے کہ اپنے کان پھوڑ لیں!

حقیقت نہیں فریب حقیقت | دہلی کے ایک معاصر کے اڈیٹوریل سے:۔

"زیادہ دن نہیں غالباً ہفتے ڈیڑھ ہفتے کی بات ہے کہ آبادی کی سائنسی تحقیقات کی بین الاقوامی یونین نے نیویارک میں ایک کانفرنس طلب کی تھی، اس کانفرنس میں ۴۴ ملکوں کے کوئی ۳۳۰ ماہر شریک ہوئے، کانفرنس کے مباحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "اضافہ آبادی کا دھماکہ" محض جذباتی سی بات ہے جس کی علم و تحقیقات کی کسوٹی پر پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں۔

آبادی کے اس ادارے کے سابق صدر ڈاکٹر ڈوڈلے کرک نے اس سلسلہ میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ انسانی زندگی اپنے مختلف دائروں میں جس طرح ترقی کر رہی ہے اس تناسب سے آبادی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ یہ اضافہ اس عام ارتقار کے مقابلہ میں سست ہے، آبادی میں اگر زیادہ اضافہ ہوا تو تین فیصدی ہوگا، ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی رفتار اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس تین فیصد اضافہ کو دھماکہ کہنا محض جہالت اور بیوقوفی اور غیر سائنسی بات ہے،

تعجب ہے کہ مغرب میں جو عصری جہالت کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ڈوڈلے کرک پیدا ہوں اور مشرق جو خود اعتمادی اور بصیرت کا گہوارہ رہا ہے وہاں نہرو اور ایوب سے بڑے آتاتے افرادی قوت کا گلا گھونٹنے کے منصوبے بنائیں!!

صورت حال اگر یہی ہے تو فارسی کے ایک پرانے شعر کا دوسرا مصرعہ دہرا دینے کا موقع اس سے بہتر اور کیا ہوگا کہ ؎

ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی ست!

مشرقی غریب جب "دانش" فرنگ سے مرعوب ہو کر مغرب زدہ ہو جاتا ہے تو اپنی فرنگیت میں فرنگیوں سے بھی کچھ قدم آگے ہی بڑھ جاتا ہے۔

"مسلم یونیورسٹی کے حق میں"

دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت پر زور شروع سے اس ادارہ کا جزو رہا ہو۔ چنانچہ جب ایک طالب علم شاہجہانپور سے اپنے والد کا خط اس مضمون کا لے کر آیا کہ اس کو مذہبی تربیت سے الگ رکھا جائے تو سرسید نے داخلہ ہی سے انکار کر دیا۔ اسلام اس ادارہ کی رگ وریشہ میں شروع ہی سے بسا رہا ہو سنی اور شیعہ دینیات کے شعبے اس میں برابر قائم رہے ہیں۔ اور اس کے نام میں لفظ "اورینٹل" کا شمول بھی اس پر دلالت کرتا ہو۔ اب جو یہ چرچا برابر زبانوں پر آرہا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے لفظ "مسلم" کو علیحدہ کر دیا جائے یا نہیں، تو آخر یہ کیوں ہے، کیا مسلم کے باقی رکھنے سے ادارہ فرقہ وارانہ ہوا جا رہا ہو؟ کیا اس کا دروازہ کبھی غیر مسلموں پر بند رہا ہے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں اس میں طلبہ کل ۲۵۹ تھے اور ان میں سے ۷۵ ہندو تھے!

آئین ہند میں ایک خاص دفعہ اس کی موجود ہو کہ اقلیتوں کو اپنی تہذیب وزبان کے ترقی دینے کا پورا حق حاصل رہے گا اور علی گڑھ اس تحفظ کی ایک زندہ مثال ہو! لفظ مسلم کو اب بھی اس کے نام کا جزو رہنا چاہیے۔ اور اس کی تائید میں تین تین دلیلیں موجود ہیں۔

(۱) اصل ادارہ کا تاریخی پس منظر اسلامی ہی کلچر پر مبنی ہو اور اس کو قائم رہنا چاہیے۔

(۲) یہ ایک اقلیت کی مقدس امانت ہو۔ چندے جتنے لیے گئے سب یہ کہہ کر کہ یہ مسلم یونیورسٹی ہوگی، اسلامی تہذیب کے تحفظ اور بقا کی خاطر اب اس سے ہٹنا صریح وعدہ خلافی ہوگی۔

(۳) علی گڑھ سیکولرزم کا بہترین نمونہ ہے۔ ہم دنیا کے سامنے اپنی سیکولرزم کے ثبوت میں اسی کو پیش کر سکتے ہیں۔"

یہ کسی مسلم اخبار کا مطالبہ نہیں۔ یو۔ پی کے انگریزی نقیب کانگرس نیشنل ہیرالڈ (۱۲ فروری) کے ایک مقالہ کا لب لباب ہو۔ جو ایڈیٹوریل صفحہ پر اور ایڈیٹوریل سے ملحق بغیر کسی نام کے شائع ہوا ہو! — حق گوئی اور حق پسندی کسی مذہب وملت کی جائداد نہیں۔ (صدق جدید لکھنؤ)

تعارف وتبصرہ

یہ عنوان وصول شدہ کتابوں سے فراغت کے بعد ختم کیا جا رہا ہے
براہ کرم اب کوئی کتاب الفرقان میں تبصرہ کیلئے نہ بھیجئے۔

(ادارہ)

معارف المشکوٰۃ | مرتبہ مولانا سید عبد الرؤف عالی، مرتب مخطوطات دار العلوم دیوبند۔ ناشر اشاعت منزل دیوبند صفحات ۱۰۴۔ سائز ۲۰×۳۰ عام قیمت ۲/ علاوہ محصول ڈاک (مستقل ممبری کی شکل میں رعایت ہے جس کی تفصیلات ناشر سے دریافت کی جا سکتی ہیں)

مشکوٰۃ شریف کی اردو شرح مظاہر حق از مولانا قطب الدین خاں دہلوی مرحوم ایک مقبول و معروف کتاب ہے۔ لیکن قریب ڈیڑھ سو برس پیشتر کی اردو میں ہونے کی وجہ سے اب بہت مشکل الفہم ہو چکی ہے۔ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سہارن پوری مرحوم ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے صاحبزادے، جوان صالح مولوی عبد الرؤف صاحب عالی نے اس کتاب کے اپنی خصوصی دلچسپی کے ماتحت اس کو جدید اردو کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے، یہ پہلا جزو ہے جو اس وقت برائے تبصرہ سامنے ہے۔ اس جزو میں تقریباً نصف صفحات پر مرتب کا مقدمہ ہے۔ باقی نصف میں مظاہر حق کا نیا قالب جس کو معارف المشکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مرتب نے مظاہر حق کے مطالب ہی کو نئی زبان میں ڈھال دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ احادیث کی تشریح میں حذف و اضافہ کا بھی پورا پورا استعمال کیا ہے۔ جن باتوں کو غیر ضروری یا مکرر سمجھا ہے حذف کر دیا ہے اور زمانہ حال کے مطابق جس قدر اضافہ کی ضرورت تھی ہے اسے عمل میں لایا گیا ہے۔ گویا یہ "مظاہر حق" ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمیں موقع نہیں مل سکا کہ اصل مظاہر حق سے اسکو ملا کر دیکھا جائے۔ جس سے معلوم ہوتا کہ یہ کس حد تک مظاہر حق ہے اور کس حد تک نہیں ہے۔ یوں بجائے خود یہ ایک مفید اور بامعنی کاوش معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ

اس میں شک نہیں کہ مظاہر حق اپنی زبان کے لحاظ سے اب بہت خال خال لوگوں کے لئے قابل استفادہ ہے، اور اس کے اس جدید اڈیشن کی بدولت اس کے کافی مطالب مع شئی زائد وقت کی زبان میں سامنے آجائیں گے ـــــ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ اس طرح کی ڈھیل کہاں تک مناسب تھی کہ اس کا پتہ ہی نہ چل سکے کہ کہاں نئے مرتب نے کچھ گھٹا دیا ہے اور کہاں کچھ بڑھا دیا ہے۔ کم از کم اضافے تو کسی امتیازی علامت کے ساتھ کئے جانے مناسب تھے، تاکہ یہ واضح رہتا کہ اتنی بات مولانا قطب الدین خاں صاحب کی ہے اور اتنی بات مولانا عبدالرؤف صاحب کی۔

بہر حال کتاب کی افادیت سے انکار نہیں، اللہ تعالیٰ باقی تمام اجزاء کی ترتیب میں مرتب کی مدد فرمائے، کہ حدیث کی خدمت کسی انداز سے بھی ہو ایک مبارک و مسعود اور دینی نفع کا کام ہے۔ کتاب کا مقدمہ بہت کام کا اور ٹھوس معلومات پر مشتمل ہے، اولاً مقام رسالت اور ضرورت حدیث پر مختصر گفتگو ہے۔ اسکے بعد علم حدیث کی تاریخ اور پھر فنی معلومات وغیرہ۔ ایک خاص کام یہ بھی کیا گیا ہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے جن کتب اصول کے حوالہ سے اپنی کتاب میں احادیث درج کی ہیں۔ ان احادیث کا متعین مقام اصل کتابوں میں تلاش کر کے اس کا ایک نقشہ شروع میں دے دیا گیا ہے۔

"پیش سخن" میں (صفحہ کی آخری سطر سے) قدیم اور جدید مظاہر حق کے درمیان زبان و بیان کے مقابلہ کا جو انداز مرتب نے اختیار کیا ہے وہ ایک خوشہ چیں کے لئے زیبا نہیں معلوم ہوتا۔ یوں بھی جدید مظاہر حق کے دوسرے اور تیسرے ہی صفحہ پر ترجمہ میں زبان و بیان کی لغزشیں نمایاں نظر آ رہی ہیں۔ بلکہ تعجب ہوتا ہے کہ "پیش سخن" کی زبان سے یہاں اس درجہ فرق کیوں ہے۔ بہتر ہے کہ آئندہ اڈیشن میں مقابلہ کے موجودہ انداز کو بدل دیا جائے۔

[illegible]

[illegible] مولانا ابو [illegible] محمد اسمٰعیل صاحب [illegible] مرحوم

مساجد اور عیدگاہوں کے ائمہ حسب ذیل پتہ پر ۸ نئے پیسے (ڈاک [illegible]) طلب کر سکتے ہیں

[illegible]

دعوت الی اللہ اور اظہار حق کیلئے وقف ہے
آپ المنبر کا مطالعہ فرمائیے ۔۔۔ المنبر
کا ہر شمارہ اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں بھرپور ہوتا ہے
المنبر نے ● مکہ معظمہ ● استنبول
● ٹوکیو اور دوسرے اہم مقامات سے حالات
حاصل کرنے کا خصوصی اہتمام کر رکھا ہے ۔۔۔ اور
متعدد ممالک میں المنبر کے خصوصی نمائندے
زیر ادارت
عبدالرحیم اشرف
المنبر
کے ذریعہ خدا کے دین کی منادی ہر شخص اور ہر گھر تک پہنچانے کیلئے
کچھ عرصہ کیلئے
زر تعاون نصف
کر دیا گیا ہے ۔۔۔ آپ
سال بھر کیلئے
منیجر المنبر لائلپور

اعلان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

مطابق فارم ۴ رول ۸

مقام اشاعت ... ... کچہری روڈ لکھنؤ

وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک کا نام ... ... محمد منظور نعمانی

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... کچہری روڈ، لکھنؤ

میں (محمد منظور نعمانی) تصدیق کرتا ہوں کہ یہ بیان میرے علم و یقین کی رو سے بالکل صحیح ہے۔

محمد منظور نعمانی

پبلشر

الفرقان
لکھنؤ
محمد منظور نعمانی
عتیق الرحمن سنبھلی

چندہ
ہندوستان و پاکستان
سالانہ ۔۔۔۔ ۶ روپے
ششماہی ۔۔۔۔ ۳ روپے
فی کاپی ۔۔۔۔ ۶۰ نئے پیسے

الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ

چندہ
اعزازی خریداران
سالانہ ۔۔۔۔ ۱۵ روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ۔۔۔۔ ۱۲ شلنگ

جلد ۲۵ | بابتہ شوال سنہ ۱۳۸۱ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۶۲ء | شمارہ ۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی۔ براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ہو اپریل تک دفتر میں ضرور آجانا چاہیئے ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائیگا۔

پاکستان کے خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک دفتر آجانی چاہیئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

الجزائر میں آزادی کا طلوع

الجزائر میں آزادی کی جو جنگ سات سال سے جاری تھی، الحمدللہ کہ اس مہینے وہ کامیابی کے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ فرانس نے آزادی کا مطالبہ اس شرط کے ساتھ مان لیا ہے کہ الجزائر کے باشندے بالغ رائے شماری کے ذریعہ آزادی کے حق میں فیصلہ دیں۔ ظاہر ہے کہ آزادی کے لئے لاکھوں کی تعداد میں کٹ جانے والے باشندے اسکے سوا کیا فیصلہ دے سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی خلاف گمان و قیاس بات پیش نہ آئی تو انشاءاللہ بہت قریبی مدت میں الجزائر آزاد ہو جائے گا۔ اور آزاد مسلمان ممالک کی صف میں ایک ایسے ملک کا اضافہ ہوگا جس کی استقامت اور شجاعت کی دھاک آج ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی ہے۔

الجزائر کے مسلمانوں کی استقامت و شجاعت اور پامردی و سرفروشی بڑا سبق لینے کے قابل اور دنیا میں ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر انسانی تاریخ میں دستیاب ہونا مشکل ہے فرانس اس ملک پر اپنا اقتدار باقی رکھنے ہی پر مُصر نہیں تھا بلکہ اس کو فرانس کا ایک حصہ قرار دیتا تھا اور اسکی خود مختارانہ حیثیت پر بات کرنے کو بھی تیار نہ تھا۔ سوا سو برس سے اس پر اس کا قبضہ چلا آتا تھا، ۹۰۰ لاکھ فرانسیسی باشندے اس کے سرسبز و شاداب علاقے پر بلا شرکت غیرے قابض ہو چکے تھے۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس فرانس کی ۴، ۵ لاکھ فوج ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہوئی تھی۔ مغربی طاقتوں کے ایک باہمی فوجی معاہدہ کے تحت امریکہ

اور برطانیہ کے اعلیٰ ترین جنگی ساز وسامان کی جو مقدار فرانس کی تحویل میں تھی، اس سے بھی پوری مدد فرانسیسی فوجیں لے رہی تھیں۔ ایک طرف دشمن کے یہ دم خم اور ساز وسامان تھے، دوسری طرف الجزائر کی نہتھی آبادی تھی۔ اس کے پاس مادی ہتھیار نہیں تھے مگر آزادی سے اسکی پیدائشی محبت اور اسلام کا دیا ہوا عقیدۂ آخرت یہ معنوی ہتھیار اسکے پاس ایسے تھے جن کی کاٹ دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔ آزادی سے محبت کا جذبہ، کامیابی کی راہ میں تاریکیاں ہی تاریکیاں دیکھ کر شاید کسی وقت ہار مان بھی لے۔ مگر اسکے ساتھ جب آخرت کی ابدی زندگی اور شہادت کے ذریعہ اس میں کامیابی کا عقیدہ بھی مل جائے تو پھر ایک ایسی مشعل ہاتھ میں آجاتی ہے۔ جس کے دو بدو رتاریکیوں کا گزر نہیں، اور مایوسی کو راہ نہیں رہ جاتی کہ وہ دلولوں کو سرد اور ہمتوں کو پست کرے۔

جہاں تک الجزائر کے عوام اور عام مجاہدین آزادی کا سوال ہے، ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ وہ جذبہ حریت کے ساتھ اس عقیدۂ آخرت سے بھی سرشار تھے اور انھوں نے سات سال کی اس صبر آزما جنگ کو اسی ہتھیار کی طاقت سے سر کیا ہے۔ عام مسلمانوں کا تو معاملہ ہر جگہ ایک ہی ہے کہ اُن کے لیڈروں کے مقاصد اور جذبات خواہ اسلامی نہوں مگر وہ اگر اپنے دشمنوں کے خلاف میدان میں آتے ہیں اور جان دیتے ہیں تو اُن کے جذبات اور ان کی نیتیں اسلامی ہی ہوتی ہیں (خواہ وہ عملاً اسلام کے معیار سے کتنے ہی گرے ہوئے ہوں) فلسطین میں اسرائیل کے مقابلہ میں آکر عرب نوجوانوں نے اسی جذبہ سے سر کٹائے، نہر سویز پر برطانوی، فرانسیسی حملہ کے وقت پورٹ سعید کی آبادی اسی جذبہ سے توپوں اور گن مشینوں کے منہ آگئی۔۔۔ اگرچہ ان میں سے کسی جگہ بھی عرب حکومتوں کے مقاصد جنگ اسلامی نہ تھے۔۔۔۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے اور مسلمات میں سے ہے! اسی طرح جہاں تک الجزائری عوام کا سوال ہے انھوں نے یقیناً اسلامی جذبہ سے ہی سات سالہ جنگ کی تمام ہولناک اور لرزہ خیز مصائب جھیلے۔ جو مجاہد آزادی کی باقاعدہ فوجوں اور گوریلا دستوں میں شامل تھے اُن کے جو حالات خود ان کے بیان کئے ہوئے پڑھنے میں آتے ہیں وہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ان کی استقامت اور پامردی میں جذبہ حریت کے ساتھ ساتھ اُن کے عقیدۂ آخرت اور اسلامی ذوق شہادت کا بڑا

دخل تھا۔ ہم نے مجاہدوں کے پہاڑوں کی وادیوں میں فوجی لباس کے اندر اذان دیتے نمازی کے فوٹو دیکھے ہیں۔ فرانسیسی درندوں کے ہاتھوں ان کے کٹے ہوئے سروں کے فوٹو میں مشرع صورتیں دیکھی ہیں۔ اور اُن کی ڈائریاں پڑھی ہیں کہ اُن کے کمانڈروں نے مہم پر روانگی کے وقت فلاں فلاں ۔ ۔ ۔ قرآنی آیات کا ورد بتایا ہے جسے وہ حرزِ جاں بنائے رہے۔ یہ سب باتیں عام اندازے اور تجربے کے علاوہ بھی اس بات کا مستقل ثبوت ہیں کہ الجزائر کے مسلمانوں نے یہ طویل جنگ اسلامی جذبات سے لڑی۔ اس جنگ کا جو ایک سو تیس برس کا تاریخی تسلسل ہے وہ بھی یقین دلاتا ہے کہ اس تسلسل کی یہ سات سالہ کڑی بھی قدرتی طور پر اسی روح کی حامل رہی ہوگی جو اسکے پچھلے دوروں میں بے حد نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یعنی اسلامی روح۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں۔ اور اسی لئے ہم کو اس جنگ میں اہل الجزائر کی فتح پر صرف عام انسانی رشتے کی نہیں بلکہ اسلامی اور دینی رشتہ کی خوشی ہے۔ ہماری جن ذرائع تک رسائی ہے اُن سے ہم اس بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں رکھتے کہ اہل الجزائر کی قیادت جن ہاتھوں میں کتنی ان کا حال کیا ہے ؟ آیا خدانخواستہ وہ بھی دوسرے مسلمان ملکوں کے لیڈروں کی طرح محض قومیت کے پرستار ہیں، اور دل کے اندر انھیں اسلامی مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف سامراج سے جنگ کے وقت وہ اپنے عوام کے اسلامی جذبے سے کام لیتے ہیں اور جب ملک کی قسمت اُن کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو عوام کی اسلامیت کو فنا کرکے اسکی جگہ قومیت کا بُت نصب کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ یا خوش نصیبی سے الجزائر کی قیادت کا معاملہ مختلف ہے۔ اور وہ اپنے جہاد حریت کے تاریخی تسلسل کی روح سے بیگانہ نہیں ہوئی ہے ؟ اگر دوسری بات ہے، اور خدا کرے کہ یہی ہو، تو پھر اہل الجزائر کی کامیابی ہمارے لئے صرف ایک وقتی خوشی کا پیغام نہیں، اسلام کی حیاتِ نو کا مژدہ اور مطلعِ انسانیت پر ایک ایسی صبح نو کی بشارت ہے جس میں رنگ بھرنے کے لئے اگر پوری اسلامی دنیا کا ایک ایک قطرہ خون بہہ جاتا تو غم نہ تھا۔

مقامِ دشتی و [illegible]

گر ایں سودا بجاں بودے بہ بودے

بہر حال یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ اسلامی جذبات کے ماتحت بہایا ہوا شہیدانِ الجزائر کا لہو صرف آزادی ہی کا پیام لایا یا اسلام کے بھی کچھ کام آیا، لیکن یہ لہو ایک پیغام ہر حال میں نقش کر گیا ہے کہ

محمد عربی کا دیا ہوا عقیدۂ آخرت اس در کے غلاموں کی
وہ طاقت ہے جس پر کسی کا فتحیاب ہونا ممکن نہیں!

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

الحمد للہ کہ ندائے ملت کا اجراء عمل میں آ گیا، اور اسکے دو پرچے شائع ہو چکے، اس کی ادارت کی ذمہ داری بھی اس ہیچمداں کے سر ہے ــــ جن بلند مقاصد اور جس اونچے معیار کے ساتھ اس اخبار کا اجراء تجویز کیا گیا تھا۔ اپنی بے بضاعتی اور صحت کی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے، اسکے تصور نے بڑا فکرمند بنا رکھا۔ لیکن اُس کارساز کا کیسے شکر ادا کیا جائے کہ پہلے ہی پرچہ کا اپنی زیادہ سے زیادہ توقع سے بھی بڑھ کر استقبال ہوا۔ اور دوسرے کے بارے میں اس سے بھی بہتر آثار نظر آ رہے ہیں۔

ندائے ملت کا اجراء مسلمانوں کی ملکی زندگی سے متعلق مسائل کے لئے ہوا ہے۔ اس بارے میں جو اپنے خیالات ہیں۔ الفرقان کے دائرے اور دامن کی وسعت کی حد تک، وہ بذریعہ ناظرین الفرقان تک پہونچتے رہے ہیں۔ لیکن الفرقان کی خاص دینی اور اصلاحی نوعیت کی بنا پر یہ خیالات ایک خاص دینی حلقہ ہی تک محدود رہتے تھے۔ اسی چیز نے سوچنے پر مجبور کیا کہ ایک ایسی نوعیت کا پرچہ ہو جس سے اس حلقے سے باہر کے افراد بھی دلچسپی لے سکیں۔ ندائے ملت کا اجراء اسی احساس ضرورت کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو چیزیں ناظرین الفرقان کے مذاق کی نکلیں گی وہ انشاء اللہ الفرقان میں بھی آتی رہیں گی۔ اور اس کے علاوہ جس انداز سے مسائل و کوائف حاضرہ پر اپنے خیالات کا اظہار الفرقان میں اب تک کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں بھی انشاء اللہ کوئی فرق نہ آئے گا۔

مَعَارِفُ الحَدِیث

(مسلسل)

نماز میں قراءۃ قرآن

قیام اور رکوع و سجود کی طرح قرآنِ مجید کی قرأت بھی نماز کا ایک لازمی جزو اور بنیادی رکن ہے اور اس کا محل و موقع قیام ہے ــــــ جیسا کہ معلوم اور معمول ہے قرأت کی ترتیب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، تسبیح و تقدیس اور اپنی عبودیت کے اظہار پر مشتمل کوئی دعا اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کی جاتی ہے (اس موقع کی تین ماثورہ دعائیں "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ" وغیرہ عنقریب ہی مذکور ہو چکی ہیں) اس کے بعد قرآن مجید کی سب سے پہلی سورۃ جو گویا اس کا افتتاحیہ ہے، یعنی سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی صفات کا بڑا جامع اور مؤثر بیان بھی ہے، ہر قسم کے شرک کی نفی کے ساتھ اس کی توحید کا اثبات و اقرار بھی ہے۔ صراط مستقیم یعنی دینِ حق اور شریعت الٰہیہ کے لیے اپنی ضرورتمندی اور محتاجی کی بنا پر اُس کی ہدایت کے لیے عاجزانہ اور فقیرانہ سوال اور دعا بھی ہے۔ ــــــ بہرحال سب سے پہلے یہ سورۃ پڑھی جاتی ہے، اور اپنی جامعیت اور خاص عظمت و اہمیت کی وجہ سے یہ متعین طور سے اس درجہ میں لازمی اور ضروری ہے کہ اس کے بغیر گویا نماز ہی نہیں ہوتی، اس کے بعد نمازی کو اجازت بلکہ حکم ہے کہ وہ قرآن مجید کی کوئی بھی سورہ یا کسی سورہ کا کوئی بھی حصہ پڑھے ــــ قرآن مجید کا جو حصہ بھی وہ پڑھے گا اس میں اس کے لیے ہدایت کا کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوگا، یا تو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسکی

صفاتِ کاملہ کا بیان ہوگا یا یومِ آخرت اور جنت و دوزخ اور نیک کرداری و بدکرداری کی جزا سزا کا ذکر ہوگا، یا عملی زندگی سے متعلق کوئی فرمان ہوگا۔ یا کسی سبق آموز اور عبرت انگیز واقعہ کا تذکرہ ہوگا، الغرض پڑھنے والے کے لیے کوئی نہ کوئی رہنمائی اس میں ضرور ہوگی، یہ گویا اُسکی دُعاءِ ہدایت (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقد جواب ہوگا جو اسی کی زبان پر جاری ہوگا ـــــ پھر دوسری رکعت میں بھی اسی طرح سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد کوئی اور سورہ یا کسی سورہ سے کچھ آیتیں پڑھی جائیں گی ـــــ اور اگر نماز چار رکعت والی ہو تو تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ تو پڑھی جائے گی لیکن اس کے ساتھ کچھ اور پڑھنا ضروری نہیں ہے ـــــ اس تمہید کے بعد مندرجۂ ذیل حدیثیں پڑھیے جن میں سے بعض تو نماز کے اندر قراءۃ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں، اور زیادہ تر وہ ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ قراءۃ فی الصلوٰۃ کے بارہ میں آپ کا طرزِ عمل کیا تھا اور کس نماز میں آپ کتنی قرأت کرتے تھے اور کون کون سی سورتیں زیادہ تر پڑھتے تھے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِقِرَاءَةٍ، قَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَمَا اَعْلَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْلَنَّاهُ وَمَا اَخْفَاهُ اَخْفَيْنَاهُ لَكُمْ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن کی قراءۃ کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں ـــــ آگے حضرت ابوہریرہؓ اپنی طرف سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن نمازوں میں قرأت بالجہر فرماتے تھے ان میں ہم بھی جہر کرتے ہیں اور دوسروں کو سُنا کے پڑھتے ہیں، اور جہاں آپ آہستہ خاموشی سے پڑھتے تھے وہاں ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور تم کو سُنا کے نہیں پڑھتے ـــ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں نماز کے لیے قرآن کی کسی خاص سورۃ کا نہیں بلکہ مطلق قراءۃ قرآن کا ضروری ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ آگے حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن نمازوں اور جن رکعتوں میں بالجہر قرأت فرماتے تھے اُن ہی

میں ہم بھی بالجہر قرأت کرتے ہیں اور جہاں آپ خاموشی سے پڑھتے تھے وہاں ہم بھی خاموشی سے پڑھتے ہیں۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔

(رواہ البخاری ومسلم وفی روایۃ لمسلم لمن لم یقرء بام القرآن فصاعداً)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اور اسی حدیث کی صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ "جس نے سورۂ فاتحہ اور اس کے آگے کچھ اور نہیں پڑھا تو اس کی نماز ہی نہیں۔

(تشریح) اس حدیث سے یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ سورۂ فاتحہ تو متعین طور سے نماز کا لازمی جزء ہے اور اس کے بعد قرآن مجید ہی میں سے کچھ اور بھی پڑھنا ضروری ہے، لیکن اس میں پوری وسعت ہے اور اجازت ہے کہ جہاں سے چاہے پڑھے۔

مسئلہ قرأت فاتحہ میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب:-

ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے حضرات نے اس حدیث سے اور اسی طرح کی بعض اور احادیث سے یہ سمجھا ہے کہ نمازی خواہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو، خواہ امامت کر رہا ہو، خواہ مقتدی ہو اور نماز خواہ جہری ہو یا سری ہر حال میں اس کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ـــــــ اور حضرت امام مالک، حضرت امام احمد بن حنبل اور ان کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے ائمہ نے اس حدیث کے ساتھ اسی مسئلہ سے متعلق دوسری بعض حدیثوں کو بھی سامنے رکھ کر یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ اگر نمازی مقتدی ہو اور نماز جہری ہو تو امام کی قرأت مقتدیوں کی طرف سے بھی کافی ہے، اور اس صورت میں مقتدی کو خود قرأت نہیں کرنی چاہیے، اس کے علاوہ باقی تمام صورتوں میں نمازی کو سورۂ فاتحہ لازماً پڑھنا چاہیے!

امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں بلکہ وہ سری نمازوں میں بھی

امام کی قراءۃ کو مقتدی کی طرف سے کافی سمجھتے ہیں ــــ ان حضرات کے اس نقطۂ نظر کی بنیاد جن حدیثوں پر ہے ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو آگے ہی نمبر پر درج ہو رہی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔

ــــــــــ رواہ ابوداؤد والنسائی و ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ مقتدی لوگ اس کی اقتدا اور اتباع کریں لہذا جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموشی سے کان لگا کر سنو۔

ــــــــــ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

تشریح) امام کی قرأت کے وقت خاموشی سے سننے کی یہ ہدایت بالکل انہی الفاظ میں بعض اور صحابۂ کرام نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث کے ضمن میں یہ ہدایت انہی الفاظ میں مروی ہے اور وہیں ایک شاگرد کے سوال کے جواب میں امام مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ والی اس حدیث کی بھی تصحیح اور توثیق کی ہے اور بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا ماخذ و منشا قرآن مجید کا یہ واضح فرمان ہے" وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝" الاعراف ع ۲۴ (اور جب قرآن پاک کی قرأت ہو تو تم اس کو متوجہ ہو کر سنو اور خاموش رہو، شاید کہ اس کی وجہ سے تم رحمت کے قابل ہو جاؤ)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو سری نمازوں میں بھی امام کی قرأت کو مقتدی کے لیے کافی سمجھتے ہیں ان کا خاص استدلال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہے جس کو امام محمد اور امام طحاوی اور امام دارقطنی وغیرہ نے خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے اپنی مصنفات میں روایت کیا ہے۔

موطا امام محمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ مَنْ صَلّٰى خَلْفَ الْاِمَامِ فَاِنَّ قِرَاءَةَ الْاِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ ۔

علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کی بھی قرأت ہے۔

(فائدہ) یہ مسئلہ کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں، ان معرکۃ الآراء اختلافی مسائل میں سے ہے جن پر ہماری اس صدی میں بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں دونوں طرف لکھی گئی ہیں اور بلاشبہ ان میں سے بعض تو علم و تحقیق اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے شاہکار ہیں۔ لیکن معارف الحدیث کا یہ سلسلہ اُمّت کے جس طبقہ کے لیے اور جس مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا جا رہا ہے، یہ مباحث اس کے لحاظ سے نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے مضر بھی ہو سکتے ہیں، اس قسم کے تمام اختلافی مسائل میں صحیح راہ یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، دل سے ان کا احترام کیا جائے اور سمجھا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے کتاب و سنت اور صحابۂ کرام کے طرز عمل کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کے بعد جو کچھ اپنے نزدیک زیادہ راجح سمجھا ہے نیک نیتی سے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی باطل پر نہیں ہے ۔ اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اُمّت کی مصلحت عامہ کی خاطر، جہالت و نفسانیت اور فتنوں کے اس دور میں کسی ایک مسلک سے اپنے کو وابستہ رکھا جائے۔ بہرحال معارف الحدیث کے اس سلسلے میں بحث و مناظرہ کی راہ سے بچتے ہوئے چلنے کا التزام کیا گیا ہے۔ الحمد للہ پوری بصیرت اور یقین کے ساتھ اس عاجز کی یہ رائے ہو کہ ہندوستان کے مایۂ فخر اور استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اصولی طور پر جو راہ عدل و اعتدال ان اختلافی مسائل کے بارہ میں اختیار کی ہو، اس دور میں اُمّت محمدیہ کے لیے بس وہی راہ ہے، جس کو اپنا لینے کے بعد اُمّت کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے جڑ سکتا ہے۔

نماز فجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت :-

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَقْرَءُ فِي الْفَجْرِ بِقٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ وَنَحْوِهَا وَكَانَتْ صَلٰوتُهُ بَعْدُ تَخْفِيفاً ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں سورۂ قٓ اور اس جیسی دوسری سورتیں پڑھا کرتے تھے اور بعد میں آپ کی نماز ہلکی ہوتی تھی (صحیح مسلم)

(**تشریح**) شارحین نے آخری خط کشیدہ فقرہ کے دو مطلب بیان کیے ہیں، ایک یہ کہ فجر کے بعد کی آپ کی نمازیں یعنی ظہر، عصر، مغرب، عشاء یہ سب بہ نسبت فجر کے ہلکی ہوتی تھیں اور ان میں بہ نسبت فجر کے آپ قرأۃ کم فرماتے تھے۔ دوسرا مطلب اس فقرہ کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور میں جب صحابہ کرام کی تعداد کم تھی اور آپ کے پیچھے جماعت میں سب سابقین اولین ہی ہوتے تھے آپ کی نمازیں عموماً طویل ہوتی تھیں اور بعد کے دور میں جب ساتھ میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی اور ان میں دوم سوم درجہ والے اہل ایمان بھی ہوتے تھے تو آپ نمازیں نسبتہً ہلکی پڑھنے لگے تھے۔ کیونکہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں اس کا امکان زیادہ ہوتا تھا کہ کچھ لوگ مریض یا کمزور یا کم ہمت یا زیادہ بوڑھے ہوں جن کے لیے طویل نماز باعث زحمت ہو جائے۔

اگرچہ واقعاتی لحاظ سے دونوں ہی باتیں صحیح ہیں لیکن اس عاجز کے خیال میں دوسری تشریح اقرب ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَءُ فِي الْفَجْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز میں واللیل اذا عسعس (یعنی سورۂ تکویر) پڑھتے ہوئے سنا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ بِمَكَّةَ فَاسْتَفْتَحَ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَتّٰى

جَاءَ ذِكْرُ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ اَوْ ذِكْرُ عِيْسٰى اَخَذَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْلَةٌ فَرَكَعَ ــــــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور سورۂ مومنون پڑھنی شروع فرمائی۔ ابھی آپ اس جگہ تک پہنچے تھے جہاں حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کا یا حضرت (عیسیٰ) (علیہ السلام) کا ذکر ہے کہ آپ کو کھانسی آنے لگی اور آپ نے رکوع فرما دیا ــــــــ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعتوں میں سورۂ قل یا ایہا الکافرون اور سورۂ قل ہو اللہ احد پڑھیں۔ ــــ (صحیح مسلم)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْجُهَنِيِّ قَالَ اِنَّ رَجُلًا مِّنْ جُهَيْنَةَ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ فِي الصُّبْحِ اِذَا زُلْزِلَتْ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا فَلَا اَدْرِيْ اَنَسِيَ اَمْ قَرَأَ ذٰلِكَ عَمْدًا ــــــ رواہ ابوداؤد

معاذ بن عبداللہ الجہنی سے روایت ہو کہ قبیلہ جہینہ کے ایک صاحب نے اُن سے بیان کیا کہ بھوں نے ایک دفعہ صبح کی نماز کی دونوں رکعتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذا زلزلت پڑھتے ہوئے سُنا۔ (آگے ان صاحب نے کہا کہ) مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے بھول کر ایسا کیا یا عمداً آپ نے دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورۃ پڑھی۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام دستور دو رکعتوں میں الگ الگ دو سورتیں پڑھنے کا تھا اس لیے جب ایک دفعہ آپ نے دونوں رکعتوں میں "اذا زلزلت" پڑھی تو ان صحابی کو یہ شبہ ہو گیا کہ آپ نے بھول کر ایسا کیا یا یہ بتانے اور جتانے کے لیے کہ یہ بھی جائز ہے آپ نے عمداً ایسا کیا۔

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ

"چند نقوش و تاثرات"

((از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی))

اسی رمضان المبارک (۱۳۸۱ھ) کے وسط میں مشہور عالم ربانی حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ اُن کے متعلق بہت کچھ لکھا جائے گا اور ان کے تلامذہ و معتقدین اور واقفین کی زبان سے بہت سے ایسے حالات اور کمالات معلوم ہوں گے جن کی دُنیا کو خبر نہیں، مولانا کی زندگی باوجود شہرت و مرجعیت اور اس عام مقبولیت کے جو اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں اور دین کے بے لوث خادموں کو عطا فرمایا کرتا ہے، اور باوجود اس کے کہ ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ نہایت وسیع تھا اپنی بعض خصوصیات اور روحانی کمالات کے اعتبار سے ایک طرح سے اخفاء و گمنامی کی زندگی تھی اور ساری عمر ان کمالات پر پردہ پڑا رہا اور بہت سے قریبی عزیزوں اور روزانہ کے اُٹھنے بیٹھنے والوں کو بھی ان کی خبر نہیں ہوئی، عام طور پر لوگ ان کو ایک واعظ و خطیب اور مفسر قرآن کی حیثیت سے جانتے تھے، لیکن اُن کے اصلی کمالات اور ان کی زندگی کے اُن گوشوں کے جاننے والے بہت کم ہیں جن کی وجہ سے وہ سلف صالحین اور علماء ربانیین کی آخری یادگاروں میں نظر آتے تھے اور جن سے زہد و ورع، خلوص و للہیت، ایثار و قربانی، استقامت و ثابت قدمی اور حق گوئی و بے باکی کی ان روایات کی تصدیق اور ان میں ایک وسیع اضافہ ہوتا تھا جو علماء و مشائخ کے قدیم تذکروں میں منقول ہیں۔

راقم سطور کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ۱۹۲۹ء سے نیاز حاصل تھا اس کو مولانا سے علمی تلمذ اور باطنی تلمذ دونوں کا شرف حاصل تھا، مجھے مولانا کی خدمت میں کئی کئی مہینے بھی قیام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، خط و کتابت اور ان کی شفقتوں کا سلسلہ تو آخیر تک جاری رہا

مدرسہ قاسم العلوم کے زمانہ قیام، فضلاء مدارس عربیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں شرکت اور بار بار کی حاضری اور مولانا کے معتمد اور عزیزوں کے ساتھ تعلقات کے ذریعہ مجھے مولانا کی سیرت کے بعض ایسے پہلو اور ان کی بعض ایسی خصوصیات کا علم ہوا جن کا عام طور پر علم نہیں، ان واقعات اور خصوصیات کا تذکرہ قارئین کیلئے بہت سی حیثیتوں سے مفید ہے اور وہ ان کے اندر ایک نئی ایمانی تازگی اور دینی اعتماد پیدا ہونے کا باعث ہوسکتا ہے، یہاں صرف وہی واقعات اور خصوصیات لکھی جائیں گی جن کا مجھے ذاتی طور پر علم ہوا یا مولانا سے قریب تعلق رکھنے والے کسی ثقہ راوی سے سننے میں آئی ہیں۔

زہد وورع مولانا کا سب سے زیادہ روشن امتیازی وصف جس کی ان کی نظیر اس نسل میں مشکل سے ملیگی، وہ انکا تورع احتیاط اور زاہدانہ و مجاہدانہ زندگی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ انجمن خدام الدین کے بانی تھے اور آخر وقت تک اس کے میر اور صدر انجمن رہے، اس انجمن کی ایک مجلس انتظامیہ تھی جس کے ارکان کو ان پر پورا کامل اعتماد بلکہ ان کی ذات کے ساتھ والہانہ تعلق اور اعتقاد تھا۔ یہ انجمن ایک مدرسہ قاسم العلوم اور ایک مدرسۃ البنات چلاتی تھی۔ اس نے کثیر التعداد تبلیغی رسائل شائع کئے جو لاکھوں کی تعداد میں تقسیم و شائع ہوئے۔ مولانا کا ترجمہ اور حواشی قرآن بھی مقبول ہوئے، رسالہ خدام الدین اس کا ترجمان اور آرگن ہے۔ غرض اس کا سارا سرمایہ، اس کا کتبہ اور اس کی دینی سرگرمیاں سب مولانا کی محنت، اخلاص اور مقبولیت کی رہین منت ہیں، لیکن یہ سن کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ مولانا اس سے ایک پیسہ لینے کے بھی روادار نہیں ہوئے۔ سیاسی انجمنوں نے اسرافی اور رشوت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی مذمت کی، اور اپنی اور اپنی اولاد کے لئے کوئی منفعت حاصل نہیں کی۔ مجھے ان کے ایک قدیم معتمد خاص نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سخت علیل ہوئے، معالج نے آپ کے لئے دوا و غذا کا ایک نظام بنایا جس کی آپ کی زاہدانہ زندگی میں گنجائش نہ تھی، انجمن کے ارکان نے یہ سمجھ کر کہ انجمن اور اس کا سارا کام مولانا کے دم سے ہے، ان کی زندگی ہی سے انجمن کی زندگی اور بقا ہے۔ مولانا کے علاج اور صحت پر کچھ انجمن کے حساب سے خرچ کر دیا۔ مولانا کو بیماری سے افاقہ کے بعد جب اس کا علم ہوا تو نہایت ناراض ہوئے

اور فرمایا کہ تم نے مجھے ناجائز کھلایا اور اس سب کو اپنے پاس سے ادا کیا۔

جب ہم لوگ مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتے تھے تو بعض اوقات ملازمین اور واقفین حال سے معلوم ہوتا کہ مولانا کے یہاں کسی کسی وقت فاقہ ہو جاتا ہے، بعض اوقات ہم طلبہ کے لئے بڑی فراوانی کے ساتھ کھانے پکتے اور ہم سب آسودہ ہو کر کھاتے لیکن یہ مجال نہ تھی کہ مولانا کے یہاں اس میں سے ایک دانہ بھی پہونچ جاتا اور ان کے گھر کا کوئی بچہ اس کھانے سے مستفید ہوتا جو ان کی معنوی اولاد شکم سیر ہو کر کھاتی۔ حالانکہ مولانا کا دولت خانہ مدرسہ کے بالکل عقب میں تھا اور درمیان میں صرف ایک تپلی سی گلی تھی۔

ہم لوگوں کو خوب اندازہ تھا کہ مولانا کے یہاں عسرت اور نہایت سادگی کے ساتھ گذران ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ اخفاء حال اور تکلیف سے بچانے کے لئے مولانا اپنے عزیز مہمانوں کے کھانے کا انتظام باہر کرتے اور انجمن کے کسی خادم یا مسجد کے کسی منتظم کو کچھ نقد عنایت فرما دیتے، جس سے ان مہمانوں کی میزبانی ہوتی رہتی، مجھے ایک مرتبہ اچانک اس کا اندازہ اور علم ہوا کہ مولانا کے گھر میں عام طور پر کیسی گذران اور کیا معیار زندگی ہے۔ رمضان مبارک میں غریب مسلمانوں کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ اہتمام اور تکلف ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں میں نے اتنا بھی اہتمام نہیں پایا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ رمضان مبارک میں میں مولانا کی خدمت میں مقیم تھا۔ مولانا نے ایک روز فرمایا کہ آج کھانا میرے ساتھ کھائیے گا، افطار ہم لوگوں نے پنجاب کے رواج کے مسجد میں پانی یا چھوہارے سے کر لیا۔ نماز مغرب کے بعد مولانا نوافل میں مشغول ہو گئے فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب میں گھر میں اطلاع دینا بھول گیا کہ آج آپ ساتھ کھانا کھائیں گے۔ یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ فرمایا۔ کھانا آیا تو صرف روٹی اور دال کا پیالہ تھا جو غالباً اسی کی تھی اسی وقت دہی کا میری خاطر اضافہ کیا گیا ہو۔ مولانا نے کھانا کھاتے ہوئے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن صاحب (مولانا اکثر مجھے اسی طرح یاد فرماتے تھے) ہم سے تو یہ دال اچھی ہے کہ یہ جس مقصد کے لئے پیدا کی گئی تھی اس کو اس نے پورا کر دیا۔ مگر ہم نے اپنی زندگی کا مقصد پورا نہیں کیا۔ اس کے بعد بغیر کسی معذرت کے کھانے میں شریک ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ آج کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

مولانا جیسا کہ عرض کیا گیا کہ انجمن خدام الدین سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے نہ مسجد یا کسی اور ادارہ سے کچھ قبول فرماتے تھے بعض واقفین حال نے پتہ بتایا تھا کہ مولانا کوئی کوئی ٹیوشن کرتے ہیں یا ہفتہ کے کسی ایک دن کوئی مزدوری کر لیتے ہیں جس سے بقیہ دن گذران ہو سکے، باوجود قرب کے ہم لوگوں کو اس کا کبھی صحیح علم نہیں ہو سکا۔ اس بارہ میں توکل اور صبر و قناعت کی وہ مسنی روش پر قائم تھے جو اہل اللہ کی ہمیشہ سے روش رہی ہے۔

طمع دنیا اور مشتبہ مال سے احتیاط سے زیادہ مشکل غیبت سے اجتناب و احتراز ہے خصوصًا ان لوگوں کے لئے جو غفلت اور گوشہ گیری کی زندگی نہ گذارتے ہوں ان کا مختلف طبقوں اور کثیر التعداد لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو، یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی جب کسی طبقہ یا فرد سے اعتقادی اور اصولی اختلاف بھی ہو اور اس کے ساتھ صریح ظلم کیا گیا ہو مولانا کو ان نازک موقعوں پر بھی ہمیشہ غیبت اور شکایت سے مجتنب اور محتاط پایا۔ درس میں ہر طرح کا تذکرہ آتا، تردید اور تنقید بھی ہوتی لیکن ایک موقع پر بھی مولانا کو اپنے کسی شدید سے شدید مخالف کی بھی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا گیا، احتیاط اور تورع کا ایک حیرت انگیز واقعہ ان کے رفقائے کار سے سننے میں آیا۔ لاہور میں ایک مرتبہ مولانا اور ان کی انجمن خدام الدین کے خلاف لاہور کے چند علماء اور ان کے خدام نے ایک سخت ہنگامہ اٹھایا۔ انجمن نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو اس وقت ڈابھیل میں تھے اپنے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا، مخالفین نے ان کو انجمن سے بدظن کرنے کی پوری کوشش کی اور بعض لوگوں نے ذاتی تعلقات سے کام لیکر مولانا کی اور انجمن کی شکایات لکھ بھیجیں اور ان کو غلط معلومات مہیا کیں۔ انجمن کے منتظمین نے یہ مناسب سمجھا کہ مولانا احمد علی صاحب خود ڈابھیل چلے جائیں اور اس طویل سفر میں شاہ صاحب کو حقیقت حال سے مطلع کر دیں۔ تاکہ معاندین انکی تشریف آوری سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ مولانا تشریف لے گئے اور ساتھ تشریف لائے انجمن کے ذمہ داروں کو اطمینان تھا کہ شاہ صاحب مولانا کے ذریعہ اصل واقعات سے واقف ہو گئے ہیں اور ان کو سب حال بتا دیا گیا ہے۔ لیکن ان حضرات کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنے مخالفین کے متعلق اس طویل سفر کی فرصت اور طویل رفاقت

صحبت کے باوجود ایک لفظ نہیں کہا۔ اور شاہ صاحب حقیقت حال سے بالکل بے خبر ہیں۔

بے لوث دینی خدمت مولانا کا شروع سے یہ عقیدہ تھا اور اس کا اظہار اکثر اپنے درس میں فرماتے تھے کہ دین کے خادم اور مبلغ کی تاثیر اور قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اپنے سامعین یا حلقۂ تبلیغ سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہ اٹھائے اور ان کے کسی احسان، خاطر مدارات اور خدمت وضیافت کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ مولانا اس اصول پر اس سختی سے کاربند تھے کہ نہ اپنے داعیوں سے کرایہ لیتے تھے نہ ان کی ضیافت قبول فرماتے تھے۔ ہم لوگوں کی تربیت کے لئے بعض مرتبہ فرمایا کہ میں کہیں تبلیغ و وعظ کے لئے جاتا ہوں تو ایک گلاس شربت کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک عرصہ تک مولانا کا یہ معمول رہا کہ کرایہ اپنے پاس سے صرف کرتے اور اس کے لئے بعض اوقات آپ کو خاصی مدت انتظار کرنا پڑتا۔ پٹنہ یا اس کے اطراف کے ایک سفر کا واقعہ بیان فرماتے تھے (تقسیم ہند سے پہلے) کہ وہاں ایک مخلص دوست نے مجھے بلایا۔ مجھے جتنے دن قیام کرنا تھا اس کے حساب سے میں گھر سے آٹے کی میٹھی ٹکیاں پکوا کر لے گیا تھا۔ چنانچہ پورے زمانہ قیام میں یہی میری خوراک رہی اور مجھے کسی کا مہمان بننے کی یا بازار میں کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

مولانا تبلیغی سفر میں بھی کسی کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک سفر میں کسی مخلص دوست نے چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے ایک رقم دی مجھے خیال ہوا کہ میں اگر برسر مجلس اس کو واپس کر دیتا ہوں تو ان کی سبکی اور دل شکنی ہوگی میں نے اس کو قبول کر لیا اور لاہور آکر ان کو کوپن پر یہ لکھ کر وہ رقم واپس کر دی کہ میں نے مصلحتاً یہ رقم اس وقت قبول کر لی تھی اب واپس کر رہا ہوں۔

مولانا ہم طلبہ کو کبھی کبھی اپنے بعض ایسے واقعات سناتے جن سے ہمارے اندر اپنے علمی و دینی منصب کا احترام اور اس کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان واقعات کا بڑا اثر پڑتا ہے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک مرتبہ سنایا کہ حکومت پنجاب کے بڑے عہدیدار اور رئیس نواب مظفر خاں نے اپنے کسی صاحب زادہ یا صاحبزادی کے نکاح کے لئے مجھے بلایا میں جب مجلس میں داخل ہوا تو بڑے بڑے عمائد شہر اور عہدیداران حکومت

موجود تھے انھوں نے مجھے اسی بے پروائی اور استخفاف کی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ مولویوں اور نکاح خوان قاضیوں کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ خطبۂ نکاح اور ایجاب قبول کے بعد نواب صاحب نے ایک معقول رقم جو نوٹوں کی گڈی کی شکل میں تھی مجھے پیش کی۔ میں نے مناسب طریقہ پر اس کے لینے سے معذرت ظاہر کر دی اور ضروری سمجھا کہ اہل مجلس پر بھی یہ بات واضح ہو جائے کہ علماء کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کی اجرت قبول کریں، اس سلسلہ میں میں نے ایک مختصر سی تقریر بھی کی، اہل مجلس کے لئے یہ نیا تجربہ تھا۔ نواب صاحب پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بڑے احترام کے ساتھ مجھے پہونچانے آئے۔ اور معذرت کی۔

مولانا جب کبھی کسی دینی دعوت پر تشریف لے جاتے تو کوشش کرتے تھے کہ وہ تمام رسوم و تکلفات سے بچے رہیں، جن کو داعی حضرات اور انجمنیں، علماء اور مقررین کے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ آپ کو کسی شہر میں مدعو کیا گیا آپ گاڑی سے اترے استقبال کرنے والے اسٹیشن پر موجود تھے۔ آپ نے منھ پر رومال ڈال لیا اور خاموشی سے کسی ایک طرف سے نکل کر قیام گاہ تک پہونچ گئے۔ استقبال کرنے والے جب مایوس ہو کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا احمد علی صاحب تشریف لا چکے ہیں۔

درس و اشاعت قرآن کریم

مولانا نے تقریباً نصف صدی قرآن مجید کی خدمت و اشاعت اور دینی دعوت و اصلاح کا کام کیا اس بارے میں ایسے انہماک شغف و محویت، ثبات و استقامت کا ثبوت دیا جو بغیر اعلیٰ درجہ کی عزیمت، یقین و للّٰہیت اور روحانی قوت کے مشکل ہے، جب انگریزی حکومت نے ان کو دہلی سے جلا وطن کر کے (جہاں وہ مولانا عبید اللہ صاحب کے جانشین کی حیثیت سے قرآن مجید کے مضامین کی اشاعت اور جہاد و حریت کی تلقین کر رہے تھے) لاہور پہونچایا تو آپ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ آپ شیرانوالہ دروازہ میں اس مسجد میں منتقل ہوئے جو لائن والی مسجد یا سبحان خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا مسقف حصہ نہایت مختصر تھا جو اب بھی موجود ہے۔ رفتہ رفتہ آپ کے درس نے شہر میں عام مقبولیت حاصل کرنی شروع کی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ پنجاب کا سب سے بڑا درس قرآن بن گیا۔ جہاں تک

ہم کو معلوم ہے آپ ہی کی وجہ سے پنجاب میں درس قرآن کا ذوق عام ہوا اور جگہ جگہ اس کی بنیاد پڑی۔ یہاں تک کہ کسی بڑی مسجد اور پڑھے لکھے مسلمان محلے کے لئے درس قرآن ایسا ضروری کام ہو گیا جس کے بغیر مسجد آباد اور خطیب کامیاب اور مفید نہیں سمجھا جاتا۔ معمولاً آپ کے درس کے دو اوقات تھے۔ ایک فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد۔ یہ عام درس تھا اور ایک مغرب کے بعد یہ انگریزی داں طبقہ اور کالجوں کے طلبہ کے لئے مخصوص تھا۔ اس درس میں صرف جمعہ کے دن ناغہ ہوتا تھا یا جب مولانا سفر میں ہوں۔ اس کے علاوہ چھٹی یا ناغہ کا کوئی دستور نہ تھا۔ بعض اوقات گھر میں میت رکھی ہوئی ہے اور مولانا اپنے درس کا معمول پورا فرما رہے ہیں درس کے بعد جنازہ کی اطلاع دیتے ہیں اور لوگ میت کے جنازہ میں شریک ہوتے ہیں۔

آخر شعبان سے ایک نئے درس کا اضافہ ہوتا تھا "یہ علماء کرام کی کلاس کہلاتی تھی" یہ آخر شعبان سے شروع ہو کر غالباً آخر شوال میں ختم ہوتا تھا۔ یہ درس تین تین چار چار گھنٹے جاری رہتا تھا۔ مولانا کا معمول تھا کہ پہلے امتحان لیتے پھر سبق پڑھاتے۔ اس درس میں صرف مدارس عربیہ کے فارغین اور آخری درجوں کے مستعد طالب علم لئے جاتے تھے۔ ان کی تعداد معمولاً پچاس دسو کے درمیان ہوتی تھی۔ آخر میں آخری امتحان ہوتا تھا اور پھر کسی صاحب نسبت بزرگ کے ہاتھ سے سندیں دی جاتی تھیں۔ یہ سند مطبوعہ ہوتی تھی۔ اس کا مضمون جو عربی میں تھا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور غالباً حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے دستخط تھے۔

کبھی کبھی اثناء سال میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس ہوتا تھا۔ مولانا کو اس کتاب کا بھی بڑا ذوق تھا اور انھوں نے بڑی محنت سے اس کو اپنے استاد و مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے پڑھا تھا۔ اور بڑے جوش اور ولولے سے پڑھاتے تھے۔ یہ درس بھی طویل ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹے مسلسل جاری رہتا تھا۔ آخر میں اس کا بھی لاہور کے کوئی ممتاز عالم امتحان لیتے تھے اور نمبر دیتے تھے۔ راقم سطور کو بھی اس درس میں شرکت کرنے اور امتحان دینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حجۃ اللہ کے علاوہ شاہ صاحب کی فوز الکبیر اور مؤطا مالک کا درس بھی بڑے ذوق و شوق سے دیتے تھے۔

قرآن مجید کے درس میں مولانا اپنے استاد مولانا عبید اللہ سندھی کے پورے متبع اور پیرو تھے اور ان کو ان کے طرز پر بڑا اعتماد تھا اس طرز کی خصوصیت الاعتبار والتاویل کے طرز پر (جس کی مثالیں صوفیاء کرام کی کتابوں اور ان کے منصوفانہ نکات اور استنباطات میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں) سیاست اور واقعات حاضرہ کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید پر غور و فکر کرنا اور اس سے سیاسی اشارات اور رہنمائی حاصل کرنا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرز میں صاف وہ اثرات جھلکتے ہیں جو تحریک خلافت کے دور کی انگریز دشمنی اور اسلامی حکومت کے قیام اور آزادی کی والہانہ خواہش کا نتیجہ تھے اور ان سے وہ سیاسی استغراق ظاہر ہوتا تھا جو اس عہد کی خصوصیت ہے ان استنباطات کی علمی و تفسیری قدر و قیمت کے متعلق خواہ کوئی کتنا ہی شبہ کرے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا احمد علی صاحب کی گہری روحانیت، قلبی تاثیر اور ان کا جذبہ اس پر ایسا حاوی تھا کہ وہ درس روحانی و اخلاقی طور پر طلبہ کیلئے بڑے بڑے علمی درسوں سے کہیں زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوتا تھا۔ خاص طور پر مولانا جب توحید خالص کا مضمون بیان کرتے (جس کی تقریب مولانا اپنے دعوتی جذبے کی بناء پر اکثر پیدا فرمایا کرتے اور قرآن مجید کے مضامین ان کی مدد کرتے) اہل اللہ خصوصاً اپنے سلسلہ کے مشائخ کے تعلق باللہ، توکل اور روحانیت کے واقعات بیان کرتے یا الحب للہ البغض للہ کا مضمون بیان فرماتے اور اس سلسلہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی تفسیر بیان فرماتے اور حکومت برطانیہ کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے تو قلب پر عجیب اثر ہوتا اور یہی اس درس کی اصل قدر و قیمت تھی۔ اہل اللہ کے واقعات میں ایسا سوز و گداز ہوتا کہ اس سلسلہ کے مضامین کبھی کا اثر رکھتے تھے اور ان سے ذکر الٰہی و خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، راقم سطور کو جو اس سے پہلے ایک خالص ادبی، علمی ماحول میں رہا تھا مردان خدا کی خدمت میں حاضر ہونے ان سے تعلق پیدا کرنے اور اپنے نفس کی اصلاح کا شوق اسی درس سے پیدا ہوا اور یہ اس درس کا احسان عظیم ہے۔ بعد میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں ترجمہ اور تفسیر قرآن کے سباق سپرد ہوئے تو اس درس سے مجھے مدد ملی۔

تبلیغی و اصلاحی خدمات | مولانا سے اللہ تعالیٰ نے جو سب سے بڑا کام لیا وہ عقائد و

رسوم کی اصلاح اور توحید و سنت کی اشاعت ہے وہ حضرات دیوبند کے مسلک پر پورے طور پر عامل اور اس کے پرجوش مبلغ اور داعی تھے۔ توحید میں ان کا ذوق اور رجحان حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بچھراں) سے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ بھی بہت محبت فرماتے تھے اور انجمن خدام الدین کے جلسوں میں آیا کرتے تھے۔ راقم سطور کے محدود علم میں پنجاب اور سندھ میں جتنا مولانا کے مواعظ اور ان کے تبلیغی رسائل اور درس قرآن اور رشد و ارشاد کے تعلق سے دینی نفع پہونچا۔ کم لوگوں سے اتنا نفع پہونچا ہوگا۔ توحید و سنت کی صاف و بے لاگ دعوت کے ساتھ ان میں تصوف کی چاشنی سیاست اور حالات حاضرہ کی بصیرت، اخلاق کی وسعت اور عوام و خواص سے مناسبت بھی جمع تھی جس نے ان کے حلقہ اصلاح کو بہت وسیع اور متنوع بنا دیا تھا۔

افادہ و اصلاح کا ایک بڑا موثر ذریعہ آن کے جمعہ کے خطبات تھے۔ میرے علم میں لاہور کی کسی مسجد میں اتنا کثیر مجمع اتنے ذوق و شوق کے ساتھ خطبہ سننے نہیں آتا تھا مولانا عربی کے خطبہ جمعہ سے پہلے پورے ایک گھنٹہ تقریر کرتے تھے۔ تقریر زندگی اور واقعات سے قریبی تعلق رکھتی تھی اس میں معاشرہ کی خرابیوں اور لوگوں کے اخلاقی و دینی بیماریوں کی نشان دہی ہوتی تھی اور غلط رجحانات حکومت وقت کی بے دینی اور اسکے انحراف پر اتنی صاف اور کھلی ہوئی تنقید ہوتی تھی جس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل ہے۔ بولنے والے کا اخلاص، اس کی بے غرضی، اعتماد علی اللہ، نتائج و عواقب سے بے نیازی اور دین کیلئے دل سوزی اور دردمندی، لوگوں کو مسحور کر لیتی تھی، بہت سی آنکھیں اشکبار نظر آتی تھیں اور بہت سے سر ندامت سے جھکے ہوئے۔ انگریزوں کے عہد اور قیام پاکستان کے زمانہ میں مولانا کی یہ حق گوئی اور بے باکی یکساں طور پر قائم رہی اس میں نہ حکومت کی تمیز تھی نہ جمہور کی۔ اہل شہر کی اخلاقی پستی تعیش کے رجحان اور اسلامی قانون کی مخالفت کو بڑی بے باکی اور صفائی سے بیان فرماتے تھے، بد اخلاقی اور فسق و فجور کے مرکزوں کو شمار کر کے بتاتے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتے۔ اکثر درس میں فرماتے۔ اے اٹھارہ لاکھ لاہوریو!

میں تم میں چھیالیس برس سے رہتا ہوں اور قرآن سناتا ہوں لیکن انسان کی صورت کو ترستا ہوں تم سب کچھ ہو لیکن انسان نہیں ہو۔ مولانا کی تقریر یہ سن کر اکثر اقبال کا یہ شعر یاد آتا ۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اسی حق گوئی کی پاداش میں مولانا انگریزوں کے عہد میں بھی کئی مرتبہ جیل گئے اور پاکستان بننے کے بعد بھی (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل تشریف لے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت دار و رسن کے لئے تیار بیٹھے ہیں، آخر دور میں علماء کی تنظیم فرمائی اور پاکستان کے مختلف مقامات پر تقریر کر کے حکومت پاکستان کی دینی مداخلت کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی۔

اپنے اساتذہ اور مشائخ سے تعلق

جن خوش نصیبوں کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور درس و مجالس ذکر میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ واقف ہیں کہ مولانا کو اپنے علمی و روحانی مربیوں اور محسنوں سے کتنا گہرا اور والہانہ تعلق تھا۔ یہ ان کی فطری سعادت و فاداری اور شرافت نفس کی دلیل تھی۔ اپنے استاد اور مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا اور ان کے طریقہ درس کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہونچا دیا، مولانا عبید اللہ صاحب کے ہندوستان آمد کے موقع پر جب کہ وہ شیخ وقت اور مرجع خلائق بن گئے تھے ایک ادنی طالب علم اور خادم کی طرح اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا۔ اگرچہ ایک موقع پر انھوں نے اپنے استاد سے اختلاف کیا اور جمعیۃ العلماء کے مسلک پر قائم رہے۔ لیکن یہ ایک اصولی اختلاف تھا جس کا ان کے ذاتی تعلق اور نیاز مندی پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ اور آخر تک ان کے ادب، و احترام اور بزرگ داشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا سندھ کے مشہور قادری راشدی سلسلہ میں مجاز تھے اور ان کو اس سلسلہ کے

دو مشائخ کبار حضرت سید تاج الدین محمود امروٹی اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری سے خلافت حاصل تھی، مولانا کا مشکل سے کوئی درس اور کوئی مجلس ذکران دونوں حضرات کے تذکرہ سے خالی جاتی تھی. تذکرہ بھی ایسے والہانہ اور عاشقانہ انداز میں جس سے ان کی قلبی کیفیت اور گہری عقیدت صاف جھلکتی تھی وہ اپنے کو بالکل انکا پروردۂ نعمت اور ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے اور ان کا ہر بن مو ان کے تشکر اور تعریف سے رطب اللسان تھا برسوں گزر جانے اور ہزاروں بار تذکرہ کرنے کے باوجود اس میں وہی تازگی اور رچاشنی تھی اور مولانا کبھی اس تذکرہ سے سیر نہ ہوتے تھے گویا مولانا کا عمل اس شعر پر تھا۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ
ھو المسک ما کررتہ یتضوع

ادب و تواضع

مولانا جہاں اہل دنیا اور اہل دول کے سامنے بڑے خوددار اور غیور واقع ہوئے تھے اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے علماء حق سے نہایت جھک کر اور فروتنی کے ساتھ ملتے تھے اور ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ان کو اپنے اساتذہ کی صف میں سمجھتے ہیں اور اپنے کو ان کے سامنے ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

معاصر علماء و مشائخ میں سے ان کو دو شخصیتوں سے بےحد عقیدت تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا معاملہ کرتے تھے ایک حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک ہمارے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہ۔ دیکھنے والوں نے بارہا دیکھا ہے کہ مولانا حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ دوزانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے ہیں جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے۔ اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بقدر ضرورت جواب دیا پھر خاموش ہو گئے مجھے یاد نہیں کہ ابتدا کوئی سوال کیا ہو یا کسی

گفتگو میں حصہ لیا ہو۔

مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بڑے معتقد اور ادب شناس تھے جب تک شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زندہ رہے ان کی خدمت میں مخلصانہ حاضری دیتے رہے اور اپنا بڑا سمجھتے رہے۔ لاہور میں جن علماء سے کچھ استفادہ کیا تھا یا جن کو عالم یا اہل حق میں سمجھتے تھے ان سے بھی خوردی اور نیازمندی سے ملتے تھے۔

مشغولیت و مقبولیت مولانا کی زندگی حد درجہ مشغولیت و انہماک اور مجاہدہ و محنت کی زندگی تھی درس کے علاوہ ملاقاتیں، مسائل شرعیہ کا جواب، تلقین ذکر، لوگوں کے حالات کا استفسار اور ہمدردی، غرض مشاغل کا ایک سلسلہ تھا جو برابر جاری رہتا بعض وقت ملاقات کے شائقین کو جو دور دور سے آتے تھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور دیر دیر میں باری آتی، میں نے سنا ہے کہ آخر میں نہایت سربرآوردہ اور صاحب وجاہت اشخاص کو کئی کئی دن کے انتظار کے بعد ملنے کا موقع ملتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مقبول بندوں کے ساتھ معاملہ ہے آخر میں مقبولیت اور رجوع خلائق بہت بڑھ گیا تھا، مولانا کو زائرین اور معتقدین کے ہجوم اور ان کی کاربرآری سے کھانے اور سونے کی فرصت ملنی مشکل ہو جاتی تھی۔ اور نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا تھا۔ بعض دن ناشتہ کی نوبت نہ آتی اور بعض وقت کھانا وقت سے بے وقت ہو جاتا۔ جنازہ میں لوگوں کا پروانہ وار ہجوم اور اجتماع عظیم تو وہ منظر تھا جو لاہور کے عظیم شہر نے مدت دراز سے نہیں دیکھا تھا اور شاید مدت دراز تک نہ دیکھے وہ جب لاہور آکے یا لائے گئے تھے تو تنہا تھے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا تھا لیکن جب اس شہر کو داغ مفارقت دیا تو اللہ کے بندوں کا اتنا بڑا مجمع تھا جس کا شمار آسان نہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا
فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝

شیخ احمد سرہندیؒ

مجدّد الف ثانیؒ

(از: جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ)

(آخری قسط نمبر (۸))

سانحۂ ارتحال وفات سے دس برس قبل ۱۰۲۴ھ میں شیخ مجددؒ نے فرمایا تھا:-

"چناں دانمودند و دہ گردانیدند کہ قضائے مبرم عمر زندگانی

شصت و سہ سالگی ست"[۱]

(مجھے الہام کیا گیا ہے اور کھول کے بتا دیا گیا ہے کہ میری عمر اور اجل مقدر ۶۳ سال)

پھر ۱۰۳۳ھ میں جب آپ کا قیام لشکر شاہی میں اجمیر میں تھا ایک دن فرمایا:-

"ہمارے انتقال کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں" اور صاحب زادگانِ گرامی قدر خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو سرہند تحریر فرمایا:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم کو دنیا کا اجازت نامہ دینے کے بجائے آخرت کا اجازت نامہ دیا گیا"[۲]

اس مکتوب کے پہنچتے ہی دونوں صاحبزادے خدمت بابرکت میں اجمیر شریف حاضر ہوئے

---

[۱] خواجہ محمد ہاشم کشمی۔ زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ ص ۲۸۲

[۲] خواجہ بدرالدین۔ حضرات القدس، مطبوعہ لاہور ۱۳۳۱ھ ص ۱۲۲

شیخ مجددؒ نے چند روز ان کو خلوت میں رکھا، پھر فرمایا:۔

"مرا اکنوں بہیچ گونہ نظرے و بہیچ وجہ بستگی بہ ایں جہاں نماندہ۔ می باید بہ آں جہاں شد و آثار رفتن ہا نیز مشہود می گردد"[1]

(مجھے اس دنیا سے کسی نظر اور کسی جہت بھی دلچسپی نہیں رہی اُس دوسرے جہاں کی خواہش ہے اور جانے کے آثار بھی مشاہدہ میں آرہے ہیں۔)

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ انہیں دنوں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ (م ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) کی درگاہ میں آپ مراقب تھے، اسی دن مزار مبارک کی چادر بدلی گئی، جب شیخ مجددؒ مراقبہ سے فارغ ہوئے تو درگاہ کے خادموں نے وہ چادر آپ کی نذر کی، آپ نے آہ سرد کھینچی اور فرمایا:۔

"لباسے ازیں نزدیک تر بہ حضرت خواجہ نبود لاجرم آں را بما لطف نمودند، برائے تکفین ما نگاہ میداشتہ باشید"[2]

(حضرت خواجہ سے نزدیک تر کوئی اور لباس بہ نسبت اس کے نہ تھا وہی عنایت فرمادیا، مجھے کفن دینے کے لئے اس کو محفوظ رکھا جائے۔)

خواجہ محمد ہاشم کشمی فرماتے ہیں کہ اجمیر شریف کے زمانہ قیام میں ایک رات حجرۂ شریف کے قریب گیا تو اندر سے گریہ وزاری کی آواز آرہی تھی، کان لگا کر سنا تو آپ زار و قطار رو رہے ہیں اور یہ شعر زبان مبارک پر جاری تھا ؎

با دو روز زندگی جانے نہ شد سیر از غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتے

اللہ اللہ! غم محبوب کی طلب تو دیکھو کہ عمر جاودانی کی آرزو بھی کی تو غم جاناں کے لئے!

۱۰۳۲ھ میں شیخ مجدد جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) سے اجازت لے کر واپس سرہند تشریف لے آئے اور یہاں آکر خلوت گزیں ہوگئے، خلوت خاص میں صرف مخدوم زادگان، خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ اور دو تین خادموں کو باریابی ہوتی تھی، صوبہ دکن میں کچھ اختلال ہوا تو خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے

---

[1] زبدۃ المقامات ص۲۸۲ [2] زبدۃ المقامات ص۲۸۳

اپنے گھر واپس جانے کے لئے اجازت طلب کی اور دعا کی درخواست کی، شیخ مجددؒ نے آہ سرد بھر کر فرمایا:۔

"دعا کنم کہ در آخرت باہم یک جا جمع شویم"[1]

(میں دعا کرتا ہوں کہ آخرت میں ہم ایک ہی جگہ جمع ہوں۔)

اس کے بعد خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ اواخر رجب ۱۰۳۳ھ میں رخصت ہو گئے، رباعی

خرّمی شگفتہ از دبستاں رفتیم صبحے شگفتہ از گلستاں رفتیم

آوخ کہ چو آہ سرد اصحاب خمار ناخوردہ شراب از دل مستاں رفتیم

اس کے بعد کے حالات خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے زبدۃ المقامات میں خواجہ بدر الدین سرہندیؒ کے بیان کے حوالہ سے لکھے ہیں جو شیخ مجددؒ کے خلفاء میں ہیں اور ایک زمانہ تک آپ کی صحبت میں رہے ہیں، خواجہ موصوف فرماتے ہیں کہ ماہ شعبان ۱۰۳۳ھ کی پندرھویں شب کو شیخ مجددؒ آدھی رات کے وقت مکان کے اندر تشریف لائے، اہلیہ محترمہ مصلے پر تشریف فرما تھیں، انھوں نے فرمایا:۔

"امشب کہ شب تقدیر آجال و آمال است خدا داند کہ نام کرا از ورق ہستی محو کردہ باشند و نام کرا ثابت داشتہ"[2]

(آج کی رات جو عمروں اور آرزوؤں کے بارہ میں فیصلوں کی رات ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کا نام صفحۂ ہستی سے محو کیا گیا، اور کس کا نام ثابت رکھا گیا)

شیخ مجددؒ نے یہ سن کر فرمایا:۔

"شما بشک و تردد می گوئید چہ باشد حال آں کس کہ معائنہ می بیند کہ نام او را از صحیفۂ زندگانی ایں جہانی محو ساختند"[3]

(تم تو یہ بات شک کے ساتھ کہہ رہی ہو، اس بندہ کا کیا حال ہوگا جس نے گویا آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا نام اس دنیا کی زندگی کے صفحہ سے مٹا رہے ہیں۔)

---

[1] زبدۃ المقامات ص۲۹۵ [2] زبدۃ المقامات ص۲۸۵-۲۸۶ وحضرات القدس ص۱۱۱ [3] ایضاً

وسط ذی الحجہ ۱۰۳۳ھ میں ضیق النفس کا عارضہ شدت اختیار کر گیا، جس قدر مرض شدت اختیار کرتا جاتا، شوق لقائے محبوب بھی بڑھتا جاتا تھا اور اللھم بالرفیق الاعلیٰ زبانِ مبارک پر جاری تھا۔ شوقِ وصال میں ایک دن فرمایا:۔

"اگر حکیم یہ کہے کہ تیرا مرض قابل علاج نہیں ہے تو خدا کا شکر ادا کروں گا"[1]

اور شدت اشتیاق میں زبان گہربار پر یہ مصرع جاری تھا۔ ع

آج ملاوا کنت سون سکھی سبھ جاگ دینوں دار

۱۲ محرم الحرام ۱۰۳۴ھ کو فرمایا:۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ چالیس پچاس دن کے اندر اندر تو اس جہان سے رخصت ہو جائے گا" (زبدۃ المقامات)

چالیس روز گزرنے کے بعد ۲۲ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو فرمایا:۔

"چالیس روز تو گزر گئے ہیں دیکھیں سات آٹھ روز میں کیا پیش آتا ہے"

(زبدۃ المقامات)

۲۳ صفر المظفر جمعرات کے دن فقراء میں کپڑے تقسیم کئے، تنفس کی شکایت کے ساتھ ساتھ بخار بھی ہو گیا، ۲۸ صفر کی رات کو تہجد کے وقت بیدار ہوئے، بخار کی حالت میں کھڑے ہو کر نماز تہجد ادا کی اور فرمایا:۔

"ایں آخریں تہجد ماست"[2] (تہجد کی یہ آخری نماز ہے)

اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عظیم الشان جذبہ تھا، آخری وقت صاحبزادگان کو وصیت فرمائی:۔

"سنت را بدنداں خواہند گرفت"[3] (سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں)

پھر اپنی قبر کے لئے وصیت فرمائی:۔

"قبر مرا در جائے گمنام خواہند مقرر داشت"[4] (میری قبر کسی گمنام جگہ میں طے کی جائے)

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۸۶ [2] ص ۲۸۹ [3] ایضاً ص ۲۸۹ [4] ایضاً۔

صاحبزادگان کو کچھ تامل ہوا تو فرمایا :-

" اگر چنیں نہ کنید بیرون شہر نزدیک والد بزرگوار دفن کنید یا بیرون شہر در باغ تربت من نقرہ دارید و قبر مرا خام گذارید تا بزودی اندک زمانے ازاں نشانے نماند"[1]

(اگر اس کرنے پر تم لوگ راضی نہیں تو پھر والد بزرگوار کے قریب شہر کے باہر دفن کر دینا یا باغ میں، اور میری قبر کو کچا رکھنا تاکہ تھوڑی مدت کے بعد اس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔)

سبحان اللہ! فنا کے کس درجہ پر تھے کہ نشان قبر تک گوارا نہیں، مگر جو اُس بے نشان کے عشق میں مبتلا ہیں ان کا نام و نشان مٹانا گردش دوراں کے بس میں نہیں ہے

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۲۸ صفر المظفر دوشنبہ کے دن جس دن آپ کا وصال ہوا، رات کو خادموں کو بلا کر فرمایا :-

" بسیار محنت کشید ہمیں محنت امشبہ است و بس"[2]

(تم لوگوں نے بہت تکلیف اٹھائی، بس آج کی رات اور باقی ہے۔)

۲۹ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ دوشنبہ کے روز آپ کی حالت زیادہ نازک ہوگئی تو خواجہ محمد سعید (م ۱۰۷۰ھ) نے عرض کیا :-

" حال شریف چگونہ است ؟" (زبدۃ المقامات)

(مزاج مبارک کیسا ہے ؟)

جواباً ارشاد فرمایا :-

" خوبیم، ہمیں دو رکعت نماز کہ کردہ ایم کافی است"[3]

(میں اچھے حال میں ہوں، وہ دو رکعت نماز جو ہم نے ادا کی ہے کافی ہے۔)

---

[1] زبدۃ المقامات صفحہ ۲۸۹-۹۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۹۲ [3] ایضاً صفحہ ۲۹۲

اس کے بعد آپ نے کلام نہیں فرمایا اور ذکر اسم ذات شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد جان عزیز جان جاناں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بہ ہر بہار گلی از رگل بر آرد و سر
گلے برفت کہ نہ آید بصد بہار دگر

کیفیت غسل | شیخ مجددؒ کی کیفیت غسل بھی قابل ذکر ہے، مکا تعیشون تموتون خواجہ بدرالدین علیہ الرحمہ غسل کے وقت موجود تھے، وہ پانی دے رہے تھے اور شیخ مجددؒ کے بھتیجے شیخ بہاء الدین غسل دے رہے تھے، شیخ بدرالدین کا بیان ہے کہ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے اس طرح نقل کیا ہے۔

"چوں غسال آں بدن انور را تختۂ غسل آورد و جامہا را از تن مبارک برکشید، ہمہ حاضراں معائنہ دیدند کہ آں حضرت بر شیوۂ نماز دست بستہ بودند و ابہام و خنصر دست برگر در سخ دست چپ حلقہ دادہ، حال آں کہ حضرات مخدوم زادہا بعد ارتحال دست ہائے ایشاں را دراز کردہ بودند در زمان خوابانیدن بر تختہ تبسم نمودند و مرتے ہم چناں تبسم بودند چناں کہ فریاد از حاضراں برآمد۔ ایں قصہ مصداق ایں قطعہ گردید۔

یاد داری کہ وقت آمدنت ہمہ خنداں بدند تو گریاں
ہم چناں زی کہ وقت رفتن تو ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

دست ہائے شریف را غاسل کشادہ راست کردہ بر پہلو مضطجع گردانیدہ غسل جانب یمین دادہ چوں بجانب یمین خوابانیدتا یسار را نیز غسل دادہ باز مرئی حاضراں گردید کہ دست ہائے شریف بحرکت ضعیفہ کہ از قوت ولایت کاملہ ایشاں قوی بود متحرک شد تا ہم آمد والطریق سابق ابہام و خنصر یمین بر رسغ یسار حلقہ گشت و حال آں کہ چوں انطجاع بر یمین بود دیافتہ کہ دست راست بر چپ نی ایستاد با وجود آں کہ دست ہائے لطیف، از غایت نرمی از موم و برگ گل ملائم تر بود ولیکن بقوتے مقبوض شدہ بود کہ افتادن و جدا شدن امکان نداشتہ، وقتے کہ کفن پوشانید؟

اند آں وقت نیز آں قبض بظہور رسیدہ بود دہم چنیں از آں کہ حضرت را بر تختہ غسل فرود
آوردند قبض بدیں بر نہج مسطور واقع گردید۔ و چوں حاضراں کشادند مشاہدہ می کردند
کہ دست ہائے مبارک آں حضرت بر سبیل مذکور باہم جمع شدند دہم بریں منوال دو سہ
کرت واقع شد آخر چوں معلوم گردید کہ ایں حالتے ست منبطن و رازے ست
مخفی باز کشادن آں متعرض نہ شدند و گفتند حضرت خواجہ محمد سعید سلمہ اللہ فرمودند
اند کہ چوں مرضی حضرت ایشاں با اسکنہ اللہ بحبوحۃ الجنان چنیں ست چنیں گزارید۔
صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما تعیشون تموتون۔ ذالک فضل اللہ
یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم[1]۔ الخ

یعنی جب غسال نے بدن انور کو تختہ پر لٹایا اور کپڑے اتارے تو حاضرین نے ملاحظہ کیا
کہ حضرت نماز کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے ہیں، حالانکہ انتقال کے وقت مخدوم زادگان
نے ہاتھ سیدھے کر دیئے تھے، جب ہاتھوں کو کھول کر بائیں کروٹ پر لٹایا اور داہنی طرف
غسل دیا اور پھر داہنی کروٹ پر لٹا کر بائیں طرف غسل دے کر سیدھا لٹایا تو پھر حاضرین نے
دیکھا کہ ہاتھوں کو حرکت ہوئی اور وہ خود بخود نماز کی طرح بندھ گئے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا گیا تو گرفت
مضبوط تھی، حالانکہ آپ کے دست مبارک پھول کی پنکھڑی کی طرح ملائم تھے، جب ہاتھ علٰحدہ
کئے گئے تو پھر حاضرین نے دیکھا کہ اسی طرح ہو گئے دو تین مرتبہ ایسا ہوا، آخر خواجہ محمد سعیدؒ نے
فرمایا کہ جب حضرت کی یہی مرضی ہے تو رہنے دو۔

اقبال نے خوب کہا ہے:-

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

غالباً شیخ مجددؒ کے اسی اعجاز کو سن کر آپ کے مخدوم زادے حضرت خواجہ محمد عبد اللہؒ
(م ۱۰۸۳ھ) نے سانحہ ارتحال کا یہ تاریخی مادہ نکالا ہے:-

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۹۳

مَاتَ وَلَمْ يَمُتْ بَلْ حَيٌّ اَبَدًا[1]

۱۰۳۴ھ

خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ) کے خلیفہ مولانا محمد صادق نے یہ مادۂ تاریخ نکالا ہے:

الموت هو جسر يوصل الحبيب الى الحبيب[2]

۱۰۳۴ھ

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اس آیت سے تاریخ وفات نکالی ہے:۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ[3]

۱۰۳۴ھ

اس کے علاوہ انھوں نے یہ قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے:۔

یا ایہا الانام لقد سافر الامام	من کان ذیل رافتہ عروۃ العقول
قطب الذی تنوعت ب السمالہ	حال التی تحیر فی شانہا العقول
ما الموت کان بدر کمال قد انطلق	من مشرق الظہور الی مغرب الافول
لما اصاب ارث رسول بجعت	اکتب لعالم رحلۃ وارث الرسول[4]

۱۰۳۴ھ

مقام شیخ مجددؒ

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

تاریخ ہند کے تاریک ترین دور میں شیخ مجددؒ نے جو اصلاحی کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ان کی عظمت پر شاہد ہیں، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے شیخ مجددؒ کو "مجدد الف ثانی" کے لقب سے پکارا[5]، اور ملت اسلامیہ نے یک زبان ہو کر اس کی تائید کی۔ چنانچہ آج ان کی شہرت اسی لقب سے ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی فرماتے ہیں:۔

---

[1] زبدۃ المقامات ص۳۰۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] وکیل احمد سکندرپوری ہدیہ مجددیہ مطبوعہ دہلی (۱۳۰۹ھ) ص۹

"راقم حروف گوید مرا بر دل خطور می کرد اگر یکے از اعاظم علمائے وقت ایں معنی راکہ حق سبحانہ ایشاں را "مجدد الف" ساختہ مسلّم می داشت تائید تمام بود تا روزے بہ ایں خطرہ بخدمت حضرت ایشاں رسیدم۔ بہ ایں حقیر خطاب نمودہ فرمودند:۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ در علوم عقلیہ و نقلیہ و تصانیف علیہ چوں وے در دیار ہند نمی نمائید کتابتے بما نوشتہ بود تبسم نمودہ فرمودند یکے از آں فقرات مرحیہ ایں بود کہ مجدد الالف الثانی[۵۱]

(راقم حروف کہتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ اکابر علما رعصر میں سے کوئی صاحب اس کو تسلیم کریں کہ حق سبحانہ نے ہمارے حضرت کو مجدد الف بنا یا ہے تو بڑی تائید ہو جائے، ــــــــ میں نے ایک روز اپنا یہ خیال حضرت کی خدمت میں بھی عرض کر دیا ــــــــ آپنے فرمایا کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جو علوم نقلیہ و عقلیہ اور بلند پایہ تصانیف کے لحاظ سے ہندوستان کے منفرد عالم ہیں، انھوں نے مجھے خط لکھا تھا ــ پھر تبسم کے ساتھ فرمایا کہ ــــــــ اُس کے مرحیہ کلمات میں سے ایک کلمہ یہ بھی ہے "مجدد الالف الثانی")

یہ بات خود ساختہ ہے کہ خود شیخ مجددؒ نے دعوی مجددیت کیا تھا، انھوں نے کسی مکتوب میں بھی اپنے کو مجدد نہیں لکھا، بلکہ ہمعصر اور متاخرین علما و صوفیہ نے آپ کو "مجدد الف ثانی" لکھا ہے۔ شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) فرماتے ہیں :۔

"ایشاں "مجدد الف ثانی" اند۔ دحقائق و دقائق وکثرت معارف الٰہیہ دفیوض دبرکات ایشاں وافاضات کثیرہ کہ اصلاح دلہا نمودہ ومقامات عالیہ کہ در طریقہ خود با لہامات حقہ مقرر فرمودہ اند و آں مقامات قرب الٰہی است سبحانہ۔"[۵۲]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شیخ مجددؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

.... وچوں ہزار گشت ونوبت اولوالعزم رسید حق تعالیٰ موافق عادت قدیم

---

[۵۱] وکیل احمد سکندرپوری، ہدیہ مجددیہ ص۹۔ [۵۲] شاہ غلام علیؒ۔ مکاتیب شریفہ مطبوعہ لاہور ۱۳۷۱ھ ص۵ مکتوب ۱ ول

برائے ہزارۂ دوم " مجددے " پیدا کردکہ درساتّر او لیا ، مجددان مثل اولوالعزم باشد در انبیا ، و رسولان وا ورا از بقیۂ طینت رسول کریم صلی اللہ علیہ آفریدو ایں مقامات و کمالات داد کہ نہ دیدہ بود و بطفیل او ایں کمالات در آخر زمان شائع و جلوہ گرگر دانید[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) اور شیخ مجددؒ کے درمیان متصوفانہ مسائل پر کچھ تکدر پیدا ہو گیا تھا ، لیکن جب سنہ ۱۰۲۰ھ میں شیخ عبدالحقؒ نے اپنے صاحبزادے شیخ نور الحق (م ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) کو شیخ کر خط وکتابت کے ذریعہ صفائی کر لی تو اسی زمانہ میں شیخ عبدالحق نے خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ) کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ (م ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء) کے نام ایک مکتوب لکھا تھا ، اس میں شیخ مجددؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

" دریں ایام صفائے فقیر بخدمت میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است و اصلاً پردۂ بشریت رغشاوۂ جبلت میاں نماندہ ، قطع نظر از رعایت طریقہ انصاف و حکم عقل کہ باایں چنیں عزیزاں و بزرگان بدنیا بید بود در باطن بطریقہ ذوق و وجدان و غلبہ چیزے افتادہ کہ زبان از نطق برآں لال است ، سبحان اللہ مقلب القلوب و مبدل الاحوال شاید ظاہر بہ ایشاں استبعاد کنند ، من نمی دانم کہ ساں چیست و چہ عنوان است[2]"

" ان دنوں میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ سے فقیر کی صفائی حد سے زیادہ ہو چکی ہے اور پردۂ بشریت و جبلت درمیان میں نہیں رہا ، انصاف و عقل اور رعایت طریقہ سے قطع نظر (کہ اس قسم کے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ برابر ہونا چاہیے) باطن میں ذوق و وجدان اور غلبہ سے وہ چیز آتی ہے کہ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے ، کیا ہی پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دیتی ہے اور حالوں کو بدل دیتی ہے ! شاید ظاہر بیں استبعاد سے کام لیں ، میں نہیں جانتا کہ ساں کیا ہے اور کس طرح ہے ؟

[1] قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی ۔ ارشاد الطالبین ، مطبوعہ لاہور ۱۳۲۷ھ ص ۶۳

مولانا محمد حسن غولی علیہ الرحمہ نے جو شاہ محمد غوث گوالیاری (م ۹۷۰ھ) کے مرید تھے، اولیائے کرام کے حالات میں ایک تذکرہ مرتب کیا تھا، موصوف شیخ مجددؒ کو ان القاب سے یاد فرماتے ہیں:۔

> بالانشین مسند محبوبیت، وصدر آرا محفل وحدانیت خدیو مقام فردیت، وصاحب مرتبہ قطبیت[1] الخ

جس زمانے میں شیخ مجددؒ لشکر شاہی کے ساتھ اجمیر شریف میں مقیم تھے، بلخ سے ایک طالب زیارت کے لئے آیا، اور ذیل کے بزرگوں کے نیازمندانہ دعوت نامے پیش کئے، شیخ میر، شیخ قدیم کبردی، میر مومن، مولانائے ربانی حسن قبادیانی، اقضی القضات مولانائے تولک وغیرہم۔ طالب مذکور نے شیخ مجددؒ کی خدمت بابرکت میں میر مومن بلخی کا یہ زبانی پیغام بھی پہنچایا۔

> "اگر ما راکبر سن ومسافت بعیدہ مانع بنودے بہ ملازمت شریف رسیدہ بقیہ عمر درخدمت می بودیم۔ واز انوار احوال بلند " مالاعین رأت ولا اذن سمعت" اقتباس می نمودیم۔ چوں ایں موانع درمیان است التماس آن است از مخلصان حضور دانستہ بہ افاضات غائبانہ متوجہ احوال ایں محبال بہ ظاہر مہجور بہ معنی درخدمت حضور می بودہ باشند"[2]

شیخ مجددؒ کی حیات ہی میں ان کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی پھیل چکی تھی۔ مولانا رحمان علی لکھتے ہیں:۔

> "درہماں زماں آوازۂ آں حضرت بلند شدہ آستاں محط رجال ومجمع اصحاب کمال گشت۔ علمائے دور ونزدیک وامرائے ترک وتاجیک بہ شرف حضور بہرہ ور گردیدند ومشائخ ارادت آوردند وسلسلہ شاں از ہند تا ما وراء النہر وروم وشام ومغرب رسیدہ"[3]

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ۔ زبدۃ المقامات ص ۲۱۸ [2] ایضاً ص ۲۱۹ [3] تذکرہ علمائے ہند مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱

"سحاب اطل، روی العرب والعجم امطاده، نیر اعظم، طلع المشارق والمغارب
انواره جامع العلوم الظاہرہ والباطنہ، خازن الکنوز البارزہ والکامنۃ"[ا]

یہ بیانات اس کے شاہد ہیں کہ شیخ مجددؒ کا آوازہ ہند اور بیرون ہند میں خود انکی زندگی میں بلند ہو چکا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) نے شیخ مجددؒ کے رسالہ "رد الرفضہ" کی عربی میں شرح لکھی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

الرسالۃ التی انشاھا اوحد زمانہ وفرید آوانہ الجھبذ الراسخ فی الشریعۃ والطریقہ والطود الشامخ فی المعرفۃ والحقیقۃ، ناصر السنۃ قامع البدعۃ، سراج اللہ الموضوع یستضی بہ من شاء من عبادہ المومنین، وسیف اللہ المسلول علی اعداءہ من الکفرہ والمبتدعین، الامام العارف العالم الالمعی مولانا الشیخ احمد الفاروقی الماتریدی الحنفی النقشبندی السرھندی[۲]

یہ رسالہ ایسے یکتائے زمانہ، فرید وقت اور کامل الفن نے تصنیف کیا ہے، جو شریعت وطریقت پر ثابت قدم ہے معرفت وحقیقت میں ایک بلند پہاڑ کی مانند ہے، ناصر سنت اور قامع بدعت ہے، خدا کا روشن چراغ ہے، اس کے مومن بندوں میں سے جو چاہتا ہے اس سے روشنی حاصل کرتا ہے، دشمنان خدا کفار اور بدعتیوں کے لئے وہ اللہ کی ننگی تلوار ہے، امام عارف ہے، روشن دماغ عالم ہے، جس کا نام مولانا شیخ احمد فاروقی ماتریدی حنفی نقشبندی سرہندی ہے۔

شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) "ایضاح الطریقہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

... وباوجود اخذ وکسب فیض ہر چہار چار دوں عالی شان سلسلہائے طریقت سے

ا[illegible] ۲[illegible] ۳۰۲

خاندان عالی شان از جناب الٰہی مواہب
جلیلہ وعطایائے نبیلہ سرفراز شدہ
اند کہ عقل در ادراک آں کمالات و
حالات حیران است حضرت خواجہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ در بارۂ حضرت
ایشاں فرمودہ اند کہ ہمچو ایشاں زیر فلک
نیست و دریں امت مثل ایشاں چند کس
معلوم می شود و معلومات و مکشوفات
ایشاں ہمہ صحیح و قابل آں است کہ
بنظر انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات
درآید و از مکاتیب شریفہ حضرت خواجہ
قدس اللہ سرہ العزیز کمال حضرت ایشاں
معلوم می شود۔[1]

اخذ اور کسب فیوض کے علاوہ اللہ کی
درگاہ سے مواہب جلیلہ اور عطایائے
نبیلہ سے سرفراز ہوئے ہیں، انکے کمالات
وحالات کے سمجھنے سے عقل حیرد عاجز ہے
حضرت خواجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے
تھے کہ آسمان دنیا کے نیچے ان جیسا کوئی
نہیں ہے اور امت مسلمہ میں ان جیسے چند
ہی لوگ گزرے ہیں، آپ کی معلومات
اور مکشوفات صحیح ہیں، اور اس قابل ہیں
کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی نظر میں
لائی جائیں، حضرت خواجہ قدس اللہ سرہ
العزیز کے مکاتیب شریفہ سے آپکے کمال
کا علم ہوتا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں مشرباً اہل حدیث تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں شیخ مجددؒ کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے:۔

.... عالم، عارف کامل مکمل بود، طریقہ نقشبندیہ را امام ہمداست دیک صوفیہ در مسالک سلوک مجدد، مکتوباتش در سہ مجلدست؛ دلیل واضح اند بر علو علم و کمال تبحر در معرفت و بلوغ غایت مقامات....... وطریقۂ علیہ وے رحمہ اللہ مبنی بر اتباع کتاب وسنت، در ظاہر و باطن و نہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد و ایں مکتوبات اصول عظیمہ است از برائے وصول بمنازل معرفت و قبول طالب صادق و سالک راغب، در ہیچ وقت از اوقات از مطالعہ

---

[1] شاہ غلام علی دہلوی۔ ایضاح الطریقہ مطبوعہ لاہور ۱۲۷۶ھ ص ۵۶

آں بے نیازی حاصل نیست[51]"

ایک اور جگہ شیخ مجددؒ کی اس طرح تعریف کرتے ہیں :-

علو مرتبہ کشفہائے مجدد الف ثانی دریافت باید کرد کہ از چشمۂ صحو سرزدہ رنگا ہے مخالف شرع نیفتادہ بلکہ بیشتر را شرع مؤید است و بعضے چناں است کہ شرع ازاں ساکت است و مرتبہ او در اولیا مثل مرتبہ الوالعزم است در انبیاء"[52]

مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) نے شیخ مجددؒ کے حضور میں جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، راقم اپنے دل میں اس کی آواز بازگشت محسوس کر رہا ہے اس لئے اپنے دلی جذبات، واردات اور کیفیات کو انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہے :-

"سیرت مجدد لکھتے ہوئے کچھ عجب انشراح خاطر اور انبساط طبع بہم پہنچا جس کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے اور یہ یقیناً اس ارادت و نسبت کا نتیجہ ہے جو حضرت ممدوح سے اس عاجز اور اس عاجز کے خاندان کے تمام اکابر کو نسلاً بعد نسلٍ حاصل رہا ہے۔ ؎

وماذاك الا ان هندا عشية　　تمشت وجوت فى جوانبه بردا

تھی کہ اس کو اپنے خمیر طینت میں ممزوج پاتا ہوں اور اس وقت بھی برسر نفوذ و ظہور دیکھتا ہوں کہ ؎

قبل ان اعرف الهوى
فصادف قلبا خاليا فتمكنا

یہی نسبت و ارادت کی ایک دولت ہے جو شاید ہم بے مایگان کا زاد رہ تہی دستان راہ کے لئے توشۂ آخرت اور وسیلۂ نجات ثابت ہو، اگر اس کے دامن تک ہاتھ نہ پہنچ سکا تو اس کے دوستوں کا دامن تو پکڑ سکتے ہیں، اللہ اس راہ میں ثبات و استقامت و رزق عطا فرمائے اور اس کے دوستوں کی محبت و ارادت سے ہمارے قلوب ہمیشہ معمور اور آباد رہیں"[53]

اللهم انى اسألك حبك وحب من يحبك وحب عمل يقربنى اليك۔ آمین!

؎ عطا اسلاف کا جذب دروں کر　　شریک زمرۂ لا یحزنون کر

---

[51] نواب صدیق حسن خاں۔ تقصار جیود الاحرار (ص ۱۱۰ - ۱۱۲) بحوالہ تذکرۂ مجدد الف ثانی مرتبہ محمد منظور نعمانی۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء ص ۳۰۰۔ [52] نواب صدیق حسن خاں۔ ریاض المرتاض ص ۱۲۰-۱۲۱ بحوالہ مذکور۔
[53] ابوالکلام آزاد۔ تذکرہ، مطبوعہ لاہور ص ۲۵۵ - ۲ (حاشیہ)

تجلیاتِ مجدّد الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(مترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۲۶۷) خواجہ حسام الدین احمد دہلویؒ کے نام (آخری حصّہ)

...... وہ مکتوب جو خواجہ زادگان (خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ) کو لکھا ہے آپ کی نظر سے گزرے گا ...... مخدوما و مکرما! جو نئی بات طریقت میں پیدا کی جائے وہ فقیر کے نزدیک اس بدعت سے کم نہیں جو شریعت میں پیدا کی جائے۔ برکاتِ طریقت اس وقت تک باقی رہتے ہیں جب تک کوئی امرِ جدید پیدا نہ کیا جائے۔ جب امرِ جدید طریقت میں پیدا ہوا اُس طریق کی راہِ فیوض و برکات بند ہوگئی ...... پس محافظتِ طریق بھی اہم مقاصد میں سے ہے اور مخالفتِ طریق سے بچنا ضروری ہے ...... جہاں کہیں اور جس کسی سے اپنے طریقے کی مخالفت دیکھیں سختی کے ساتھ اس کو روکیں اور طریقے کی اشاعت و تقویت کریں۔

...... والسلام والاکرام

مکتوب (۲۶۸) خانخاناں کے نام ......

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ...... اس طرف کے فقراء کے احوال لائق حمد و شکر ہیں ...... آپ کی سلامتی و عافیت، ثابت قدمی و استقامت بھی بدرگاہِ الٰہی مطلوب ہے۔ چونکہ علم و وراثت کا تذکرہ (اس وقت) درپیش تھا اس لئے چند کلمات اسی سے متعلق تقاضائے وقت لکھے جاتے ہیں ...... حدیث میں ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں)

رہ واضح ہو کہ جو علم انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے وہ دو قسم کا ہے۔ علم احکام اور علم اسرار انبیاء کا وارث کہلانے کا مستحق وہ عالم ہے جس کو دونوں قسم کے علوم سے حصّہ ملا ہو یہ نہ ہو کہ فقط ایک قسم کا علم نصیب ہو دوسری قسم سے محروم ہو، یہ بات وراثت کے منافی ہے۔ وراث کا مورث کے تمام اقسام کے ترکے میں سے حصّہ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ کچھ میں حصّہ ہو اور کچھ میں نہ ہو اور جس کا حصّہ کسی خاص جنس تک محدود ہے وہ (وارث نہیں ہے) قرضخواہوں کی فہرست میں شامل ہے اس لئے کہ قرض دینے والے کا حصّہ صرف اس کے حق کی جنس سے متعلق ہوتا ہے.....

مکتوب (۲۷۳) خواجہ حسام الدین احمد دہلویؒ کے نام ——— (دربیان مولودخوانی)

.... التفات نامہ جو ازراہ کرم اس حقیر کو بھیجا تھا اس کو پاکر خوش ہوا ———

جزاکم اللہ خیرا۔ اس گرامی نامہ میں لکھا ہوا تھا کہ اگر سماع کے رد کرنے کے اندر اتنا مبالغہ ہو کہ مولود سے منع کرنا بھی اس کے ضمن میں شامل ہو جائے ——— حالانکہ مولود میں قصائد نعتیہ اور کچھ اشعار کا پڑھنا ہوتا ہے ——— تو اس صورت میں میر محمد نعمان اور یہاں کے (خانقاہ خواجہ باقی باللہ کے) احباب کے لئے جنھوں نے خوابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ اس مجلس مولود سے بہت راضی ہیں ——— مولود کا ترک کرنا بہت مشکل ہے ———

مخدوما! اگر خوابوں پر ہی اعتماد کر لیا جائے، تو مریدوں کو پیروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور صوفیاء کے طریقوں میں سے کسی طریقے کو لازم پکڑنا ایک بے فائدہ عمل ہو جائے گا اس لئے کہ ہر مرید اپنی خوابوں کے موافق ہی عمل کیا کرے گا اور انھیں خوابوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے گا، چاہے وہ خوابیں طریقۂ پیر کے موافق ہوں یا نہ ہوں اور مرشد کی پسندیدہ ہوں یا نہ ہوں ——— ایسی صورت میں سلسلۂ پیری و مریدی درہم و برہم اور ہر بوالہوس اپنے طور و طریق میں منتقل ہو جائے گا ——— مرید صادق، ہزار خوابوں کو بھی اپنے پیر کے ہوتے ہوئے آدھے جو کے عوض میں بھی نہیں خریدے گا اور طالب رشید پیر کے ہوتے اس قسم کی خوابوں کو خواب ہائے پریشاں سمجھے گا ——— شیطان لعین بڑا زبردست دشمن ہے۔ جو لوگ انتہاء کمال کو پہونچ گئے ہیں وہ بھی اس کی چال سے مامون و بے فکر نہیں ہیں بلکہ اسکی مکاری سے برابر ڈرتے اور لرزتے رہتے ہیں ——— مبتدیوں اور متوسطوں کا ذکر ہی کیا ہے ——— زیادہ سے زیادہ

یہ ہے کہ منتہی، غلبۂ شیطان سے محفوظ ہو جاتے ہیں برخلاف مبتدیوں اور متوسطوں کے (کہ غلبۂ شیطان سے ان کے مغلوب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے) ـــ پس ان کی خوابیں قابل اعتبار اور شیطان کے مکر سے محفوظ نہیں ـ

(اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ) جس خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو وہ تو سچی ہی ہوتی ہے اور مکر شیطان سے محفوظ ـــ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا لہذا مذکورہ بالا خوابیں سچی ہیں اور مکر شیطان سے محفوظ ہیں ـــ (اس کا جواب یہ ہے کہ) صاحب فتوحات مکیہ (شیخ اکبر ابن عربیؒ) نے شیطان کے عدم تمثل وتشکل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صورت خاص کے ساتھ مخصوص کیا ہے جو مدینہ منورہ میں (گنبد خضرا کے اندر) مدفون ہے ـــ شیخ اکبر تشکل خاص کے علاوہ کسی اور شکل میں عدم تمثل کو تجویز نہیں کرتے (یعنی وہ کہتے ہیں کہ شیطان حضور صلی اللہ کی اصل شکل میں تو نہیں آسکتا البتہ دوسری شکل میں آکر اور اصلی شکل کا گمان پیدا کرکے دھوکے میں ڈال سکتا ہے) ـــ اور یہ بات ظاہر اور قابل شک وشبہ ہے کہ خواب میں اس شکل خاص کی تمیز بہت ہی مشکل ہے، لہذا (یہ) خواب کیسے لائق اعتماد ہوگی ـــ اچھا اگر عدم تمثل کو صورت خاصۂ آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہ بھی کریں جیسا کہ بہت سے علماء نے مخصوص نہیں کیا اور مناسب رفعت شان نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے کہ مخصوص نہ کیا جائے تو پھر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس دیکھی ہوئی صورت سے احکام حاصل کرنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ اور غیر پسندیدہ باتوں کا معلوم کرنا مشکل ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ دشمن لعین (شیطان) درمیان میں آگیا ہو اور خلاف واقع کو واقع دکھا رہا ہو اور شبہ میں ڈال کر اپنی عبارت واشارت کو اس ذات عالی کی عبارت واشارت بتا رہا ہو (یعنی) بموجب حدیث آپؐ کو خواب میں دیکھا تو واقعی آپ ہی کو دیکھا مگر خواب کے کلام اور اشارت کو تعلیمات محمدیہ اور شریعت مطہرہ کے مطابق کرکے دیکھا جائے گا اگر وہ اس قانون کے مطابق ہے جو صحابۂ کرام کے ذریعے سے دنیا میں اشاعت پذیر ہوا تو قابل تسلیم ہے ورنہ مخالفت قانون شریعت کی صورت میں وہ قابل قبول نہ ہوگا ـــ خود حدیث میں بھی رویت کے حق ہونے کو فرمایا گیا ہے، کلام کے

بارے میں نہیں فرمایا گیا کہ ایسے خواب کا ہر مسموع کلام حق ہے) ....
حالتِ خواب حواس کے معطل ہونے کی حالت ہے اور التباس و اشتباہ کا محل بھی ہے،
علاوہ ازیں خواب کے عالم میں انسان تنہا ہوتا ہے پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ خواب
(ہر حیثیت سے) تصرفِ شیطان اور تلبیس ابلیس سے محفوظ ہے؟ ——— یا یوں کہا جائے گا
کہ چونکہ (مولود میں) قصائد نعت پڑھنے اور سننے والوں کے ذہنوں میں یہ بات پہلے سے بیٹھی
ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عمل سے راضی ہوں گے جیسا کہ دنیا کے ممدوح اپنے
مدح گویوں سے راضی ہوتے ہیں اور یہ بات اُن کی قوتِ متخیلہ میں نقش تھی اس لئے ہوسکتا ہے
کہ خواب میں انھوں نے اپنی صورتِ متخیلہ کو دیکھا ہو اور اس خواب کی نہ کوئی حقیقت ہو اور
نہ وہ (شیطان لعین کا) تمثل ہو ——— اسکے علاوہ (اگر وہ خواب سچے ہوں تو) سچے
خواب کبھی ظاہر پر محمول ہوتی ہے اور اسکی حقیقت وہی ہوتی ہے جس کو دیکھنے والے نے
دیکھا ہے۔ مثلاً زید کی صورت کو خواب میں دیکھا ہے اور مراد بھی حقیقتِ زید ہی ہو، اور کبھی
ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر سے پھیر کر اسکی تعبیر لی جاتی ہے۔ مثلاً صورتِ زید کو خواب میں دیکھا ہے
اور اس سے مراد عمرو ہو اس علاقہ و مناسبت کی بنا پر جو زید و عمرو کے درمیان میں ہے۔
پس یہ خواب ہائے مذکورہ جن کو دوستوں نے دیکھا ہے ——— کہاں سے معلوم ہوا کہ ظاہر ہی
پر محمول ہیں اور ظاہر سے پھیری ہوئی نہیں ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ ان خوابوں کی کوئی
دوسری تعبیر ہو اور وہ خوابیں دوسرے امور کی طرف کنایے ہوں اس صورت میں تمثل
شیطانی کی گنجائش ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔

الغرض (مخلص) خوابوں پر ہی بھروسہ نہ رکھنا چاہیئے۔ خارج میں اشیاء موجود ہیں
کوشش کی جائے کہ اُن اشیاء کو بیداری میں دیکھیں کہ یہ صورت شایانِ اعتماد ہے اور اس
میں تعبیرات کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ جو خواب و خیال میں دیکھا جائے گا وہ خواب خیال
ہی ہے۔ ——— خانقاہ دہلی کے دوست مدت سے اپنی ایک روش پر زندگانی گزار رہے
ہیں خیر اُن کو اختیار ہے مگر میر محمد نعمان کو تو تعمیل حکم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر میرے
منع کرنے کے بعد وہ ایک لمحہ بھی توقف کریں گے تو اللہ تعالیٰ (پناہ میں رکھے) اُن کے لئے

خاص طور پر ضرر کا اندیشہ ہے) اگر فرض کرو وہ بھی توقف کریں گے تو ضرر کیسے پہونچے گا با فقیر جو اتنے مبالغے کے ساتھ منع کرتا ہے اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں اپنے طریقے کی مخالفت ہے ــــ طریقے کی مخالفت خواہ سماع و رقص کے ساتھ ہو خواہ مولود و شعر خوانی کے ساتھ دونوں برابر ہیں ــــ ہر طریقے میں ایک مطلب خاص تک پہونچنا ہوتا ہے ہمارے اس طریقے میں مطلب خاص تک پہونچنا ان مذکورہ امور کے چھوڑنے پر موقوف ہے۔ جس کسی کو ہمارے اس طریقے کی طلب مقصود ہو اس کو چاہیئے کہ اس طریقے کی مخالفت سے اجتناب کرے ...... بستی فیروز آباد (دہلی) جو ہم فقراء کا ملجا اور ماویٰ ہے اور ہمارے پیر و مرشد کا مرکز ــــ اس میں اگر کوئی ایسی بات پیدا کی جائے جو اس طریقے کے مخالف ہو تو ہم فقراء کے لئے یہ امر باعث تشویش و اضطراب ہے ــــ مخدوم زادگان (خواجہ عبیداللہ و خواجہ عبیداللہ) اپنے والد بزرگوار کے طریقے کو محفوظ رکھنے کے لئے زیادہ ذمہ دار ہیں ــــــ حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے صاحبزادوں نے اپنے والد بزرگوار کے طریقے میں تغیر آجانے کے بعد اُن کے اصل طریق کی محافظت کی اور تغیر و تبدل کرنے والوں سے مجادلہ کیا، چنانچہ آپنے کبھی اس کو سُنا ہوگا ــــ

آپنے ہمارے حضرت خواجہؒ کے مشرب کے متعلق بھی کچھ لکھا تھا ــــ ہاں شروع شروع میں انھوں نے بعض امور میں مشرب ملامتیہ کی رعایت کر کے سہل پسندی سے کام لیا ہے اور ملامت کو ترجیح دے کر بعض معاملات میں ترک عزیمت (ترک اولیٰ) کو اختیار کیا ہے لیکن آخر میں ان باتوں سے اجتناب کرتے تھے اور ملامت و ملامتیہ سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا ــــ از روئے انصاف فرمائیے اگر بالفرض حضرت خواجہ (باقی باللہؒ) اس وقت دنیا میں موجود ہوتے اور یہ مجلس (مولود خوانی) منعقد ہوتی تو کیا وہ اس امر سے راضی

لہ مکتوبات جلد ثالث کے ایک مکتوب کے اندر اسی سلسلے میں خواجہ حسام الدین احمدؒ کو ذرد دار طریقے پر آخری بات تحریر فرماتے ہیں مخدوما بخاطر فقیر میرسد کہ تا مطلق این باب را مسدود نہ کنند بوالہوساں ممنوع نگردند۔ (یعنی جب تک اس قسم کی مجلس کا دروازہ مطلقاً بند نہ کیا جائے گا بوالہوس باز نہیں آئیں گے) جب یہ مکتوب آئے گا مزید تشریح کی جائے گی۔

ہوتے اور اس اجتماع کو پسند فرماتے ؛ فقیر کو تو یقین ہے کہ وہ ہرگز اس امر کو جائز نہ رکھتے بلکہ وہ اس سے منع فرماتے ــــ مقصود فقیر اطلاع کرنا ہے میری بات کو قبول کیجئے یا نہ کیجئے ــــ .... اگر مخدوم زادگان اور وہاں کے احباب اسی موضوع پر قائم رہے تو ہم فقیروں کو ان کی صحبت سے محرومی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوگا ....

والسلام اوّلاً وآخراً ــــ

مکتوب (۲۰۵) ــــ ملا احمد برکی کے نام

(تعلیم علوم شرعیہ اور اشاعت احکام فقہیہ کی ترغیب میں)

بعد الحمد والصلٰوۃ وتبلیغ الدعوات ــــ وہ مکتوب جو شیخ حسن وغیرہ کے ہاتھ بھیجے تھے پہونچے انکوں نے بہت خوش کیا .... تمھیں مقبولیت کی دولت حاصل ہونے کا سبب بڑا سبب تمھارا علوم شرعیہ کی تعلیم دینا اور فقہ کے احکام کی نشر واشاعت کرنا ہے ان مقامات میں جہاں جہالت کارفرما ہے اور بدعت نے اپنی جڑ جمالی ہے۔ اور پھر یہ تعلیم بھی اُس محبت اور اُس اخلاص کے ساتھ ہونا جو تم کو تمھارے دوستوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے ــــ پس تم پر تعلیم علوم دینیہ اور اشاعت احکام فقہیہ حتی المقدور لازم ہے ــــ اس لئے کہ یہ کام مدارِ کار، بنیاد ترقی اور ذریعۂ نجات ہے ــــ کمر ہمت کو مضبوط باندھ کر خود کو گروہ علماء میں شامل رکھو اور امر معروف اور نہی منکر کے ذریعے مخلوق کو حق جلّ شانہ کا راستہ دکھاؤ ــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (یعنی بے شک یہ نصیحت ہے پس جو شخص چاہے وہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے) ــــ ذکر قلبی جس کی تم کو اجازت دیدی گئی ہے ــــ احکام شرعیہ کی ادائیگی میں قوت دینے والا اور نفس امّارہ کی سرکشی کو دفع کرنے والا ہے ــــ اس ذکر قلبی کو بھی جاری رکھیں .... شیخ حسن تمھارے رکن خاص اور تمھارے کام کے معاون ہیں اگر بالفرض تم کو ما وراء النہر یا ہندوستان جانے کا شوق پیدا ہو تو تمھاری جگہ پر تمھارے قائم مقام ہوں گے .... وتوجہ اُن کے حق میں برابر رکھیں اور کوشش بلیغ کریں کہ وہ تحصیل

علوم دینیہ ضروریہ سے بہت جلد فارغ ہو جائیں اُن کا یہ ہندوستان کا آنا خود اُن کے حق میں اور تمھارے حق میں بھی اچھا ہوا، اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو ملت اسلامیہ پر استقامت بخشے، علی صاجبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیہ .... وہ مکتوبات جو ان ایام میں لکھے ہیں بہت عزیز الوجود ہیں، فوائد عجیبہ اُن میں درج ہو گئے ہیں ان مکتوبات کی نقل شیخ حسن لے گئے ہیں اچھی طرح مطالعہ کر دگے! تم نے اپنی والدہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کی تھی۔ دعا کی گئی ــــ یہاں کے باقی حالات شیخ حسن تفصیل سے زبانی بیان کریں گے ....

فقیر اور فقیر زادے تم سے دعائے سلامتی خاتمہ چاہتے ہیں۔ والسّلام

مکتوب (۲۷۸) ملا عبد الکریم سنامی کے نام ــــــ

(سلامتی قلب کے بیان میں)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــــــ مکتوب مرغوب پہونچا، موجب فرحت ہوا دوستوں کو جو نصیحت کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اہل سنت وجماعت کی کتابوں کے مطابق اپنے عقائد صحیح کرنے کے بعد اور احکام فقہیہ کی ادائیگی یعنی فرض و واجب سنت و مندوب، حلال و حرام، مکروہ و مشتبہ میں کرنے اور نہ کرنے والی چیزوں کا لحاظ رکھنے کے بعد ــــ ماسوائے حق کی گرفتاری سے اپنے قلب کو سالم و محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور یہ بات اس وقت میسّر ہوتی ہے کہ قلب میں ماسوائے حق کا گزر بھی نہ ہو۔ فرض کرو اگر ہزار سال کی عمر ہو تب بھی غیر حق سبحانہ دل میں نہ گزرے .... شیخ حبیب اللہ کا مکتوب پہونچا اُس میں انھوں نے اپنے والد مرحوم کی وفات کا ذکر کیا تھا ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ فقیر کی جانب سے دعا کے بعد تعزیت کریں اور کہیں کہ دعا، فاتحہ اور صدقہ واستغفار سے اپنے والد مرحوم کی امداد و اعانت کریں اسلئے کہ میت ڈوبنے والے کی مانند (سہارے کی محتاج و منتظر) ہوتی ہے اور وہ امید رکھتی ہے اس دعا کی جو اُسے اُسکے لڑکے یا ماں باپ یا بھائی اور دوست کی طرف سے پہونچے ....

مکتوب (۲۸۰) حافظ محمود کے نام ــــ (محبت فقرا سرمایۂ سعادت دارین ہے)

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ــــ مکتوب شریف جو مولانا محمد علی کی معرفت

بھیجا تھا پہونچا باعث مسرت ہوا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ محبت نقراء جو کہ سرمایہ سعادت دارین ہے ـــــ تمھارے اندر تحکم ہے اور زمانہ جدائی کی درازی نے اس محبت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے ـــــ تم کو ان دو چیزوں کی محافظت ضروری ہے۔ (۱) اتباع صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم (۲) شیخ مقتدیٰ سے محبت و اخلاص۔ ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے جو کچھ بھی اُدھر سے عنایت فرما دیں نعمت ہی نعمت ہے اور اگر کچھ بھی نہ دیں اور یہ دو چیزیں راسخ و مضبوط ہوں تو کوئی غم کی بات نہیں پھر کبھی نہ کبھی نواز دیں گے لیکن اگر خدانخواستہ ان دو چیزوں میں سے کسی ایک میں بھی خلل آیا ہے تو ذوق و شوق میں کوئی کمی نہ آئے پھر بھی اس کو استدراج سمجھنا اور اپنی خرابی تصور کرنا چاہیئے ـــــ طریق استقامت ہی ہے ـــــ واللہ سبحانہ الموفق۔ والسلام

دنیا میں
سب سے بڑا روحانی انقلاب
پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ برپا ہوا تھا۔
جو لوگ اردو زبان کے ذریعہ
اُس تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور فائدہ اٹھانا چاہیں جس نے یہ انقلاب برپا کیا تھا
ہم انکی خدمت میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی تالیف
معارف الحدیث
اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں
اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ یہ حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ ہے جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری
سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ مصنف کی خاص کوشش
پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے
اس کتاب کے ناظرین کے دلوں پر بھی وہی اثرات کسی درجہ میں پڑیں۔ (دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں)
جلد اوّل — جس میں ایمان اور آخرت سے متعلق ۳۰۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ۴/۸ غیر مجلد ۳/۱۲
جلد دوم — جس میں تزکیہ روح اور اصلاح اخلاق سے متعلق ۲۶۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے جنکے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے
کہ قرآن مجید کے بعد تزکیہ نفس اصلاح قلب اور تربیت اخلاق کا کوئی موثر ذریعہ ان حدیثوں سے بڑھکر دنیا کے اصلاحی ادب میں موجود نہیں ہے۔ قیمت مجلد ۵/۸ غیر مجلد ۴/۸
ملنے کا پتہ
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ
لکھنؤ

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

چندہ		چندہ
ہند و پاک سے	# الفرقان	دیگر ممالک سے
سالانہ ...... چھ روپے	لکھنؤ	سالانہ ...... ۱۲ شلنگ
ششماہی ...... تین روپے	ماہنامہ	اعزازی چندہ
فی کاپی ...... ۶۰ نئے پیسے		سالانہ ...... پندرہ روپے

جلد ۲۹ | بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق مئی ۱۹۶۲ء | شمارہ ۱۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی، براہ کرم آیندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۱ مئی تک دفتر میں ضرور آجانا چاہیے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائیگا۔

پاکستان کے خریدار } اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری ۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت } الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

قرآن مجید کی بیش بہا تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے :-

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا　　کسی قوم کی عداوت تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔

——— گفتنی کے چند بول ہیں لیکن یہ اگر کسی قوم کی سیرت اور طرزِ عمل کے سانچے میں ڈھل کر دنیا کے سامنے آئیں تو تسخیر کا جو کام تلواریں اور رعب و داب کے وسائل نہیں کر سکتے وہ سیرت اور طرزِ عمل کے روپ میں ڈھلی ہوئی قرآن کی اس تنہا تعلیم سے انجام پا سکتا ہے۔ ایک زمانہ میں عدل و انصاف مسلمانوں کا قومی کیرکٹر تھا جس کی بدولت وہ جس ملک کی حکومت کو زیر کر کے اُس ملک میں فاتحانہ داخل ہوئے، وہاں کی پبلک بہت جلد اُن کی گرویدہ ہو گئی اور انھیں غیر ملکی لعنت کی نظر سے دیکھنے کے بجائے رحمتِ حق کے روپ میں دیکھنے لگی۔ کسی قوم کو کا ہے کو کبھی ایسا تجربہ ہوا ہوگا کہ اُس کی فوجیں کسی شہر کو فتح کرنے کے بعد جنگی مصلحت کی بنا پر اُسے چھوڑ دینے کے لئے مجبور ہوئی ہوں تو اُس شہر کی آبادی نے اُن کو غم کے آنسوؤں اور واپسی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا ہو، لیکن مسلمان نے یہ نرالا تجربہ بھی تاریخ کے اوراق پر ثبت کیا اور واقعی ایسا ہوا کہ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں جب شام کے شہر حمص کو رومی سلطنت سے چھین کر مسلمانوں نے اپنے قبضہ میں کیا اور پھر کچھ ہی دن بعد فوجی بالائی کمان کے حکم سے قبضہ اُٹھا کر اُن سے رخصت ہونا پڑا

تو رُومیوں کی اس ہم مذہب آبادی نے مسلمانوں کی جُدائی پر سچ مچ آنسو بہائے اور دعائیں کیں کہ خدا انھیں پھر واپس لائے۔"

دُور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے اسی ہندوستان میں محمد بن قاسمؒ نے اموی دورِ حکومت میں سندھ اور ملتان کو فتح کیا اور اُس کے بعد اُسے مرکزی حکومت کا معتوب ہو کر واپس جانا پڑا تو تاریخ گواہ ہے کہ اس کا کیسا غم غیر مسلم آبادی نے منایا حتیٰ کہ موت کے بعد اُسے عدل و انصاف کا دیوتا قرار دے کر اُس کی مورتیاں بنائیں۔

دلوں کی یہ تسخیر کا ہے کا نتیجہ تھی۔ کیا تعداد اور طاقت کا؟ تلوار تو مفتوحوں کے دلوں میں زخم ڈال کر انھیں نفرت سے بھرتی ہے۔ گو سر مجبور ہو کر جُھک جاتے ہیں لیکن ان فاتحوں کی عدل پروری اور انصاف دوستی وہ اکسیر تھی جس نے نہ صرف تلوار کے زخم بھر دیئے بلکہ اُن میں ایسی عقیدت و محبت بھی بھر دی کہ سروں سے زیادہ دل جھک گئے اور بات پرستش تک جا پہنچی۔

آج ہندوستان کا جو ماحول ہو رہا ہے اُس میں ہمیں اسی تسخیر کی ضرورت ہے اور مسئلہ کا اگر کوئی سب سے زیادہ اطمینان بخش اور پائیدار حل ہو سکتا ہے تو اسی طرح کی دلوں کی تسخیر سے ہو سکتا ہے۔

مگر آپ کہیں گے کہ اب اس عمل تسخیر کا موقع کہاں ہے اب ہمارا ... کب کہ لوگوں کو ہمارے عدل و انصاف کی ضرورت محسوس ہو اور ہم ان کو انصاف کا ثبوت دے کر اُن کے دل جیتیں۔ اب تو مسئلہ خود ہمارے ساتھ انصاف یا بے انصافی کا ہے۔ مگر نہیں۔ انصاف کوئی اقتدار اور بالادستی ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ جس ہم آج جس پوزیشن میں ہیں اُس میں بھی انصاف کا سوال آتا ہے اور ایسے موقع پر انصاف کر کے بھی ہم دلوں کو مسخر کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کے ساتھ کوئی بے انصافی اور ظلم و زیادتی کا واقعہ پیش آئے تو خود اُس میں آپ کے لئے انصاف کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی بالکل تازہ مثال مالدہ (مغربی بنگال) کی اُس مسلم آبادی کا واقعہ ہے جو اسی سال جولی کے موقع پر کچھ غیر مسلموں کے جور و ستم کا نشانہ بنی۔ اس میں اصل شرارت مشرقی بنگال سے

آئے ہوئے شرنارتھیوں کی تھی، وہی حملہ آور ہوئے تھے، مگر ایک جھوٹی خبر اُڑا کر اُنھوں نے مقامی سنتھال قبیلہ کے لوگوں کو بھی اس مجرمانہ کارروائی میں شرکت پر اُکسا دیا۔ اور پھر ان کی شرکت سے سہارا پا کر بستی کو خوب تہس نہس کیا۔ لُٹے پٹے مسلمان ان دونوں ہی گروہوں کو یکساں مجرم گردانتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ لیکن ایک مُسلم وفد کی رپورٹ کے مطابق اُنھوں نے اس حالت میں بھی انصاف سے کام لیا اور بتایا کہ سنتھالیوں نے جو کچھ کیا غلط فہمی میں کیا اور ایک حد کے اندر رہے۔ باقی اصل مجرم یہ شرنارتھی ہیں جنھوں نے بدنیتی کے ماتحت حد سے گزری ہوئی حرکتیں کیں ——— یہ بھی انصاف اور عدل ہی ہے اور یہ رائیگاں جانے والی چیز نہیں۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اکثریت کا ہر ہر فرد آپ کے ساتھ ظلم و زیادتی کا خواہاں نہیں ہے۔ بے شمار افراد ہیں جو ان حرکتوں کو بُرا سمجھتے ہیں جو اُن کے فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ موقع بہ موقع اُن کی آواز بھی بلند ہوتی ہے۔ وہ ایسی باتوں کو روکنے کے لئے تگ و دو بھی کرتے ہیں، نہیں کرتے تو کم از کم دل میں ضرور سمجھتے ہیں کہ یہ باتیں بُری اور انسانیت سے گری ہوئی ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ ایسے ماحول میں کہ مسلمانوں پر آئے دن آج وہاں، کل یہاں عافیت تنگ ہوتی رہتی ہے جس سے ہر مسلمان قدرتی طور پر ایک ذہنی اذیت میں مبتلا ہے، اگر مسلمانوں کا یہ رویہ دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ کسی ظلم و ستم کی واردات کے بیان میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں، نہ بغیر تحقیق کے کوئی فیصلہ صادر کرتے ہیں، اسی طرح جو چھوٹے چھوٹے ہندو مسلم تنازعات چاہے وہ انفرادی پیمانے پر ہوں یا فرقہ وارانہ وہ ان میں کسی جنبہ داری سے کام نہیں لیتے، سچائی کے ساتھ خطا وار کو خطا وار اور بے خطا کو بے خطا کہتے ہیں، حتیٰ کہ عدالت کے روبرو بھی انھیں حق بات کہنے سے گریز نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کا یہ رویہ اور یہ کردار اگر آج کے ماحول میں لوگوں کے سامنے آتا ہے تو کیا اس میں کوئی شبہہ کی بات ہے کہ اکثریت میں جتنے بھی شرافت پسند عناصر ہیں وہ اُس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور شرارت پسندوں کی شرانگیزیوں سے وہ چشم پوشی ملک کے عام ضمیر کے لئے ممکن نہیں رہ گئی جس کی بدولت انھیں آج کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ آج کے نا تربیت یافتہ عوام سے سیرت و کردار کے اس بلند معیار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس اثر انگیزی کے لئے قوم کے ہر ہر فرد کا معیاری بن جانا ضروری نہیں۔ اگر ہر جگہ کے صرف سمجھ دار اور خواص اس رویہ کو اپنا لیں تو اس کی تاثیر بھی معمولی نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ لیڈری کا مقام رکھنے والے ذمہ دار لوگوں اور اخبار نویسوں ہی کا یہ رویہ ہو جائے تو اس سے بھی بڑا کام انجام پا سکتا ہے۔ مگر ہم صورت حال کچھ ایسی دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت کے شرارت پسندوں کی مسلسل صبر آزما چیرہ دستیوں کے اثر سے ہمارے اچھے اچھوں کا ذہنی توازن غیر شعوری طور پر ختم ہو کر بلفظ فرقہ پرستی کا انداز پیدا ہوتا جا رہا ہے اور ہم معاملات کو انصاف کی اُس باریک ترازو پر تولنا بھولتے جا رہے ہیں جو قرآنی حکم کے بموجب ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اس رَو میں بہتے ہوئے نظر آنے لگے ہیں جن کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ تمام فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بلند رہ کر ملک کے ہر فرقہ میں دعوت اسلامی کا کام کریں گے۔

کوئی شبہہ نہیں کہ اس طرزِ عمل سے ہر قوم کے عوام کی طرح عام مسلمان خوش تو بہت ہی ہوتے ہیں یا کہیے کہ اُن کی ناراضگی کا خطرہ نہیں پیدا ہوتا۔ مگر ایک طرف تو یہ طرزِ عمل قرآن کے اس حکم کے خلاف ہے کہ کچھ بھی ہو انصاف کی ترازو کو مت چھوڑو اور دوسری طرف اُن کا حاصل سوائے مسلمان کی خوشنودی کے کچھ نہیں۔ ملک کا ضمیر جس کو جگانے کے لئے ہم بے چین ہیں، اس طریقہ سے کبھی نہیں جاگ سکتا۔ اس کو جگانا ہے تو قرآن کے نسخہ کو آزماؤ۔ اور خود اپنے ضمیر کی آواز کو کسی تلخیٔ احساس یا کسی مصلحت کی آواز میں گم مت ہونے دو۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال!

تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ

شیخ احمد سرہندیؒ کا وہ خاص کارنامہ جسکی وجہ سے آپ کو "مجدد الف ثانی" کا عظیم لقب اُمت سے ملا۔ اس کارنامہ کو پورے تین سو سال کے بعد الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ نے طشت از بام کیا تھا۔ یہ نمبر لوگوں کو آج تک یاد ہے اسی کے اہم مضامین تذکرۂ مجدد الف ثانی کے نام سے از سر نو شائع کئے گئے ہیں

ہندوستان کے موجودہ حالات میں شیخ احمد سرہندیؒ کے حالات کا مطالعہ بڑی گراں قدر روشنی بخشتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجدد کا دور تجدید شاید اب تک جاری ہے۔

قیمت چار روپے ۔/۴ مجلد ۔/۵

مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی

حضرت مجدد کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپکے بعد جس ہستی نے سنبھالا اور سلطنت مغلیہ میں حضرت مجددؒ کے ڈالے ہوئے دینی رخ کو تکمیل تک پہنچایا وہ ہیں آپکے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ۔ آپکے مکتوبات بھی آپکے والد ماجد کے شہرۂ آفاق مکتوبات کی طرح عظیم مصلحانہ کارناموں اور عرفانی علوم و حقائق کے آئینہ دار اور فصاحت و بلاغت کا بحر ذخار ہیں۔ اصل زبان فارسی ہے۔ فارسی کے اس خزانہ کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص و انتخاب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی آب و تاب کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے

قیمت صرف چار روپے ۔/۴ مجلد ۔/۵ روپے

ہندوستان کا مشہور سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو اسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب مرادآبادی نے حرمین شریفین کا سفر بڑے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال تک اس پورے سفر عشق کی مکمل روداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑ دی تھی تاریخی اعتبار سے غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ مصنف کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندوستان و حجاز کے بہت ہی نادر حالات و معلومات اس کے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا ایک مجسم نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے بڑی محنت سے تحقیق و تعلیق کے ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ کیا

قیمت ۱/۷۵

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت

مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ اُن کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلا شبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کا مبسوط مقدمہ ہے۔ قیمت ۲/۵۰ مجلد ۔/۳

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انھیں جاننا اور اُن کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کر لے جو دین کے حقائق اور معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا قیمت ۱/۵۰

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

معارف الحدیث

نماز میں قراءۃ قرآن

نماز فجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت :- (مسلسل)

[۵۔ حدیثیں اس عنوان کے تحت، اس سلسلہ کی گزشتہ قسط میں ذکر کی جا چکی ہیں، اس کے آگے آج کی اس قسط میں پڑھئے۔]

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَالَّتِيْ فِيْ آلِ عِمْرَانَ قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ——— رواہ مسلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعتوں میں سورۂ بقرہ کی آیات "قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا الخ" اور سورۂ آل عمران کی آیات "قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" پڑھا کرتے تھے۔

——— (صحیح مسلم)

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ كُنْتُ اَقُوْدُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاقَتَهٗ فِي السَّفَرِ فَقَالَ لِيْ يَا عُقْبَةُ

اَلَا اُعَلِّمُكَ خَيْرَ سُورَتَيْنِ قُرِئَتَا فَعَلَّمَنِي قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ. قَالَ فَلَمْ يَرَنِي سُرِرْتُ بِهِمَا جِدًّا فَلَمَّا نَزَلَ لِصَلٰوةِ الصُّبْحِ صَلّٰى بِهِمَا صَلٰوةَ الصُّبْحِ لِلنَّاسِ فَلَمَّا فَرَغَ الْتَفَتَ اِلَيَّ قَالَ يَا عُقْبَةُ كَيْفَ رَاَيْتَ۔

ـــــــــ رواہ احمد وابو داؤد والنسائی

حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ مبارکہ کی مہار پکڑ کر چلتا تھا، اثنا سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا عقبہ میں تم کو قرآن کی دو بہترین سورتیں تعلیم کر دوں، اس کے بعد آپ نے سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تعلیم فرمائیں، پھر آپ نے محسوس فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کی تعلیم سے مجھے بہت زیادہ خوشی نہیں ہوئی تو جب صبح کی نماز کے لئے آپ اترے تو آپ نے یہی دونوں سورتیں پڑھ کر فجر کی نماز پڑھائی، پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، عقبہ! تم نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا ـــــ"

(مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن نسائی)

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَاُ فِي الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِاَلٓمٓ تَنْزِيلُ فِي الرَّكْعَةِ الْاُولٰى وَفِي الثَّانِيَةِ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی پہلی رکعت میں الم تنزیل (یعنی سورۃ السجدہ) اور دوسری رکعت میں ہل اتیٰ علی الانسان (یعنی سورۃ الدہر) پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) فجر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت سے متعلق جو حدیثیں یہاں تک درج کی گئیں اور کتب حدیث میں ان کے علاوہ جو اور روایات اس سلسلہ میں

ملتی ہیں اُن سب کو پیش نظر رکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت فجر کی نماز میں بہ نسبت دوسری نمازوں کے اکثر و بیشتر کسی قدر طویل ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی (غالباً کسی خاص داعیہ سے) آپ فجر کی نماز بھی قل یاایہا الکافرون اور قل ھو اللہ احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس جیسی چھوٹی سورتوں سے پڑھا دیتے تھے۔ اسی طرح ان حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کا عام معمول نماز کی رکعتوں میں مستقل سورتیں پڑھنے کا تھا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی سورۃ میں سے کچھ آیات پڑھ دیتے تھے، اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورۃ کی قرأت فرمائی ــــــ جمعہ کی فجر میں سورۃ "الم تنزیل السجدہ" اور سورۃ دہر پڑھنے کی حکمت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت اور جزا سزا کا بیان بہت موثر انداز میں کیا گیا ہے، اور قیامت جیسا کہ احادیث میں بتلایا گیا ہے جمعہ ہی کے دن قائم ہونے والی ہے، اس لئے غالباً آپ اس کی تذکیر و یاددہانی کے لئے جمعہ کی فجر میں یہ دونوں سورتیں پڑھنا پسند فرماتے تھے، واللہ اعلم

ظہر و عصر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت :-

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْرَأُ فِی الظُّھْرِ فِی الْاُوْلَیَیْنِ بِاُمِّ الْکِتَابِ وَسُوْرَتَیْنِ وَفِی الرَّکْعَتَیْنِ الْاُخْرَیَیْنِ بِاُمِّ الْکِتَابِ وَیُسْمِعُنَا الْاٰیَۃَ اَحْیَانًا وَیُطَوِّلُ فِی الرَّکْعَۃِ الْاُوْلٰی مَا لَا یُطِیْلُ فِی الرَّکْعَۃِ الثَّانِیَۃِ وَھٰکَذَا فِی الْعَصْرِ وَھٰکَذَا فِی الصُّبْحِ ــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اسکے علاوہ دو سورتیں پڑھتے تھے اور آخر کی دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ، اور کبھی کبھی (اس سری نماز میں بھی) ایک آدھ آیت آپ اتنی آواز سے پڑھتے تھے کہ ہم سن لیتے تھے، اور پہلی رکعت میں طویل قرأت فرماتے تھے دوسری رکعت میں اتنی طویل نہیں فرماتے تھے، اور اسی طرح عصر میں اور اسی طرح فجر میں آپ کا معمول تھا۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ظہر کی سرّی نماز میں ایک آدھ آیت آپ اتنی آواز سے پڑھ دیتے تھے کہ پیچھے والے اُس کو سُن لیتے تھے ...... بعض شارحین نے لکھا ہے کہ غالباً ایسا کبھی غلبۂ استغراق میں ہو جاتا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کبھی بقصد تعلیم ایسا کرتے ہوں یعنی یہ بتانا چاہتے ہوں کہ میں فلاں سورہ پڑھ رہا ہوں یا اپنے اس عمل سے یہ مسئلہ واضح فرمانا چاہتے ہوں کہ اگر سری نماز میں ایک آدھ آیت اتنی آواز سے پڑھ دی جائے کہ پیچھے والے مقتدی سُن لیں تو اس کی گنجائش ہے اور اس کی وجہ سے نماز میں کوئی نقصان نہیں آئے گا۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ بِاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَفِي رِوَايَةٍ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ وَفِي الْعَصْرِ نَحْوَ ذَٰلِكَ وَفِي الصُّبْحِ أَطْوَلَ مِنْ ذَٰلِكَ ــــ رواہ مسلم

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں سورۃ واللیل اذا یغشیٰ ـــــ پڑھتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ سورہ سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تھے، اور عصر کی نماز میں بھی قریب قریب اتنی ہی بڑی سورت پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں اس سے کچھ طویل۔

(صحیح مسلم)

نماز مغرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت :-

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَرَأَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ بِحٰمٓ الدُّخَانَ

رواہ النسائی

حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں سورہ حٰم الدخان پڑھی۔ (سنن نسائی)

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ ـــــ رواہ البخاری ومسلم)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ أُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا — رواہ البخاری ومسلم

حضرت ام الفضل بنت الحارث رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورہ والمرسلات عرفاً پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الْمَغْرِبَ بِسُوْرَةِ الْاَعْرَافِ فَرَّقَهَا فِيْ رَكْعَتَيْنِ۔

رواہ النسائی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۂ اعراف مغرب کی دو رکعتوں میں تقسیم کر کے پڑھی۔ (سنن نسائی)

(تشریح) ان چاروں حدیثوں میں نماز مغرب میں جن سورتوں کی قراءت کا ذکر ہے اُن میں سے کوئی بھی اُن چھوٹی سورتوں میں سے نہیں ہے جن کو "قصار" کہا جاتا ہے بلکہ سب اُن بڑی سورتوں میں سے ہیں جن کو "طِوال" کہا جاتا ہے۔ بلکہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا والی آخری حدیث میں جس سورہ اعراف کی قراءت کا ذکر ہے وہ تو پورے سوا سیپارہ کی ہے، بہر حال ان چاروں حدیثوں میں تو نماز مغرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل طویل سورتیں پڑھنا ہی ذکر کیا گیا ہے لیکن آگے درج ہونے والی بعض دوسری روایتوں میں معلوم ہوگا کہ آپ کا اکثری معمول مغرب میں چھوٹی سورتیں پڑھنے کا تھا، اس لئے اکثر علماء کرام کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا حدیثوں میں نماز مغرب کے جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں آپ نے طویل طویل سورتیں پڑھیں یہ سب اتفاقی واقعات ہیں، اور آپ کا عمومی اور اکثری معمول مغرب میں چھوٹی ہی سورتوں کی قراءت کا تھا، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اُس مکتوب سے بھی معلوم ہوتا ہے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ

اشعریؓ کو لکھا تھا، انشاء اللہ عنقریب ہی حضرت فاروق اعظم کا یہ مکتوب بھی درج کیا جائیگا۔ واللہ اعلم

نمازِ عشا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت :-

عن البراء قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی العشاء والتین والزیتون، وما سمعت احدا احسن صوتا منہ — رواہ البخاری ومسلم

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں سورۂ والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سُنا ہے اور میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز والا کسی کو نہیں سنا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) صحیحین ہی کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جس کا ذکر حضرت براء بن عازب نے اس حدیث میں کیا ہے سفر کا ہے اور آپ نے اس نماز کی کسی ایک رکعت میں سورۂ والتین پڑھی تھی۔

عن جابر قال کان معاذ بن جبل یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یاتی فیؤم قومہ، فصلی لیلۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ثم اتی قومہ فامھم فافتتح بسورۃ البقرۃ فانحرف رجل فسلم ثم صلی وحدہ وانصرف فقالوا لہ انافقت یا فلان؟ قال لا واللہ ولآتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرنہ فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انا اصحاب نواضح نعمل بالنہار وان معاذا صلی معک العشاء ثم اتی قومہ فافتتح بسورۃ البقرۃ، فاقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذ فقال یا معاذ افتان انت؟ اقرأ والشمس وضحٰھا، والضحٰی، واللیل اذا یغشٰی، وسبح اسم ربک الاعلٰی۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ معاذ بن جبل کا معمول تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی مسجد میں نماز پڑھتے پھر آکر اپنے قبیلہ کی مسجد میں امامت کرتے، ایک رات انھوں نے عشاء کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے ساتھ پڑھی پھر اپنے قبیلہ میں آئے اور ان کی امامت کی اور (سورہ فاتحہ کے بعد) سورہ بقرہ شروع کر دی، ایک شخص نماز توڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور اس نے تنہا اپنی نماز پڑھی، (چونکہ یہ بات بہت غیر معمولی تھی اور اُس دور میں نماز با جماعت کا اہتمام نہ کرنا منافقوں ہی کا طریقہ تھا اس لئے) لوگوں نے اس کو بہت محسوس کیا اور اُس شخص سے کہا" فلانے! تو منافق تو نہیں ہو گیا ہے" اس نے جواب دیا "خدا کی قسم، نہیں"، بلکہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے سامنے یہ بات رکھوں گا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا" یا رسول اللہ! ہمارا کام اونٹوں کے ذریعہ پانی سینچنا ہے، ہم لوگ دن بھر محنت مشقت کرتے ہیں اور (گزشتہ رات ایسا ہوا کہ) معاذ عشا کی نماز آپ کے ساتھ پڑھنے کے بعد اپنے قبیلہ کی مسجد میں آئے (اور یہاں انھوں نے نماز پڑھانی شروع کی) تو سورہ بقرہ شروع کر دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر حضرت معاذ کی طرف رخ فرمایا اور ارشاد فرمایا معاذ! کیا لوگوں کو تم فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہو! سورۂ والشمس وضحٰہا، سورہ والضحیٰ، سورۂ واللیل اذا یغشیٰ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا کرو۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز دو دفعہ پڑھتے تھے ایک مسجد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتدی بن کر اور دوسری دفعہ اپنے قبیلہ کی مسجد میں امام بن کر، لیکن جمہور ائمہ وعلما اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے ایک دفعہ کی نماز وہ نفل کی نیت سے پڑھتے تھے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ جو نماز وہ مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کی اقتدا میں پڑھتے تھے وہ فرض کی نیت سے پڑھتے تھے اور اپنے قبیلہ والی مسجد میں امام بن کر نفل کی نیت سے پڑھتے تھے، اسی بنا پر حضرت امام شافعیؒ اس کے قائل ہیں کہ نفل پڑھنے والے امام کی اقتدا میں فرض نماز پڑھی جا سکتی ہے اُن کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے ـــــ لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی

تحقیق یہ ہے کہ نفل پڑھنے والے امام کی اقتدا میں فرض نماز نہیں پڑھی جاسکتی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے زیر بحث واقعہ کے متعلق ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ وہ فرض عشا کی نیت سے اپنے قبیلہ کی مسجد ہی میں نماز پڑھاتے تھے اور چونکہ مسجد نبوی کی جماعت کے وقت تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اس لئے آپ کی نماز کی خاص برکات میں حصہ لینے کے لئے اور سیکھنے کی غرض سے وہ نفل کی نیت سے آپ کے ساتھ بھی شریک ہوجاتے تھے، اس مسئلہ پر بھی دونوں طرف سے بڑی فاضلانہ فقیہانہ اور محدثانہ بحثیں کی گئی ہیں —— اہل علم شروح حدیث فتح الباری، عمدۃ القاری اور فتح الملہم میں دیکھ سکتے ہیں۔

حدیث کی خاص ہدایت جو ہمارے موضوع اور عنوان سے متعلق ہے بس یہ ہے کہ ائمہ کو چاہیئے کہ وہ نماز اتنی طویل نہ پڑھیں جو مقتدیوں کے لئے باعث مشقت ہوجائے خاصکر ضعیفوں، کمزوروں اور محنت پیشہ لوگوں کا لحاظ رکھیں۔

ہندوستان کی روحانی تسخیر
اور
چشتی سلسلہ کے اکابر شیوخ

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[ہمارے ناظرین اس سے باخبر ہیں کہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اُمتِ مسلمہ کی اہم اصلاحی اور تجدیدی کوششوں پر ایک مستقل تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اس تصنیفی سلسلہ کی دو جلدیں "تاریخ دعوت و عزیمت" کے نام سے ایسے سے کئی سال پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری جلد کا کام بھی قریب الختم ہے۔ اس میں موصوف نے دعوت و ارشاد اور اصلاحِ قلوب کے اُس کام کو مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں یقین و معرفت کے بعض ائمہ سے ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے دور سے بھی دو ڈھائی سو سال پہلے لیا تھا۔ ذیل میں اسی کتاب کے باب اول کا ایک حصہ درج کیا جا رہا ہے جو اصل مضمون کے لئے ایک طرح کی تمہید ہے]
(نعمانی)

عالمِ اسلام کا نیا روحانی و فکری مرکز

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس صدی کے آخر میں وسیع اسلامی دنیا میں ایک ایسے نئے وسیع ملک کا اضافہ ہو رہا تھا جو قدرتی خزانوں اور انسانی صلاحیتوں سے مالا مال تھا اور جس کے لئے مستقبل قریب میں اسلامی دعوت کا عالمگیر مرکز اور اسلامی علوم

کی محافظ و امین بننا مقدر ہو چکا تھا۔

اس صدی کے اوائل میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام پر مور و ملخ کی طرح یورش کی ملک کے ملک اُن کی بربریت اور وحشیانہ مظالم سے تاراج اور بڑے بڑے نامی گرامی شہر جو کبھی علم و تہذیب کے علمبردار اور مدارس و خانقاہوں سے یکسر گلزار ہو رہے تھے بے چراغ ہو گئے شہروں کا امن و سکون، زندگی کا نظم و نسق اور شرفاء کی عزت و ناموس خاک میں مل گئی۔ بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم اور بالآخر مرکز خلافت دارالسلام بغداد اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا اور قدیم تہذیب کا مدفن بن کر رہ گیا اس بلائے ناگہانی سے عالم اسلام کی چولیں ہل گئیں اور پوری قدیم اسلامی دنیا پر سیاسی زوال اور فکری و علمی اضمحلال کے بادل چھا گئے۔ اس وقت اس پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنۂ عالم آشوب سے محفوظ رہ گیا تھا۔ یہاں تازہ دم، قوی اور پُرجوش ترکی النسل خاندانوں کی حکومت تھی جو ان تاتاریوں اور مغلوں سے پنجہ آزمائی کر سکتے تھے اور اپنی ایمانی غیرت اور اسلامی جوش کی بنا پر جنگی قوت اور شجاعت میں نہ صرف اُن کے حریف بلکہ اُن سے فائق تھے۔ تاتاری اور مغل ہندوستان پر بار بار حملے کرتے رہے اور پسپا ہوتے رہے۔ حضرت سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں چنگیزی مغلوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا۔ پہلا حملہ ۶۹۷ھ میں ہوا چھٹے اور پانچویں حملہ میں سلطان کی طرف سے ملک تغلق (غازی ملک) نے جو بہادری دکھائی اور مغلوں کو اس طرح شکست فاش دی کہ "دراں روز باز مغل را ہوس ہندوستان بردل سرد شد و دندان طمع کند گشت"[1] (اُس دن سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد پڑ گئی اور اُن کے دندانِ حرص و آز ہمیشہ کے لئے کھٹے ہو گئے)۔

ان خصوصیات کی بنا پر عالم اسلام کے بہترین خاندان جن کو اپنا ناموس اور ایمان عزیز تھا اور بہترین دل و دماغ جو اپنے بدقسمت وطن میں سکون و اطمینان سے محروم ہو گئے تھے، ہندوستان کے جدید دارالامن اور دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے۔ لائق ترین انسانوں اور

[1] منتخب التواریخ ص۱۹۶، تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص۲۵۱ و ص۳۰۲ و ص۳۲۰ و ص۳۲۳

اور شریف خاندانوں کا یہ سیلاب ایران، ترکستان و عراق کی طرف سے بار بار اُمنڈتا رہا اور اُن کی وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر اور رشک بغداد و قرطبہ بن گئی۔ مؤرخین ہندوستان ضیاء الدین برنی وغیرہ جب ان شریف و نجیب خاندانوں، اساتذۂ وقت، علمائے نامدار اور مشائخ کبار کی فہرست سناتے ہیں جو فتنۂ تاتار میں ہندوستان ہجرت کرکے آگئے تھے اور ہنگامۂ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین گرم کئے ہوئے تھے، نیز جنھوں نے سلطنت کی نازک ترین ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اور ملک کی زیب و زینت کا باعث تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام کا جوہر شرافت و فضیلت یہیں آگیا تھا۔[1]

اس انقلاب سے ہندوستان نہ صرف عالم اسلام کا ایک اہم حصہ بن گیا تھا بلکہ تاریخ کا صاف اشارہ تھا کہ وہ اسلام کی فکری و روحانی قوت، علمی تحریکات اور احیاء و تجدید کا نیا مرکز بن رہا ہے اور فکر اسلامی اور دعوت و عزیمت کے مؤرخین کو اب مسلسل کئی صدیوں تک اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی پڑے گی۔

اسلامی ہند کے معمار | اسلامی دنیا کے لئے ہندوستان کی دریافت اور بازیافت "نئی دنیا" کی دریافت سے کم انقلاب انگیز اور عہد آفریں واقعہ نہ تھا۔ اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر و اخلاق سے تسخیر کر لیا تھا اور اس برصغیر (ہند) میں جابجا داعیان اسلام کے مرکز و خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں جیسے ع

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندر اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سر، اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصہ میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتی (م ۶۲۷ھ) کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی ص ۱۱۱-۱۱۲

ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ وجود میں آچکے تھے اور عرصہ سے پھل پھول رہے تھے۔ اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہنچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر و تشکیل میں سب کا حصہ ہے۔ شکر اللہ مساعیہم۔ لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور اس سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لیے دین کے ساتھ [illegible] (الاتقا) حکمت الٰہی نے چشتی سلسلہ کو انتخاب فرمایا وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ

ان اسرارِ الٰہی سے قطع نظر جن کو ہماری کوتاہ نظر نہیں پاسکتی، چشتیوں پر اس ملک کا حق ہمسائیگی بھی تھا، ان کا سلسلہ اس ملک کے ہمسایہ ملک ایران میں فروغ پا رہا تھا، اپنے دردمند مزاج اور نسبت عشق کی بنا پر بھی جو سلسلۂ چشتیہ کا سرمایہ ہے اس سلسلہ کو ہندوستان کا دل جیت لینا اور اس کو اپنی محبت کا اسیر اور عشق الٰہی کا نخچیر بنا لینا آسان تھا کہ زمانۂ قدیم سے محبت ... درد اس سرزمین کے خمیر میں ہے۔

ہندوستان سے چشتیوں کا پہلا تعلق | غرض ان معلوم و نامعلوم حکمتوں کی بنا پر قدرت الٰہی نے ہندوستان میں اسلام کے تعارف اور اشاعت کے لئے اس سلسلہ کو انتخاب فرمایا اور چشتیوں کو ہندوستان کی طرف رخ کرنے کا اشارۂ غیبی ہوا۔ سب سے پہلے جس چشتی شیخ نے ہندوستان کی طرف عنان عزیمت موڑی وہ خواجہ ابو محمد چشتی [1] تھے جن کی دعائیں اور بابرکت ذات سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی پشت پناہ تھی۔

مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں:۔

وقتے کہ سلطان محمود بہ غزوِ سومنات ... "جس وقت سلطان محمود سومنات کی

---

[1] خواجہ ابو محمد چشتی (م ۴۰۹ھ یا ۴۱۱ھ) خواجہ ابو احمد چشتی کے فرزند و خلیفہ تھے جو خواجہ ابو اسحٰق شامی کے خلیفۂ اعظم اور خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کے شیخ و مرشد تھے۔ خواجہ ناصر الدین ابو یوسف خواجہ قطب الدین مودود کے والد اور شیخ ہیں اور وہ حاجی شریف زندنی کے، حاجی شریف زندنی کے خلیفہ حضرت عثمان ہارونی، ان کے خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی۔

[۱] رفتہ بود خواجہ سا در واقعہ نمودند کہ بمدد گاری دے باید رفت، در سن ہفتاد سالگی با درویشے چند متوجہ شد، چوں آں جا رسید، بنفس مبارک خود با مشرکان وعبدۂ اصنام جہاد کرد [۲]

طرف گیا ہوا تھا خواجہ ابو محمد کو اشارۂ غیبی ہوا کہ اُس کی مدد کے لئے جائیں، وہ ستر برس کی عمر میں چند درویشوں کے ساتھ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر بنفس نفیس جہاد میں شرکت فرمائی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی لیکن جس طرح محمود کی سیاسی فتح کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کے استحکام واستقلال کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری کے لئے مقدر تھی خواجہ ابو محمد چشتی کے کام کی تکمیل اور اسلام کی عمومی اشاعت اور مستحکم اسلامی مرکز رشد وہدایت کا قیام اسی سلسلہ کے ایک شیخ، شیخ الشیوخ خواجہ معین الدین سجزی [۳] کے لئے مقدر ہو چکا تھا

---

[۱] محمود نے سومنات پر حملہ ۴۱۶ھ میں کیا۔ اگر خواجہ ابو محمدؒ کا سنہ وفات مذکورۂ بالا صحیح ہے تو اس سے پہلے اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ غالباً مولانا جامی کی مراد حملۂ ہندوستان سے ہے۔ انھوں نے اس کو حملۂ سومنات سے تعبیر کیا ہے کہ ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ اسی کی شہرت ہوئی سومنات پر حملہ کرنے سے پہلے ہندوستان پر محمود کے آٹھ حملے ہو چکے تھے ان میں سے کسی حملہ میں۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے حملہ میں الشیخ ابو محمد ساتھ رہے ہوں گے۔

[۲] نفحات الانس صفحہ ۲۲۳

[۳] خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اصلی وطنی نسبت سجزی ہے جو کاتبوں کی غلطی اور پڑھنے والوں کی غلط فہمی سے "سنجری" بن گیا۔ قدیم مسودات واسفار سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں "سجزی" ہی لکھا اور بولا جاتا تھا۔ سجزی نسبت سجستان کی طرف ہے، قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اس کو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس کا اکثر حصہ ایران میں شامل ہے اور باقی افغانستان میں۔

اس علاقہ کا پایۂ تخت زرنج تھا جس کے کھنڈرات "زاہدان" کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ میں سجستان کے حدود غزنین تک تھے۔ (احسن التقاسیم) (باقی حاشیہ صفحہ ۲۰ پر)

قدیم تر مؤرخین (جن میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی بھی شامل ہیں جو حضرت کے کمسن معاصر ہیں) کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ سلطان شہاب الدین غوری کے اُس لشکر کے ساتھ تھے جس نے والی اجمیر رائے پتھورا پرتھوی راج[۵] کو شکست دی اور

(بقیہ صفحہ ۱۹) بعض جغرافیہ دانوں کے نزدیک سجز، سجستان کے ایک خاص مقام کا نام ہے جس کی طرف نسبت سجزی آتی ہے۔ کبھی کبھی پورے سجستان کی طرف بھی سجزی کہہ کر نسبت کرتے ہیں۔

"جغرافیہ خلافتِ مشرقی" کے مصنف جی. بی. اسٹرینج نے تیس صفحوں میں سجستان کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیستان فارسی لفظ سگستان سے ماخوذ ہے۔ عرب اسے سجستان کہتے ہیں۔ اس ملک کی زمین نشیب میں ہے اور جھیل زرہ کے گرد اور اُس کے مشرق میں واقع ہے۔ دریائے ہلمند اور جس قدر دریا اس جھیل میں گرتے ہیں ان سب کے ڈیلٹا اسی زمین میں پڑتے ہیں۔

فارسی میں سیستان کو نیمروز (یا جنوبی ملک) بھی کہتے ہیں اور جنوبی ملک کہنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سیستان، خراسان کے جنوب میں واقع ہے ص ۵۰۴-۵۰۳

[۵] پرتھوی راج یا رائے پتھورا (۱۱۶۸ء تا ۱۱۹۲ء) سومیشور کا بیٹا تھا۔ جو اجمیر کے چوہان حکمران خاندان کے بانی "ارنو راجہ" کا فرزند اور اس خاندان کے نامور فرمانروا وگرہ راجہ عرف ویسل دیو کا بھائی تھا۔ "سومیشور" کا دہلی کے تومر راجپوت حکمراں خاندان اور اجمیر کی چوہان شاخ پر یکساں اقتدار تھا۔ سومیشور دہلی کے آخری تومر فرمانروا اننگ پال (اننگ پال) کا داماد تھا اور اس رشتہ سے پرتھوی راج دہلی کے آخری فرمانروا کا نواسہ ہوتا تھا۔ اننگ پال کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اُس نے پرتھوی راج کو متبنّیٰ کیا تھا۔ اُس کے انتقال پر دہلی کی سلطنت پرتھوی راج کے حصہ میں آئی۔ اور اجمیر کی سلطنت اُس نے اپنے باپ سومیشور سے وراثت میں پائی، اس طرح وہ راجپوتوں کی دو طاقتور مرکزی سلطنتوں دہلی و اجمیر کا مالک ہوا، چونکہ اجمیر سے اُس کا آبائی اور وطنی تعلق تھا اور وہ اُس کی دادھیالی گدی تھی اس لئے اغلب ہے کہ اُس کا زیادہ قیام اجمیر میں رہتا تھا۔ اس وجہ سے اجمیر اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ پرتھوی راج اپنی ذات سے بڑا حوصلہ مند، منچلا، فنونِ سپہگری میں طاق اور بہادر راجپوت تھا۔ اُس نے بہت سی جنگوں میں (بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

ہندوستان کی فتح کی تکمیل کی۔ اس فتح میں اُن کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصہ[1] تھا۔

بعد کے مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوری کے حملوں کے درمیان (جو ۵۸۸ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے ابتدائی سنین ہی میں اجمیر میں[2] جو اُس وقت راجپوت طاقت وحکومت اور ہندو مذہب وروحانیت کا بہت بڑا مرکز تھا

(بقیہ صفحہ ۲۰) نمایاں فتوحات حاصل کیں، جنھوں نے ایک صدی تک اس کے نام کو زندہ اور روشن رکھا۔ قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو "سوئمبر" سے لے آنے کی وجہ سے وہ ان داستانوں اور نظموں کا ہیرو بن گیا جو اب تک شمالی ہند میں گائی اور پڑھی جاتی ہیں۔ وہ اپنی سپہ گری، حوصلہ مندی اور فتوحات کی بنا پر ہندوستان کے دورِ آخر کے بہادر راجپوتوں اور طاقتور فرمانرواؤں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، لیکن اُس کی آخری شکست نے اُس کی عظمت پر پردہ ڈال دیا اور تاریخ ہند نے اُس کا قصور معاف نہیں کیا۔ ۱۱۹۱ء میں جب سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا، پرتھوی راج نے ترائن (حال تلاوڑی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکستِ فاش دی۔ اگلے سال ۱۱۹۲ء میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا۔ پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا۔ ۱۵۰ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے۔ پرتھوی راج نے شکست کھائی۔ گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا (پروفیسر ایشوری پرشاد اور دیگر مؤرخین، خلاصتاً)

[1] طبقات ناصری ص ۱۲، فرشتہ ص ۵۵، منتخب ص ۵۸

[2] اجمیر سے ۷ میل کے شمال پُشکر، ایک مشہور مذہبی تیرتھ گاہ تھی جس کی یاترا کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ اس جھیل کو جو مذہبی تقدس حاصل تھا اُس میں صرف مان سرور کی جھیل اس کی ہمسری کر سکتی ہے۔ پُشکر کی جھیل کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ برہما نے یہاں یگ کیا اور یہاں پر سرسوتی نئے پانچ دھاراؤں سے برکت ہوتی ہیں۔ (اجمیر ڈسٹرکٹ گزیٹر ص ۱۸)

قیام اختیار فرما لیا تھا۔ ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اُس کی ترکتازیاں شمالی مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اُس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی۔ حضرت خواجہ نے اُس کی سفارش کی۔ پتھورا نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا: "یہ شخص آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کرتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں نہ سنیں"۔ خواجہ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے محمد غوری کو دے دیا۔" اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی[۱]۔ بہرحال واقعہ کی جو ترتیب ہو اس میں شک نہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت اور استحکام سے بیشتر ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے عظیم سیاسی و روحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لئے انتخاب فرمایا۔ یہ فیصلہ اُن کی اولوالعزمی، عالی ہمتی اور جرأتِ ایمانی کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحینِ عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال و اخلاص اُن کے توکل و اعتماد، اُن کے زہد و قربانی اور اُن کے ورد اور اُن کے درد و سوز نے ہندوستان کے لئے دار الاسلام بننے کا فیصلہ کر دیا اور جو سرزمین ہزاروں برس سے صحیح یقین اور صحیح معرفت سے محروم اور توحید کی صدا سے ناآشنا تھی وہ علماء اولیا کی سرزمین اور علوم اسلامیہ اور کمالاتِ دینیہ کی محافظ و امین بن گئی اور اُس کی فضائیں اذانوں سے اور دشت و جبل اللہ اکبر کی صداؤں اور اُس کے شہر و دیار قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے ایسے گونجے کہ صدیوں سے عالم اسلام گوش بر آواز ہے۔

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

سیر الاولیاء کے مصنف نے بڑی صداقت و بلاغت سے لکھا ہے:۔

مملکت ہندوستان تا حد بر آمدن آفتاب ۔۔۔۔ ملکِ ہندوستان اس آفتاب ہدایت

---

[۱] سیر الاولیاء، ص۴۷ تا آخر الکرام

همه دیارِ کفر و کافری و بُت پرستی بود و متمردانِ هند هر یکے دعوائے انا ربکم الاعلیٰ می کردند و خدائے را جل و علا شریک می گفتند و سنگ و کلوخ و دار و درخت و ستور و گاؤ و سرگین آں را سجده می کردند و بظلمتِ کفر قفلِ دلِ ایشاں حظلم و محکم بود۔

کے طلوع سے پہلے کفر و بُت پرستی کی دنیا بنا ہوا تھا اور یہاں کے باغیانِ خدا میں سے ہر ایک (انا ربکم الاعلیٰ) کا دعویٰ کرتا تھا اور شرک ان کا شعار تھا اور یہاں ڈھیلوں، پتھروں، استھانوں، گائے بیل وغیرہ جانوروں اور اُن کے فضلات کی پوجا ہوتی تھی اور اس کفر و شرک کی ظلمت سے اُن کے دل سیاہ اور گویا پتھر ہو گئے تھے۔"

همه غافل از حکم دین و شریعت
همه بے خبر از خدا و پیمبر
نه هرگز کسے دیده هنجار قبله
نه هرگز شنیده وکس الله اکبر

به وصولِ قدمِ مبارک آں آفتابِ اہلِ یقین که بحقیقت معین الدین بود ظلمتِ این دیار بنورِ اسلام روشن و منور گشت۔

"اہلِ یقین و معرفت کے آفتابِ عالمتاب خواجہ معین الدین کے قدوم کی برکت سے یہ تاریک علاقے نورِ اسلام سے منور ہوئے۔"

از تیغِ او بجائے صلیب و کلیسا
در دیارِ کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا که بود نعره و فریادِ مشرکاں
اکنوں خروشِ نعرهٔ الله اکبر است

و هر که ازیں دیار مسلمان شده تا روزِ قیامت مسلمان خواهد شد و فرزندانِ ایشاں تا توالداً و تناسلاً است مسلمان خواهند بود و آں طائفه را که بہ تیغِ اسلام به دارِ حرب در

"ان علاقوں میں جن بندوں کو ایمان نصیب ہوا اور جن کو آئندہ نصیب ہوگا اور اُن کی اولاد در اولاد جو قیامت تک ایمان کے ساتھ اس سرزمین پر زندگی گزارے

دار اسلام خواہند آورد الی یوم القیامۃ منسوبات آں بارگاہ باجاہ شیخ الاسلام معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہ العزیز بتالعبت، حضرت او واصل و منوا، خواہند بود، انشاء اللہ العزیز[1]	گی اور جن طبقات کو اسلام کی طاقت و قوت علاقہائے دار الحرب سے اس دار الاسلام میں کھینچے گی الی یوم القیامۃ ان سب کے ایمان و اسلام کا ثواب خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کو انشاء اللہ ضرور پہنچے گا۔"

اس طرح ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور اُن کے مخلص و عالی ہمت بانیٔ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے مولانا غلام علی آزاد نے صحیح لکھا ہے:۔

لاشک بزرگان چشتت عنبر سرشت راحقی است قدیم بر ولایت ہند[2]	"بلا شبہہ ملک ہندوستان پر بزرگانِ چشت کا قدیم حق ہے

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے:۔

بہندوستان بیمن قدوم میمنت لزوم مش طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر و شرک از عرصۂ روزگار بزدود[3]	"ہندوستان میں انھیں کی آمد سے اسلام کی روشنی پھیلی اور کفر و شرک کی سیاہی کا زور ٹوٹا۔"

حضرت خواجہ معین الدین کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا اور اجمیر نے اپنی اہمیت بہت کچھ کھو دی۔ خواجہ بزرگ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو بٹھایا اور خود اجمیر ہی میں مقیم رہے جہاں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت، اور مشغولی بحق میں اپنی بقیہ زندگی پوری کر دی۔ کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور اُن کے نتائج و اثرات کا مستند

---

[1] سیر الاولیا صہ۴۷ [2] مآثر الکرام صہ۷ [3] سیر الاقطاب صہ۱۰۱

وتعین طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے ان سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے :۔

عزلت گزیں باجمیر شد و فراوان چراغ برافروخت واز دم گیرائے او گروہا گروہا مردم بہرہ برگرفتند[1]

"آپ اجمیر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور وہیں بیٹھ کر لاتعداد چراغ آپ نے روشن کئے اور آپ کے پاک انفاس سے انسانوں کے بہت سے گروہ بہرہ یاب ہوئے۔"

تقریباً نصف صدی ارشاد و تلقین، اسلام کی اشاعت اور داعیانِ اسلام و اہلِ قلوب کی تعلیم و تربیت اور یادِ حق میں سرگرمی کے ساتھ مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں سنہ ۶۲۷ھ[2] میں اُس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں اُن کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا اور دارالحکومت دہلی میں اُن کا جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین بختیار کاکی) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا۔ اور اُس کا عقیدت مند و حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشہور تھا۔

---

[1] آئینِ اکبری (سرسید ایڈیشن)، صفحہ ۲۷

[2] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر تین سنہ لکھے گئے ہیں۔ سنہ ۶۲۷ھ، سنہ ۶۳۲ھ اور سنہ ۶۳۳ھ۔ صاحب سیر الاقطاب نے آفتاب ملک ہند سے سنہ وفات سنہ ۶۳۳ھ استخراج کیا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے بھی یہی سنہ وفات مانا ہے۔

لو آپ اپنے دام میں — صیاد آگیا!

جناب غلام احمد پرویز (پاکستان) جو انکارِ سنّت میں نام پا چکے ہیں اور قرآن کی تشریح کا حق رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) سے چھین کر اس منصبِ خاص پر خود قابض ہونے کے لئے عجیب عجیب صلاحیتوں کا مظاہرہ ایک عرصہ سے کر رہے ہیں، ایک زمانہ میں اس مکتبِ فکر پر خود زبردست تنقید کر چکے ہیں۔ یہ مشکلہٗ کی بات ہے۔ اُس وقت کا اُن کا ایک مضمون معارف اعظم گڈھ کی پرانی فائلوں میں دریافت کیا گیا ہے۔ ایشیا لاہور کے شکریہ کے ساتھ ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں بھی اس کا ایک حصہ پیش کرتے ہیں۔ (ادارہ)

منکرینِ سنت کی تیسری گمراہی

تیسرا اعتراض ان کا یہ ہوتا ہے کہ قرآن چونکہ فی ذاتہٖ تبیاناً لکل شیئٍ ہے۔ اس لئے اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

گمراہی کا عملی ثبوت | سب سے پہلے تو اُن کا اپنا طرزِ عمل اُن کے اس دعوے کے منافی ہے۔ یعنی جس کتاب کو وہ مفصل، بیّن و تبیان سمجھتے ہیں خود اُس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کے ایک مقام کی تفسیر دوسرے مقام سے کرتے ہیں۔ لیکن اگر اُن کی تفاسیر کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقام اور دوسرے مقام کے درمیان جو خلیج رہ جاتی ہے، اُسے پُر کرنے کے لئے وہ اپنے ذہن و اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ یعنی ربط

مضامین اور استنباطِ نتائج میں قرآنی آیات کو اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق چلاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ اُن کی نئی جماعت کا وجود ہی اس دعوے پر مبنی تھا کہ مسلمانوں میں "قرآن کے باہر" کی تعلیم سے جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں اُنھیں مٹانے کے لیے رجعت الی القرآن ضروری ہے۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ ابھی اُن کی پیدائش کو چند روز بھی نہیں ہوئے اور وہی جماعت کئی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ہر جماعت بیّن اور مفصل قرآن کو کھینچ تان کر اپنے مزعومات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتی ہے

نظری ثبوت | یہ تو رہا عملی ثبوت۔ اب نظری حیثیت سے دیکھئے تو اُصول و قانون کی کوئی کتاب خواہ وہ کسی قدر مفصل و مبین کیوں نہ ہو اُس کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے اور اُس کے حقائق و رموز کی علّت و غایت معلوم کرنے کے لئے اُس کی تفصیل و تبیین کی ضرورت لابدہوتی ہے۔ اسی ضرورت کو مدّنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

وَمَا اَرسلنا من رسولٍ اِلا بلسان قومہٖ لیُبیّن لھم　　اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اُس کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ اُن سے (احکام الٰہیہ) بیان کریں۔

رسول کو اُس کی قوم کا ہم زبان بھیجنا اس پر دلالت کرتا ہے (اور خود قرآن نے اس کی وضاحت کردی ہے) کہ رسول کا فریضہ تبیینِ احکام بھی ہے ورنہ اگر مقصود محض پیغام پہنچانا ہی ہوتا تو اللہ تعالےٰ کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ ایک عجمی شخص پر عربی میں قرآن نازل کر دیتا۔ اور اس طرح قرآن کو عربوں تک پہنچا دیتا۔ اس شکل میں مصرحہ صدر آیت میں رسول کی جگہ رسالت یا کتاب کا لفظ ہونا چاہیے تھا یعنی "جس قوم پر کوئی کتاب یا پیغام بھیجتے ہیں وہ اسی کی زبان میں بھیجتے ہیں" یہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں نبی اکرم کی تبیان کا حکم دیا گیا ہے وہاں تبیان بمقابلہ "کتمان" ظاہر کر دینے کے معنی میں ہے یعنی اے رسول جو تم پر نازل کیا گیا ہے اُسے چھپا کر نہ رکھو بلکہ ظاہر کردے۔ لیبیّن کے ان معانی کو مذکورہ صدر آیت میں رکھ کر دیکھئے، مطلب

---

۵ (معارف) یہ بیان سیرت النبی جلد چہارم میں صفحہ ۱۳۶ سے صفحہ ۱۳۸ تک ہے۔

کس قدر مہمل ہو جاتا ہے۔ سورۃ النحل آیت ۴۴ میں ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْہِمْ وَلَعَلَّہُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ

"ہم نے تمھاری طرف ذکر (قرآن) کو اتارا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں پر نازل کیا گیا ہے اُسے آپ بیان کردیں تاکہ وہ اس میں تفکر کیا کریں۔"

اس آیت میں ایک فردِ واحد (الیک) کی طرف تنزیلِ قرآن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے (لِ۔ تاکہ) کہ جو پیغام اللہ نے لوگوں کی طرف بھیجا ہے اُس کی تبیین کردے۔ اس پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ اگر رسول نے اس پیغام کی تبیین کردی تو لوگوں کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خود غور و فکر کریں، اُن کے لئے غور و فکر کے لئے کون سی چیز باقی رہ جائے گی؟ گزارش ہے کہ قرآن نے اپنے آپ کو بار بار مفصّل، مبین، تبیانٌ لکلِّ شیٍٔ کہا ہے۔ اپنی آیات کو بیّنات قرار دیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ تفصیل و تبیین، تدبّر و تفکّر کا بار بار حکم دیا گیا ہے:

لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ۔ لَعَلَّھُمْ یَدَّبَّرُوْنَ۔ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (یونس ۲۴)

اگر قرآن باوجود بیّن اور مفصّل ہونے کے بھی اس قابل رہتا ہے کہ اُس میں تدبّر و تفکّر کی گنجائش باقی رہ جائے تو یقیناً رسول کی تبیین کے بعد انسانی عقل و فکر پر مہریں نہیں لگ جاتیں۔ لعلّھم یتفکّرون کے لئے تبیینِ رسول مانع نہیں ہو سکتی بلکہ بصیرت و شعور کی سینکڑوں اور راہیں کھل جاتی ہیں ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا[1]

---

[1] اسلامی تدبّر و اجتہاد سے مقصد یہ ہے کہ جن رموز و معارف کا قرآن نے اشارۃً اور اجمالاً ذکر کیا ہے دنیوی علوم و فنون اور ذاتی تحقیق و تدقیق سے اُن کی کنہ و حقیقت دریافت کی جائے۔ مثلاً سیرفی الارض قرآن کا اشارہ تھا اور محکمۂ آثارِ قدیمہ اس اشارہ میں تدبّر کا نتیجہ۔ اسی طرح احکامِ قرآنی میں تدبّر کے یہ معنی ہیں کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ وہ کن مصالح پر مبنی ہیں اور اس طرح انھیں دنیا کی بہترین تعلیم ثابت کیا جائے۔ مثلاً الصلوٰۃ کی غرض و غایت کا قرآن میں اجمالاً ذکر ہے۔ تدبّر فی القرآن سے ثابت کیا جائے کہ تکمیلِ انسانی کے مقاصد کے حصول کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی الصلوٰۃ کی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی۔ اس بارے میں تدبّر سے مراد یہ ہوگی کہ ثابت کردیا جائے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس سے بہتر عملی شکل کوئی پیدا نہیں ہو سکتی (پرویز)

یہیں سے منصبِ رسول کی تمام راہیں روشن و منور ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ)

"وہی ہے جس نے عرب کی ناخواندہ قوم میں اُنہی میں سے ایک پیغمبر بھی بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، اُن کو پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

منصبِ رسالت اس آیت میں رسولِ اکرم کے منصبِ رسالت میں تین بین اور مستقل چیزیں بیان کی گئی ہیں: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیۂ نفوس اور (۳) تعلیم کتاب و حکمت۔

اگر لتبیین (تاکہ وہ ظاہر کردے) میں تبیین سے مراد وحی الٰہی کو لوگوں پر محض ظاہر کر دینا ہی ہے۔ اگر ما علی الرسول الا البلاغ میں بلاغ کے معنی پہنچا دینا (یعنی وضاحت نہ کرنا بلکہ محض پہنچا دینا) ہی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اتنا کام منصب نمبرا (یعنی تلاوتِ آیات) میں پورا ہو گیا جب رسولؐ نے خدا کی آیات پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں تو ما اُنزِلَ اِلَیْهِم (جو کچھ اُن کی طرف بھیجا گیا ہے) کا اظہار (بقول معترضین تبیین) ہو گیا تو اس کے بعد جو ابھی دو شقیں اور باقی ہیں۔ ان سے کیا مطلب، شق نمبر ۲ سردست الگ رہنے دیجئے۔ لیکن شق نمبر ۳ میں "تعلیم کتاب و حکمت" تو تلاوت سے علیحدہ چیز ہے۔ کتاب و حکمت کے واؤ عطف کی بحث میں بھی نہ اُلجھیئے کہ یہ تفسیری ہے یا فصلی۔ بہرکیف تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب دو جداگانہ اور مستقل عنوان ہیں۔ اظہار و ابلاغ تو تلاوت میں آگیا۔ اس تعلیم کے لئے کیا باقی رہ گیا۔ یہ ہے وہ منصبِ عظمیٰ جس کو نظرانداز کر دینے سے یہ تمام گتھیاں پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی ہیں۔ ذرا بھی تدبر سے کام لیا جاتا تو یہ حقیقت کھل جاتی کہ اظہار و تبیین میں وہی فرق ہے جو تلاوت و تعلیم میں ہے اور یہی تعلیم و تبیین کی ضرورت تھی جس کی وجہ سے رسول انسان بھیجے گئے اور پھر وہ زبان بھی وہی بولتے تھے جو اُن لوگوں کی تھی جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے۔ کفار کا یہی اعتراض تھا کہ رسول کو فرشتہ کیوں نہیں بنایا گیا؟ جواب ملا۔

قل لو کان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزّلنا علیھم من السّمآء ملکاً رسولا۔

"کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے رہتے ہوتے اور اس میں چلتے بستے تو البتہ ہم اُن پر آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔"

اسوۂ حسنہ کی ضرورت ورنہ اگر غور و فکر اور ہدایت و نجات کے لئے کتاب کی آیات ہی کافی ہوتیں تو کتاب کسی پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دی جاتی۔ عوام کے دلوں میں القا کر دی جاتی (جیسا کہ وہ اکثر اعتراض یہی کرتے ہیں) کہ ہم پر وحی کیوں نہیں بھیجی جاتی لیکن اس علیم و حکیم کو خوب علم تھا کہ تعلیم بلا عمل اور کتاب بلا رسول ناقص رہ جاتی ہے۔ یہی ضرورت تھی جس کے پورا کرنے کے لئے فرمایا کہ:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُولِ اللہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

"تمھارے لئے رسولِ خدا (کی زندگی) میں عمدہ نمونہ ہے"

اور اس نمونہ کی ضرورت یوں بیان فرمائی

لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللہَ کَثِیْراً (الاحزاب۔ ۲)

"(یہ نمونہ) ایسے شخص کے لئے جو خدا (کی ملاقات) اور یوم آخرت کی اُمید رکھتا ہے اور خدا سے بہت ڈرتا ہو۔"

لہ قرآنِ کریم میں صرف دو ہستیوں کے اسوۂ مقدسہ کو مسلمانوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے، ایک تو خود نبی اکرم اور دوسرے حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھی (والذّین معہ ممتحنہ۔ ۴-۶)۔ ظاہر ہے کہ صحف ابراہیمی مسلمانوں کے پاس موجود نہیں، سو اگر اسوہ کا مقصد کتاب کی تعلیم ہی ہوتا تو اسوۂ ابراہیمی آج کہاں سے لیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے صحفِ ابراہیمی کے الفاظ کو کہیں نہیں دہرایا بلکہ اُن کے اعمالِ حیات کا بہ وضاحت ذکر کیا ہے جن کی بنا پر وہ امتِ مسلمہ کے امام اور ملتِ حنیفہ کے قائدِ اعظم قرار دئے گئے تھے سو اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کے حروف اسوۂ حسنہ نہیں بن سکتے بلکہ نقوشِ قدم ہی اسوہ ہو سکتے ہیں اور یہی وہ نقوش ہیں جو اپنی آغوش میں رموز و اسرار کی ہزار داستانیں پنہاں رکھتے ہیں سہ

یہاں کا ہو قصد آپ جائیں مگر نہ انگوٹھا لے چلیں — کہ صاحبانِ جنوں سے باتیں ہزار یہ نقشِ پا کریں گے

(بقیہ حاشیہ)

یہ آیت آپ اپنی تفسیر ہے۔ یعنی ایک شخص خدا سے بہت ڈرتا ہے اور اُسے یقین ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں کیا جاتا ہے ایک دن خدا کے حضور پہنچ کر اس کی جوابدہی ضرور ہوگی۔ اب جس شخص کا یہ ایمان و ایقان ہو لامحالہ وہ یہی چاہتا ہے کہ اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ کون سی شاہراہِ حقیقت ہے جس پر گامزن ہو کر وہ اس منزلِ مقصود کو پالے گا اور ادھر اُدھر ضال و مغضوب (ذلیل و خوار) نہیں ہوتا پھرے گا۔ اس کے لئے فرمایا کہ تردد کی کیا ضرورت ہے رسولؐ کی زندگی کا نمونہ سامنے ہے اس ہادیٔ صراطِ مستقیم کے نقوشِ قدم موجود ہیں۔ بلاخوف و خطر ان نشانوں پر چلتے جاؤ۔ کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہوگا۔

وَاِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (الانعام ۱۵۴)

"اور یہ ہے میری راہ جو مستقیم ہے۔ سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے الگ کر دیں گی۔"

اطاعتِ رسول کا مطلب منصبِ رسالت میں آخری اور سب سے اہم شق اطاعتِ رسولؐ ہے۔ معترضین جو رسول کی حیثیت ایک نامہ بر سے زیادہ نہیں سمجھتے بھلا رسول کو مطاع کس طرح سے تسلیم کر سکتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ قرآن کریم میں اطاعتِ رسولؐ کا حکم اس تکرار و اعادہ اور شدت و اصرار سے آیا ہے کہ اُنھیں اُس کی تاویلات میں بڑی بڑی اُلجھنیں پیش آتی ہیں چنانچہ طول و طویل بحث و تمحیص کے بعد اُنھوں نے دو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اطیعوا الرسولؐ سے مقصد فی الحقیقت اطیعوا اللہ ہی ہے اور دوسرے یہ کہ رسول کی اطاعت بحیثیت امیرِ قوم فرض کی گئی تھی۔ آئیے ان نتائج کا موازنہ بھی قرآن کی روشنی میں کریں:

ہمیں شبہہ نہیں کہ دنیا میں کتبِ سماوی اور حضراتِ انبیائے کرام کی تشریف آوری کا سلسلہ اس غرض و غایت کے لئے ہے کہ دنیا میں انسان خدا کا فرمانبردار بن کر جیئے۔ گویا انسانی زندگی کا مقصود بالذات اطاعتِ خداوندی ہی ہے۔ لیکن چونکہ خدا ہر ایک کے سامنے نہیں آتا نہ ہر ایک سے کلام کرتا ہے، اس لئے انسانوں کو پتہ کیسے چلے کہ کس کام میں اُس کی اطاعت ہے اور کس میں معصیت۔ اس کے لئے اُس نے اپنے

پیغامات علی التواتر دنیا میں بھیجے اور اُن پر کاربند ہونے کا حکم فرمایا تو گویا ان کتابوں پر عمل پیرا ہونا درحقیقت اطاعتِ خدا ہی تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کتاب بلا تعمیل یہ واضح نہیں کرسکتی تھی کہ اس کے احکام پر کس شکل اور کس نوعیت سے عمل پیرا ہونا چاہیے اس کے لئے انسانوں میں سے رسول منتخب کئے گئے تاکہ وہ ان احکام پر خود عمل پیرا ہو کر دوسروں کے لئے ایک اُسوہ قائم کریں لہٰذا حکم دیا گیا کہ رسول کی اطاعت کرو، مقصودِ آخری یا منتہیٰ اگرچہ اطاعتِ خدا ہی تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس اطاعت کی شکل کو ہر ایک کی اپنی مرضی یا زیادہ سے زیادہ فہم و ادراک پر چھوڑا جاتا۔ حکم دے دیا کہ اپنی رائے کو دخل نہ دو بلکہ جس طرح سے یہ رسول کرکے دکھاتا ہے یا کرنے کا حکم دیتا ہے اُس کے مطابق کرتے جاؤ یہی اطاعتِ خدا ہو جائے گی۔

مَن يُطِعِ الرسولَ فقد اَطَاعَ اللہ۔ "جس نے رسول کا حکم مانا اُس نے گویا خدا کی اطاعت کی"

چنانچہ انبیائے سابقہ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی اپنی قوم کو خدا کی اطاعت کا جو سبق دیا تو انہی الفاظ میں کہ ہماری یعنی خدا کے رسولوں کی اطاعت کرو سورۃ الشعراء میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ الفاظ مذکور ہیں:۔

فَاتَّقُوا اللہَ وَاَطِیْعُوْنِ "اللہ سے ڈرو اور میری تابعداری کرو۔

بعینہٖ یہ الفاظ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ کی زبان سے اسی جگہ مذکور ہیں چنانچہ اسی حقیقتِ عظمیٰ کو قرآن نے اجتماعی طور پر بطور حصر ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللہ "ہم نے ہر ایک رسول کو اسی لئے بھیجا کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"

گویا رسولؐ کی اطاعت خدا کے حکم سے ہے لیکن اطاعت اُس کی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ حکم دیا ہے کہ:۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (اعراف ۱۰۸) "اُس کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف

سے اُتارا گیا ہے۔

اور کہیں نجات و سعادت کو اتباعِ رسولِ عربیؐ کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی دعا کے جواب میں فرمایا کہ تمھاری قوم میں سے ہماری رحمت اُن کے ساتھ ہوگی:

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف- ۱۵)

"جو اتباع کریں گے اُس رسول و نبی اُمّی کا جس کا ذکر یہ لوگ اپنے ہاں توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔"

تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ (نعوذ باللہ) ان احکام میں تضاد ہے کہ کہیں قرآن کے اتباع کا حکم ہے اور کہیں رسولؐ کے اتباع کا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ رسولؐ کا اتباع ہی قرآن کا اتباع ہے کیونکہ رسولؐ کو خود حکم دیا گیا ہے کہ:

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔

"جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جاتی ہے اُس کا اتباع کرو۔"

لہٰذا ان احکام کی موجودگی میں اب یہ کسی کی اپنی مرضی و منشار کے ماتحت نہ رہا کہ جس طرح جی چاہے قرآن کا اتباع کرے بلکہ قرآن کا اتباع ہو ہی اُسی شکل میں سکتا ہے جس شکل میں رسولؐ نے کیا یا کرنے کا حکم دیا۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ اطاعت چونکہ صرف خدا کی کرنا چاہیئے اس لئے اگر اس اطاعت میں رسولؐ کو بھی شامل کر لیا گیا تو توحید باری تعالیٰ کے منافی ہوگا۔ سو اس کا جواب بھی اوپر آچکا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت اس لئے نہیں کہ اُس نے اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے، بلکہ اس کے لئے تو قرآن میں صاف حکم موجود ہے کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (آل عمران)

"کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، و لیکن (وہ تو یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔"

یہ اطاعت اس لئے ہے کہ ایسا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے (النساء ۶۴)[1] چونکہ اس تعمیل

---

[1] آیت یہ ہے: وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء ۶۴) (ترجمہ) "اور ہم نے سارے ... [illegible] کو حکم سے اس لئے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔" (الفرقان)

اور یہ نہ کے بغیر خدا کی اطاعت ممکن نہ تھی اس لئے جہاں قرآن حکیم میں اطیعوا اللہ آیا ہے اُس کے ساتھ ہی اطیعوا الرسول بھی آیا ہے کہیں ایک جگہ بھی اکیلا اطیعوا اللہ نہیں آیا۔ چونکہ اطیعوا الرسول میں اطاعت خداوندی خود بخود آجاتی ہے اس لئے خالی اطیعوا الرسول بھی قرآن میں بعض جگہ آیا ہے۔ مثلاً

وَاطیعوا الرّسول لعلکم ترحمُون (نور۔ ۵۶)	"رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

اور جہاں جہاں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول آیا ہے وہاں درحقیقت اطیعوا اللہ سے مراد اطاعت رسول ہی ہے چنانچہ:

۱۔ یا ایّھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ ورسولہٗ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۔	" اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور اُس سے رسول سے روگردانی نہ کرو، درآنحالیکہ تم سُن رہے ہو۔"
۲۔ یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہِ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸۔۲۴)	"اے ایمان والو! جب اللہ اور اُس کا رسول تمھیں ایسے کام کے لئے بُلائے جو تمھارے لئے حیات بخش ہو تو فوراً حاضر ہو جایا کرو۔"

اسی طرح سورۂ نور میں ہے :

۳۔ قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولّوا فانما علیہ ما حُمّل وعلیکم ما حُمّلتم وان تطیعوہ تھتدوا۔	"کہہ دے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر روگردانی کروگے تو سمجھ رکھو کہ رسول کے ذمہ اُس کا بار ہے اور تمھارے ذمہ تمھارا بار۔ پس اگر تم نے اُس کی اطاعت کرلی تو راہ پر لگ جاؤ گے۔"

آیت نمبر ایک میں عنہ کی ضمیر واحد غائب نمبر ۲ میں دعاکم اور نمبر ۳ میں تطیعوہ کے اضافہ سے جن کا مرجع رسول ہے عیاں ہے کہ رسول کی اتباع کا حکم ہے اور اُس کی آواز پر حاضر ہونے کی تاکید ہے اور اس کی روگردانی سے منع کیا گیا ہے۔ پس اطاعت رسول عین اطاعت خدا ہے،

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

ایک اور اعتراض معترضین کہتے ہیں کہ رسولؐ چونکہ ابلاغ پیغام کا ایک ذریعہ ہے اس لئے ذریعہ کی پیروی کیا معنی؟ جہاں جہاں اس کا حکم ہے دراصل مقصود اطیعوا اللہ ہی سے ہے (یعنی قرآن کا اتباع) اطیعوا الرسول یونہی کہہ دیا گیا ہے۔ اول تو اُن سے یہ پوچھئے کہ قرآن کیا شاعری ہے کہ اُس میں زیب داستان کے لئے قافیہ بجائی کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے انسانوں تک پہنچنے میں رسولؐ ہی ایک ذریعہ نہیں ہے۔ ایک اور بھی ذریعہ ہے یعنی جبرئیل۔ قرآن نے اُن کو بھی رسول کے لفظ سے پکارا ہے۔

اگر رسولؐ کی پیروی سے مقصد خدا کی پیروی (بذریعۂ کتاب و بمطابق اجتہاد خویش ہی) ہوتی تو کہیں جبرئیل کی پیروی کا بھی حکم دے دیا ہوتا۔ یہ کیا معنی ہے کہ دو واسطوں میں سے ایک واسطہ تو اتنا اہم کہ اُس کی اتباع اپنی اتباع کے ساتھ ساتھ رکھی اور دوسرا واسطہ ایسا کہ کہیں اطاعت کا ذکر نہیں۔

سو اس سے بھی ظاہر ہے کہ جبرئیل کے رسولؐ (قاصد) ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہونے میں نمایاں فرق ہے اور یہ وہی فرق ہے جس کے لئے پہلے کہا جا چکا ہے کہ فرشتوں کو کیوں رسول بنا کر زمین پر نہیں بھیجا گیا۔

امیر قوم یا مرکز ملت سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کرتے ہیں کہ رسولؐ کی جو اطاعت فرض قرار دی گئی ہے وہ درحقیقت امیر قوم کی حیثیت سے ہے نہ کہ رسولؐ کی حیثیت سے۔ قرآن کریم نے اس پوزیشن کو بھی ایسا صاف کیا ہے کہ تھوڑے سے تدبر سے تمام اشکال حل ہو سکتی تھیں۔ ارشاد ہے:

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور جو صاحب امر تم میں سے ہوں۔

ـــــــــــــــــــ

لہ سورۂ تکویر کی آیت "مطاع ثم امین" سے بعض مفسرین نے جبرئیل امین مراد لیا ہے وہ بھی انھیں صرف آسمانوں میں مطاع مانتے ہیں، انسانوں کے لئے نہیں۔

الی اللہ والی الرسول — اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو اُس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو۔"

اس میں (۱) خدا (۲) اُس کے رسولؐ اور (۳) امیر قوم کی اطاعت کا حکم ہے۔ امیر کی اطاعت کے بارے میں ساتھ ہی یہ حکم ہے کہ اگر کہیں ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں امیر اور تم میں تنازع ہو جائے (اختلاف پیدا ہو جائے) تو اُس وقت اس اختلاف کو مٹانے کے لئے، اس تنازعہ کے فیصلہ کے لئے اور جھگڑا چکانے کے لئے فوراً خدا اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس سے یہ امر واضح ہے کہ امیر کی اطاعت میں تنازعہ اور اختلاف کا امکان ہے لیکن سارے قرآن پر نظر دوڑائیے کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں پائیں گے کہ اگر تم میں اور رسولؐ میں کبھی تنازعہ ہو جائے، کبھی اختلاف پیدا ہو جائے، تو اُس کے لئے خدا کی طرف رجوع کرو بلکہ رسولؐ کے فیصلہ کے متعلق تو ارشاد ہے کہ:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (سورۂ نساء ۶۵)

"قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو یہ لوگ اپنا حَکَم نہ بنائیں۔ پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کسی قسم کی کدورت نہ پائیں اور آپ کے حکم کو پوری طرح برضا و رغبت مان لیں۔"

یعنی رسولؐ کو اپنے فیصلوں میں حکم بنانا شرطِ ایمان ہے (یہی معنی رسول پر ایمان لانے کے ہیں) اور پھر جس طرح ایک امیر کے فیصلہ کے خلاف اپیل ہو سکتی ہے، رسولؐ کا فیصلہ نہ صرف ایسا ہی ہے کہ اُس کی کہیں اپیل نہیں بلکہ اُس کے تسلیم کرنے کی شرط یہ ہے کہ طوعاً و کرہاً نہیں بلکہ دل میں بھی کسی قسم کا خیال نہ گزرے اور رضا و رغبت سے ان فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اولی الامر کے فیصلہ اور رسولؐ کے فیصلہ میں اس سے زیادہ بیّن فرق اور کیا ہو سکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ امیر ایک عدالتِ ماتحت کی طرح ہے جس کے فیصلہ کی اپیل ہو سکتی ہے لیکن اطاعتِ رسولؐ ایک پریوی کونسل ہے کہ جس کے فیصلہ کی پھر کہیں اپیل نہیں۔ اور یہ

بات تو دنیا کے کسی پریوی کونسل کو بھی حاصل نہیں کہ اُس کے فیصلہ کے خلاف دل میں کوئی خیال پیدا کرنا بھی جرم ہو، لہٰذا رسولؐ کی اطاعت محض بحیثیت امیر قوم نہیں بلکہ بحیثیت رسولؐ بھی فرض ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ رسولؐ قوم کے امیر بھی تھے اور بہت سے احکام بحیثیت امیر صادر فرمایا کرتے تھے لیکن تھوڑے سے تفحص سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے احکام کون سے تھے۔ مثلاً

یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول۔	"یہ لوگ آپ سے انفال (خاص مالِ غنیمت) کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی اور اُس کے رسولؐ کی ہیں۔"

دینی اور دنیوی اُمور ظاہر ہے کہ یہاں اللہ اور رسولؐ سے مفہوم امارت ہے اور رسولؐ کے بعد یہی چیز امیر قوم کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ چنانچہ ملکی امور کا انتظام عساکر وجیوش کا انصرام، وقتی اور عارضی مصالح کی تدابیر ایسے احکام ہیں جن کا تعلق بحیثیت امیر ہے اور اس مسئلہ کو خود صحابۂ کبار (رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہی حل کرا لیا تھا۔ چنانچہ دُنیوی امور کے متعلق بعض اوقات صحابۂ کرام دریافت کر لیا کرتے تھے کہ یہ حکم بحیثیت رسول کے ہے یا بحیثیتِ امیر۔ کیونکہ امارت کے متعلق یہ قرآن کا حکم تھا کہ:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ	"اور اُن سے حکومت میں مشورہ لے لیا کرو۔"

چنانچہ کئی دفعہ کثرتِ رائے سے ایسا فیصلہ ہوا جو حضور کی رائے سے مختلف تھا اور یہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کو ایک صحیح جمہوری نظام اور سچی مواخاتِ اسلامی کا عملی نمونہ دکھانا مقصود تھا، لیکن جو اُمور متعلق بہ دین تھے اُن میں نہ کسی سے مشورہ لیا جاتا تھا اور نہ اس کے خلاف کسی کی رائے ہو سکتی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ امورِ دنیا کے متعلق بحیثیتِ امیر حضور نے معاملات مجلسِ شوریٰ کے سامنے پیش کئے لیکن کسی ایک واقعہ سے بھی ثابت نہیں کہ حضور نے کوئی مجلسِ مشاورت اس غرض کے لئے منعقد کی ہو کہ نماز کی کتنی

بکثرت مقرر کرنی چاہیئے۔ اور زکوٰۃ کا کتنا حصہ معین ہونا چاہیئے۔ یہ فیصلے بحیثیتِ رسول صادر فرماتے تھے اور اُن کی نوعیت امارت کے معاملات سے بالکل جُدا گانہ تھی۔

اس کی سب سے عمدہ مثال خود قرآن نے بیان کی ہے۔ مدینہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا ہو رہی ہے حسبِ معمول نمازی بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے تھے کہ یکایک تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور حضور نے سمت بدلی۔ مومنین کو اس حکم کا کچھ علم نہیں، لیکن چونکہ معاملہ دین کا تھا اور اس بارے میں وہ اطاعتِ رسول کو عین ایمان سمجھتے تھے اس لئے بلا چون وچرا، بلا شائبہ تشکیک اُنھوں نے بھی صفوں کا رخ بدل لیا۔ قرآن اس کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے :-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (بقرہ ۱۷)	"اور جس سمتِ قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں[1] وہ تو محض اس لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسولؐ کا اتباع کرتا اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے۔"

اتباعِ رسولؐ کی اس سے بیّن دلیل اور کون ہو سکتی ہے؟

لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ بعض وقتی اور خالصتہً عارضی معاملات میں حضورؐ کی اطاعت بحیثیتِ امیر قوم اگرچہ دینی تھی لیکن حضور کی اطاعت بحیثیتِ رسولؐ مستقل اور قیامت تک کے لئے فرض بلکہ شرطِ ایمان ہے اور یہی وہ اطاعت ہے جس سے سرتابی ابد الآباد کے جہنم کا موجب ہوگی۔

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (جن ۲۳)	"اور جس نے خدا اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کی اُس کے لئے جہنم کا عذاب ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔"

---

[1] یہ ترجمہ (کان کو ناقص سمجھ کر) عام مترجمین نے کیا ہے لیکن اس عاجز کے خیال میں کان کو اگر تامہ لے لیا جائے تو بہت سی مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔ اس صورت میں کُنتَ علیہا سے مراد موجودہ قبلہ ہو جائے گا۔ یعنی ملکہ کو قبلہ اس لئے بنایا . . . . الخ　　(پرویز)

وحی خفی تصریحات بالا سے یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ رسول کی حیثیت محض ایک آلۂ ابلاغ ہی کی نہیں، اور نہ اس کی اطاعت محض ایک امیر کی حیثیت سے ہنگامی اور وقتی تھی۔

اس وقت ان اصطلاحی مباحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ حضور کے احکام آپ کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہیں یا اُن کی بنا وحی خفی پر ہے اس لئے کہ جب اطاعتِ رسول شرطِ ایمان ٹھہری تو اس استقصا کی گنجائش کہاں کہ حکم کس بات پر مبنی ہے۔ جو ماننے والے اور مان کر کر کے دکھانے والے ہیں انھیں ان باریکیوں کی ضرورت ہی نہیں ہے ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لہٰذا صحیح ترین مسلک اس باب میں یہی ہو سکتا ہے کہ جس بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ رسول نے فرمائی ہے اُس میں کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی اپنی ضد چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو سوائے اس کے کہ اس کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی مجددی رحمۃ اللہ علیہ

میری واقفیت اور تاثرات

(محمد منظور نعمانی)

اکثر ناظرین کو اخبار اور دوسرے ذرائع سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہو چکی ہوگی کہ ۱۷ ذیقعدہ، دوشنبہ کے دن مغرب سے کچھ پہلے اہل سنت کے جلیل القدر ربانی عالم اور نقشبندی مجددی سلسلہ کے صاحب مقام اور صاحب ارشاد شیخ، حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی نے ہماری اس دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰہم اغفر لہ ولا تفتنا بعدہ۔ ذیل میں حضرت مولانا مرحوم کے متعلق اپنی کچھ ذاتی معلومات اور تاثرات حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہے، امید ہے کہ خود راقم سطور کے لئے اور سعید و صالح فطرت رکھنے والے ناظرین کے لئے یہ تذکرہ ان شاء اللہ نفع مند ہوگا۔

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار "النجم" لکھنؤ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا، لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے قریباً ۳۸ - ۳۹ سال قبل (غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں) جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں ہوا تھا، چونکہ مولانا کی شہرت ایک مقرر و مناظر اور ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی اس لئے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے، مثلاً شیروانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوقیہ چشمہ

لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مراد آباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جا رہے ہیں یہی النجم کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بالکل پرانے قسم کے سیدھے سادے علماء کی وضع تھی، سر پر وہی پرانے علماء کا سا عمامہ، جسم پر عبا، ہاتھ میں لاٹھی نما عصا ـــــ جمعیۃ کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم از کم متکلمانہ و فلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا، جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر ایسے وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین و تاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ اُن پر طاری ہے۔

ـــــ پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امروہہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق و فلسفہ اور اصول فقہ و علم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل مدرسہ اسلامیہ چلّہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادہ سے، نیز اس نیت سے کہ موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہو کر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہو رہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں رہا، لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقعہ ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل کنارہ کش ہو کر ان خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اُسی مدرسہ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کارپردازان اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت و ارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے

مولانا نے اپنے منجھلے صاحبزادے مولوی عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لئے وہاں بھیج دیا تھا، اس لئے سال میں دو چار مرتبہ ضرور مولانا کی تشریف آوری امروہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہ ہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انھیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت و شفقت فرماتے تھے، اس لئے ہر ملاقات میں ربط و تعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا ——— کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۱۳۵۰ھ میں) حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب و روز مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اور حضرت کو اب تک جو کچھ جانا اور سمجھا تھا اس سفر میں اس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا، پھر برما کے اس سفر کے غالباً ایک ہی سال بعد مولانا نے دارالمبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لئے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا ——— اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دور طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ بھی اتنا رہنے کا اتفاق غالباً نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۳۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متاثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان میں سے چند آج کی صحبت میں حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تاثرات کو میں دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہوں، ایک وہ جن کا تعلق علم و تحقیق اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گزاری اور پرہیزگاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہل سنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہو

کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ مدرس حضرت مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں[1]۔ سلامتی فہم کے ساتھ ذہانت وذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا ــــ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلہ تفسیر آیات، آپ کے تذکرۃ القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

---

(۱) جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انھیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات و احادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور شیعہ مصنفین کی کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہنامہ اور حملۂ حیدری کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں اپنے آتش پرست اسلاف اکابر کا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ کو جس طرح اس نے حقیر و بے حیثیت دکھلانے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اس وقت اٹھی تھی یا نہیں؟ مجھے یقین تھا اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اس کا ضرور علم ہوگا۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیماری اور اس کے پیدا کردہ ضعف نقاہت کے علاوہ برسوں پہلے سے مولانا کے لئے بڑھاپے کا وہ وقت آچکا تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا"؎۵ ضعف کی وجہ سے مولانا کیلئے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا اس کے باوجود میں نے یہ بات دریافت کی، فرمایا کہ "صحیح العقیدہ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہنامہ کے خلاف شدت کے ساتھ آواز اٹھی تھی" "حملۂ فاروقی" "ایک مستقل کتاب لکھی گئی" یہ منظوم ہے اور گویا شاہنامہ کا جواب ہے چھپ بھی چکی ہے میں نے اس کا مطبوعہ نسخہ بھی کبھی دیکھا تھا، پہلے تو اس کا خاصا حصہ یاد تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آگیا اور شاید وہی آپ کے مقصد کے لئے کافی ہوگا۔ وہ شعر یہ ہے فردوسی کے بارہ میں مصنف لکھتا ہے

ع　دلش گبر و جاں گبر و گبری زباں　　زگبراں بگبری زباں قصہ خواں

بہرحال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

؎۵ مطلب یہ ہے کہ نقصان جب زیادہ بڑھا ہو جاتا ہے تو حاصل علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔۱۲

تحریر و تقریر کا امتیاز تحریر و تقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری حشو و زوائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی، میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر و تقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظ بلفظ لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لئے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی تقریر میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لئے مولانا اس مبالغہ کے کبھی روادار اور عادی نہیں تھے جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہوگئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے۔ ہماری اسی صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ حبیب الرحمن صاحب محدث امروہوی (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں ان سے خود سُنا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں ان کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز قوت استدلال اور متانت و سنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں محقق مناظر کبھی غلط مبحث نہیں کرتا بلکہ اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے، مولانا کا بالکل یہی طرز تھا، اسی لئے وہ فریق مخالف کی غلط مبحث کی کوششوں کو بھی چلنے نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود غلط مبحث میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر اتر پر میں ضرور دہرا دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات محفوظ ہوجاتی تھی، فن کے لحاظ سے یہ مناظر کا کمال ہے اور احقاق حق کے مقصد کے لئے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے

خاص موضوع اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کئے، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہائے ضالہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعی حملوں سے صحابۂ کرام اور مسلک اہل سنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب شیعہ کی

ضلالتوں کو واضح کر کے حجت حق قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع ہے جو ہندستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے —— اب سے قریبًا ساڑھے تین سو سال پہلے گیارھویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد بارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے معاصر بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد استاذ الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے تلامذہ، اور اُن کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ الغرض اپنے اپنے زمانہ میں ان سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (اُن خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے —— جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیشرو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادت مند پیروکار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کر کے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا —— اس ناچیز کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا بدیہی بنا دیا کہ عامیوں کے لئے بھی ان کا سمجھنا آسان ہو گیا

ردِ شیعہ کے مشغلہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث

مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابۂ کرامؓ کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے لیکن میں جو اس کام کو درجۂ اول کی اہمیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابۂ کرام ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلہ کی پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی

ناقابل اعتبار ہو گئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا۔ اور ہمارے پاس اُن کے بارہ
میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہرحال میں صحابۂ کرامؓ کی حمایت اور مدافعت اور
ان کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت
ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ اُمید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال

مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی
مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا
ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور اکثری
تجربہ ہے۔ ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی محتاط اور با توفیق پایا۔ صرف ایک مثال
نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ
اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> "حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں
> اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں
> لیکن حضرت علی مرتضیٰ سے ان کو کوئی نسبت نہیں، ان کی مجلس میں اگر صف نعال میں بھی
> [illegible] جگہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے۔"

الغرض یہاں تک جو کچھ ذکر کیا ان کا تعلق حضرت مولانا کی عالمانہ و مناظرانہ حیثیت
سے ہے، گو مولانا کی عام شہرت [illegible] مرشدانہ حیثیت کا بھی ان میں خاصا حصہ ہے۔ اب دو چار باتیں میں
وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق اس [illegible] دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبت ابراہیمی

نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی زندگی کی حالت
[illegible] ہر مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوف خدا اور فکر آخرت کا
کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہرحال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے لیکن نماز کے ساتھ دلی لگاؤ
لگاؤ، اس کا کما حقہ اہتمام اور فکرمندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی
دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے بھی
پہلے آپ کے جد امجد سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص نسبت اور وراثت ہے انھوں نے

اپنے بیوی بچوں کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بساکر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ (اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل کو تیرے مقدس ومحترم گھر کے پاس بن کھیتی والی وادی میں بسادیا ہے اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں)

اور عرض ومعروض اور مناجات کے اسی سلسلہ کے آخر میں دعا کی تھی:

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ

(میرے رب مجھے بنادے نماز کا قائم کرنے والا اور میری نسل کو بھی یہ چیز نصیب فرما، پروردگار میری دعا قبول فرما)

اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت امت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی۔ بہرحال نماز کے ساتھ فکرمندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اوپر ذکر کرچکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین و تاکید ضرور فرماتے تھے بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرما رہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے غالباً اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی مؤثر مستقل کتاب بھی "کتاب الصلوٰۃ" کے نام سے لکھی تھی، اس میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدی اور ترغیبی وترہیبی حدیثیں بھی اور آخر میں ائمۂ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کتاب نہایت مؤثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے، مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود ہی فرمائی تھی (حضرت مولانا

نہایت جمیل الخط تھے اور بد خط تحریر سے گرانی ہوتی تھی) ــــــ لکھنؤ کے متعدد واقف حضرات سے میں نے سنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا، بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمد للہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہو۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق

اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے (جنہیں سے دو کا سامنے انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے ان سب کو قرآن مجید حفظ کرایا۔[1] ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا وہی کرے گا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند اخیر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا، گزشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اس کی تلاوت میں مشغول ہیں، حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیاز مندوں تک کا زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سنا، لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انہیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنیوالا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

اہل و عیال سے محبت اور ان کی جدائی پر صبر والی نبوی وراثت

اپنے اہل و عیال سے محبت بھی انسانی فطرت کا تقاضہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔ حدیث و سیرت پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال اور مقام تھا کتب حدیث میں مذکور ہے کہ نواسوں اور نواسیوں میں سے کوئی بچہ منبر پر خطبہ دیتے وقت قریب آ گیا تو آپ نے اسی حالت میں اسے گود میں اٹھا لیا بلکہ کبھی کبھی تو انہیں گود میں لے کر آپ نے نماز بھی پڑھی ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی ملاطفت اور حسن معاشرت مثالی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وراثت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اولاد اور اولاد کی اولاد کے ساتھ آپ کے دل کا لگاؤ بھی مثالی تھا

(۱) بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے

لیکن دو جوان صاحبزادوں (مولانا حافظ عبدالغفور صاحب مرحوم اور مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم اور جو ان العمر اکلوتی چہیتی صاحب زادی اور ان سے پہلے ان کی والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال اور ارشاد کا کامل نمونہ دیکھا گیا جو عہد نبوت کے اکلوتے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علیٰ ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے وقت آپ کا حال اور قال دیکھا اور سُنا گیا تھا، حدیث شریف میں ہے کہ ان کے انتقال پر آپ نے فرمایا۔

العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا انا للہ وانا الیہ راجعون ــ آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل کو رنج اور صدمہ ہے اور زبان وہی بولے گی جس سے میرا مالک راضی ہو" انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

ایک عارف کامل کی شہادت آخر میں اس دور کے ایک مسلّم عارف بلکہ یقین و معرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تأثرات کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں:

حضرت مولانا اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور قریباً ایک ہفتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا تھا، ایک روز دارالعلوم کی مسجد کے وضوخانہ میں وضو فرما رہے تھے، دارالعلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی (موجودہ ناظم شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے حضرت مولانا کی ان پر شفقت و عنایت کی خاص نظر تھی، اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا، میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے۔ فرمایا "نہیں تم نہیں جانتے"۔ پھر فرمایا "وہ امام وقت ہیں"

ـــــ لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم سطور بھی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہمرکاب تھا، ایک صحبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) خود مجھ سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا ــ (حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا)

آخر میں ناچیز راقم سطور اپنے ناظرین سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ حضرت مولانا کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور تمام محبین و متعلقین کے لئے صبر و اجر اور اُن کے نقش [illegible] فرمائیں، یہ اُن کا اس ناچیز پر ذاتی احسان ہوگا۔

حضرت مولانا احمد علی رح

(از جناب قاضی محمد عدیل عباسی)

حضرت مولانا احمد علی رح کے وصال حق کی خبر پڑھ کر میں اپنی جانب سے عقیدت و فدویت کی حقیر نذر پیش کرتا ہوں۔

غالباً ۱۹۲۲ء ہوگا۔ میں "مدینہ" اخبار سے استعفا دے کر "زمیندار" اخبار کی ایڈیٹری کی خدمت انجام دینے لاہور گیا اور دفتر زمیندار میں مقیم ہوا۔ میں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رح کے بہت سے افسانے ان لوگوں کی زبانی سُنے تھے جو اُن کی خدمت میں رہ چکے تھے۔ اُن کے شاگرد مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اُس زمانہ کے ایک مشہور عالم اور انقلابی انسان تھے۔ ممدوح پہلے سندھ یا صوبۂ سرحد میں قرآن پاک کا درس دیتے رہے، پھر دلی کی فتح پوری کی مسجد میں آکر قیام کیا اور "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی۔ یہیں سے "سُرخ لفافوں" کی سازش کا اہتمام ہوا، جس کا منشا ایک مقررہ وقت پر تمام ہندوستان کے انگریزوں کو قتل کر کے جمہوریۂ ہند کا اعلان کرنا تھا۔ سازش ناکام ہوگئی۔ مولانا محمود حسن رح مالٹا میں نظربند کر دیئے گئے اور مولانا عبید اللہ صاحب افغانستان نکل گئے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے بارے میں طرح طرح کی ایسی باتیں مشہور تھیں جن کو سُن کر بڑا جوش و ولولہ پیدا ہوتا تھا مثلاً یہ کہ وہ ایک بڑے مجاہد انسان ہیں اور بڑے مدبر ہیں اور قرآن کی تعلیم کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی پستی کو رفع کرنا چاہتے ہیں" ترتیبِ آیاتِ قرآنی کے دعویدار ہیں، ناسخ و منسوخ کے قائل نہیں ہیں، یہ وہ باتیں تھیں جو اس زمانہ میں نئی تھیں۔ اور اُن سے انگریز مؤرخین و مصنفین کا جواب ملتا تھا۔ میں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں عیسائی مصنفین کی متعدد کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ قرآن مختلف مضامین کا ایک بے ترتیب مجموعہ ہے اور جو آیات قرآنی منسوخ ہوگئیں اُن

کو کتاب میں رکھنے سے کیا حاصل؟ اس طرح مولانا عبید اللہ سندھی اُس وقت حال دماغی کے اجتماع کے باعث ایک بڑی جاذب شخصیت تھے اور جس طرح وہ ہندوستان کی سی آئی ڈی کی نگاہوں سے بچ کر افغانستان پہنچ گئے تھے اُس سے اُن کی ہستی محیر العقول کارناموں کے انجام دینے کی اہل سمجھی جانے لگی تھی۔ مولانا احمد علیؒ مولانا عبید اللہ کے شاگرد بھی تھے اور داماد بھی۔ یہ بھی ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے مگر وہاں سے واپس آکر دہلی اور پھر لاہور میں شیرانوالہ دروازہ کے پاس ایک مسجد میں قرآن کا درس دینے لگے تھے۔ شب و روز کا یہ مشغلہ تھا۔ لہٰذا قدرتاً میرے اندر ایک تڑپ مولانا سے نیاز حاصل کرنے کی پیدا ہوئی اور میں بار بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

درس قرآن دیوبند وغیرہ کے کثیر التعداد فارغ التحصیل طلبا، مولانا سے "ترتیب آیات" پڑھنے آیا کرتے تھے۔ اور مولانا اُن کو صرف یہ سبق دیتے تھے کہ ایک آیت کا دوسری آیت سے کیا ربط ہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے پورے قرآن کو مربوط کر دیا تھا اور تبویب بھی کر دی تھی چنانچہ سورۃ بقرہ کا عنوان "خلافت کبریٰ" رکھا تھا۔ اب وہ سب چیزیں مولانا عبید اللہ صاحب کے دوسرے شاگرد مولانا عبدالحی فاروقی سابق استاذ تفسیر قرآن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قلم سے شائع ہو چکی ہیں۔ مگر یہ اشاعت کئی سال بعد ہوئی۔ اُس وقت ترتیب آیات کے مطالعہ کا عام شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا سے شرف نیاز حاصل ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک ایسا کلاس قائم ہونے والا ہے چنانچہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ مجھے بھی اس درس میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے عصر کے بعد کا وقت تھا اور مولانا مسجد میں تنہا بیٹھے تھے فرمایا آپ عربی جانتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں فہم عربی سے یکدم قاصر ہوں تو ارشاد ہوا کہ آپ کو اس کلاس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ معانی و مطالب کا اس میں ذکر نہ ہوگا۔ جو لوگ ان چیزوں سے واقف ہیں صرف ان کو ایک آیت سے دوسری آیت کا ربط بتلایا جائے گا۔ آپ چل نہ سکیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا کیا حرج ہوگا، میں بھی صف میں شریک رہوں گا اور اگر چل نہ سکا تو خود بخود عدم دلچسپی کے باعث ترک کر دوں گا۔ چونکہ مولانا نہایت متواضع، منکسر المزاج اور با مروت تھے فوراً

مان گئے حالانکہ میں نے اُن کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ اُن کے نزدیک میں ایک فعلِ عبث کا ارتکاب کر رہا تھا۔ میرے پاس ایک حمائل مترجم تھا۔ میں اُس سے ترجمہ یاد کرتا تھا اور بھاگتا ہوا کلاس میں جاتا تھا۔ بعد کو میرے اوپر بڑی شفقت فرمانے لگے اور مجھ سے ہی تلاوت کراتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دن ایک عجیب واقعہ بھی پیش آیا۔ تلاوت کے دوران مولانا مسکرائے اور کہا کہ پکڑ گئے کہ عربی نہیں جانتے ہیں۔ "الف" نہیں پڑھا جائے گا۔ میرے حمائل پر خط کھینچ کر یہ عبارت تحریر ہے۔ وہ قرآن پاک پر نشان بنانے اور نوٹ لکھنے کی اجازت دیتے تھے۔ میں ایک علیٰحدہ کاپی پر اُن کی کل تقریر نوٹ بھی کرتا رہتا تھا اور عام طور پر لفظ بہ لفظ لکھ لیتا تھا۔ مولانا اس سے بہت خوش ہوتے تھے اور کبھی کبھی اُسے پڑھوا کر سُنتے تھے۔ رفتہ رفتہ مولانا ممدوح کے متعلق میرا خیال یہ ہو گیا کہ وہ مجھے بہت مانتے ہیں۔ غالباً یہ خیال ہر اُس شخص کا ہو گا جو اُن کے قریب رہتا ہو گا۔ میں جو بھی وقت پاتا تھا مولانا ممدوح کی خدمت میں گزارتا تھا۔ افسوس ہے کہ دس سیپاروں کے بعد میری اہلیہ کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ اچانک مجھے چلا آنا پڑا اور پھر میں آگے نہ جا سکا اور جو نوٹ میں نے دس سیپاروں کے بارے میں لکھا تھا وہ بھی کہیں گم ہو گیا۔ کئی سال بعد جب میں بستی میں وکالت کر رہا تھا تو مولانا کا ایک خط میرے پاس آیا کہ اپنا نوٹ بھیج دو، شائع کیا جائے گا مگر افسوس ہے کہ اُسے کوئی صاحب لے جا چکے تھے۔ اس طرح میں مولانا ممدوح کے کچھ دنوں بہت قریب رہا اور قریب سے ان کو مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ تعلیم و تعلّم کے سلسلہ میں وہ انتہائی متحمل اور بردبار و شفیق تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُن کو کبھی کسی پر غصہ کرتے یا کسی کو جھڑکتے دیکھا ہو۔

معمولات | مولانا مسجد کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ مسجد میں ایک حجرہ بھی تھا جو اُن کے استعمال میں رہتا تھا۔ روزمرہ بعد نمازِ فجر مولانا فوراً ممبر پر بیٹھ جاتے تھے اور کلامِ پاک کی تفسیر کا درس دیتے تھے۔ یہ درس ۲؍ شوال کو ہر سال الحمد للہ سے شروع ہوتا تھا اور ۲۹؍ رمضان کو والناس پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس درس میں چار پانچ سو آدمیوں سے کم کبھی نہیں ہوتا تھا اور انگریز کے سی۔ آئی ڈی علانیہ تقریر نوٹ کرتے رہتے تھے۔ بایں ہمہ

مولانا کی حق گوئی و بیباکی ہمیشہ عروج پر رہی اور اس حد تک کہ بسا اوقات ہم لوگوں کو جو اُس وقت نوجوان تھے اور تحریک خلافت میں حصہ لے رہے تھے سخت حیرت ہوتی تھی مولانا جیل میں بھی رہ چکے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے بزرگان دین کی نگاہ اثر نمود کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ الحمد للہ طبیعت تو ہمیشہ جیل میں مطمئن رہی مگر ایک دن میں اپنی تنہائی کی کوٹھری سے پانی پینے کے لئے نکالا گیا اور اسی وقت ایک اور بزرگ بھی اسی طرح نکالے گئے ہم دونوں میں گفتگو تو کوئی ہو نہیں سکتی تھی اور نہ ہوئی مگر اُنھوں نے میرے اوپر ایک بھرپور نگاہ جو ڈالی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ دل پتھر ہو گیا۔

صبح کی تفسیر کے بعد فوراً قرآن کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ یکہ وان اور تانگہ والے ہیں ان کو ناظرہ قرآن پڑھا رہے ہیں، یہ علماء کی جماعت ہے ان کو ترتیب آیات کا درس دیا جا رہا ہے۔ یہ بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ اے، ایم۔ ایس۔ سی ہیں، انھیں قرآن کے نکات بتلائے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اس درجہ متأثر ہوتے تھے کہ کبھی کبھی ان لوگوں میں سے کوئی انگریزی اخبارات میں فضائل اسلام پر مضمون بھی لکھتا تھا جو شائع بھی ہوتے تھے۔ اس طرح پورا دن گزر جاتا تھا بجز کلام پاک کی تعلیم کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ صرف ایک ذوق تھا کہ مسلمان قرآن یا مطلب پڑھیں اور اُس کا پیغام سمجھیں اور اپنے کو اس تعلیم کے سانچہ میں ڈھالیں گویا ؏

از تاک بادہ گیرم و در ساغر انگنم

کے مصداق نہیں۔ اُن کے ہاں قرآن کی تعلیم کے سلسلہ میں کسی معاوضہ کا کوئی سوال نہ تھا بس خالصۃً للہ تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن ایک نکاح کی تقریب میں بہت لوگ جمع تھے۔ وہاں ایک بیرسٹر صاحب جو مسلمان تھے کہنے لگے کہ دیکھئے قرآن نے شروع میں دعوے کیا ہے کہ "یہ ہے کتاب جس میں کوئی شک نہیں"۔ دعوے بلا دلیل۔ مولانا کچھ دور بیٹھے سن رہے تھے۔ سکوت اختیار فرمایا پھر بیرسٹر صاحب کے قریب آئے اور اُن سے کہا کہ میں قانون پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر انگریزی نہیں جانتا۔ آپ مجھے اُردو کی کچھ کتابیں بتا دیں تاکہ میں قانون کا ماہر بن جاؤں۔ بیرسٹر صاحب بھڑک اُٹھے۔ کہنے لگے قانون سمجھنے کے لئے اُس کی ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے

لحقہ علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ صرف ترجمہ سے آپ قانون کیسے سمجھ لیں گے۔ مولانا اصرار فرماتے رہے اور وہ شدّت سے مخالفت کرتے رہے، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو مولانا نے کہا اگر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے فہم و ادراک پر تو اس درجہ پابندیاں ہیں تو کیا خدا کے بنائے ہوئے قوانین یوں ہی ترجمہ سے آپ سمجھ لیں گے جو آپ ابھی اعتراض فرما رہے تھے۔ بیرسٹر صاحب بہت خفیف ہوئے اور دیر تک معذرت کرتے رہے اور مولانا سے قرآن پڑھنے کی بھی خواہش ظاہر کی۔ مولانا تو اس کے لئے تیار ہی تھے۔ مگر بیرسٹر صاحب کے پاس مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا وقت نہ تھا تو مولانا نے خود پیش کش کی کہ وہ اُن کے مکان پر جاکر تعلیم دیا کریں گے مگر جب بیرسٹر صاحب نے کہا کہ وہ اپنا موٹر بھیج دیں گے تو مولانا نے انکار کیا اور کہا کہ کسی قسم کا معاوضہ تعلیم کے لئے میں قبول نہیں کر سکتا میں اپنی سائیکل پر آپ کے گھر آکر آپ کو قرآن پڑھاؤں گا۔ ہر گھر میں درس قرآن کے پھیلانے کا ایسا ہمہ گیر جذبہ تھا کہ کوئی بڑی سے بڑی مشقت اُن کے لئے گراں نہ تھی۔

ذریعۂ معاش مولانا بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ کھدر کا لمبا کرتا اور تہبند ان کا عام لباس تھا۔ سر پر معمولی سی ٹوپی، کبھی کھدر کے سوا ان نے اور کچھ پہنے اُن کو نہیں دیکھا۔ جمعرات کا پورا دن اور جمعہ کی نماز تک، اُن کے اس کالج میں جس کی عمارت مسجد اور جس کے وہ خود پرنسپل اور پروفیسر تھے تعطیل رہا کرتی تھی۔ ان ڈیڑھ دنوں میں مولانا اپنی معاش کا بندوبست کرتے تھے، کبھی صابن بناتے اور کبھی عربی کتابوں کی کتابت کی تصحیح فرماتے تھے۔ میں نے خود اُن کو صابن بناتے تو نہیں دیکھا، اس کا اہتمام شاید گھر کے اندر رہتا ہو لیکن کتابت کی اصلاح میں مشغول دیکھا ہے۔ یہ کام مسجد کے حجرہ میں انجام پاتا تھا۔ چنانچہ جو کچھ ان ڈیڑھ دنوں میں آمدنی ہو جاتی تھی اُسے ہفتہ بھر کھاتے تھے۔ یہ آمدنی کتنی ہوتی تھی اس کا میں کوئی اندازہ نہیں بتلا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ بہت قلیل تھی۔ میں نے سُنا کہ بعض دن پورے گھر نے صرف چنا چبا کر گزر کیا۔ مگر بایں ہمہ یہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی شانِ خودداری اور فقر و استغنا کی آن میں کوئی بھی فرق ڈال سکے۔ مولانا کے پاس ایک بائیسکل بھی تھی اور اُس کو خود بھی استعمال کرتے تھے اور اُس سے ایک اور کام بھی لیتے تھے جو دلچسپ بھی تھا اور جس سے

سائیکل کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ شیرانوالہ دروازہ لاہور کی مسجد سے ملحق ہائی سکول کا ایک بڑا میدان تھا۔ جب کوئی مولوی صاحب کسی عربی مدرسہ کے فارغ التحصیل وہاں آجاتے تھے اور درس میں شرکت کی اجازت طلب کرتے تھے تو ان سے پہلے سوال یہ ہوتا تھا کہ آپ سائیکل کی سواری کر سکتے ہیں جواب عموماً نفی میں ہوتا تھا کیونکہ اُس زمانہ میں علماء کے لئے سائیکل کی سواری ان کے منصب کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ بس حکم ہوتا تھا کہ میری سائیکل لیجئے اور سیکھ کر آیئے تب درس میں شرکت ہوگی۔ ہم لوگ رحم کی نگاہوں سے ان بیچاروں کی بے کسی کا نظارہ کرتے تھے جو مولانا کی سائیکل کا گلا دبوچے ہاکی فیلڈ میں دھادھم گرتے پڑتے رہتے تھے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کے حامل کو موٹر، ہوائی جہاز اور تمام مشینوں پر عبور ہونا چاہئے نہ کہ علماء سائیکل کی سواری تک سے نا واقف ہوں۔ اُس زمانہ میں یہ بڑی روشن خیالی کی بات تھی۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم مشہور مؤرخ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ وہ مولانا عبید اللہ سے ملے۔ مولانا عبید اللہ نے پوچھا کہ قرآن کا نچوڑ ایک جملہ میں بتاؤ تو اُنھوں نے سوچ کر جواب دیا کہ یہ حکمرانی کی تعلیم دیتا ہے۔ کہتے تھے کہ خوش ہو گئے اور فرمایا کہ صحیح۔ قرآن پر عمل کرنے والے کبھی غلام نہیں رہ سکتے۔ ہمارے مولانا صاحب نے وہیں سے اکتساب فیض کیا تھا اور سائیکل کی سواری اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔

زہد و تقویٰ اُس کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کا کیا ذکر کیا جائے جس کی تمام زندگی ہدایت و رشد کے لئے وقف رہی ہو اور جس کے اندر ایک بے پناہ تڑپ، ایک بے مثال بے چینی ہر شخص کو قرآنِ حکیم کے سانچے میں ڈھال دینے کی تمام عمر کارفرما ہو۔ لیکن جس چیز نے مجھ کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اُن کا "مداومتِ عمل" تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی اتنی پابند نہیں ہے جتنا مولانا کا ہر فعل وقت کا پابند تھا۔ نیند اور کھانا بس تقاضائے بشریت تک محدود تھے۔ علی الصباح تہجد کے لئے اُٹھ جانا اور پھر تمام دن تعلیم قرآن میں مشغول رہنا یہ تھا اوقات کا ایک مجمل سا خاکہ۔ رمضانِ مبارک میں ایک لمحہ کے لئے بھی شب میں استراحت نہ فرماتے تھے۔ نمازِ عشاء کے بعد ذکر و شغل جاری رہتا تھا اور ایک بجے سے تراویح اور تہجد کی نمازیں ساتھ ساتھ ادا ہوتی تھیں اور فجر بعد بلا کچھ آرام کئے بدستور درسِ قرآن کا سلسلہ شروع

ہو جاتا تھا۔ دوپہر میں صرف دو گھنٹے آرام فرماتے تھے۔ مولانا کی زندگی کا ایک اور واقعہ مجھے قابلِ ذکر ملا ہے۔ لاہور سے کلکتہ جمعیتہ علماء کی مجلسِ عاملہ کی شرکت کے لئے تشریف لے جانا ہوا۔ واپسی میں گورکھپور کے اسٹیشن پر کچھ لوگ آئے اور سخت اصرار کیا کہ مولانا انجمنِ اسلامیہ کے جلسہ میں شرکت فرمائیں۔ آپ نے منظور کر لیا اور ایک تقریر کی جس میں درسِ قرآن کو عام کرنے پر زور دیا۔ اس انوکھی بات سے لوگ حد درجہ متأثر ہوئے۔ یہ ایک تعمیری پروگرام تھا اور زمانہ کی روش سے علیحدہ چیز تھی۔ جب آپ واپس اسٹیشن پہنچے تو منتظمین انجمن نے پچاس روپے پیش کئے۔ مولانا نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے۔ کسی کی یہ ہمت تو ہوئی نہیں کہ کہہ دے کہ نذر ہے، لوگوں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ کرایہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ لاہور سے کلکتہ اور کلکتہ سے لاہور تک کا کرایہ جمعیتہ علماء نے مجھ کو دے دیا ہے۔ آپ اپنے تانگے پر لے گئے اپنے ہاں کھانا کھلایا۔ میرا کچھ خرچ نہیں ہوا تو کرایہ کیسا؟ تب لوگ مجبور ہوئے اور کہنے لگے نذر سمجھ کر رکھ لیجئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نذر نہیں لیتا اور انکار کر دیا۔ مولانا کے اس بلند کردار اور اخلاق کا عرصہ تک گورکھپور میں چرچا رہا۔

میں آٹھ ماہ لاہور رہنے کے بعد گرفتار ہو گیا اور ایک سال سنٹرل جیل میں رہا۔ وہاں سے نکلنے پر سرسری نیاز حاصل ہوا اور اس کے بعد کئی بار صرف زیارت کے لئے لاہور جانے کا ارادہ کیا مگر تقدیر نے یاوری نہ کی۔ نیاز کا وہ آخری شرف تھا جو حاصل ہوا۔ مولانا کی زندگی مسلمانانِ عالم کے لئے ایک پیغام ہے وہ ایک خود آگاہ و خدامست عالم، صوفی اور درویش تھے اور انھوں نے اپنی مثال کا ایک ایسا نمونہ چھوڑا ہے جس کی تقلید ہر مسلمان کے لئے باعثِ فخر قرار دی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے مدارج بلند کرے۔ ؎

دگر دانائے راز آید کہ ناید

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی

نائب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

چندہ:
ہند و پاک سے
سالانہ ..... چھ روپے
ششماہی ... تین روپے
فی کاپی .... ۶۰ نئے پیسے

چندہ:
دیگر ممالک سے
سالانہ ..... ۱۲ شلنگ
اعزازی چندہ
سالانہ .... پندرہ روپے

جلد ۲۹ | بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ مطابق جون ۱۹۶۲ء | شمارہ ۱۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی۔ براہِ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک دفتر میں ضرور آ جانا چاہیے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار | اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

نمبر خریداری | براہِ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

تاریخ اشاعت | الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور آپ کے تشریعی ارشادات کے "حجتِ دینی" ہونے سے انکار کرنے والے اور اسلام اور قرآن کی اس دور میں بالکل نئی تشریح کرنے والے غلام محمد صاحب پرویز اور اُن کے خاص خیالات سے ہمارے اکثر ناظرین کرام واقف ہوں گے۔ اِدھر کچھ عرصہ سے پاکستان کے دینی اخبارات و رسائل میں اُن سے متعلق ایک تکفیری فتوے کا بہت چرچا ہو رہا ہے جو مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے تقریباً ایک ہزار علماء کی تصدیق اور توثیق کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ اگرچہ اس فتوے سے متعلق بعض مباحث اور پرویز صاحب اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک مختصر سی مراسلت کے بعض رسائل میں ہم نے پڑھی ہے لیکن وہ اصل فتویٰ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے اور نہ پرویز صاحب کے بارہ میں رائے قائم کرنے یا اُسے ظاہر کرنے کے لئے ہمیں اس خاص فتوے کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ہم پرویز صاحب کے خاص نظریات و خیالات سے جس حد تک بطورِ خود واقف ہیں اُنہی کی بنیاد پر پورے شرحِ صدر کے ساتھ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں ایسے خیالات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جس شخص کے یہ خیالات ہوں اُس کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام سے یقیناً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ان افکار و خیالات کے بعد بھی آدمی مسلمان ہی رہتا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلام کوئی متعین اعتقادی و فکری نظام نہیں ہے بلکہ ہندو ازم کی طرح اُس میں بھی ہر مثبت و منفی عقیدہ کی گنجائش ہے۔ ہمارے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اب سے بہت پہلے (جب وہ وزیر اعظم نہیں بلکہ صرف سیاسی لیڈر تھے) اپنے [illegible] دلچسپ انداز میں لکھا تھا کہ ہندو مذہب بھی عجیب مذہب ہے۔ وہ آدمی کا پیچھا کسی طرح

چھوڑتا ہی نہیں، میں کسی مذہب پر بلکہ خدا پر بھی یقین نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوجود ہندو ہوں اور ہندو مذہب میرے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔[1]

ہمیں بڑا تعجب اور ساتھ ہی دُکھ ہوتا ہے جب ہم کسی ایسے صاحب سے جن کو ہم دین سے ناواقف اور ناپابند نہیں قرار دے سکتے، ایسی بات سُنتے ہیں جس کا حاصل اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص جب تک اپنے کو مسلمان کہے اور توحید و رسالت کا اقرار کرے خواہ دین کی اساسی حقیقتوں کے بارہ میں بھی اُس کے خیالات میں کتنا ہی زیغ اور انحراف آ جائے اور حقائقِ دینی کی وہ کیسی ہی دُور از کار ملحدانہ تاویلیں کرے وہ مسلمان ہی رہتا ہے اور اُس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسلام کی سرحد اور اُس کے دائرہ سے نکل گیا۔

ہم بار بار غور کرنے کے بعد بھی بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس مسئلہ میں ایسے حضرات کا واقعی موقف کیا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ وہ اللہ جس کی وحدانیت کا میں کلمہ میں اقرار کرتا ہوں مختلف زمانوں میں مختلف انسانی ہستیوں کے روپ میں آتا رہا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں فلاں ہستی کی شکل میں اُس نے ظہور کیا ہے اس لئے میں اسی ہستی کی پرستش کرتا ہوں۔ خدا اور انبیاء جائے کیا اس گمراہانہ عقیدہ کے بعد بھی یہ کہا جائے گا کہ اس کا کلمۂ شریعت پر ایمان ہے اور وہ اب بھی مسلمان اور اُمتِ محمدیہ کا ایک عضو ہے؟ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور کلمہ کے دونوں جزو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو واحد معبود اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول مانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنے فرسودہ اور دقیانوسی خیالات کی بناء پر نبی و رسول کے معنی بالکل غلط سمجھے اور توہم پرستی کے تحت جبرئیل فرشتے اور وحی کا ایک خاص تصور اس کے ساتھ جوڑ لیا، حقیقت میں رسول بس قوم کا روشن ضمیر لیڈر اور مُصلح ہوتا ہے اور اپنی خداداد عقل

---

[1] پنڈت جی کی اصل تحریر اس وقت سامنے نہیں ہے، اس کا مضمون ہے جو حافظہ میں محفوظ ہے، اب سے قریباً ۲۵ سال پہلے اُن کی خود نوشت سوانح کا اُردو ترجمہ پڑھا تھا، غالباً اُسی میں اُنھوں نے یہ بات اپنے خاص دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

اور فہم و فراست سے قوم کی رہنمائی کرتا ہے اور ایک دستور حیات وضع کر کے اُس کو دیتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن سے پہلے سارے نبیوں رسولوں کی اصلی حیثیت بس یہی تھی، ناتجربہ پسند اور توہم پرست لوگوں نے نبوت و رسالت کا ایک محیّر العقول اور توہم پرستانہ تصور فکر کے اسلام میں داخل کر دیا۔ صحیح اسلامی عقیدہ وہ ہے جو میں پیش کر رہا ہوں اور سچا مسلمان میں ہی ہوں۔ فرمایا جائے کیا اس ملحدانہ عقیدہ کے بعد بھی اُس کو مسلمان ہی کہا جائے گا کیونکہ اپنے کو وہ مسلمان ہی کہتا ہے اور کلمہ کا انکاری بھی نہیں ہے؟

اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص کلمہ پڑھتا ہے اپنے کو مسلمان کہتا ہے، قرآن کو "خدا کی کتاب" بھی مانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ قرآن کے بارہ میں "کلام اللہ" اور "وحی الٰہی" ہونے کا جو تصور عام مسلمانوں کا ہے وہ بالکل غلط اور جاہلانہ ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو نیک خیالات اور اچھی تجویزیں آتی تھیں آپ اُن کو ایک خاص خطیبانہ انداز سے مرتب کر کے قلمبند کرا دیتے تھے اور اُس کو خدا کی طرف نسبت کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے کیونکہ ہر اچھائی کا چشمہ خدا ہی کی ذات ہے۔ قرآن کے "کتاب اللہ" ہونے کا مطلب بس اتنا ہی ہے اور عام مولویوں اور مسلمانوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے وہ اُن کی جہالت ہے۔

فرمایا جائے کیا اس شخص کے اس عقیدہ کے باوجود یہ کہا جائے گا کہ قرآن کے کتاب اللہ ہونے پر اُس کا ایمان ہے اور وہ صاحب ایمان اور مسلمان ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ کوئی صاحب بھی جن کو دین کی ابجد کا بھی علم ہو ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیں گے اور مندرجہ بالا گمراہانہ خیالات رکھنے والے لوگوں کو مسلمان نہیں کہیں گے حالانکہ یہ سب اپنے کو مسلمان کہتے اور کلمہ پر ایمان کا دعوےٰ رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے غور نہ کیا ہو انھیں سوچنا چاہئیے کہ دعوائے اسلام اور بظاہر کلمہ کے اقرار کے باوجود ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں نہیں کہا جا سکتا؟ وجہ صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے دین کی ایسی مسلّم باتوں کا انکار کیا ہے جن کا دینی حقیقت اور دینی عقیدہ ہونا پورے یقین اور قطعیت کے ساتھ اُمت کو معلوم ہے اگرچہ اُنھوں نے یہ انکار تاویل کے پردہ میں کیا ہے۔

علماء و مصنفین کی خاص اصطلاح میں دین کی ایسی حقیقتوں کو "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں۔ یہاں ضروریات کے معنی فرائض و واجبات کے نہیں ہیں بلکہ "ناقابلِ شک یقینیات" اور "بدیہیات" کے ہیں۔ ایسی کسی ایک چیز کا بھی انکار کر دینے کے بعد آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ یہ انکار تاویل کے پردہ میں اور لفظوں کے اقرار کے ساتھ ہو جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہو چکا۔

پرویز صاحب کے مسئلہ کی نوعیت بھی یہی ہے۔ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اُنھوں نے ادھر چند برسوں سے منصبِ رسالت کی جو نئی تشریح کی ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور آپ کے تشریعی ارشادات کو "امیرِ ملّت" کے وقتی اور ہنگامی احکام قرار دیتے ہوئے اُس کے حُجّتِ شرعی ہونے سے انکار کیا ہے (جو اُن کی دعوت کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے)۔ ہمارے نزدیک اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ تاویل کے پردہ میں حقیقتِ رسالت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کا انکار ہے۔ انکار کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی صاف کہہ دے میں فلاں کو نبی و رسول نہیں مانتا۔ یہ بالکل سیدھا سادہ کفر ہے جس میں کوئی دجل و فریب اور کوئی پردا نہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ رسولؐ اور رسالت کے الفاظ کا تو انکار نہ کرے بلکہ اقرار کرے لیکن نبوّت کی حقیقت اور رسولؐ کے منصب کی بالکل نئی ایسی تشریح کرے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ رسولؐ کی جو حیثیت قرآن مجید نے بیان کی ہے اور جو اُمّت میں بلا اختلاف مُسلّم چلی آ رہی ہے وہ باقی نہ رہے یہ انکارِ رسالت کی نہایت خطرناک اور فریب کارانہ صورت ہے اور علمی و دینی اصطلاح میں کفر و انکار کی اس صورت کو الحاد و زندقہ کہا جاتا ہے۔ اگر دین کی مُسلّم اور بنیادی حقیقتوں کی اس قسم کی ملحدانہ تاویلوں کو بھی کفر نہ کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ توحید و رسالت جیسی بنیادی دینی اصطلاحوں کی بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہے جس کا جو جی چاہے ان کے معنی تراش لے اور اسلام کے بارے میں اس سے زیادہ غلط اور گمراہانہ بات کوئی نہیں کہی جا سکتی۔

ایک فریب یا مغالطہ

یہاں ایک مغالطہ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جب کسی محرّفِ دین ملحد کے بارے میں محتاط اور خدا ترس علمار بھی اپنے منصبی فریضہ اور اُمّت کی خیر خواہی کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس شخص نے اپنا رشتہ اسلام سے منقطع کرلیا اور یہ اسلامی برادری سے نکل گیا اس لئے اب مسلمان اس کے ساتھ مناکحت جیسے وہ معاملات نہ کریں جو صرف مسلمانوں کے ساتھ کیئے جاسکتے ہیں، تو اُس کے حامیوں کی طرف سے علمار کے اس فیصلہ کو بے اثر و بے وقعت بنانے کے لئے ایک دلیل نما چال یہ بھی چلی جاتی ہے کہ طبقۂ علما کے بعض غیر محتاط افراد یا بعض خاص حلقوں کی طرف سے تکفیر کے بارے میں جو بے احتیاطیاں اور افسوسناک زیادتیاں پچھلے دور میں ہوئی ہیں اُن کی فہرست مرتب کرکے عوام کے سامنے رکھ دی جاتی ہے اور بڑے معصومانہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ ان "دیدین نفتیوں کے فتوؤں کا کیا اعتبار، ان لوگوں نے تو فلاں فلاں اکابر اُمّت اور خادمانِ دین و ملّت کو کافر کہا ہے ..." حالانکہ یہ محض مغالطہ یا فریب ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اس بارے میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی تو کسی بھی منطق کی رُو سے اس سے یہ تو لازم نہیں ہوجاتا کہ اب قیامت تک جس ملحد کے خلاف بھی فتوے دیا جائے وہ لازماً غلط ہی ہوگا۔

اگر یہ لوگ اپنی اس غلط منطق کے ذریعہ سیدھے سادے بندگانِ خدا کی آنکھوں میں دیدہ و دانستہ خاک جھونکنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ غلط فہمی یا کم علمی کی وجہ سے یہ باتیں کرتے ہیں تو ہم اُن سے کہنا چاہتے ہیں۔ خدارا آپ سوچیں کہ انسانوں کا وہ کون سا معاملہ اور ہماری کتابِ زندگی کا وہ کون سا باب ہے جس میں کبھی غلطی نہیں ہوئی ؟ اگر کسی معاملہ میں کچھ لوگوں سے غلطی ہوجانا یا دیدہ و دانستہ نفسانیت کے کسی تقاضہ کی بنا پر کسی کا کوئی غلط فیصلہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں اب جو کوئی بھی کچھ کہے گا وہ لازماً غلط ہی ہوگا تو پھر تو زندگی کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکے گی۔ کیا پولیس کی طرف سے مجرموں کے چالانوں اور عدالتوں کی طرف سے ان کے لئے سزاؤں کے فیصلوں میں کبھی کبھی غلطی ہوجانے کو بنیاد بناکر پولیس کے ہراُس چالان کو جو وہ کسی چور، ڈاکو یا دوسری

تسیم کے کسی مجرم کا کرے اور اُس کی سزا کے ہر عدالتی فیصلہ کو غلط ہی کہا جائے گا اور محکمۂ پولیس اور سارے عدالتی نظام کو لاحاصل اور بے اعتبار قرار دے کر اُس کو ختم کر دیا جائے گا؟ اور کیا طبیبوں، ڈاکٹروں کی تشخیص و تجویز میں کبھی کبھی غلطی ہو جانے کی وجہ سے سارے محکمۂ صحت کو فضول اور ناقابلِ اعتبار قرار دے کر سارے ہسپتالوں کو توڑ ڈالا جائیگا

کیسی احمقانہ بات اور کتنا لچر مغالطہ ہے جس کو ہمارے زمانہ کے ملحدوں اور اُن کے حامیوں نے "منطق" بنایا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کے متعلق اب اور مرزا غلام احمد قادیانی اور اُن کو نبی ماننے والے اُن کے امتیوں کے بارے میں اب سے پہلے محتاط اور خدا ترس علماء نے جو فیصلہ کیا وہ اُس وقت کیا جب یہ بات غیر مشکوک طور پر سامنے آ گئی کہ اُنھوں نے تحریف اور تاویل کے پردہ میں دین کی اُن اساسی حقیقتوں کا انکار کیا ہے جن کے انکار کے بعد کسی شخص کے لئے اسلام کے زیادہ سے زیادہ وسیع دائرہ میں بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی برادری والے تعلقات ایسے شخص سے منقطع کر لیں اور دین و شریعت کے امین علمائے کرام پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کے بارے میں بلا خوف لومۃ لائم مسلمانوں تک اللہ و رسولؐ کا حکم پہنچا دیں۔

ظاہر ہے کہ جدید دور کی "روشن خیالی" کے اس زمانہ میں اس دینی ذمہ داری کا ادا کرنا اور فیشن کے خلاف اس طرح کے شرعی فیصلہ کا اعلان کرنا کوئی خوشگوار اور "نفع بخش" کام نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو ملامت کے طعنوں اور ملامت کے تیروں کا نشانہ بنانا ہے۔ اگر علماء فیشن سے مرعوب ہو کر اس فرض کا ادا کرنا چھوڑ دیں تو اسلام اور کفر کا امتیاز ہی ختم ہو جائے گا اور اللہ و رسول اور دین کے ساتھ یہ علماء کی غداری ہوگی۔ ہاں اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ علماء کرام کا یہ بھی فرض ہے کہ اس طرح کا کوئی فیصلہ انتہائی احتیاط بلکہ پوری خدا ترسی اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ صرف اس وقت کریں جب شرعاً وہ اس کے لئے بالکل مجبور ہوں اور اس میں بھی لگے رہیں، اور اُمت کی خیر خواہی کو اپنا اُصول کے طور پر اپنے سامنے رکھیں۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

معارف الحدیث

(مسلسل)

مختلف اوقات کی نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت:-

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشْبَهَ صَلٰوةً بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فُلَانٍ قَالَ سُلَيْمَانُ صَلَّيْتُ خَلْفَهُ فَكَانَ يُطِيْلُ الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْأُخْرَيَيْنِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ بِوَسَطِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ ——— رواہ النسائی

سلیمان بن یسار تابعی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے (اپنے زمانہ کے ایک امام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا کہ میں نے کسی شخص کے پیچھے ایسی نماز نہیں پڑھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے زیادہ مشابہ ہو فلاں امام کی بہ نسبت" ——— سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ ان صاحب کے پیچھے میں نے بھی نماز پڑھی ہے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ ظہر کی پہلی دونوں رکعتیں لمبی پڑھتے تھے اور آخری دو رکعتیں ہلکی پڑھتے تھے اور عصر ہلکی ہی پڑھتے تھے۔ اور مغرب میں قصار مفصل اور عشاء میں اوساط مفصل پڑھتے تھے اور فجر کی نماز میں طوال مفصل پڑھا کرتے تھے۔ (سنن نسائی)

(تشریح) "مفصل" قرآن مجید کی آخری منزل کی سورتوں کو کہا جاتا ہے یعنی سورۂ حجرات سے آخر قرآن تک، پھر اس کے بھی تین حصے کیے گئے ہیں۔ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک کی سورتوں کو "طوال مفصل" کہا جاتا ہے۔ اور بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک کی سورتوں کو "اوساط مفصل" اور لم یکن سے لے کر آخر تک کی سورتوں کو "قصار مفصل" کہا جاتا ہے۔

اس حدیث میں اُن صاحب کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جن کے متعلق حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان ہے کہ "ان کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے بہت زیادہ مشابہ تھی" اور کسی شخص کے پیچھے میں نے ایسی نماز نہیں پڑھی جو بہ نسبت ان کی نماز کے حضور کی نماز سے بہت زیادہ مشابہ ہو"

بہرحال ان صاحب کا نام نہ تو ابوہریرہ نے ذکر کیا اور نہ سلیمان بن یسار تابعی نے۔ مگر شارحین حدیث نے محض قیاس اور اندازہ سے ان کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر کوئی بات بھی اس بارہ میں قابل اطمینان نہیں ہے، لیکن حدیث کا مضمون بالکل واضح ہے اور نام معلوم نہ ہونے سے اصل مقصد اور مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سلیمان بن یسار تابعی نے ان صاحب کی نماز کے بارہ میں جو تفصیل بیان کی ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مذکورۂ بالا ارشاد کی روشنی میں اسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مختلف اوقات کی نماز کی قرأت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول بھی وہی تھا جو ان صاحب کا معمول سلیمان بن یسار نے بیان کیا ہے۔ یعنی ظہر کی نماز میں تطویل، عصر میں تخفیف، مغرب میں قصار مفصل، عشاء میں اوساط مفصل، اور فجر میں طوال مفصل۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا تھا (جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے)، اس میں بھی مختلف اوقات کی نمازوں کی قرأت کے بارے میں بھی ہدایت کی گئی ہے مصنف عبدالرزاق میں سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

كَتَبَ عُمَرُ اِلٰى اَبِىْ مُوْسٰى	حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ
اَنِ اقْرَأْ فِى الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ	اشعری کو لکھا تھا کہ مغرب کی نماز میں

الْمُفَصَّلِ وَفِي الْعِشَاءِ بِوَسَطِ الْمُفَصَّلِ وَفِي الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ" (نصب الرایہ)

قصار مفصل، عشاء میں اوساط مفصل اور فجر میں طوال مفصل پڑھا کرو۔

اور امام ترمذی نے اسی خط کا حوالہ دیتے ہوئے ظہر میں اوساط مفصل پڑھنے کی ہدایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ (جامع ترمذی باب ما جاء فی القراۃ فی الظہر والعصر)

ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ہدایت جب ہی فرمائی ہوگی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی تعلیم سے انھوں نے ایسا ہی سمجھا ہوگا۔ اسی بنا پر اکثر ائمہ مجتہدین نے مختلف اوقات کی نمازوں میں قرأت کی مقدار کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط کو خاص راہنما مان کر اسی کے مطابق عمل کو اولیٰ اور مستحسن قرار دیا ہے۔

جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت:-

عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ اَبِي رَافِعٍ قَالَ اسْتَخْلَفَ مَرْوَانُ اَبَا هُرَيْرَةَ عَلَى الْمَدِيْنَةِ وَخَرَجَ اِلَى مَكَّةَ فَصَلّٰى لَنَا اَبُوْهُرَيْرَةَ الْجُمُعَةَ فَقَرَأَ سُوْرَةَ الْجُمُعَةِ فِي السَّجْدَةِ الْاُوْلٰى وَفِي الْاٰخِرَةِ اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ بِهِمَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ ——— رواہ مسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور غلام اور خادم ابو رافع رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبید اللہ بن ابی رافع (جو اکابر تابعین میں ہیں) بیان کرتے ہیں کہ مروان (جس زمانہ میں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا حج وغیرہ کسی ضرورت سے) مکہ معظمہ گیا اور حضرت ابو ہریرہ کو ان دنوں کے لیے اپنا قائم مقام بنا گیا، تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز پڑھائی تو اس کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری میں سورۂ منافقون پڑھی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ کے دن یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ (صحیح مسلم)

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْعِيْدَيْنِ وَفِي الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَهَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ، قَالَ وَاِذَا اجْتَمَعَ الْعِيْدُ وَالْجُمُعَةُ فِيْ يَوْمٍ وَاحِدٍ قَرَأَ بِهِمَا فِي الصَّلٰوتَيْنِ　　　(رواہ مسلم)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ کی نماز میں "سبح اسم ربک الاعلیٰ" اور "ھل اتاک حدیث الغاشیہ" پڑھا کرتے تھے۔ اور اگر عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں جمع ہو جاتے تو آپ دونوں نمازوں میں بھی دو سورتیں پڑھتے۔　　　(صحیح مسلم)

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سَأَلَ اَبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِيَّ مَا كَانَ يَقْرَأُ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ فَقَالَ يَقْرَأُ فِيْهِمَا بِقٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ وَاقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ　　　(رواہ مسلم)

(حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھتیجے) عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود (تابعی) سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو واقد لیثی سے پوچھا کہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا پڑھتے تھے؟[1] انھوں نے فرمایا کہ آپ ان دونوں میں "ق والقرآن المجید" اور "اقتربت الساعۃ" پڑھا کرتے تھے۔　　　(صحیح مسلم)

(تشریح) ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ کی دونوں رکعتوں

---

[1] بعض شارحین نے لکھا ہے کہ بظاہر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سوال عدم واقفیت کی وجہ سے تھا اور نہ بھول کی وجہ سے (دونوں ہی باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہت مستبعد ہیں) اس لیے اس سوال کا مقصد یا تو ابو واقد لیثی کے علم اور ان کی یادداشت کا حال معلوم کرنا تھا یا ان کی زبان سے دوسروں کو سنوانا تھا یا خود اپنے علم کی توثیق مقصود تھی۔ واللہ اعلم۔

میں علی الترتیب اکثر و بیشتر سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون یا سورۂ اعلیٰ و سورۂ غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ اور عیدین کی نماز میں بھی یا تو یہی دونوں آخری سورتیں سورۂ اعلیٰ و غاشیہ پڑھا کرتے تھے یا "ق والقرآن المجید" اور "اقتربت الساعۃ"۔

نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی نمازوں میں قرأت سے متعلق اب تک جو حدیثیں درج کی گئی ہیں اور جو کچھ ان کی تشریح کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے اس سے ناظرین نے یہ دو باتیں ضرور سمجھ لی ہوں گی۔

(۱) آپ کا اکثری معمول یہ تھا کہ فجر میں قرأت طویل فرماتے تھے اور زیادہ تر طوال مفصل پڑھتے تھے، ظہر میں بھی کسی قدر طویل قرأت فرماتے تھے، عصر مختصر اور ہلکی پڑھتے تھے، اور اسی طرح مغرب بھی، عشاء میں اوساط مفصل پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا تھا۔

(۲) کسی نماز میں ہمیشہ کسی خاص سورت کے پڑھنے کا نہ آپ نے حکم دیا اور نہ عملاً ایسا کیا، ہاں بعض نمازوں میں اکثر و بیشتر بعض خاص سورتیں پڑھنا آپ سے ثابت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

وقد اختار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض السور فی بعض الصلوات لفوائد من غیر حتم ولا طلب موکد فمن اتبع فقد احسن ومن لا فلا حرج۔

(حجۃ اللہ البالغہ مقصد دوم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض نمازوں میں کچھ مصالح اور فوائد کے پیش نظر بعض خاص سورتیں پڑھنی پسند فرمائیں۔ لیکن قطعی طور پر نہ ان کی تعیین کی نہ دوسروں کو تاکید فرمائی کہ وہ ایسا ہی کریں، پس اس بارہ میں اگر کوئی آپ کا اتباع کرے (اور ان نمازوں میں وہی سورتیں اکثر و بیشتر پڑھے) تو اچھا ہے اور جو ایسا نہ کرے تو اس کے لیے بھی کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔

تجلّیاتِ مجدّدِ الفِ ثانی

مکتوبات کے آئینے میں!

(مترجمہ ــــ مولٰنا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۲۸۶) مولانا امان اللہ فقیہ کے نام (اعتقادِ صحیح کے بیان میں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــ جاننا چاہیئے ـــ اللہ تعالےٰ تم کو ہدایت دے اور صراطِ مستقیم الہام کرے ـــ کہ طریقِ سالک کی ضروریات میں سے ایک ضروری شئے اعتقادِ صحیح ہے ـــ اُس طرح کا اعتقاد جیسے علماءِ اہلسنت نے کتاب وسنّت اور بزرگانِ دین کے اقوال سے اخذ کیا ہے۔ ـــ کتاب وسنّت سے جمہور علماءِ اہلِ حق یعنی علماءِ اہلِ سُنّت وجماعت نے جو معانی ومطالب سمجھے ہیں وہی معانی ومطالب برقرار رکھنا ضروری ہیں۔ اگر فرض کرو کشف والہام سے اُن معانی ومطالب کے خلاف کوئی معنی ظاہر ہوں تو اُس کا کوئی اعتبار نہیں، ایسی بات سے بچ کر پناہِ خداوندی کو ڈھونڈھنا چاہیئے۔ ...... حقانی علماء کے سمجھے ہوئے معانی ومطالب کو اپنے کشف والہام کی کسوٹی قرار دینا اور اُسی سے کشف والہام کی سچائی معلوم کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جو معانی علماءِ حق کے سمجھے ہوئے معانی کے خلاف ہیں وہ درجۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے اعتقادات کا پیشوا، کتاب وسُنّت ہی کو جانتا ہے مگر اپنی ناقص سمجھ کے مطابق کتاب وسنّت سے غیر مطابق معنیٰ سمجھ لیتا ہے ...... اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ علماءِ حق

کے سمجھے ہوئے معانی قابلِ اعتبار ہیں اور اُن کے خلاف معتبر نہیں۔ اس وجہ سے کہا ہے کہ علمائِ حق نے اُن معانی کو صحابۂ کرامؓ اور سلفِ صالحین کے اقوال کی تلاش وجستجو کرکے لیا ہے ـــ اور اُن ہدایت کے ستاروں (صحابۂ کرامؓ) کے انوار سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا نجاتِ اُخروی اور فلاحِ سرمدی اُن علمائِ حق کو نصیب ہوئی۔ "یہ اللہ والوں کا گروہ ہے اور اللہ والوں کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے" ـــ اگر کچھ علماء اپنے اعتقاد کو صحیح رکھتے ہوئے فروعی مسائل میں کچھ سستی برتیں اور اعمال میں کوتاہی کا ثبوت دیں تو اس بات سے تمام علماء سے برگشتہ ہوجانا اور سب کو نشانۂ ملامت بنانا محض بے انصافی اور دھاندلی کی بات ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس صورت میں بہت سی ضروریاتِ دین سے ایک قسم کا انکار پایا جاتا ہے۔۔ اس لئے کہ یہ علماء ہی تو ضروریاتِ دین کو ہم تک منتقل کرنے اور کھرے کھوٹے کو پہچاننے والے ہیں۔ اگر علمائِ حق کا نورِ ہدایت نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاسکتے ـــ وہ حضرات صحیح اور غلط کو جدا نہ کرتے تو ہم گمراہ ہوجاتے۔ علمائِ حق ہی نے دینِ مبین کا کلمہ بلند کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے۔ انھوں نے ہی کثیر التعداد لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلایا ہے۔ پس جس نے ان حقانی علماء کی پیروی کی وہ نجات پا گیا اور جس نے اُن کی مخالفت کی وہ خود گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔۔۔۔ اور جس طرح اعتقاد بمطابقِ کتاب وسُنّت ضروری ہے اُسی طرح کتاب وسنّت پر عمل بھی اُس طریقے پر کرنا ضروری ہے جس طرح ائمۂ مجتہدین نے کتاب وسُنّت سے احکام اخذ کرکے بتایا ہے۔ اُنھوں نے حلال وحرام، فرض وواجب، سُنّت ومستحب، اور مکروہ ومشتبہ کو کتاب وسُنّت کی روشنی میں بیان کیا ہے ان باتوں کا علم بھی ضروری ہے ـــ ایک مقلد کو یہ حق نہیں ہے کہ مجتہد کی رائے کے خلاف خود کتاب وسنّت سے احکام اخذ کرکے اُس کے مطابق عمل کرے ـــ (اُس کو چاہیئے کہ) جس امام کا وہ تابع ہے اُسی کے مسلک کے مطابق پسندیدہ قول کو اختیار کرے اور رُخصت سے پرہیز کرکے عزیمت پر عمل پیرا ہو ـــ جہاں تک ہوسکے ائمہ کے اقوال کو جمع کرنے میں پوری کوشش کرے تاکہ ایسے قول پر عمل ہو جو سب کے نزدیک مسلّم ہو ـــ مثلاً امام شافعیؒ وضو میں نیت

کو فرض قرار دیتے ہیں لہٰذا (حنفی) بے نیت وضو نہ کرے اسی طرح وضو کے اندر اعضاء کے دھونے میں ترتیب کو اور پے در پے وضو کرنے کو امام شافعیؒ ضروری قرار دیتے ہیں لہٰذا ترتیب وار اور پے در پے یعنی مسلسل بڑے وقفہ کے بغیر وضو کرنا چاہیئے ۔ امام مالکؒ اعضاء کے دھونے میں اعضاء کا ملنا بھی فرض قرار دیتے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ وضو میں اعضاء کو اچھی طرح مل لیا جائے۔ ایسے ہی عورت کو چھو لینے اور ستر مگاہ کے چھو لینے کو وضو کا توڑنے والا بتاتے ہیں اس لئے اگر ایسا ہو جائے تو (احتیاطاً) وضو از سر نو کر لیا جائے۔ اسی پر اور بہت سے مسئلوں کو قیاس کر لیا جائے (مثلاً چوتھائی سر کا مسح امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض ہے اور امام مالکؒ کے یہاں تمام سر کا مسح فرض ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ حنفی پورے سر کا مسح کرے۔ اس صورت میں اختلاف ائمہ سے بھی نکل جائے گا۔ اور سنت بھی ادا ہو گی اس لئے کہ پورے سر کا مسح نزد امام اعظمؒ سنت ہے)۔ اعتقاد صحیح اور عمل صالح کے دولت میسر آنے کے بعد قرب خداوندی کے مدارج میں ترقی کی طرف متوجہ ہو اور اس راہ کے تمام منازل کو طے کرنے کا طالب ہو لیکن یہ واضح رہے کہ قطع منازل اور ترقیٔ مدارج ایسے شیخ کی توجہ سے وابستہ ہیں جو خود کامل ہو اور دوسروں کی تکمیل کر سکتا ہو۔ نیز جو واقف راہ ہونے کے ساتھ ساتھ رہنمائی بھی کر سکتا ہو۔ ایسے شیخ کامل کی نظر امراض قلبیہ کو دور کرتی اور اخلاق غیر پسندیدہ کو دفع کرتی ہے ۔ پس پہلے شیخ کامل کی طلب کرے ۔ اگر محض فضل خداوندی سے شیخ کامل کی پہچان ہو جائے تو اس پہچان کو نعمت عظمیٰ تصور کر کے اپنے کو اُس شیخ کامل سے وابستہ کر دے اور کلیتہً اُس کا مطیع ہو جائے ۔ شیخ الاسلام ہرویؒ نے فرمایا ہے ۔ "اے اللہ تو نے اپنے دوستوں کے بارے میں یہ کیا عجیب معاملہ کیا ہے ؟ کہ جو اُن کو پہچان لیتا ہے تجھ کو پا لیتا ہے اور جب تک تجھ کو نہیں پاتا اُن کو نہیں پہچانتا"

اپنے اختیار کو شیخ کامل کے اختیار میں گم کر دے اور خود کو تمام آرزوؤں سے خالی کر کے اُس کی خدمت کے لئے کمر ہمت باندھ لے ۔ شیخ کامل اگر ذکر اذکار کو اُس کی استعداد کے مناسب دیکھے گا تو ذکر کا حکم کرے گا ۔ اگر توجہ و مراقبے کو مناسب تصور

کرے گا تو اُس کے لئے ارشاد فرمائے گا اور اگر محض اپنی صحبت میں رہنے کو کافی سمجھے گا تو اُس کا امر کرے گا . . . . . . نیز چاہیئے اِس راہ کی شرائط کا خیال رکھے۔ یہ شرائط کتب مشائخ میں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں وہاں دیکھ کر اُن کو ملحوظ رکھا جائے ــــ اس راہ کی سب سے بڑی شرط، نفسِ امّارہ کے ساتھ مخالفت کرنا ہے اور یہ مخالفت موقوف ہے اس بات پر کہ مقامِ تقویٰ کی رعایت و پاسداری کی جائے ـ تقویٰ کہتے ہیں حرام چیزوں سے باز رہنے کو۔ اور حرام چیزوں سے اُس وقت تک باز نہیں رہ سکتا جب تک قدرِ ضرورت سے زائد مُباحات سے پرہیز نہ کرے۔ اس لئے کہ ضرورت سے زائد مُباح کاموں کے کرنے میں ڈھیل دے دینا مشکوک اشیاء تک پہنچاتا ہے اور مشکوک حرام سے قریب ہے۔ مشکوک کے ارتکاب سے حرام میں داخل ہو جانے کا قوی احتمال ہے۔

(حدیث میں آیا ہے) "جو چرواہا مخصوص شاہی چراگاہ کے قریب اپنی بکریاں چراتا ہے بعید نہیں کہ ایسی صورت میں اُس کی بکریاں اُس چراگاہِ خاص میں داخل ہو جائیں۔" پس تقوے کے سلسلہ میں زیادتیٔ مباح سے بچنا بھی (خاص طور پر) قابلِ لحاظ ہے۔ ترقی و عروج، تقویٰ ہی سے وابستہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اعمال کے دو جزء ہیں۔ ایک اوامر کی تعمیل کرنا، دوسرے مناہی (منع کئے ہوئے کاموں) سے باز رہنا۔ اوامر کی تعمیل میں تو فرشتے بھی شریک ہیں۔ اگر (فقط) اوامر کی تعمیل ہی سے ترقی وابستہ ہوتی تو فرشتوں کے درجات میں بھی ترقی ہوتی (لیکن اُن کو اس سے ترقیٔ درجات حاصل نہیں ہوتی) پس معلوم ہوا کہ انسان کو بھی صرف اوامر کی بجا آوری سے ترقی نہ ہوگی جب تک وہ مناہی سے باز نہ رہے مناہی سے باز رہنے کا سوال فرشتوں میں اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے معصوم ہیں۔ وہ مخالفتِ حُکم کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ اُن کو اِس مخالفت سے منع کیا جائے ــــ پس لازم آیا کہ ترقیٔ مدارج، مناہی سے باز رہنے ہی سے وابستہ ہے . . . .

مکتوب (۲۸۸) سید (غلام) انبیاء سارنگپوری کے نام (نمازِ نفل کو شب برات وغیرہ میں جماعت سے پڑھنے کے عدم جواز میں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے شایان ہیں جس نے ہم کو

سیدالمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری سے مشرف کیا اور ہمیں دین کے اندر بدعات کا ارتکاب کرنے سے بچایا اور درود و سلام اُس ذاتِ عالی پر اور اُس کے آل واصحاب پر جس نے گمراہی کی بنیادوں کو اُکھاڑ پھینکا اور ہدایت کے جھنڈوں کو اونچا کیا ـــ جاننا چاہیئے کہ اکثر لوگ خواص و عوام میں سے ایسے ہیں جو ادائے نوافل میں تو پورا اہتمام کرتے ہیں مگر فرائض میں سُستی برتتے ہیں نیز فرائض میں سُنن و مُستحبات کی رعایت بہت کم کرتے ہیں۔ نوافل کو عزیز رکھتے ہیں اور فرائض کو خوار و زبوں حال ـــ بہت کم لوگ ہیں جو فرائض کو مستحب وقتوں میں ادا کرتے ہیں ـــ لوگ جماعتِ مسنونہ کے بڑھانے میں بلکہ نفسِ جماعت ہی کے لئے کوئی پابندی نہیں کرتے اور کاہلی و سُستی کے ساتھ (بغیر جماعت) فقط فرائض کی ادائیگی کو ہی غنیمت سمجھ لیتے ہیں لیکن دسویں محرم کو اور شبِ براءت میں نیز ماہِ رجب کی ستائیسویں شب (شبِ معراج) میں، نیز رجب کے سب سے پہلے جمعہ کی شب میں جس کو لیلۃ الرغائب کہتے ہیں انتہائی اہتمام کو مدِ نظر رکھ کر جماعتِ کثیرہ کے ساتھ نماز کو با جماعت ادا کرتے ہیں اور اِس فعل کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ سب شیطان کی ملمع کاری ہے کہ بُرائیوں کو اچھائیوں کی شکل میں دکھاتا ہے ـــ شیخ الاسلام مولانا عصام الدین ہروی شرحِ وقایہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ "نفل، جماعت کے ساتھ پڑھنا اور فرض کو جماعت کے ساتھ نہ پڑھنا شیطان کے جالوں میں سے ایک جال ہے۔" خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کی باتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ جس شخص نے ایسی بات کو پیدا کیا جو اس دین سے نہیں ہے پس وہ بات باطل و مردود ہے۔

واضح ہو کہ نوافل کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا بعض روایاتِ فقہیہ کی رُو سے مطلقاً مکروہ ہے اور بعض روایات میں کراہت کو اعلان و اجتماع کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے لہٰذا اگر بغیر اعلان کے ایک دو آدمی گوشۂ مسجد میں نفل کو جماعت کے ساتھ پڑھ لیں تو جماعت (دوسری قسم کی روایات کے لحاظ سے) بلا کراہت جائز ہوگی ـــ تین آدمیوں کے جمع ہونے کی صورت میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ بعض جائز اور بعض ناجائز بتلاتے ہیں اور

چار آدمیوں کی نفلی جماعت سب کے نزدیک مکروہ ہے۔ بعض روایات میں اور بعض فتاویٰ میں زیادہ صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ (چار آدمیوں کے جمع ہونے کی صورت میں) نمازِ نفل کی جماعت مکروہ ہے۔

فتاویٰ سراجیہ میں ہے ۔۔ مکروہ ہے نفل نماز جماعت سے۔ ہاں نماز تراویح اور سورج گرہن کے وقت نمازِ کسوف جماعت سے پڑھنا جائز ہے ۔۔ فتاویٰ غیاثیہ میں ہے کہ امام سرخسیؒ نے فرمایا ہے کہ علاوہ رمضان کے جماعت کے ساتھ نفل پڑھنا مکروہ ہے جب کہ اعلان کیا جائے لیکن اگر ایک یا دو شخص نماز نفل میں مقتدی بن گئے تو مکروہ نہیں ہے۔ البتہ تین شخصوں کے بارے میں اختلاف ہے اور چار آدمیوں کی جماعت بلا اختلاف مکروہ ہے ..... فتاویٰ شافیہ میں ہے ۔۔ نماز نفل با جماعت نہ پڑھے مگر رمضان کے مہینے میں اور رمضان میں بھی نفلوں کی جماعت مکروہ ہوگی۔ اگر اعلان اور اذان واقامت کے ساتھ ہو .... اس قسم کی روایات بہت سی ہیں اور فقہ کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں ..... جو لوگ دسویں محرم کے دن اور شب برات نیز لیلۃ الرغائب میں نفلی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور دو سو دو سو تین تین سو آدمی مختلف مسجدوں میں جمع ہو جاتے ہیں اور اس نماز کو اور اس اجتماع و جماعت کو اچھا سمجھتے ہیں وہ تمام فقہاء کے نزدیک فعل مکروہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور مکروہ کو مستحسن سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے اس لئے کہ حرام کو مباح جاننا تو کفر تک پہنچا ہی دیتا ہے۔ مگر مکروہ کو حسن (اچھا) قرار دینا بھی اس سے کچھ ہی کم ہے۔ اس فعل کی برائی کی طرف اچھی طرح توجہ کرنا چاہئے ۔۔ جماعت نفل کرنے والوں کے نزدیک کراہیت نہ ثابت ہونے کے لئے بڑی دستاویز اعلان کا نہ ہونا ہے۔ بے شک بعض روایات کی رو سے اعلان کا نہ ہونا (جماعتِ نفل کی) کراہت کو دور کر دیتا ہے مگر (اس میں کراہت نہ ہونا) ایک یا دو آدمیوں تک محدود و مخصوص ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مسجد کے کسی گوشے میں بے جماعت ہو ۔۔ علاوہ ازیں نمازِ نفل کے لئے تداعی کے یہ معنیٰ ہیں کہ ایک دوسرے کو اطلاع کی جائے اور یہ معنی ان مذکورۂ بالا نفلی جماعتوں میں موجود ہیں اس لئے کہ ہر خاندان کے لوگ روزِ عاشورا

وغیرہ میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر اطلاع کرتے اور بلا وادیتے ہیں کہ فلاں شیخ یا فلاں عالم کی مسجد میں جانا چاہیے اور وہاں نماز نفل با جماعت پڑھنا چاہیے — اور اس طرح اطلاع کرنے کی لوگوں نے عادت ڈال لی ہے۔ اس قسم کا اعلان تو اذان و تکبیر سے بھی زیادہ ہے پس تداعی کا بغیر اذان کے پایا جانا بھی ثابت ہو گیا — اور اگر ہم تداعی کو اذان و تکبیر کے ساتھ ہی مخصوص رکھیں جیسا کہ بعض روایات میں واقع ہوا ہے اور اس سے (فقط) حقیقت اذان و تکبیر ہی کو مراد لیں، نہ کہ ہر قسم کا اعلان و اعلام) تو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ اذان و تکبیر نہ ہونے کی صورت میں بھی نماز نفل باجماعت کا جائز ہونا، ایک یا دو آدمیوں کی جماعت تک محدود و مخصوص ہے دوسری شرط کے ساتھ ساتھ جو اوپر ذکر کی گئی ہے (یعنی گوشۂ مسجد میں پڑھنا)۔

(یہ بھی) جاننا چاہیے کہ ادائے نوافل (کی قبولیت) کا دارومدار پوشیدہ طریقے سے پڑھنے پر ہے اس لئے کہ نفل پڑھنے میں ریاکاری اور حرص شہرت کا گمان ہو سکتا ہے اور جماعت میں پوشیدگی کہاں؟ البتہ ادائے فرائض میں اظہار و اعلان مطلوب ہے اس لئے کہ فرائض دکھاوے اور شہرت کی آمیزش سے مبرا ہیں۔ پس فرائض کو باجماعت ہی پڑھنا بہتر و مناسب ہے — علاوہ ازیں کثرت اجتماع فتنہ پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ اسی وجہ سے ادائے نماز جمعہ کے لئے سلطان یا اس کے نائب کی موجودگی کو شرط قرار دیا گیا ہے تاکہ فتنہ برپا نہ ہونے پائے اور ان مروجہ جماعتوں میں تو فتنہ جاگنے کا قوی احتمال موجود ہے۔ لہٰذا اس قسم کا اجتماع مشروع نہ ہوگا ناجائز ہوگا ..... پس حکام اسلام نیز قاضیوں اور محتسبوں پر لازم ہے کہ اس قسم کے اجتماعات کو روکیں اور اس معاملہ میں اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیں تاکہ یہ بدعت جو فتنہ کی طرف لے جانے والی ہے جڑ بنیاد سے اکھڑ جائے — واللہ یحق الحق وھو یہدی السبیل۔

مکتوب (۲۸۹) مولانا بدرالدین کے نام (یہ عربی زبان کا ایک طویل مکتوب گرامی ہے جس میں اسرار قضا و قدر کا بیان ہے۔ اس کے آخری حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔)

..... واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اُن کی طاقت و وسعت کے

مطابق مُکلّف کیا ہے اور انسان کی تکلیف میں تخفیف کا لحاظ ۔۔ اُس کی خلقت کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ۔۔ فرمایا ہے ۔۔ جیسا کہ خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔۔ "خدا چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تمہارا بوجھ اور انسان تو ضعیف پیدا ہوا ہے"۔۔ خدا آسانی و تخفیف کیوں نہ کرے جب کہ وہ حکمت والا، مہربانی کرنے والا اور رحمت والا ہے۔ یہ بات حکمت، رافت (مہربانی) اور رحمت کے مناسب نہیں کہ وہ اپنے بندے کو ایسی چیز کی تکلیف دے جس کو وہ برداشت نہ کر سکے ۔۔ اُس نے اپنے بندے کو کسی بھاری پتھر کے اُٹھانے کا حکم نہیں دیا ہے۔ اُس نے تو اُن چیزوں کا حکم دیا ہے جو بندے پر آسان سے آسان تر ہیں۔ پانچ وقت کی نمازوں ہی کو دیکھو جو قیام و رکوع اور سجدہ و قرأۃ پر مشتمل ہیں۔ یہ سب کام آسان اور انتہائی آسان ہیں۔ ایسے ہی روزہ ہے جس میں نہایت سہولت رکھی ہے زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے ۔۔ زکوٰۃ میں (سال بھر گزرنے پر مال نصاب کا) چالیسواں حصہ واجب کیا گیا ہے۔ تمام مال یا نصف مال، زکوٰۃ میں دینا واجب نہیں کیا گیا تاکہ بندوں پر دشواری نہ ہو۔ کمالِ رحمت ہی کی بنا پر اُس نے عذر کی موجودگی میں اصل مامور بہ کا بدل و عوض بھی مقرر فرما دیا ہے چنانچہ وضو کا بدل تیمم قرار دیا ہے۔ اسی طرح اجازت دی ہے کہ جو شخص کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور جو بیٹھنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو وہ لیٹ کر نماز ادا کرے ۔۔ ایسے ہی جو شخص رکوع و سجود پر قدرت نہ رکھتا ہو وہ اشارے سے نماز پڑھ لے ۔۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی سہولتیں ہیں جو اُس شخص پر پوشیدہ نہیں ہیں جو نظرِ انصاف سے احکامِ شرعیہ کو دیکھتا ہے۔ نظرِ انصاف سے دیکھنے والا تمام احکامِ شرعیہ کو انتہائی آسان اور سہل پائے گا۔ نیز بندوں کو جن باتوں کا مُکلّف کیا ہے اُن میں اللہ تعالیٰ کی کمال مہربانی دیکھے گا ۔۔۔ اس بات کی گواہ کہ تکلیفِ شرعی میں تخفیف و آسانی موجود ہے ۔۔ عوام[1] کی شرعی احکام میں کچھ اور زیادہ تکلیف کی تمنا کرنا ہے۔ چنانچہ بعض عوام فرض روزوں کی مقررہ تعداد سے اور زیادہ ہونے کی تمنا کرتے ہیں اور بعض عوام نمازِ فرض میں زیادتی کی تمنا کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ کاش فرض روزے بھی کچھ زائد ہوتے اور فرض نمازیں بھی زائد ہوتیں)۔ اُن کی یہ زیادتی کی تمنا اسی بنا پر ہوتی ہے کہ احکامِ شرعیہ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر پڑھیے۔

میں انتہا درجے کی رعایتِ تخفیف (پہلے سے) موجود ہے ۔ بعض کو جو احکام شرعیہ کی ادائیگی میں آسانی محسوس نہیں ہوتی یہ بات "ظلماتِ نفسانیہ" اور "کدورات طبعیہ" کی بنا پر ہے ۔ یہ ظلماتِ نفسانیہ اور کدوراتِ طبعیہ نفسِ امّارہ کی خواہش سے پیدا ہوتی ہیں اور نفسِ امّارہ ظاہر ہے کہ عداوتِ حق پر ڈٹا ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ "دشوار واقع ہوئی مشرکوں پر وہ بات جس کی طرف آپ اُن کو دعوت دے رہے ہیں" نیز فرماتا ہے ۔ بے شک نماز دشوار ہے مگر اُن پر دشوار نہیں جو عاجزی اور فروتنی کرنے والے بندے ہیں" ۔ پس جس طرح [illegible]ری مرض ادائیگی احکام میں دشواری کا سبب ہو جاتا ہے ۔ ایسے ہی باطنی مرض بھی دشواری کا باعث بن جاتا ہے ۔ شریعتِ مطہرہ نفسِ امّارہ کو کچلنے اور اُس کے وسوسوں کو دُور کرنے کے لئے وارد ہوئی ہے ۔ خواہشِ نفس اور اتباعِ شریعت دونوں آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا جب کوئی احکامِ شرعیہ میں دشواری محسوس کرے گا ۔ یہ بات اُس کے اندر خواہشِ نفسانی کے موجود ہونے پر دلالت کرے گی ۔ جس قدر دشواری محسوس ہوگی اُسی قدر سمجھا جائے گا کہ خواہشِ نفس موجود ہے ۔ اور جب نفسِ امّارہ کی خواہش کلیتہً دفع ہو جائے گی ۔ احکامِ شرعیہ میں احساسِ دشواری کا وجود بھی نہ رہے گا ......

(حاشیہ صنلہ)

ملہ عوام کی قید اس لئے لگائی کہ شریعت کی مقرر کی ہوئی مقدار کے خلاف زیادتی کی تمنا کرنا خواص کا شیوہ نہیں ہے اور یہی خواص کا کمال ہے کہ ہر حکمِ شرعی کو من وعن تسلیم کریں اور اُس کے خلاف زیادتی وکمی کی تمنا بھی نہ کریں ، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے سہ

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اخلاق و صفات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیر تصنیف کتاب تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم کا ایک باب

جامع اوصاف حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے اوصاف و خصوصیات کا خلاصہ اور ان کا صحیح ترین و جامع ترین تعارف ان الفاظ میں ہے جو عطائے خلافت کے وقت ان کے صاحب نظر شیخ و مرشد شیخ کبیر حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی زبان سے نکلے، اُنھوں نے فرمایا:-

باری تعالیٰ ترا علم و عقل و عشق داده است و ہر کہ بدیں صفت موصوف باشد از و خلافت مشائخ نیکو آید[1]

اللہ تعالیٰ نے تم کو علم و عقل و عشق کی دولت عطا کی ہے اور جو ان صفات کا جامع ہو وہ مشائخ کی خلافت کی ذمہ داریاں خوب ادا کر سکتا ہے۔

حضرت خواجہ کی سیرت اسی جامعیت کا مرقع ہے، یہاں علم و عقل و عشق تینوں

پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ محبت و معرفت حقیقی اور مشائخ کبار کی تربیت و صحبت جو بہترین اثرات و نتائج پیدا کرتی ہے اور جن کے بہترین مجموعہ کا نام دور آخر میں "تصوف" پڑ گیا ہے۔ یعنی اخلاص و اخلاق اس کی بہترین نمود ان کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

اخلاص

ان کی زندگی کا بہترین جوہر جس نے اُن کو اپنے معاصرین ہی میں نہیں بلکہ مشائخ اسلام میں ایک بلند مقام اور اپنے زمانہ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قبول عام اور بقائے دوام عطا کیا اور ان کو محبوبیت کے خاص انعام سے نوازا، وہ توحید و اخلاص کی وہ خاص کیفیت اور ذوق ہے جس میں محبت و رضائے الٰہی کے سوا کوئی چیز مطلوب و مقصود نہیں رہی۔ محبت و یقین کے شعلہ نے ہر طرح کے خس و خاشاک کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ حُبِ دنیا، حُبِ جاہ اور اس طرح کی تمام محبتوں اور طلبوں کا استیصال کلی ہو چکا تھا۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما
عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت
ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت
شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت[1]

امیر حسن سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ مسجد میں قیام کرتے ہیں اور وہاں قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اپنے گھر ہی میں رات کو قیام کریں تو کیسا ہے؟ فرمایا کہ آدمی اپنے گھر میں ایک پارہ پڑھے

---

[1] مولانا روم

وہ مسجد میں ایک قرآن ختم کرنے سے بہتر ہے۔ اس پر یہ ذکر آگیا کہ گزشتہ زمانہ میں ایک صاحب جامع مسجد دمشق میں رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے اس لالچ میں کہ اُس کی عام شہرت ہوگی اور شیخ الاسلامی کے عہدہ پر جو اُس زمانہ میں خالی تھا اُن کا تقرر ہو جائے گا۔ یہ سُن کر حضرت خواجہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا :۔

بسوز اوّل شیخ الاسلامی را و پس	آگ لگاؤ ایسی شیخ الاسلامی کو، پھر
خانقاہ را و بعد ازاں خود را[1]	خانقاہ کو، پھر اپنے کو خاک کر کے رکھ دو۔

حضرت خواجہ کی ساری زندگی اسی دل سوختگی، اور خود باختگی کا نمونہ ہے اور اسی چیز نے اُن کی صحبت میں کیمیا اور اکسیر کی خاصیت پیدا کر دی تھی

اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے خلفاء اور جانشینوں کے بارے میں بھی (جن سے تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کا کام لینا تھا) اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ وہ اخلاص کے اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ حبِ جاہ کا اُن کے دل سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ مولانا فصیح الدین نے سوال کیا کہ مشائخ کی خلافت کا اہل کون ہوتا ہے ؟ فرمایا :۔

کسے را کہ در خاطر او توقع خلافت نہ باشد	وہ شخص جو خلافت کا متوقع اور منتظر بھی ہو۔

صاحبِ سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک ممتاز خادم کے متعلق جن کو اجازت دی جا چکی تھی معلوم ہوا کہ وہ کمبل کئی مرتبہ تہہ کر کے بچھا کر اُس پر مشائخ کی طرح بیٹھتے ہیں اور اُمراء و خواص اُن کی خدمت میں معتقدانہ حاضر ہوتے ہیں۔ آپ اس سے اتنا آزردہ ہوئے کہ جب وہ آئے تو آپ نے اُن سے منھ پھیر لیا اور اُن کو اجازت سے محروم کر دیا۔ عرصہ تک اُن سے ایسی ہی بے رُخی رہی، جب تک کہ اُن کا عذر ظاہر نہیں ہوا اور اُنھوں نے معافی نہیں مانگی اُن پر نظرِ عنایت مبذول نہیں ہوئی[2]۔

---

[1] فوائد الفواد صہ ۲۴

(۲) سیر الاولیاء میں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔

دشمن نوازی اخلاص وفنائیت اور بے نفسی کے اس مقام پر پہنچ کر سالک کے دل سے رنج وشکایت، انتقام کا جذبہ اور ایذا رکی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے، وہ نہ صرف آشنا پرور، دوست نواز ہوتا ہے بلکہ دشمن کا احسان مند اور دشمن کے حق میں دعاگو بن جاتا ہے۔ گویا دشمنی کوئی احسان ہے اکوئی نادر تحفہ اور زخم دل کا مرہم ہے جس پر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے، اور منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ امیر علی سنجری راوی ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا۔ ع

ع "ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد" "جو ہم کو رنج دے خدا اُس کو بہت راحت پہنچائے"۔

اُس کے بعد یہ شعر ارشاد ہوا۔

ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی　　ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد[1]

سیر العارفین میں ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی فرماتے تھے کہ حصار اندرپت میں (جو موضع غیاث پور کے قریب ہے) جھجو نامی ایک شخص تھا جس کو بے حد حضرت سے دشمنی تھی، بُرا بھلا کہتا تھا اور آپ کو تکلیف وایذا پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا، اُس کا انتقال ہوگیا۔ حضرت شیخ نے اُس کے جنازے میں شرکت کی۔ دفن کے بعد اُس کے بالیں پر دو رکعت نماز پڑھی اور دعا فرمائی کہ "خدایا اس شخص نے جو کچھ کہا ہو یا بُرا سوچا ہو، میں نے اس کو بخش دیا، تو میری وجہ سے اس کو سزا نہ دینا"۔

ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ بعض آدمی جناب والا کو منبر پر اور دوسرے موقعوں پر بُرا بھلا کہتے ہیں، ہم سے نہیں سُنا جاتا۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کرو، اور ایسے آدمی سے جھگڑا نہ کرو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان رنجش ہو تو اس رنجش کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باطن کو عداوت سے خالی کرے، دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائیگا۔

---

[1] (ترجمہ) جو ہمارے راستہ میں کانٹے بچھائے اللہ کرے اُس کے گلشن حیات میں جو پھول کھلے بے خار رہے۔

فرمایا کہ آخر لوگ بُرا بھلا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں مشہور یہ ہے کہ مالِ صوفی سبیل است و خونِ او مباح (صوفی کا مال وقف ہے اور اس کا خون روا) جب معاملہ یہ ہے تو کسی بُرا کہنے والے سے کیوں جھگڑا کیا جائے۔[1]

ایک دن فرمایا کہ دنیا کا عام اُصول تو یہ ہے کہ نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بدی کی جائے لیکن مردانِ خدا کا اُصول یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دیا جائے، فرمایا:۔

یکے خار نہد و تو ہم خار نہی۔ ایں خار خار باشد ..... میانِ مردماں چنیں است۔ یا نغزاں نغزی و با گزاں گزی اما میانِ درویشاں چنیں است کہ با نغزاں نغزی و با گزاں ہم نغزی[2]

"اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹا رکھ دو تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں گے۔ لوگوں کے درمیان اُصول یہی ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھا لیکن درویشوں کا اُصول یہ ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا"

حضرت خواجہ کا اس بارے میں معیار اتنا بلند تھا کہ بُرا کہنا تو بڑی چیز ہے وہ بُرا چاہنے کو بھی روا نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا:۔

بدگفتن اندک است اما بدخواستن ازاں بدتر است[3]

"بُرا کہنا بھی بُرا ہے لیکن بُرا چاہنا اس سے کہیں بُرا ہے"

جب یہ معاملہ آپ کا سب کے ساتھ تھا تو اپنے شیخ اور ولی نعمت کے عزیز دل اور تعلق والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوتا جن کے احسان سے آپ کا رواں رواں زیر بار تھا سیر العارفین میں ہے کہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے نواسے خواجہ عطاء اللہ ایک لا اُبالی و بے باک آدمی تھے۔ ایک دن دوات قلم اور کاغذ لے کر آئے اور کہا کہ میرے لئے فلاں سردار کو ایک سفارشی خط لکھ دیجئے تاکہ مجھے وہ کوئی اچھی رقم دے دے۔ شیخ نے فرمایا کہ نہ میری اس سردار سے کبھی ملاقات ہوئی ہے نہ وہ یہاں کبھی آیا ہے۔ جس شخص سے بالکل جان پہچان

---

(۱) فوائد الفوائد ص۹۵　(۲) ایضاً ص۵۶　(۳) سیر الاولیاء ص۵۵۲

نہ ہوا اُس کو رقعہ کس طرح لکھا جائے۔ صاحبزادے کو غصہ آ گیا اور اُنھوں نے سخت سُست کہنا شروع کیا کہ ہمارے ہی نانا کے مُرید ہو، اور ہمارے ہی خاندان کا صدقہ پایا ہے۔ اب ایسے احسان فراموش ہو گئے ہو کہ میرے لئے ایک رقعہ تم سے نہیں لکھا جاتا، یہ تم نے کیا پیری مریدی کا جال بچھا یا ہے اور خلقِ خدا کو دھوکا دے رہے ہو؟ یہ کہہ کر دوات زمین پر پٹک دی اور اُٹھ کر چلے۔ حضرت نے دامن پکڑ لیا اور فرمایا کہ ناراض ہو کر کیوں جاتے ہو، خوش ہو کر جائیے، اس کے بعد ایک رقم سامنے رکھی اور رضامند کر کے رخصت کیا

پردہ پوشی و نکتہ نوازی سیر الاولیاء میں ہے کہ اکثر معمول تھا کہ جو لوگ باہر سے آتے وہ کوئی شیرینی یا تحفہ خرید کر اپنے ساتھ لاتے اور پیش کرتے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ اسی ارادہ سے آرہے تھے۔ ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے۔ اُنھوں نے سوچا کہ لوگ مختلف تحائف پیش کریں گے اور وہ اکٹھا حضرت کے سامنے رکھیں گے۔ خادم سب کو اٹھا کر لے جائے گا۔ کیا پتہ چلے گا کہ کون لایا؟ اُس نے تھوڑی سی مٹی راستہ سے اُٹھا کر کاغذ میں باندھ دی۔ جب سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہر ایک نے اپنی چیز سامنے رکھی۔ مولوی صاحب نے بھی اپنی پڑیا سامنے رکھ دی۔ خادم وہ سب چیزیں اُٹھا کر لے جانے لگا۔ پڑیا کو بھی اُٹھانا چاہا۔ حضرت نے فرمایا۔" اس کو یہیں چھوڑ دو، یہ میری آنکھ کا سُرمہ ہے۔" یہ اخلاق دعالی ظرفی دیکھ کر ان عالم صاحب نے توبہ کی اور مرید ہوئے۔

شفقت و تعلق اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ کو عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور اپنے اہلِ تعلق کے ساتھ ایسی شفقت و محبت عطا فرمائی تھی جس کو اگر ماں کی شفقت سے تشبیہ یا اُس پر بھی ترجیح دی جائے تو واقعات کے لحاظ سے اُس میں کوئی مبالغہ اور شاعری نہ ہوگی۔ شیوخ کاملین کی یہ شفقت، دراصل نبیؐ کی اُس شفقت کی وراثت اور نیابت ہے جس کی حقیقت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم	آئے تمھارے پاس تم میں سے ایک
عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم	رسولؐ۔ گراں ہے اُن پر تمھاری ہر زحمت

بالمومنین رؤف الرحیم　　اور مشقت، وہ شفیق ہیں تم پر۔ اہلِ ایمان کے لئے بڑے ہمدرد اور بڑے مہربان ہیں۔"

اور اُس حکم کی تعمیل ہے جس کا خطاب رسولؐ سے ہے۔

واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین　　"اور فروتنی و تواضع کے ساتھ پیش آیئے اُن اہلِ ایمان کے ساتھ جنھوں نے آپ کی پیروی قبول کر لی ہے۔"

اس شفقت و تعلق نے وہ "اتحاد" پیدا کر دیا تھا کہ دوسروں کی جسمانی اذیت سے اپنے کو جسمانی طور پر اذیت اور دوسروں کی قلبی راحت سے اپنے کو قلبی راحت ملتی تھی:
امیر حسن علی سنجری راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مجلس ہو رہی تھی۔ سایہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے۔ آپ نے سایہ میں بیٹھنے والوں سے فرمایا۔ بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کے لئے بھی جگہ ہو جائے۔ دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور میں جلا جا رہا ہوں[1]۔

ایک مرتبہ آپ نے کسی بزرگ کا مقولہ نقل کیا جو درحقیقت اپنے ہی حال کی ترجمانی تھی کہ "خدا کی مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے اور میں اُس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں، جیسے وہ کھانا میں ہی کھا رہا ہوں[2]۔"

امیر علی سنجری فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بے وقت حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اس طرف عزیزوں سے ملنے آیا ہوا تھا، حاضری کو جی چاہا بعض دوستوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی اور کام سے آیا ہو اور شروع سے حاضری کی نیت نہ کی ہو تو شیخ کی خدمت میں نہیں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگرچہ قاعدہ یہی ہے لیکن دل نہیں مانتا کہ یہاں آکر حضرت کی زیارت کئے بغیر واپس چلا جاؤں۔ میں آج قاعدہ کے خلاف ہی کروں گا۔

(۱) فوائد الفوائد صفحہ ۹　(۲) سیر الاولیا، صفحہ ۷

حضرت نے فرمایا۔ اچھا کیا۔ پھر یہ شعر پڑھا:

درکوی خرابات وسرائے اوباش
منع نبود بیا و بنشین و بباش

پھر فرمایا کہ مشائخ کا معمول یہی ہے کہ کوئی اُن کے پاس اشراق سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد نہیں جایا جاتا لیکن میرے یہاں یہ قاعدہ نہیں جس وقت جس کا جی چاہے آئے۔

غمخواری عام یہ اہلِ قلوب غمِ دنیا سے فارغ البال لیکن دنیا والوں کے غم اور خلقِ خدا کی فکروں سے نڈھال اور خستہ حال رہتے ہیں، وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں اور ساری دنیا کا غم اپنا غم بنا لیتے ہیں، یہ کہنے کا حق درحقیقت انھیں کو ہے ع

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے نواسے خواجہ شرف الدین سے کسی مجلس میں کسی صوفی نے کہا۔ خواجہ نظام الدین عجیب فارغ البال بزرگ ہیں۔ مجرد ہیں۔ اہل وعیال واطفال کا کوئی تردد اُن کو نہیں ہے اُن کو ایسا فراغ خاطر حاصل ہے کہ ایک ذرہ غم بھی اُن کو چھو نہیں گیا ہے۔ وہ عزیز اس مجلس سے اُٹھے تو حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چاہتے تھے کہ خود اس کا ذکر کریں۔ حضرت خواجہ نے خود ہی ارشاد فرمایا:-

"میاں شرف الدین وہ رنج وغم جو میرے دل کو وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اس سے زیادہ ہوتا ہو۔ جو شخص میرے پاس آتا ہے اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے اُس سے دوچند فکر وتردد اور غم والم مجھے ہوتا ہے۔ بڑا سنگ دل ہے وہ جس پر اپنے دینی بھائی کا غم اثر نہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ جو کہا گیا ہے۔ المخلصون علیٰ خطر عظیم (مخلصین کو بڑا خطرہ درپیش رہتا ہے)، اس سے بھی سمجھ سکتے ہو کہ نزدیکاں را بیش بود حیرانی"

حضرت خواجہ کے نزدیک مسلمان کا دل خوش کرنا اور اُس کی دلجوئی اور راحت رسانی افضل ترین عمل اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ تھا۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ فرمایا:-

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی اُس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہوسکے دلوں کو راحت پہنچاؤ کہ مومن کا دل اسرار ربوبیت کا مقام ہے۔ کسی بزرگ نے خوب کہا ہے ؎

می کوش کہ راحتے بجانے برسد

یا دستِ شکستہ بنانے برسد

(ترجمہ) "کوشش کرو کہ کسی انسانی جان کو تم سے آرام پہنچے یا جو دستِ شکستہ ہے اُس کو تمھارے ذریعہ سے روٹی ملے۔"

ایک مرتبہ فرمایا کہ "قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور چلن نہ ہوگا جتنا دل کا خیال رکھنے اور دل کے خوش کرنے کا"[1]

چھوٹوں پر شفقت

حضرت خواجہ اپنے قیمتی مشاغل اور اعلیٰ کیفیاتِ باطنی کے ساتھ بچوں اور چھوٹوں پر بڑے شفیق تھے اور وہ اپنی شدید مصروفیت کے باوجود اُن کی دلجوئی اور ملاطفت کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ ان عظیم ذمہ داریوں اور باطنی مشغولیت کے باوجود ان بچوں کی رعایت فرماتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتے۔

خواجہ رفیع الدین ہارون آپ کے حقیقی بھانجے کے صاحبزادے تھے، اگر کبھی کھانے کے وقت وہ موجود نہ ہوتے تو اگرچہ بڑے بڑے بزرگ دسترخوان پر بیٹھے ہوتے لیکن آپ اُن صاحبزادے کا انتظار کرتے، آپ اپنے بچہ کی طرح خلوت و جلوت میں اُن کی تربیت و دلداری فرماتے۔

خواجہ رفیع الدین کو تیر و کمان اور تیراکی و کشتی کا بڑا شوق تھا۔ حضرت سلطان المشائخ بڑی شفقت کے ساتھ اُن سے انھیں فنون کی باتیں کرتے تھے، اُن کی ہمت افزائی اور تشویق فرماتے، ان فنون کی باریکیوں اور نکتوں کی تعلیم دیتے تاکہ یہ خوش ہوں[2]

جو شریف النفس اور ذی استعداد نوجوان اپنے زمانہ کے خوش وضع لوگوں کے جیسا لباس پہنتے اور اُن میں نوجوانی کے تقاضہ سے لباس میں تجمل پیدا ہوتا (جسکو بعض سخت گیر خلافِ ثقاہت و متانت سمجھ کر اعتراض کرتے ہیں) حضرت خواجہ اُن کی بھی دلجوئی فرماتے اور اُس کو جوانی

---

[1] سیر الاولیاء صفحہ ۱۲۸ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۳ [3] ایضاً صفحہ ۲۰۴

اور زمانہ کا تقاضا سمجھ کر نظر انداز فرماتے۔ سیرالاولیاء کے مصنف امیر خسرو لکھتے ہیں کہ میرے چچا سید حسین کرمانی کی نوجوانی کا زمانہ تھا، وہ اس زمانہ کے شوقین نوجوانوں کے لباس اور وضع میں ایک روز تشریف لائے۔ حضرت خواجہ نے ان کو دیکھ کر فرمایا

سید بیا و بنشیں و سعادت ببر[1] "سید آؤ، بیٹھو اور سعادت میں حصہ لو"

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس شفقت و ملاطفت اور دلجوئی و دل نوازی سے کتنے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت ہوئی ہوگی اور کتنے "آہوئے وحشی" اسیر دام محبت ہوئے ہوں گے اور اُن کا شمار خدا کے مقبول بندوں اور شیوخ کاملین میں ہوا ہوگا۔

حضرت خواجہ کے ان اخلاق و صفات اور صوفیائے صافیہ کی سیرت کو دیکھ کر امام غزالی کی اس رائے اور شہادت کی تصدیق ہوتی ہے جس کا اُنھوں نے "تلاش حق" کے طویل سفر اور مختلف گروہوں اور انسانی طبقات کے عمیق مطالعہ کے بعد اظہار کیا ہے۔

> " مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں۔ ان کی سیرت بہترین سیرت، اُن کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور اُن کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی اُن کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں۔ اُن کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے[2]"

---

[1] سیرالاولیاء، صـ ۲۰۳

قانونِ نصرت

(جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

آج مسلمان جس نازک دور سے گزر رہے ہیں اور اضطراب و پریشانی کی جو کیفیت ان پر طاری ہے اُس کے پیش نظر اگر خدا کی امداد کے کچھ گزشتہ واقعات ان کو یاد آرہے ہیں اور آج بھی ان کو خدا کی مدد کا انتظار ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا قانون مقرر ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ نصرت پر غور کیا جائے تاکہ ہم اپنے کو خدا کی امداد و اعانت کا اہل بنا سکیں اور تائیدِ الٰہی کی دولت سے سرفراز ہوں۔

"نصر" کے معنی "مدد کرنے" "غالب کرنے" کے ہیں۔ خاص طور سے مظلوم کی امداد کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید نے اسم پاک "نصیر" کا استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نصیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امداد و اعانت ان کی ایسی صفت ہے جو ہر لحظہ ان کے ساتھ ہے، وہ ہمیشہ سے نصیر تھے، اب بھی نصیر ہیں، اور ہمیشہ نصیر رہیں گے۔ نصیر کے یہ معنی پیش نظر رکھنے سے اندازہ ہوگا کہ بے شبہ تنہا وہی ایک ایسی ذات ہے جو صحیح معنی میں نصرت فرما سکتی ہے، اسی کی نصرت اعتماد اور بھروسہ کے لائق ہو، بقاء اور دوام اسی کی اعانت کو حاصل ہے۔ جو اس کی نصرت سے سرفراز ہوا، اس کو اب نہ کسی اضطراب کی ضرورت ہو اور نہ کسی دوسرے کی مدد کی حاجت ہو، ارشاد فرمایا۔

کفیٰ باللہ نصیرا　　　اور اللہ کافی مددگار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کی نصرت سے سرفراز ہونے کا شرف کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

اس سلسلے میں پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ خدا کی امداد و اعانت کے اصلی مستحق وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے اس کی اطاعت و انقیاد کا اقرار کیا ہے اور اس کی دعوتِ حق پر لبیک کہا ہے، ارشاد ہوا:۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ	ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی
آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ	دنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں۔ اور جس
يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۔ (مومن)	دن کھڑے ہوں گے گواہ۔
وكان حَقًّا علينا نصر	ایمان والوں کی مدد کرنا، ہم پر حق
المؤمنين (روم ۵)	ہے۔

معلوم ہوا کہ ایمان کے بغیر خدا کی نصرت کا تصور عبث ہے۔ اور اسی طرح ایمان کے بعد خدا کی نصرت سے مایوسی حرام ہے۔ ارشاد ہوا:۔

من كان يظن ان لن ينصره الله	جس کو یہ خیال ہو کہ ہرگز مدد نہ کرے
في الدنيا والآخرة فليمدد	گا اس کی اللہ دنیا میں اور آخرت
بسبب الى السماء ثم ليقطع	میں تو تانے ایک رسی آسمان کو اور پھر
فلينظر هل يذهبن كيده	کاٹ دے۔ اب دیکھے کچھ گیا اس کی
ما يغيظ (حج)	تدبیر سے اُس کے جی کا غصہ۔

اہلِ تفسیر کی ایک جماعت کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ جو شخص خدا کی مدد سے ناامید ہے وہ خیال کرے کہ جیسے ایک شخص اونچی لٹکتی ہوئی رسی سے لٹک رہا ہے۔ اگر اوپر چڑھ نہیں سکتا تو اس کی تو امید ہے کہ رسی اوپر کو کھینچے اور چڑھ جائے۔ لیکن اگر رسی ہی توڑ دی تو پھر اوپر چڑھنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ اسی طرح خدا سے امید کا رشتہ توڑ دینے کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی!

حاصل یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو خدا کی امداد پر یقین کامل رکھنا چاہیے اور ان کے دل میں خدا کی نصرت کی طلب اور خواہش پیدا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سراپا تمنا اور انتظار بن جانا چاہیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو جنت کی بشارتیں سناتے ہوئے ان کی نصرت خداوندی

کے لیے تڑپ اور بے چینی کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

وأخرىٰ تحبونها نصر من اللّٰه وفتح قريب۔	اور (جنت کے علاوہ) دوسری وہ چیز تم کو دے گا جس کی تم کو چاہت ہو۔ مدد اللہ کی اور قریبی فتح۔

خدا کی نصرت کے ساتھ یہ قلبی تعلق دعا کی صورت میں بھی ظاہر ہونا چاہیے اور پورے آداب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے درخواست اور التجا کرنی چاہیے، قرآن مجید کا بیان ہو کہ اہل ایمان خدا سے عرض کرتے ہیں۔

أنت مولانا فانصرنا على القوم الكٰفرين۔	تو ہی ہمارا آقا ہے، تو مدد کر ہماری کافروں کے مقابلہ میں۔
وما كان قولهم الا أن قالوا ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا في أمرنا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكافرين۔	اور ان کا کہنا تو بس اتنا ہی تھا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے باب میں ہماری زیادتی کو بخش دے۔ اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور ہم کو کافروں پر غالب رکھ۔

بدر کے موقع پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور خود مسلمانوں نے جس طرح بارگاہ خداوندی میں فریاد اور امداد کی دعا کی ہے اس درخواست کا نقشہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

اذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم۔	اور اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے پھر اس نے تمہاری فریاد سن لی۔
أني ممدكم بألف من الملٰئكة مردفين۔	(اور فرمایا) کہ میں تمھیں ایک ہزار یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتوں سے مدد دوں گا۔

اس موقع پر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ رب العزت میں الحاح وزاری بھی یاد کرنے کے لائق ہے۔ اور اگر گوش حقیقت نیوش ہو تو بدر کی فضا میں اب بھی یہ مناجات سنی جا سکتی ہو:۔

"اے میرے پروردگار اپنا وعدہ پورا فرما، خداوندا! اگر یہ مٹھی بھر انسان تباہ ہو گئے تو قیامت تک تیری پرستش نہ ہوگی"

پھر معاملہ محض تمنا، طلب اور دعا ہی پر نہیں ختم ہو جاتا بلکہ جس سلسلہ میں ہم امداد خداوندی کے طلب گار ہیں اس کے لیے بقدر طاقت وہمت جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔ خصوصاً دین کے راستے میں جدوجہد اور سعی وکوشش نصرت خداوندی کے حصول کا خاص وسیلہ وذریعہ ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

ولینصرنّ اللہ من ینصرہ۔ (حج ۶)	اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے۔

آج مسلمانوں کے دل ودماغ میں خام خیالی کی وجہ سے یہ خواہش پیدا ہے کہ انھیں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کرنا پڑے اور خدا کی آسمانی مدد ان پر سایہ فگن ہو جائے۔ یہ انتہائی خطرناک غلطی ہے۔ قرآن مجید نے نصرت خداوندی کے جتنے بھی واقعات سنائے ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی نصرت نے اہلِ ایمان کی دستگیری اسی وقت فرمائی جب انھوں نے اپنے کو اس کی راہ میں پیش کر دیا!

مسلمانوں کو اگلے اہلِ ایمان کے حالات سناتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ	کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں پہنچ
ولما یأتکم مثل الذین خلوا	جاؤ گے، درانحالیکہ ابھی تک تم پر اگلے
من قبلکم مستھم البأساء	بندگان خدا کے سے حالات نہیں آئے
والضرّاء وزلزلوا حتی یقول	آئیں ان پر سختیاں اور تکلیفیں اور وہ ہلا ڈالے
الرّسول والذین اٰمنوا معہٗ	گئے۔ یہاں تک کہ کہنے لگے رسول اور ان
متی نصر اللہ الا ان نصر اللہ	کے ایمان والے ساتھی کہ کب آئے گی اللہ
قریب (البقرہ ۲۰۵)	کی مدد؟ ۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی مدد

قریب ہے۔

ظاہر ہے کہ نصرت خداوندی کی یہ بشارت محلوں کے آراستہ کمروں میں، غفلت کی زندگی گزارنے والوں کو اور محض دنیاوی عیش وعشرت میں مست وسرشار رہنے والوں کو نہیں سنائی گئی، بلکہ یہ خوش خبری ان لوگوں کو دی گئی جو ابتلاء وآزمائش کی کٹھن منزلوں سے گزرے مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔ اگر زحمتیں پیش آئیں تو ان کو برداشت کیا۔ اور اگر خدا نے دنیاوی سکون وطمانیت نصیب فرمائی تو اس سے بھی انھوں نے رضائے حق کی جستجو کا کام لیا، سورۂ انعام میں صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے پیشتر پیغمبروں کو جھٹلایا گیا اور ان کو تکلیفیں دی گئیں۔ مگر وہ ثابت قدم رہے یہاں تک کہ ہماری امداد ان کے پاس آگئی ــــ

ولقد کُذِّبَتْ رسل من قبلک	اور تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے
فصبروا علیٰ ما کذبوا واُوذوا	گئے پس وہ جھٹلانے پر صبر کرتے رہے
حتیٰ اتاھم نصرنا (الانعام)	یہاں تک کہ ان کو میری مدد پہونچی۔

بدر کے موقع پر خدا کی مدد مسلمانوں کے پاس مدینہ طیبہ میں نہیں آئی بلکہ بدر کے میدان میں وہ خدا کی نصرت سے سرفراز ہوئے۔ وہ کمزور تھے، بے سروسامان تھے، جس حال میں بھی تھے دین کی پکار پر حاضر ہو گئے۔ ارشاد ہوا:۔

لقد نصرکم اللہ ببدر وانتم	اللہ تمھاری مدد بدر میں کر چکا ہے، اور
اذلۃ۔	تم کمزور تھے۔

راہ حق پر صبر وثبات اور جد وجہد کے لیے قرآن مجید نے ایک نقشہ پیش فرمایا ہے جس کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مقصود کو پانے کے لیے انسانوں کو کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اور محض تمنا اور آرزو، مقصد میں کامیابی کے لیے کافی نہیں ہوا کرتی۔ ارشاد فرمایا۔

یاایھا الذین اٰمنوا اصبروا	اے ایمان والو صبر کرو، اور مقابلہ میں
وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ	مضبوطی سے جمے رہو اور لگے رہو۔ اور
لعلکم تفلحون (آل عمران)	اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو

اس آیت کا پہلا حکم ہے۔ اصبروا ـــــــ صبر کرو۔

صبر روکنے اور سہارنے کو کہتے ہیں، تحمل برداشت کی یہ قوت جب صحیح مواقع پر استعمال کی جائے اس کو صبر کہیں گے۔

اس آیت میں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ تن آسانی اور نفس پروری کے جذبات کو دبا کر میدان عمل میں آنا چاہیے اور اس پر جمنا چاہیے۔

دوسرا حکم ہے۔ صابروا ـــــــ اور مقابلہ میں مضبوط رہو۔

قرآن مجید نے صابروا کا عجیب جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ مقابلہ میں مضبوط رہنے کا حکم تو دیا مگر مقابلہ کی کوئی صورت متعین نہیں فرمائی، اس جامعیت کا فائدہ یہ ہے کہ مخالف جس سمت سے بھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانا چاہے ہم کو حکم ہے کہ ہم مضبوطی سے اس کا مقابلہ کریں۔

ہوسکتا ہے کہ دشمن اسلام اور مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے جنگ کا سامان کرے یا مسائل دینیہ پر حملہ کرے، اسلامی تہذیب کو برباد کرنے یا مسلمانوں کے اندر افتراق پیدا کرنے کی کوشش کرے، غرض جو صورت بھی ہو تم کو پامردی کے ساتھ مقابلہ میں جمنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں امام رازی کو انھوں نے صراحتاً اس مفہوم کو اپنی تفسیر میں لکھ دیا۔ ارشاد فرمایا:۔ مصابرۃ میں جہاد اور اسی طرح اہل باطل کے شکوک و شبہات کا ازالہ بھی داخل ہے۔

صابروا کا ایک مطلب اہل تفسیر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اہل باطل باطل کے سلسلہ میں جو زحمتیں برداشت کرتے ہیں تم حق کے سلسلہ میں مشقتوں کو برداشت کرنے میں ان سے کم نہ رہو۔

آج دنیا میں علم و عمل، تہذیب و اخلاق اور معاملات غرض ہر شعبۂ زندگی میں خدا سے بے تعلقی کا رجحان کس قدر بڑھ گیا ہے اور چونکہ حقیقۃً ان تمام امور میں خداوندی پیامات کا صحیح حامل اسلام ہی ہے اس لیے ان تمام حملوں کی زد براہ راست اسلام ہی پر پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اہل باطل جس عزم وارادہ اور قوت کے ساتھ باطل کی حمایت میں سرگرم عمل ہیں کیا ہم حق کی حمایت میں کسی طرح بھی ان سے پیچھے رہ جائیں؟ باطل کی راہ میں لوگ جو پریشانیاں اٹھاتے ہیں کیا ہم صداقت کی راہ میں ان مصائب کو نہیں برداشت کر سکتے؟ ظاہری مشکلات، مادی پریشانیاں، اور وقتی مصیبتیں ہم کو مایوس اور پست ہمت نہ بنادیں۔ بلکہ اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے ہم کو پورے استقلال اور پامردی کے ساتھ میدان عمل میں آنا چاہیے۔ صابروا کا یہی مفہوم ہے۔

تیسرا حکم ہے :۔ ورابطوا۔ یعنی لگے رہو۔ ربط عربی زبان میں باندھنے کو کہتے ہیں۔ مرابط ان لوگوں کو کہتے ہیں جو تحفظ کی غرض سے دشمن کے حملے کا جواب دینے کے لیے ہر وقت سرحدوں پر تیار رہتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں مسلمانوں کو صبر وثبات کا حکم دیا۔ دوسرے ٹکڑے میں صبر وثبات میں مضبوط رہنے اور دشمن پر غلبہ پانے کا حکم دیا۔ اب فرمایا گیا کہ ان دونوں صورتوں میں اصبروا اور صابروا میں مرابط کی شان ہونی چاہیے جس طرح مرابط کسی وقت غافل نہیں ہو سکتا، سرحد کو چھوڑ نہیں سکتا، اپنے تحفظ اور دشمن کے جواب کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو دین پر عمل کرنے اور اس کی حمایت میں مرابط کی شان اختیار کرنا چاہیے۔ نفس وشیطان ہمارے ایمان و عمل میں رخنہ اندازی نہ کر سکیں اور اعداء دین کے حملوں کے جواب کے لیے ہم ہر وقت مستعد اور ہوشیار رہیں۔

چوتھا حکم ہے :۔

واتقوا اللہ   اور خدا سے ڈرتے رہو۔

یعنی اصبروا، صابروا اور رابطوا کی منزلوں میں تقویٰ کا لحاظ رہے، ان چیزوں کا مقصود بھی حصول تقویٰ ہو۔ اور ان چیزوں کے برتنے میں بھی تقویٰ پیش نظر رہے۔ اچھی سے اچھی تحریک ہو اور بہتر سے بہتر پروگرام ہو اگر اس کے چلانے اور برتنے میں صحیح طریقے نہیں اختیار کیے جاتے ہیں تو نتائج خراب نکلتے ہیں اس لیے مسلمان کی زندگی وہ انفرادی ہو یا اجتماعی تقویٰ سے رنگین ہونا چاہیے اس کی ابتدا بھی تقوے سے ہو اور انتہا بھی تقویٰ ہی پر ہو۔ یہ وہ مراحل

ہیں جن کے طے کرنے کے بعد

لعلکم تفلحون　　　تاکہ تم اپنی مراد کو پہونچو۔

کی منزل آتی ہے۔

غور کیجئے کہ اس آیت کے پہلے مخاطب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں جو مکہ کا عہد ستم گذار کر مدینۂ منورہ (صلی اللہ علیٰ صاحبہا) آچکے ہیں، اور راہ حق میں بے نظیر قربانیاں پیش کرچکے ہیں۔ فقر وفاقہ، سب وشتم، قید وبند، زدوکوب، اور جلا وطنی، ان میں سے وہ کون سی آزمائش ہے جس میں یہ اللہ کے بندے پورے نہیں اترے۔ مگر قرآن مجید انھیں کو مخاطب فرماکر کہتا ہے کہ اگر منزل مقصود تک پہونچنا ہے تو ان چاروں چیزوں کو اختیار کرو۔

جب حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جیسے ملاکشان اسلام کو اس آیت کا مخاطب اول بنایا گیا تو اب فیصلہ آسان ہے کہ ہمارے لیے ان اصولوں کا لحاظ کس درجہ ضروری ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے۔ اسلام کے لئے ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لئے بھی۔ اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پُرتاثیر ہے۔ مجلد عگر غیر مجلد عہ/ ہندی ایڈیشن قیمت

مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی

حضرت مجدد کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپ کے بعد جس ہستی نے سنبھالا اور سلطنت مغلیہ میں حضرت مجددؒ کے ڈالے ہوئے دینی رُخ کو تکمیل تک پہنچایا وہ ہیں آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ۔ آپ کے مکتوبات بھی آپ کے والد ماجد کے شہرۂ آفاق مکتوبات کی طرح عظیم مصلحانہ کاوشوں اور عرفانی علوم و حقائق کے آئینہ دار اور فصاحت و بلاغت کا بحرِ ذخار ہیں۔ اصل زبان فارسی ہے۔ فارسی کے اس خزانہ کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص و انتخاب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی آب و تاب کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔ قیمت صرف چار روپیے ۴/-/۱

سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو اسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد کے پوتا کے ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب مرادآبادی نے حرمین شریفین کا سفر بڑے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفرِ عشق کی مکمل روداد قلمبند کرکے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفرنامہ کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہند و حجاز کے بہت ہی نادر حالات و معلومات اس کے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو یہ عجیب و غریب ہی مرقع ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ قیمت ۱/۷۵

حضرت مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ اُن کی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے۔ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کا مبسوط مقدمہ ہے قیمت عگر مجلد عہ

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس

مرتبہ: مولانا منظور نعمانی

آج مولانا مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اُنھیں جاننا اور اُن کی باتیں اور ہدایتیں سننا چاہے تو حضرت مرحوم کے اس مجموعۂ ملفوظات کا مطالعہ کرے جو دین کے حقائق اور معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا۔ قیمت عہ

اسلام کے متعلق اہل مغرب کا غلط رویہ

ایک مغربی فاضل کی نظر میں

از جیمس اے مشنر ــــ ترجمہ مولوی محمد اقبال صاحب اعظمی (فاضل دیوبند)

[ذیل کا مضمون ایک مغربی فاضل (JAMES.A.MICHENER) کے ایک فاضلانہ مقالہ کا ترجمہ ہے جو موصوف نے اسلام کے بارے میں اہل مغرب کے غلط رویہ کے خلاف احتجاج اور اظہار افسوس کے طور پر لکھا ہے اور اپنے علم و مطالعہ کے مطابق اسلام کی طرف سے جواب دہی کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ لندن کے مشہور و مقبول عام رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ (READERS DIGEST) میں شائع ہوا تھا۔ راقم نے الفرقان کے لئے یہ ترجمہ کیا ہے ـــ اہل علم ناظرین محسوس فرمائیں گے کہ اسلام کی وکالت میں صاحب مضمون سے بعض جگہ تسامحات بھی ہوئے ہیں، میں نے اپنی طرف سے ان کی تصحیح ضروری بلکہ مناسب بھی نہیں سمجھی البتہ ایک اضافہ ضرور کیا ہے کہ جن قرآنی آیات اور احادیث کا مصنف نے حوالہ دیا تھا اور صرف ترجمہ دیا تھا میں نے اصل آیات اور متون احادیث بھی نقل کر دیے ہیں

اس مقالہ سے ایک طرف یہ بات معلوم ہوتی کہ اہل مغرب اسلام کے بارے میں کس قدر غلط خیالات رکھتے ہیں اور کیسی بے سر و پا باتیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق ان میں مشہور ہیں، اور دوسرے یہ کہ انھیں میں بعض ایسے انصاف پسند بھی ہیں جو اس غلط روش کے خلاف کھل کر احتجاج اور اپنی علمی بساط کے مطابق اسلام

کی طرف سے مدافعت اور جواب دہی بھی کرتے ہیں ۔]

اقبال

آج کی دنیا میں یہ ایک نہایت حیرت انگیز حقیقت ہے کہ مذہب اسلام جس کے بہت سے احکام شریعت عیسوی و موسوی سے ملتے جلتے ہیں، یورپ اور امریکا میں اس کے بارے میں واقفیت بہت کم ہے، لیکن جب دنیا میں تقریباً ۴۵ کروڑ مسلمانوں کی آبادی ہے اور دنیا کے بہت سے اہم مقامات پر ان کی حکومتیں بھی ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں اچھی طرح سمجھیں :-

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ابھی حال ہی میں ایک بہت معزز مسلمان امریکا آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ بہت غلط سلوک کیا گیا اور غیر شعوری طور پر ان کی جس قدر توہین کی گئی اور ان کے اوپر جتنے تحقیر آمیز فقرے کسے گئے وہ اس قابل ہیں کہ ان کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جائے ۔

——— نیویارک کے ایک گرجا میں انھیں پتھر پر بنی ہوئی ایک تصویر دکھائی گئی اور ان سے کہا گیا کہ "دیکھئے ہم آپ کے پیغمبر کی بھی تعظیم کرتے ہیں" ——— لیکن تصویر میں انھوں نے دیکھا کہ عیسیٰ، موسیٰ اور بدھ دلوں کو علم اور روشنی کے ذریعہ منور کر رہے ہیں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تلوار لئے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "تبدیل مذہب کرو ورنہ موت کے گھاٹ اتار دئے جاؤ گے ۔

——— انھوں نے ایک فلم میں دیکھا کہ بہادر عیسائی کمزور اور ڈرپوک مسلمانوں سے اپنے مقدس شہر یروشلم (بیت المقدس) کے لئے لڑ رہے ہیں ——— اس میں عیسائیوں کو تعلیم یافتہ اور مہذب اور مسلمانوں کو جاہل اور وحشی دکھایا گیا تھا ۔

——— ایک اخبار میں بے اصل قصوں کہانیوں کی بنیاد پر ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تابوت شیشہ سے بنایا گیا ہے اور وہ آسمان و زمین کے درمیان معلق ہے اور اس کو مسلمانوں کا عقیدہ قرار دے کر اس پر سخت

تنقید کی گئی اور اس کا خاکہ اُڑایا گیا، جس سے ہر اس شخص کو اذیت ہوگی جو انکے ساتھ عقیدت کا تعلق رکھتا ہے۔

—— عام گفتگوؤں میں انھوں نے سُنا کہ لوگ مذہب اسلام کی طرف عیش پسندانہ اور شہوت انگیزی کے خیالات منسوب کرتے تھے۔

—— ایک عام جلسہ میں ایک مقرر نے بطور مذاق یہ بات کہی کہ "ہاں! اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آئے گا تو محمد خود ہی پہاڑ کے پاس چلے جائیں گے —— ایسا تمام چھوٹے پیغمبروں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

—— سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے انھیں محمڈن اور ان کے مذہب کو محمڈن ازم سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اس کا مقصد صرف نسبت کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے ان کا مقصد اس عظیم مذہب کی تحقیر ہوتی تھی کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں وہاں نہایت پست اور ذلیل باتیں عوام میں مشہور تھیں —— اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ایک مسلمان کے ساتھ یہ توہین آمیز اور تکلیف دہ رویہ کیوں اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ ———

پیغمبر اسلام کا تعارف: اسلام کے بانی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تقریباً سنہ ۵۷۰ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، آپ پیدائش ہی سے یتیم تھے، آپ کو خصوصیت کے ساتھ کمزوروں، ضرورتمندوں، یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کی بہت فکر رہتی تھی —— ابھی آپ تقریباً بیس سال ہی کے تھے کہ آپ ایک کامیاب تاجر ہو گئے اور جلد ہی ایک مالدار بیوہ خاتون کے تجارتی اونٹوں کے قافلہ کے سربراہ ہو گئے، جب آپ کی عمر پچیس سال کی ہوئی تو انہی خاتون (خدیجہ) نے آپ کی صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ کو شادی کا پیغام دے دیا اور اگرچہ خدیجہ عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں لیکن آپ نے ان کے ساتھ نکاح کرنا منظور فرمالیا اور جب تک وہ زندہ رہیں آپ ایک وفادار اور محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے اور چالیس ہی برس کی عمر میں آپ محبوب بیوی، اچھی اولاد اور سکون بخش دولت سے بہرہ ور ہو گئے، پھر مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق حیرت انگیز حالات میں جبرئیل کے واسطہ سے اللہ کے کلام کی وحی

آپ پر شروع ہوگئی ۔۔۔۔ پہلے پیغمبروں کی طرح آپ نے بھی ایک گونہ گھبراہٹ محسوس کی اور اللہ کے کلام کو ادا کرنے میں ابتداءً تکلف ہوا لیکن جب فرشتہ نے کہا " اقراؑ (پڑھو) تو باوجودیکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے، آپ نے ان مقدس الفاظ کو دُہرانا شروع کر دیا اور اس کے بعد آپ توحید خالص کے حامل اور داعی بن گئے ۔

مالدار عرب جن کا عقیدہ لاتعداد بتوں کی عبادت کا مطالبہ کرتا تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس دعوت توحید سے اشتعال میں آگئے اور آپ کو مع آپ کے چند ساتھیوں کے آپ کے وطن مکہ سے نکال دیا گیا اور اس کے بعد بھی طرح طرح سے اذیتیں دی جاتی رہیں تو اپنے دین کے تحفظ اور ضمیر کی آزادی کے لئے مجبور ہو کر آپ ایک فوجی لیڈر کی شکل میں سامنے آئے اور اگرچہ بارہا لڑائیوں میں آپ بے سروسامان تشریف لے گئے اور کبھی کبھی فریق مخالف کی پانچ گنا فوجوں سے مقابلہ ہوا لیکن آپ کو ان لڑائیوں میں عموماً شاندار فتح حاصل ہوئی اور آپ ایک آزاد ریاست کے صدر بن گئے اور آپ کے مخالفین کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے جس خوبی سے حکومت کا نظام چلایا اور بہت سے پیچیدہ مقدمات میں آپ نے جو دانشمندانہ فیصلے کئے ہیں وہ مذہبی قانون کی بنیاد ہیں جو اسلام میں آج بھی رائج ہیں ۔ اخیر سالوں میں جب آپ کو ڈکٹیٹر یا مذہبی پیشوا بنائے جانے کی پیش کش کی گئی تو آپ نے دونوں چیزوں سے یہ کہہ کر انکار فرما دیا کہ " میں ایک معمولی انسان ہوں جسے اللہ رب العزت نے دنیا کی طرف اپنا پیغام پہونچانے کے لئے مقرر فرمایا ہے " پھر اپنی غیر معمولی شخصیت کے زور پر آپ نے عرب اور مشرق وسطیٰ میں زندگی کا ایک انقلاب برپا کر دیا، آپ نے ایک ایسے مذہب کا اعلان کیا جو ایک خدا کو ماننے کا حکم دیتا ہے، آپ نے عورتوں کو غلامی سے نکالا اور عام سماجی انصاف کا حکم دیا۔

...... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زندگی کے ہر شعبہ میں عملی تھے، جب آپ کے محبوب فرزند "ابراہیم" کا انتقال ہوا، اتفاق سے اسی دن سورج گرہن واقع ہوگیا، لوگوں میں اس بات کے چرچے ہونے لگے کہ خدا خود سوگوار ہے اور یہ سورج گرہن آپ کے صاحبزادے کی موت کی وجہ سے واقع ہوا ہے تو آپ نے اس کی شدت سے تردید کی اور اعلان فرمایا :-

ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ لا ینکسفان
لموت احد ولا لحیاتہ الخ

یہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانی ہیں یہ کسی کی موت اور
زندگی سے منکسف نہیں ہوتے ۔

خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کے بعض عقیدتمندوں نے آپ کی وفات سے انکار کیا اور آپ کو مافوق البشر سمجھا تو ایک شخص (حضرت ابوبکر) جو آپ کے انتظامی جانشین ہونے والے تھے انھوں نے اس جذباتی طوفان کو دبایا اور ایک ایسی موثر تقریر فرمائی جو مذہبی تاریخ میں یادگار رہے گی، انھوں نے فرمایا :-

من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ
فان اللہ حی لا یموت ۔

جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ
وفات پاگئے اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے ۔

..... لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئیں اور پھر آپ ایک معمولی مکان میں دفن کر دئے گئے جس کی جائے وقوع آج بھی سب کو معلوم ہے —— رہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آسمان زمین کے بیچ شیشے کے تابوت کا افسانہ! اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ یورپ میں بعد کی صدیوں میں گھڑا گیا ہے ——

مغربی مصنفین کا یہ الزام مسلمانوں کے لئے خاص طور سے تکلیف اور دل آزاری کا باعث، ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک تعیش پسند اور نفس پرور مذہب کی بنیاد ڈالی ہے اور انھوں نے عیش پسندی کے اس الزام میں خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے مسئلہ پر زور دیا ہے ۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ بات ان کے سامنے رہنی چاہئے کہ محمدؐ ہی تھے جنھوں نے شراب کے متوالوں سے شراب چھڑا دی، کاہلوں اور تن آسانی کے ترکار لوگوں کو مستقل روزانہ پانچ وقت کی نمازیں لازم قرار دیں، اور ایک ایسی قوم کو جو خور و نوش کی دھنی تھی آپ نے سال میں پورے ایک مہینہ کے روزہ کا حکم دیا اور انھیں یہ بات خصوصیت کے ساتھ یاد

رکھنی چاہئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے لاتعداد بیویوں کے رکھنے کا عام رواج تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں صرف چار میں محدود کر دیا، پھر قرآن نے مزید صراحت کی کہ جو شوہر اپنی متعدد بیویوں میں مساوات قائم نہ رکھ سکے اس کو چاہئے کہ وہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرے۔

ایک عام غلط فہمی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وعدۂ جنت کے متعلق بھی ہے، ایک تپتے ہوئے ریتیلے ملک (عرب) کے باشندوں سے آپ نے فرمایا کہ "مرنے کے بعد بُرے لوگ دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دئے جائیں گے اور ان کے مقابلے میں اچھے لوگ ٹھنڈی ہواؤں، آرام دہ چشموں اور خوبصورت حوروں والی جنت میں زندگی بسر کریں گے"۔۔۔۔۔۔ مغربی اہل قلم اس آخری لفظ یعنی "حور" کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہیں چنانچہ وہ اس کی تعبیر محض قیاس کی بناء پر ایک ایسے لفظ سے کرتے ہیں جو انگریزی زبان کا سب سے گندا لفظ کہا جاسکتا ہے اور اسی بناء پر انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ محمدؐ کی جنت ایک شہوت پرست شخص کا محض ایک تخیل ہے، ۔۔۔ لیکن یہ غلط ہے ۔۔ حور سے مراد ایک خوبصورت سیاہ آنکھوں والی عورت ہے جس کا خمیر مشک اور مسالوں سے تیار ہوا ہے اور وہ دائمی طور پر ناکتخدا رہنے والی ہے، یہ صرف ایک تمثیلی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس کا یقینی وجود بھی ہے۔ پچھلی گرمیوں میں اسلام کے ایک بہت بڑے فلسفی کے ساتھ ایشیا کے ایک ریگستان کے کنارہ پر میں کھڑا گفتگو کر رہا تھا۔ ایک موقع سے انھوں نے فرمایا کہ "آج زیادہ کوشش اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جنت محض ایک تمثیلی چیز ہے۔ اہل علم ہر بات کے جوابات دے چکے ہیں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ میں نے اپنی پوری زندگی اسی ریگستان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گذاری ہے اور میں نے دنیا کی تمام خواہشات کو صرف اسی جنت کے حصول کے لئے قربان کیا ہے ،اب اگر مجھے وہاں ٹھنڈے پانی کی نہریں، سایہ دار درخت اور مشک و مسالہ والی خوبصورت لڑکیاں نہ ملیں تو میں سمجھوں گا کہ مجھے فریب دیا گیا تھا"۔۔۔ ریگستانی فلاسفر نے مزید یہ بات کہی کہ "ایک عیسائی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا جز تھے اور یہی اس کے مذہب کا بنیادی نقطہ ہے، لیکن ایک مسلمان حضرت محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کو خدا کا جزء نہیں مانتا اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان تھے، آپ نے شادی کی، آپ کی اولاد تھی، آپ نے روزی کمانے کے لئے محنت ومشقت برداشت کی، آپ کی وفات ہوئی اور آپ ہماری طرح ایک قبر میں دفن کر دیئے گئے، اسی وجہ سے ہم میں کا کوئی باہوش آدمی محمد صلی اللہ کی عبادت نہیں کرتا ہم صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم کو مسلم (خدا کی اطاعت اور اس کی رضا کو پورا کرنے والا) کہا جاتا ہے —"

قرآن | قرآن غالباً دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی، یاد کی جانے والی اور اپنے معتقدین کی روزانہ زندگی میں سب سے زیادہ دخل رکھنے والی کتاب ہے، یہ نہایت اعلیٰ و ارفع اسلوب میں لکھی ہوئی ہے، یہ نہ تو نظم ہے نہ ہی کوئی عام قسم کی نثر ہے لیکن یہ اپنے سننے والوں میں ایمانی جذبہ ابھارنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا ترنم نقارہ کی گرج، فطرت کی آواز بازگشت اور قدیم (مذہبی) نغموں سے ملتا جلتا ہے، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور مسلمانوں کے دینی پیشواؤں نے بسا اوقات اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی مخالفت کی ہے جس سے ایک شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ اس طرح کی خواہش اسلام کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کو محدود کردے گی لیکن باوجودیکہ عربی زبان کوئی آسان زبان نہیں، ساری دنیا میں لوگ اسے سیکھنے کی کوشش محض اس لئے کرتے ہیں کہ اپنی مقدس کتاب کو سمجھ کر پڑھ سکیں اور عربی (قرآن کی اصل زبان) میں عبادت کرسکیں۔

قرآن —— محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے درمیان تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا اور آپ کے جاں نثار خدام اسے کاغذ کے ٹکڑوں، درختوں کی چھالوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھتے رہے، قرآن نے ابتداءً یہ یقین کرنے پر آمادہ کیا کہ معبود صرف ایک "اللہ" ہے جو نہایت رحیم اور مہربان ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا، چیزوں کو بنایا اور صورت بخشی، زمین وآسمان میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب اس کی بڑائی کا اعتراف کرتی ہیں وہ اللہ بڑا طاقت ور اور علم و دانش والا ہے، —— اور یہی وہ پیغام تھا جس نے افراد اور قوموں میں زندگی کی نئی روح پھونک دی، اور پھر جب اسلام عرب کے بڑے بڑے خطوں اور شہروں میں پھیلا اور اسے طاقت ملی تو وحی الٰہی انسانی سوسائٹی کی اصلاح، سوسائٹی کے قانون و دستور اور اس کی مشکلات کو

حل کرنے کی طرف متوجہ ہوئی — قرآن میں امم سابقہ کے متعلق ایسے بیانات بھی موجود ہیں کہ عیسائی اور یہودی قرآن کو پڑھیں تو وہ اپنے کو ایک جانے پہچانے ماحول میں پائیں گے اور اس کے پڑھنے کو وہ اپنے وقت کا سب سے اچھا مشغلہ سمجھیں گے، چنانچہ مندرجہ ذیل آیات جو انھیں جیسی سیکڑوں آیتوں میں سے لی گئی ہیں اگر یک بیک عیسائیوں کے گرجا گھر یا یہودیوں کے سائنا گوگ (عبادت خانہ) میں پڑھ دی جائیں تو بنی اسرائیل یہ معلوم کرنے کی فکر اور کوشش کریں گے کہ ان کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ —

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے :—

لقد کان فی یوسف واخوته آیات للسائلین اذ قالوا لیوسف واخوه احب الی ابینا منا ونحن عصبة ان ابانا لفی ضلل مبین، اقتلوا یوسف او اطرحوه ارضا یخل لکم وجه ابیکم و تکونوا من بعده قوما صالحین قال قائل منهم لا تقتلوا یوسف والقوه فی غیٰبت الجب یلتقطه بعض السیارة ان کنتم فاعلین -

یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں جب ان کے (علاتی) بھائیوں نے کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی یہ دونوں ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ان سے قوت والے ہیں۔ ہمارے باپ صریح غلطی پر ہیں، یوسفؑ کو مار ڈالو یا اسے کسی ملک میں پھینک آؤ تاکہ تمھارے اوپر باپ کی پوری توجہ رہے اس کے بعد تم نیک لوگ بن جاؤ — ان میں سے ایک نے کہا کہ قتل نہ کرو اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی گمنام کنویں میں ڈال دو کوئی مسافر اٹھا لے جائے گا۔

حضرت مریم کے قصہ میں ہے :—

فارسلنا الیها روحنا فتمثل لها بشرا سویا قالت انی اعوذ بالرحمن منك ان کنت تقیا قال انما رسول ربك لاهب لك غلاما زکیا۔

بھیجا ہم نے اس کے (مریم) کے پاس فرشتہ۔ وہ جب انسان کی شکل میں گیا تو

مریم نے کہا میں تم سے خدا کی پناہ چاہتی ہوں اگر تم خدا سے ڈرتے ہو۔ فرشتہ نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں میں تجھے ایک صاف ستھرا لڑکا دینے آیا ہوں۔

قالت انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر ولم اک بغیا قال کذلک قال ربک ھو علی ھین و لنجعلہ اٰیۃ للناس و رحمۃ منا و کان امرا مقضیا ۔

مریم نے کہا کہ مجھے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی انسان نے چھوا بھی نہیں ہے اور نہ میں بدکار رہی ہوں ۔ فرشتہ نے کہا یوں ہی ۔تیرے رب کا فرمان ہے کہ یہ بات اور پر آسان ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اسے لوگوں کے لئے اپنی نشانی اور رحمت بنائیں اور اس کام کا ہونا طے ہو چکا ہے ۔

اسی طرح عیسائی اور یہودی مذہب کے بہت سے مقدس نام قرآن میں موجود ہیں۔ نوح ، یونس ، یوسف ، ابراہیم اور مریم (علیہم السلام) ان پانچ ناموں سے قرآن کی پانچ اہم سورتیں بھی موسوم ہیں اور ان کے علاوہ عیسیٰ ، آدم ، داؤد ، الیاس ، موسیٰ ، لوط اور سلیمان (علیہم السلام) وغیرہ کے نام قرآن میں آئے ہیں اور اگرچہ ان کے ناموں کے ساتھ سورتیں موسوم نہیں پھر بھی قرآن میں جابجا انھیں ایک مقام دیا گیا ہے اور دراصل اسلام کی بنیاد جزوی طور پر عیسیٰ ، نوح ، ابراہیم اور موسیٰ (علیہم السلام) کے ارشادات پر ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے مبعوث ہوئے تھے ۔

قرآن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا نہیں مانتا اور یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت صلیب پر واقع ہوئی ہو، کیونکہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مان لینا عقیدۂ توحید کے خلاف ہوگا جو اسلام کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔ عقیدہ توحید کے بعد قرآن کا ایک اچھی زندگی بنانے کا تصور حیرت انگیز طور پر عملی ہے ، ایک سورہ میں وہ اس طرح خطاب کرتا ہے:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ و لیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یاب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب و لیملل الذی علیہ الحق

ولیتق اللہ ربہ ولا یبخس منہ شیئا فان کان الذی علیہ الحق سفیھا اوضعیفا اولا یستطیع ان یمل ھو فلیملل ولیہ بالعدل واستشھدوا شھیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامراتان ممن ترضون من الشھداء ان تضل احدا ھما فتذکر احدھما الاخری ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا اوکبیرا الی اجلہ ذلکم اقسط عنداللہ واقوم للشھادہ وادنی الا ترتابوا

اے ایمان والو جب تم آپس میں (ایک وقت متعین تک) ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور چاہیئے کہ لکھنے والا انصاف سے لکھ دے اور جیسا اللہ نے علم دیا ہے اسے لکھنے سے انکار نہ کرے اس کو چاہیئے کہ لکھ دے۔ اور قرضدار بتلاتا جاوے اور خدا سے ڈرے اور کچھ کم نہ کرے اگر قرضدار بے وقوف یا کمزور ہے یا بتانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اس کا کارگذار انصاف سے بتائے اور دو مرد گواہ بناؤ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرتے ہو تاکہ اگر ان میں کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد رکھے، اور گواہ جس وقت بلائے جائیں تو انکار نہ کریں اور تم کاہلی نہ کرو چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے وقت معین پر لکھ دو۔ طریقہ اللہ کے نزدیک انصاف کا ہے اور شہادت کو درست رکھنے والا۔ اور یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس سے تم شبہ میں نہیں پڑو گے۔

توحید خالص کی تعلیم کے ساتھ یہ عملی ہدایات ہی قرآن کو ایک بے مثل کتاب بنا دیتی ہیں جن کی بنا پر بہت سے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی زندگی کا سیاسی نظام بھی اسی وقت اطمینان بخش ہو سکتا ہے جب کہ ان کے ملک کے قوانین قرآن سے ماخوذ ہوں۔

سیرۃ النبیؐ کی جھلکیاں

(جناب ڈاکٹر محمد عزیر صاحب شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

انسان کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر تعلیم سے بھی اس وقت تک اثر قبول نہیں کرتا جب تک اس تعلیم کو عمل کے پیرایہ میں پیش نہ کیا جائے۔ پیغمبروں کی بعثت کی اصلی غرض یہی تھی کہ اُن کی زندگی اُن کی تعلیم کی عملی تفسیر ہو تاکہ لوگوں کو یہ عذر باقی نہ رہے کہ تعلیم کا کوئی جزو ناقابلِ عمل ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے کہ آپ کی زندگی قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا زندہ نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ کا یہ قول مشہور ہے کہ بعض حضرات نے جب اُن سے حضورؐ کے اخلاق کی نسبت دریافت کیا تو اُنھوں نے فرمایا کان خلقہ القرآن، یعنی آپ کے اخلاق تمام تر قرآن کے مطابق تھے۔

پیغمبری کا منصب کوئی اکتسابی چیز نہیں کہ انسان اپنی کوشش سے حاصل کر سکے بلکہ ایک وہبی عطیہ ہے جس میں ذاتی سعی کو مطلق دخل نہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے سہ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اس شعر سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ پیغمبری کا ملنا بھی ایسا ہی ہے جیسا کسی سنگریزے جمع کرنے والے کے ہاتھ ایک قیمتی ہیرے کا آجانا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے جن برگزیدہ بندوں کو اس منصب پر فائز کرتا ہے وہ شروع ہی سے نہایت سلیم الفطرت

ہوتے ہیں۔ باطل کی تاریکی میں بھی اُن کا وجود حق کے انوار سے مستنیر ہوتا رہتا ہے۔ شرک اور بُت پرستی سے وہ طبعاً نفور ہوتے ہیں، اور اپنے اعمال و اخلاق کی پاکیزگی میں اُن کو ابتدا ہی سے امتیاز حاصل رہتا ہے۔

آنحضرت صلعم کے عہدِ رسالت کے حالات محدثین کرام اور مؤرخینِ اسلام نے جس تفصیل اور احتیاط سے جمع کئے ہیں اُس کی نظیر سے تاریخ کا دفتر خالی ہے۔ لیکن قبلِ نبوت کے جن واقعات کو انھوں نے جستہ جستہ بیان کیا ہے اُن سے بھی صاف ظاہر ہے کہ رسالت کے منصبِ عظیم پر مامور کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اُس کی اہلیت آپ کی فطرت میں پوری طرح ودیعت فرما دی تھی۔ ایک مشرکانہ ماحول اور بُت پرستی کے گہوارہ میں آنکھیں کھولنے کے باوجود آپ بچپن، اور جوانی میں بھی ہمیشہ مراسم شرک سے الگ رہے کبھی کسی بُت کے سامنے سر نہیں جھکایا، کبھی بتوں کے چڑھاوے کا کھانا نہیں کھایا۔ جاہلیت کی اُن رسموں سے ہمیشہ اجتناب فرمایا جو گویا عرب کے ہر بچہ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ہاں جس معاملہ میں حق و ناحق کا مقابلہ ہوتا آپ حق کا ساتھ دیتے خواہ اس کے علمبردار مُشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ جنگِ فجار میں جو قریش اور قیس کے قبیلوں میں ہوئی تھی آپ نے آلِ ہاشم کی صف میں اسی لئے شرکت فرمائی تھی کہ قریش برسرِ حق تھے۔ اسی طرح جنگِ فجار کے بعد جب زبیر بن عبدالمطلب نے ایک معاہدہ کی تجویز پیش کی جس کا مقصد ہر مظلوم کی حمایت کرنا تھا تو آپ اُس میں بھی شریک ہوگئے۔ عہدِ رسالت میں اس معاہدہ کا ذکر کبھی آجاتا تو فرماتے کہ اس کے مقابلہ میں اگر سُرخ رنگ کے اونٹ بھی مجھے دیئے جاتے تو میں قبول نہ کرتا اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔

سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد آنحضرت صلعم نے معاش کے لئے آبائی پیشہ تجارت اختیار کر لیا تھا۔ لڑکپن میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ کچھ تجارتی سفر بھی کر چکے تھے جن سے کسی قدر تجربہ حاصل ہوگیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی دیانت اور حُسنِ معاملہ کی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی اور آپ "امین" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ اُس زمانہ میں عرب کا دستور تھا کہ لوگ اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور دیانت دار شخص کے سپرد کر کے منافع میں شرکت

کر لیتے تھے۔ اس قسم کے معاملات آنحضرت صلعم کو بھی پیش آتے رہے۔ جن لوگوں کو آپ کے ساتھ تجارتی کاروبار میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا وہ ہمیشہ آپ کی راستبازی اور دیانت کے معترف رہے۔ سائب نام ایک شخص اسلام لاکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو صحابہ نے حضور سے اُن کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا۔ "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں" سائب نے عرض کیا "آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے اور آپ نے ہمیشہ معاملہ صاف رکھا" ایسی ہی شہادت ایک دوسرے صحابی قیس بن سائب مخزومی بھی دیتے ہیں جو نبوت سے پہلے آپ کے شریکِ تجارت رہ چکے تھے۔ تجارت ہی کے سلسلہ میں ایک دفعہ ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ایک صحابی عبداللہ بن ابی الحمسا کا بیان ہے کہ عہدِ رسالت سے پہلے میں ایک مقام پر آنحضرت صلعم سے خرید فروخت کا کوئی معاملہ کر رہا تھا۔ اُس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا کہ میں کہہ اُٹھا کر ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔ اتفاق سے میں اپنا وعدہ بھول گیا۔ تیسرے دن جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آپ اسی جگہ میرا انتظار فرما رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں"

حضرت خدیجہؓ کا آپ کو نکاح کا پیغام بھیجنا جب کہ قریش کے بعض معزز رئیسوں کے پیغام وہ مسترد کر چکی تھیں دراصل آپ کے صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق ہی کا نتیجہ تھا آپ کی امانت اور راستبازی کی شہرت جب عام ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں جو معاوضہ دوسروں کو دیتی ہوں اُس کا دوچند آپ کو دوں گی۔ آنحضرت نے اسے قبول فرما لیا اور بصریٰ تشریف لے گئے۔ واپسی پر جب حضرت خدیجہ نے حساب کتاب دیکھا تو آپ کے حُسنِ معاملہ سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ تقریباً تین ہی مہینے کے بعد آپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا جسے آپ نے منظور فرمالیا۔

نبوت سے پہلے آپ کئی کئی دن تک غارِ حرا کی تنہائی میں غور و فکر میں مصروف رہا کرتے تھے۔ پہلی وحی وہیں نازل ہوئی۔ فرشتہ کو دیکھنے کا اتفاق اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا حضرت جبرئیل سامنے آئے اور سورۂ اقرا کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں تو آپ کے قلب کی

حالت متغیر ہوگئی کاشانۂ مبارک پر آکر حضرت خدیجہ سے صورت حال بیان فرمائی اور اپنے خوف کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے ان الفاظ میں آپ کو تسکین دی۔ "ہرگز نہیں! خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا۔ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اُٹھاتے ہیں غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں"

آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق کی یہ شہادت حضرت خدیجہ دے رہی تھیں جو پندرہ سال تک خلوت و جلوت میں آپ کی رفیقۂ حیات رہ چکی تھیں اور جن سے آپ کی سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ تھا۔ پھر یہ شہادت اُس وقت دی جا رہی تھی جب آنحضرت نے منصب رسالت کا کام شروع بھی نہیں فرمایا تھا اور ام المومنین کو اسلام لانے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ انھوں نے حضور کی نسبت جو باتیں فرمائیں وہ سب قبل نبوت کے واقعات اور مشاہدات سے تعلق رکھتی تھیں۔

نجاشی کے دربار میں مہاجرین کے نمائندے حضرت جعفرؓ نے جو تقریر کی تھی وہ اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس تقریر کا جو فقرہ یہاں قابل غور ہے وہ یہ ہے۔ اپنی قوم کے جاہلی اعمال و اخلاق بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر فرماتے ہیں ــ "اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے"

قریش کے سفراء دربار میں موجود تھے۔ اُنھوں نے نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے یہ تو کہا کہ اسلام بت پرستی اور عیسائیت دونوں کا دشمن ہے۔ مگر یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ پیغمبر اسلام کے جو اوصاف جعفرؓ نے بیان کئے ہیں وہ صحیح نہیں۔

ساعتے با اولیاء
سفیان بن سعید ثوری

(از مولوی اقبال احمد اعظمی)

حضرت سفیان ثوری خدا کے اُن برگزیدہ بندوں اور اُمت کی اُن ممتاز ترین ہستیوں میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم و عمل اور نورِ باطن، تینوں نعمتوں سے بھرپور نوازا تھا، تاریخِ اسلام میں علم والوں کی ہمیشہ بہتات رہی ہے لیکن علم کے ساتھ عمل، زہد و ورع، تقویٰ اور پرہیزگاری، توکل اور دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر اور امیر و غریب، حاکم و محکوم کی تفریق کئے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ نعمتیں مجموعی طور پر اللہ کے خاص ہی بندوں کو ملا کرتی ہیں۔ حضرت سفیان اُنھیں بندگانِ خدا میں سے ہیں، وہ ایک طرف امام المحدثین اور فقہاء کے سرتاج ہیں اور دوسری طرف آسمانِ ولایت پر بھی آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں — آیئے تھوڑی دیر کے لئے مطالعہ اور تصور کے راستہ سے اُن کی مجلسِ مبارک میں حاضر ہوں۔

—— عباسی خلافت کا دور ہے۔ مدینہ منورہ اور کوفہ و دمشق کے بعد بغداد دارالخلافہ بن چکا ہے۔ حکومتی اقتدار اور اُمت کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے جو اس کے بالکل اہل نہیں ہیں۔ عرب پہلے ہی سے بے آب و گیاہ ملک اور غذائی اجناس کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج تھا۔ اسلامی فتوحات نے اہلِ حجاز کے لئے غذا کے مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا تھا کہ عام حالات میں غذائی قلت اور اُس کی وجہ سے لوگوں کے فاقوں مرنے کا کوئی سوال باقی نہیں رہا تھا لیکن فرض ناشناس فرماں رواؤں کی بے اعتنائیوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ حرمین کے باشندے غذائی کمی سے سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ انہی ایام میں سفیان ثوریؒ

حج کے لئے مکۂ مکرمہ آئے۔ جب آپ کو اہلِ حرمین کی اس تکلیف اور پریشانی کا علم ہوا تو تڑپ گئے، اور خلیفہ ابوجعفر جو اُس وقت حج کے لئے آیا ہوا تھا فوراً اُس کے پاس پہنچے، اُس کے شاہانہ ٹھاٹھ اور تزک واحتشام سے بالکل متأثر نہیں ہوئے اور اللہ کے ایک بے خوف داعی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے نائب کے انداز میں اُس کو مخاطب کرکے فرمایا: "ابوجعفر خدا سے ڈر! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس مرتبہ پر تجھے انصار ومہاجرین کی تلوار وں نے پہنچایا ہے جن کے بچے آج تیرے عہد میں بھوکوں مر رہے ہیں"۔ ابوجعفر نے پوچھا کہ "اچھا اگر میں اس منصب کی ساری ذمہ داریاں ادا نہ کرسکوں تو کیا کروں؟" فرمایا کہ پھر تمھیں کوئی حق نہیں کہ خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لو۔ اس منصب سے دست بردار ہوکر اپنے گھر بیٹھو۔ اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کو کھڑا کردے گا جو ذمہ دارانہ طور پر سب کے حقوق ادا کرسکے گا۔"

۲۔ ایک مرتبہ والیٔ مکہ "ابراہیم ہاشمی" نے آپ کے پاس دوسو دینار بھیجے، آپ نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پوچھا گیا۔ "کیا آپ اس کو حلال نہیں سمجھتے؟ فرمایا کہ "میں روپیہ لے کر اپنے ضمیر کو ذلیل نہیں کروں گا۔

۳۔ عام طور پر آپ امراء اور اربابِ حکومت سے بہت دُور رہتے۔ بُلانے پر بھی اُن کے پاس نہ جاتے۔ کیوں کہ اُن کے پاس جانا یا تو عزت وجاہ کے لئے ہوتا ہے یا مال کی طمع اور طلب میں اور حُبِ جاہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے قلب کو بالکل پاک کردیا تھا اور مال کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ:۔

"مال دین کا مرض ہے اور عالم دین کا طبیب، اگر طبیب ہی مرض کا طالب و خواہشمند ہو تو وہ دوسروں کا علاج کیا کرے گا"

(ماخوذ از کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم وتذکرۃ الحفاظ للذہبی)

دُنیا میں
سب سے بڑا روحانی انقلاب
پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ برپا ہوا تھا
جو لوگ اُردو زبان کے ذریعہ
اُس تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور فائدہ اٹھانا چاہیں جس نے یہ انقلاب برپا کیا تھا
ہم انکی خدمت میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی تالیف
معارف الحدیث
اعتماد اور یقین۔ کے ساتھ پیش کرتے ہیں
ہ و تشریح کے ساتھ یہ حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ ہے جو دورِ حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری
نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس کتاب کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ مصنف کی خاص کوشش
میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے
کے ناظرین کے دلوں پر بھی وہی اثرات کسی درجہ میں پڑیں۔ (دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں)
د اوّل — جس میں ایمان اور آخرت سے متعلق ۱۴۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت مجلد غیر مجلد
د دوم — جس میں تزکیہ روح اور اصلاح اخلاق سے متعلق ۲۶۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے جس کے متعلق ذوق سے کہا جا سکتا ہے
کے بعد اور تزکیہ نفس اصلاح قلب اور تربیت اخلاق کا کوئی موثر ذریعہ ان حدیثوں سے بڑھکر دنیا کے اصلاحی ادب میں موجود نہیں ہے۔ قیمت مجلد غیر مجلد
ملنے کا پتہ
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ
لکھنؤ

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW